

READING SECTION

READING SECTION

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سینس ڈائجسٹ

ماہنامہ

اپریل 2016

پاک

رجسٹرڈ

ڈاکٹر کام



READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

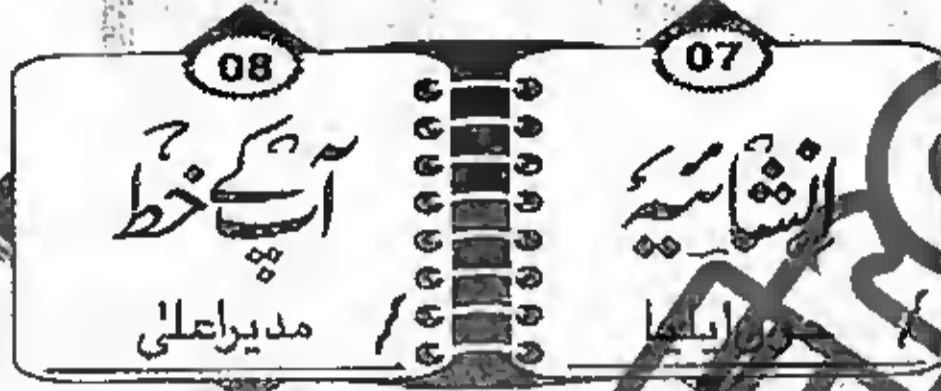
READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING Section





سپنس کی مجلس اور تہذیبی قدریں کی ترویج و ترقی
 شیریں باتیں، گلے گلے اور پر خلوص مشورے

پورا دل سے شکر کے شہسدر کی برآمدی
 پراپنا سہرا اور کائنات



غنا کا نہ طرز عمل اختیار کرنے والی
 ایک خود غرض صنف نازک کا قصہ

ماضی کا آئینہ اختیار کرنے والے افراد کی زندگیوں
 کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات



بھولے بسیرے چہروں میں
 شبتوں کی تلاش کا سفر کا سفر

اسرار و تخیل کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ
 بدلتی واروات قلبی کی عکاس دلچسپ داستان



بال برابر مشرق سے سج اور غنم کی
 پہچان کرنے والے مسیحا کا ماخبر

ماضی سے حال کی جانب کھلنے
 والے دروازے داستان الہم کے رنگ



147	144
استحقاق	محفل شعروں سخن
کر ڈاکٹر شیر شاہ سید	کر قاری عین

پل صراطِ لِحسانت کو عبور کرنے کی تکالیف کا ادراک

ایکے ہاتھوں سچی ایک آنکھیں ملے گی
آپ کی پسند آپ کے ذوق سے ہم اب تک

158	153
مارگوئی	بچے کے بلے
کر محی الدین نواب	کر منظر امام

ایک چہرہ کی روپ کبھی چھاؤں کبھی دھوپ محبت کی
عنایتوں رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل بجا سلسلہ

رشتوں کی تباہی اور رستم
فطرت لوگوں کے مابین محبت تاشا

221	205
مخبر الیوم	والی
کر ضیاء نسیم بلگرامی	کر علی اختر

رشتہ شناسی کا مترجم
حاصل کرنے والے ایک ولی کا قصہ

زیںہ بنتے والی ایک بے بس
دوشیزہ کی تنہائیوں کا عکس

242	235
انجمن انسا	بہر و پیا
کر ناہید سلطانہ اختر	کر ابراہیم جمالی

تک بچھ کر محبت سے کھیلنے والے ایک
عاقبت نا اندیش عاشق کی داستان بہو

کھیل تماشہ کرنے والے
ایک بہر و پیا کا اصل روپ

پبلشر و پریپرٹائن: ذیشان رسول، مقام: اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیزا ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن، مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



نسخہ کیمیا

وہ سرزمین ہارگئی جس میں سب سے پہلی بار گہریوں بویا گیا تھا۔ وہ زمین ہارگئی جس میں پہیا اسیا ہوا تھا۔ وہ زمین ہارگئی جس نے دنیا کو دانش سکھائی تھی اور پتھروں کو پرورش کیا تھا۔ وہ زمین ہارگئی جس نے انسانوں کو اپنی دانش پر فخر کرنا سکھایا تھا۔ وہ زمین ہارگئی جس نے دنیا کو پہلی بار قانون کے ضابطے تعلیم کے تھے۔ ہاں، تھورابی ہارگیا۔ تو صورت حال یہ ہے کہ عراق ہارگیا۔ انسانوں کی بہترین ذہانتوں، کہانتوں اور خطابتوں کی پیش گاہ ہارگئی۔ جون ایلیا تم ہار گئے، تمہارا نسب نامہ ہارگیا۔ تمہارا ماضی اور ماضی کا ماضی ہارگیا۔ باطل ہارگیا، بغداد ہارگیا۔

استحضر کے بعد تاریخ نے بغداد سے زیادہ دانش افروز شہر پیدا نہیں کیا۔ اگر تاریخ پڑھتے ہوئے بغداد کو چھوڑ کر آگے بڑھا جائے تو مہذب انسانیت کا ذہن بیسویں صدی سے گزرنے کا تصور ہی نہیں کر سکتا۔

جب ہلاکو خان نے بغداد کو تباہ کیا تھا تو دنیا کے عظیم ترین شاعر سعدی نے اس تباہی کا مرثیہ کہا تھا۔

آسماں راتق بود گر خون بہ بارو بر زمیں
بر ذوال ملک مستعصم امیر المومنین
اے محمدؐ گر قیامت سر بروں آری ز خاک
سر بروں آرد قیامت در میان خلق میں

اے میرے ہم نشین شام قیامت برپا ہوگئی ہے۔ بغداد اپنی بدترین سرنوشت سے دوچار ہوا ہے۔ تمہاری تہذیب کی سب سے بڑی علامت ابولہان ہوگئی ہے۔ شہروں کا وہ شہرتاہ و برباد ہو گیا ہے جس کے چوراہوں پر تاریخ کی سب سے اعلیٰ دانش، سب سے اعلیٰ پیش کام کیا کرتی تھیں۔ یہ سب کچھ ہو گیا ہے اور کچھ بھی نہیں ہوا۔ بغداد تباہ و برباد ہو گیا اور کسی سہی نے کوئی مرثیہ نہیں کہا۔ اس لیے کہ اس زمانے کا بغداد سہی کے زمانے کا بغداد نہیں تھا۔ اس وقت بغداد کے پیچھے ایک درخشاں تاریخ تھی مگر اس بار بغداد کے پیچھے کوئی تاریخ نہیں تھی۔

سن لیا جائے اور سمجھ لیا جائے کہ تاریخ کے خلاف کبھی جنگ نہیں کی جاسکتی اور اگر جنگ کی جائے گی تو شرمناک ترین شکست کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ تم نے تاریخ کے خلاف جنگ کی اور اپنے اندر اور اپنے باہر شکست کھا گئے۔ جو مستقبل کی طرف قدم نہیں اٹھائے گا، وہ ماضی کی طرف بری طرح و کھیل دیا جائے گا۔ تمہارے حریف اور اس کے اتحادیوں کے ساتھ علم تھا، دانش تھی۔ حکمت اور عمل کا ایک طویل سلسلہ تھا اس لیے ان کی وحاعدنی جیت گئی۔ تمہارے ساتھ ایسا کوئی سلسلہ نہیں تھا اس لیے تمہاری غلط کاری اور غلط کوشی کو تو سزا یا بے ہونا ہی تھا۔ تم بتاؤ، جو اب وو کہ ایسا کیوں نہ ہوتا۔ آخر تم نے تاریخ سے ایسا کون سا معاہدہ کیا ہے کہ تم وقت سے ہٹ کر چلو اور وقت تمہیں راستہ دے دے۔ عراق کی شکست جمہوریت کے مقابلے میں آمریت کی شکست ہے۔ علم کے مقابلے میں جہالت کی شکست ہے۔

کیا یہاں کبھی یہ سوچا گیا کہ اسلحہ وراثہ کرنے والے، اسلحہ برآمد کرنے والوں سے کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں اور اگر مقابلہ کر بھی گزریں تو کیسے جیت سکتے ہیں؟

کیا ہنر کی نقالی ہنر سے جیت سکتی ہے، کیا خریدی ہوئی مہارت حقیقی مہارت کا سامنا کر سکتی ہے؟ حیرت ہے کہ ہم یہ بات کیوں نہیں سوچتے اور یہ نقطہ کیوں نہیں سمجھتے۔ ہمیں اس حقیقت کا احساس کیوں نہیں ہوتا کہ ہم ایک ہزار برس سے تاریخ کے دسترخوان پر حرام خوردی کے سوا اور کچھ نہیں کر رہے۔

میں اپنے آپ سے اور اپنے گرد و پیش سے یہ سوال کرنا چاہتا ہوں کہ آخر ہم نے سوچا کیا ہے؟ ہم تاریخ سے آخر کس طرح کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں؟

حقیقت حال یہ ہے کہ ہم تاریخ سے کوئی معاملہ کرنا ہی نہیں چاہتے۔ ہم نے تاریخ سے کبھی کوئی سلیقے کا معاملہ نہیں کیا۔ تاریخ تو مومنوں کی کوئی زر خرید لوٹنی نہیں ہے کہ اس سے جو کچھ چاہا جائے، وہ منوالیا جائے۔

تاریخ کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ یہ زمانہ علم، دانش اور جمہوریت کا زمانہ ہے۔ علم کے سامنے ذلیل ہونا جہالت کا مفقود ہے۔ جمہوریت کے مقابلے میں شکست کھانا آمریت کا مقوم ہے اور کوئی قوم اپنے تاریخی مقدر اور مقوم سے سرتابی نہیں کر سکتی۔ جو قوم علم، دانش اور جمہوریت کے ساتھ زندہ رہنے کا شعور نہیں رکھتی، اسے رہنے کا کوئی حق نہیں۔ علم، دانش اور جمہوریت، یہی قوموں کے لیے اک لٹخہ کیمیا ہے اور بس۔

☆...☆...☆.....



محترم قارئین
السلام علیکم!

اپریل 2016ء کا بہار رنگ شمارہ آپ کے ذوق کی نذر ہے۔ سال آنے جاتے اور موسم بدلتے رہتے ہیں لیکن انسانی شعور کا خاندان بہت حساس ہوتا ہے جہاں حقیقی لحظات اپنی یادیں مثبت کرتے جاتے ہیں۔ اس بار سال اور موسم کچھ اس طرح بدلا کہ سسٹنس کی پھلواری کے دو خوب صورت پھول مر جھاگے۔ گزشتہ شمارے میں جناب منی الدین نواب کے پھلڑ جانے کی انیسویں ناک خبر تھی اور اس بار برڈگرسز نے تمہیں کار جناب کاشف زبیر کے ملک عدم سدھارنے کی دلدوز خبر دی جا رہی ہے جو 22 فروری 2016ء کو لہنے خالق حسنی سے جا ملے (اناللہ وانا الیہ راجعون) سسٹنس کے صفحات پر اپنی انفرادی شناخت بنانے والے کاشف زبیر کا نام اپنی تحریروں کے حوالے سے ہمیشہ ذمہ دہ رہا ہے۔ وقت کچھ اور آگے بڑھا اور پچھلے ماہ خواجہ نمن کا عالمی دن بڑے جوش و خروش کے ساتھ منایا گیا۔ اگر باغی پر نگاہ ڈالی جائے تو ریسٹریٹر میں تقریباً 1886ء سے خواجہ نمن کے حقوق کے لیے جدوجہد جاری ہے۔ حتیٰ کہ 1918ء میں آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس نے خواجہ نمن کے حق رائے دہی کی حمایت بھی کی۔ آج بھی اس دن کی مناسبت سے ریلیاں نکالی جاتی ہیں۔ تقاریر منعقد کی جاتی ہیں اور قومی منڈلات کا بے دریغ استعمال کیا جاتا ہے۔ مگر سناج صفر..... رتے رتے نوروں اور طے شدہ تقاریر میں الگ الگ منہج نظر کا پرچار کیا جاتا ہے اس کے باوجود آج بھی مسائل اپنی جگہ قائم اور "عالمی دن" کی اہمیت اپنی جگہ رکھتی ہے۔ نہ حقوق کی اوائلی نکل ہو پائی نہ بہتہ جائق سے پردے اٹھائے جاتے ہیں۔ بالکل ایسی طرح جیسے حالی منڈلی میں بیٹروں کی قیمتوں میں نمایاں کمی کے باوجود نہ تو فوری اطلاق کیا جاتا ہے اور نہ ہی اشیائے صرف کی قیمتوں میں کوئی کمی کی جاتی ہے البتہ اضافے کی صورت میں فوراً سے ویشتر تک سے لے کر آنے والے دال تک ہر چیز کی قیمتوں میں بڑے ذوق و شوق اور جوش و دلہلے سے اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ کیسا نظام اور یہ کیسے ہموں ہیں کہ اندھیر نگری جو پٹ راج کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اسی قیمتوں و بہتیشی کی کیفیت سے نکلنے اور غصہ رنگی کا احساس مٹانے کے لیے اب چلتے ہیں اپنی دشت کھٹ محفل کی جائزہ جہاں کم از کم ایک دوسرے کا خیال تو کیا جاتا ہے۔

عذرا ہاشمی، الائیڈ اسکول گزہ موڑ سے محفل میں شریک ہیں

”اینا ہے صنف نادک کا بانہیں مجھے جان بہاراں جیسے رنگ تھن
چل بھریں، بھاری پلکیں، بند آنکھیں اور وا دہن
اڑتا آجمل اور جو طواف تھلیاں ہم رنگ و برجک برنگ
سوشم بہار کا عکاس سرورق بہت خوبصورت و من موہن

آگے بڑھے تو منفر دہرست ویدہ زیب و دل پسند۔ انٹائیٹ میں جون الیٹیا مرحوم انسانیت اور انسانیت و حسی کی محکمک جھکیاں سلجھاتے نظر آئے۔ شکل اور ایسے میں آپ کے تفکرات جیسی بر حقیقت ہیں۔ جس ملک میں بد عنوانی عام ہو اور ڈھکے چھپے انداز میں نہیں بلکہ کھلم کھلا بہت خوفناک ماحول اور خوفناک حالات پیدا کیے جا رہے ہوں اور کسی حد تک کر چکے ہیں۔ ہم تو فقط یہی دعا کر سکتے ہیں کہ اللہ عزوجل ہمیں ایسا لیڈر عطا فرمائے جو بکھرے پاکستانیوں کو متحد اور ایک جان قوم میں بدل دے۔ (آئین) منی الدین نواب صاحب کی رحلت کی اطلاع نے اتنا دکھائی کیا کہ دو دن تک کچھ پڑھا ہی نہیں کیا اور ذمہ کورہ دو دنوں میں نواب صاحب کی یادگار تحریر ویوٹا اور اس کے کردار زمین میں گھومتے رہے اور وفاقی پروہ اسکرین پر ان کی مختلف تحاریر متاخر کی شکل میں قاروڑ کی جانے والی قلم کی طرح بھانگی رہیں۔ ادو کی بیٹی طویل داستان تنہیم ہو گئی۔ اللہ پاک نواب صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آئین) قدرت اللہ نازی صاحب مسند صدارت کی مبارکباد قبول فرمائیں۔ آپ کا سانچہ اے بی ایس اور سانچہ چار سداہ پر برشل شعر بہت اچھا لگا۔ اشفاق شاہن صاحب آپ کا الفاظ کا چناؤ اور بروقت استعمال شاندار ہے۔ سسٹنس میں پہلی کوشش ہے (خوش آمدید۔۔ بہت دیر کی مہریاں آتے آتے) ایک راز طلستہ از ہام کیے ویسے ہیں کہ ہمیں جاسوسی سے حصارف کروالے والا اور دو سالوں میں سے ہماری پہلی محنت سسٹنس ہے جو آج بھی باقاعدگی سے جاری و ساری ہے۔ آج خط لکھتے ہوئے ہم خود بھی حیران ہیں کہ ہم نے سسٹنس سے طویل رفاقت کے باوجود خاموش قاری کی حیثیت کیوں برقرار رکھی اور چاہئیں یہی حیثیت کب تک برقرار رہتی کہ بھلا ہوسید عہادت کاظمی اور نانا حبیب الرحمن کا جنہوں نے اپنی مصنفت کی حدودی برتری کے زعم کا برملا اظہار کر کے ہماری غیرت نسوانی کو چھینوڑ ڈالا اور ہم نے اس تقاضا فرینے کی بجائے آوری پر کمر کس لی۔ (شاہیاش) اچھا لگتا) مر جاگل اور محمد خواجہ کے تہمرے جا ہند اور بہت اعلیٰ تھے اور محمد صہدر صابو کا تہمرہ بھی جامع اور عمدہ تھا۔ ڈاکٹر صاحبہ نے محفل بہار شاہ اکبر کے مجھ سے لے کر جہانگیر کے عہد تک کی تمام بغاوتوں کو ”سیلے بغاوت کے“ میں یوں سمیٹا کہ ہم اس اس کراٹھے۔ ناہید سلطنت اختر نے

اسلام آباد کے ایس مہر میں شہمی شہمی جیتوں کو لڑی میں پرو کر یوں پیش کیا جیسے مسند کو کوزے میں بند کر دیا ہو۔ یہ تحریر آنکھوں سے نہیں دلی سے پڑھی اور قصہ شہر شاہاں نے دل پر امن نقوش چھوڑے۔ اپنی پسندیدہ ترین کہانی شیش محل پڑھی۔ جو لیٹ کے والد جوزف کی موت کا قصہ جو لیٹ کے صدقات کی فہرست میں اضافہ کر گیا۔ قسط کی آخری سطر اس میں فاروق سے اچانک نلنے والی لڑکی یقیناً بھائیہ سیٹھ کی جعلی ممبر ہوگی۔ ہماری پڑھن گوئی ہے کہ جو لیٹ جوزف اور جوزفین کی سگی بیٹی نہیں ہوگی بلکہ کسی مسلمان گھرانے کی پھڑی ہوئی بیٹی ہوگی۔ اس کا دوری صاحبہ ہماری فرمائش ہے کہ جو لیٹ اور فاروق کے دکھوں کی طویل قطار میں خوشیوں کے لحاظ فوراً شامل کریں۔ کارنامہ میں جان اور ڈیپٹی بلیک میلر کم جاسوس ثابت ہوئے عام ڈگر سے ہٹ کر اچھی کہانی تھی۔ بد طبیعت میں حسب سابق اور حسب روایت مرزا احمد بیگ مظلوم یا سبکدوش کو اس کے سوتیلے پورا محل شاہ کے چنگل سے بچانے میں کامیاب و کامران ٹھہرے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس کے شوہر شوکت علی کے کس کو بھی اسی نشست میں حل کیا جاتا۔ چلتر لائبریری عورت کی مہارت اور چالاکی پر مبنی مختصر تحریر کو کی خاص اثر چھوڑنے میں ناکام رہی، ناراض استوری تھی۔ روٹیاں اس ماہ کی دوسری کہانی جس نے دل و ذہن کو تھموز ڈالا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ کیا اس شہمی ہی جان نے جان اچان آفرین کے سپرد کرتے وقت یہ نہ پوچھا ہوگا کہ کیا میرا جرم اتنا بڑا تھا کہ قابل گردن زنی قرار پاتا اور وہ بھی اپنوں کے ہاتھوں۔ اگر محفل شعر و سخن میں انتخاب کا حق ہمارے پاس ہوتا تو زریں آفریدی کا شعر اول نمبر پر، محمد شہباز اکرم نوکی کا دوسرے نمبر پر اور قدرت اللہ غازی صاحب کا تیسرے نمبر پر ہوتا۔ (پسند اپنی اپنی..... نصیب اپنا اپنا) محفل میں شیراں کے حسن دادا کے تو بھی محل کو پڑھا۔ مسمر کی کورتوں کی یاد تازہ ہوئی اور اس کے شوہر رنڈنٹ کو بھی ساگر پر عجیب محفل لینے کی لت تھی، حیرت انگیز اور اچھی کہانی تھی اللہ بنو اب مرحوم کی ماری کی یہ قصہ روایت کے برخلاف بہت اچھی لگی۔ مراد اور ہم زاد دونوں نے اپنے اپنے جیون ساتھی ڈھونڈ لیے، اوکھتے ہیں چار گھنٹے بعد کیا ہوتا ہے۔ ہماری فرمائش ہے کہ ماری کے بعد نیا سلسلہ خاہر جاوید محفل کے قلم سے شروع کیا جائے (آپ کی فرمائش پہنچا دی تھی) بے رنگ میں بھر پور سٹاپس پیدا کیا گیا۔ استوری کا رتہ قدرتی جاسوس نکلا۔ مگر انسان کو ڈکسن چتا دیو اور ڈرپوک نہیں ہونا چاہیے۔ حنیہ نسیم کی اچھی اور عمدہ کوشش ابوالکھلی قطب دوراں میں دوبارہ اکبر اور جہانگیر کے ادوار سے واسطہ پڑا۔ سچ پوریکری ایک تاریخی شہر ہے۔ اس کی ابتدا اور وجہ تسمیہ کے بارے میں پڑھ کر معلومات میں گراں قدر اضافہ ہوا۔ زبردست اور اعلیٰ محبوب مصنف کاشف زبیر صاحب لہذا لائے۔ روینہ کی حد جہد نہ حد کر دل سے بر ملا نکلا۔ شاندار اور آؤت اسٹینڈنگ کاشف زبیر صاحب۔ کسی چھانگے اور عبدالرب بھٹی صاحب نے سبکس کے قیمتی آخری صفحات کا حق ادا کر دیا۔ جاہد شیر علی غازی رہا۔ کشمیر کے متعلق ایسی ایسی معلومات ملیں جو کسی تاریخی کتاب سے آج تک نہیں ملیں۔ کیا کہنے بھٹی صاحب۔ اس ماہ اکثر کبتر میں بھی خوب محفل مگر شفقت محمود کیوڑہ کے لاجواب نظی نے ہنسا ہنسا کر بے حال کر دیا۔ عمومی طور پر اس ماہ کا شمار طویل سلسلوں کے علاوہ چار ہیرے جیسی کہانیوں سے حرمین تھا جو صدیوں نہیں بھلائی جاسکتیں گی۔ تمام ادارے کے انتھک ساتھی یونہی ہی بخیرت جھنگاتے رہو۔ (اتنی گہری نظر سے کیا جانے والا تبصرہ واقعی بہت جامع ارتقا)

بلا رسول قلمی کی پرستار..... رضوانہ قریشی، راولپنڈی سے محفل کی زینت بنی ہیں، مگر ان اعلیٰ محترم صحرا ج رسول صاحب ارب کائنات سے دعا ہے کہ وہ آپ کو لمبی عمر کے ساتھ صحت و تندرستی والی زندگی دے (آمین) آپ کی بیماری کا بہت دور سے پتا چلا اور وہی بہت اداس ہو گیا۔ یقیناً آپ نے بہت بے حد شوق سے پڑھتے ہیں، سب بہت پریشان ہوئے۔ مجھے آپ کی بیماری کا بہت دور سے پتا چلا اور وہی بہت اداس ہو گیا۔ یقیناً آپ نے بہت بیماری کاٹی ہے (بس اللہ اپنے نیک بندوں کو ہی آزماتا ہے۔ اللہ رب العزت ہمیں اس آزمائش پر پورا اتارے، آپ کی پراثر دعائیں ہمارے لیے قیمتی سرمایہ ہیں) آج آپ اپنے رب کے بہت نزدیک ہیں اور وہ جانتا ہے کہ آپ اسے ہر وقت یاد کرتے رہیں۔ (بے شک بیماری میں انسان اللہ کے نزدیک ہو جاتا ہے) آج آپ کی وجہ سے آپ کے والدین کے لیے توبہ کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ آپ جو بھی ان کے لیے دعا کریں گے، وہ ان کی بخشش کا ذریعہ بنیں گی۔ اچھی اور نیک اولاد بھی والدین کے لیے صدقہ جاریہ ہوتی ہے آپ تو جس جس کے لیے دعا کریں گے وہ بڑا خوش نصیب ہوگا۔ آپ کے رسالوں کے ذریعے ہمیں دنیا بھر کی معلومات گھر بیٹھے مل جاتی ہیں۔ آپ نے ہمیں ہر ایسے برے کام کے بارے میں بتایا ہے۔ اچھے برے لوگوں کے بارے میں معلومات دی ہیں۔ (ان معلومات سے مستفید ہونے کے لیے آپ نے بھی وقت نکالا۔ بہت شکر یہ) آپ کی یہ نیکیاں قیامت تک ساری دنیا میں پھلتی رہیں گی اور لوگ قائمہ اٹھاتے رہیں گے۔ رب کائنات نے اس نیکی کے لیے آپ ہی کو چنا ہے۔ آپ بہت خوش نصیب ہیں کہ آپ کے ہمارے بھی آپ کے لیے صدقہ جاریہ کا کام کر رہے ہیں۔ اچھی کتاب اور اچھی پڑھائی انسان کی تنہائی اور دکھ درد کا بہترین ساتھی ہوتی ہیں۔ آپ یوں بھی بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ کو اتنی اچھی، نیک اور خدمت گزار شریک حیات ملی ہیں جو اپنا ہر کام گھر سے لے کر پبلی کیشنز تک بخوبی نبھاتا ہے۔ میری ان سے جب پہلی بار گفتگو ہوئی تو مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میری ان سے بات ہو رہی ہے۔ آپ پبلی کیشنز کی دنیا کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ میرے اس خط کا جواب ضرور دیں۔ میں نے آپ کو اپنی لائبریری کی تصویریں ای میل کی ہیں اور اپنی اس چھوٹی لی لائبریری کو آپ کا نام دیا ہے اور خدا رسول صاحب! آپ سے بات کرنا ہی ہمارے لیے ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ (بہت شکر یہ اس عزت افزائی کا) میں نے تصویروں کے ساتھ جو کالم ای میل کیا ہے اسے دیکھ کر پہلی نظر میں آپ نے کیا محسوس کیا، ضرور لکھیں۔ اب کچھ آپ کے رسالوں کے بارے میں۔ رب کائنات آپ سب کو اس کام کو بڑھانے میں آپ سب کی مدد کرے اور آپ کو صحت دے۔ (اتنی چاہت کا بے حد شکر یہ۔ جی آپ کا ای میل کرو کہ کالم اور لائبریری کا ٹکس ہمیں مل گیا ہے۔ آپ نے اپنی لائبریری جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشن کے روح رواں صحرا ج رسول کے نام کی ہے۔ بہت مہربانی۔ آؤت نے بے زبان جانوروں کے بارے میں کالم لکھا۔ اچھا ہے اور واقعی ہمیں ان بے زبانوں کا بے حد خیال رکھنا چاہیے۔ آپ کے خیالات کن ہم قدر کر رہے ہیں لیکن سبب میں اشاعت کے حوالے سے ہم محذرت چاہتے ہیں مگر ان تمام باتوں میں ڈائجسٹ کی کہانیوں کے بارے میں آپ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا، کہ مزید آپ اس کے لیے کیا چاہتی ہیں۔ مصنف اور کہانی پر کوئی رائے نہیں دی۔ خیر آپ نے جو بھی کہا آپ کی محبت سر آنکھوں پر۔ فون پر

فرادہ اور اسب سے بات کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ لہذا خطوط کی یہ محفل آپ کی اور ہماری آسانی کے لیے رابطے کا خوب صورت ذریعہ ہے۔ جو بھی کہنا ہے خط لکھیں۔ آپ کے خطوط ہماری محفل کی زینت بنتے رہیں گے۔ ہمارے لیے تمام قارئین محترم ہیں اور سب ہماری محبت اور توجہ کے حق دار ہیں جن کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں



✽ اور ایس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے تمبرہ کر رہے ہیں "ماہ مارچ کا سہنس خوب صورت رنگوں کا استخراج آزا و نفا میں اڑتی ہوئی تئیاں بہت عمدہ لگا۔ انٹائیے میں محفل و خرو کے موتی پنے جس میں انسانیت کا ذکر فریبہ مست رہا۔ ادارے کا بھی اپنا الگ انداز تھا۔ ناموں کی دنیا میں محمد قدرت اللہ نیازی صاحب کا نام تھا۔ مبارکباد۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی سلسلے بغاوت کے محفل سحر میں اکبر اعظم کے حالات و واقعات بہترین و موثر انداز میں پیش کیے محبت و رقابت، انہوں کی ریشہ و انیاں، فیروں کی بے انتہائیاں خوب عکاسی کی گئی تھی۔ قصہ شہر شاہاں ناہید سلطانہ خرو اتھی انسان کا ایسا ہے کہ وہ ساری عمر جدوجہد کرتا ہے ایک گھر بنانے میں مگر بیٹا لوگ زندگی بھر کاوشیں کرنے کے باوجود سر پھپھانے کے لیے گھر نہیں بنا پاتے اور دنیا سے گزر جاتے ہیں حسرت و یاس لیے ہوئے۔ شیش محل اسما قادری کی کہانی خوب صورتی و دلچسپی کا عنصر لیے جاری و ساری ہے۔ ہر ماہ بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہے پھر کئی کا احساس لیے کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ کارنامہ تنویر ریاض کی اچھی کہانی تھی۔ بد طینت بھی ایسے انداز میں لکھی گئی کہانی تھی۔ چلتر میں ایک عورت نے پولیس والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکی اور دولت لے اڑی۔ روٹیاں منتر امام کی تھی جس نے عزت کا درس دیا۔ حقیقت سے قریب تر کہانی تھی۔ انسانیت سوز یہ واقعہ کہ گول روٹی نہ بنانے پر باپ و بھائی نے ایک بچی کو مار مار کر ختم کر دیا، انسانیت بھی کانپ گئی ہوگی۔ محفل شعر و سخن میں بھی اشعار نے مزہ دیا۔ سچ سچ میں کتوں نے۔۔۔ لظائف و اقوال زریں نے آگہی کا درد کیا۔ تھنہ اور بے رنگ بھی اچھی تحریریں تھیں۔ ابو الحسنی قلب دوراں نے نئی کیفیت کو نورانی جذبوں سے ہمکنار کیا۔ اللہ کے ولی جب دنیا کو چھوڑ کر اللہ سے لڑ لگتے ہیں تو ان کی زبان اللہ کی زبان بن جاتی ہے۔ جیسا وہ چاہتے ہیں اللہ ان کی خواہشوں کو پورا کرتا ہے کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی صرف اور صرف اللہ کے لیے ہی وقف کی ہوتی ہے۔ آخری صفحات کی دونوں کہانیاں لہوا اثر کا شغذ بہر کی بہترین کہانی تھی۔ دوسری کہانی ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی کفن بہ دوش تھی جو شہیر کے ہنس منتر پر لکھی ہوئی پڑا تحریر تھی، بہت ہی خوب صورت تحریر تھی۔"

✽ محمد صفدر محادویہ، خانیوال سے چلے آ رہے ہیں "15 فروری کی شام کو مارچ کا شمارہ مسرور نہیں میں ملا۔ مسرور کو ایک خوب صورت ماڈل کے ساتھ رنگ کھیرتی تئیلوں سے سجایا گیا۔ جون ایلیا محترم سنگی لے کر آئے بہت خوب کہا کہ بس وہی عقیدے ہیں، انسانیت اور انسانیت دشمن۔ چاہے مغرب ہو یا شرق ایسے لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں جو نادان لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ آپ کا ادارہ پڑھا 23 مارچ تو پاکستان کے سنگ بنیا میں ایک اہم قدم تھا جس سے ہم نے پاکستان حاصل کیا۔ افسوس کہ قائد اعظم اور لیاقت علی خان کے بعد کوئی ایسا لیڈر اور سپاہی نہ نظر آیا جو پاکستان کے لیے اچھا ثابت ہوتا۔ اپنی محفل میں آئے تو اپنے ہم شہر بھائی قدرت اللہ کو کربھی صدرت پر عمدہ تمبرہ کرتے ہوئے برا بھلا پایا۔ بہت ہی عمدہ تمبرہ مبارک ہو۔ شا کر لیلیف کی شکایت محمد خواجہ کی وٹڈ رٹل تمبرہ نگاری کمال کا تمبرہ لکھا۔ رانا حبیب کی سینٹرل چین لہ اور سے شرکت آپ کی بہت ہے کہ چٹل میں بیٹھ کر پڑھنا اور لکھنا اللہ آپ کی مشکل آسان کرے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل سے شروع کیا۔ جولی کو باپ کی موت کا پہاڑ جیسا غم بھی اٹھانا پڑا۔ اب وہ ولد آغا سے انتقام کو وقتی طور پر بھول کے اپنے والدین کی سہری پڑھ رہی ہے۔ قادیوں شملہ جا پہنچا تحریر میں ہندو مسلم فسادات کے بارے میں بتایا گیا۔ ہندوستان کا بنوا ہوا ہے کہے گا کیونکہ مسلم قوم کے لیے ایک الگ ملک ضروری تھا جہاں وہ اپنی زندگی سکون سے گزار سکیں۔ اس کے بعد ماروی تک پہنچے جس کے لکھاری محترم محمد الدین نواب منوں مٹی تھے جا سوئے جو لوگ لوگوں کے دلوں میں اور کتابوں میں اتر جائیں وہ بھی مرا نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ نظروں اور دھاؤں میں زندہ رہتے ہیں۔ ماروی کی یہ قطع بھی ایکشن سے بھر پور رہی۔ اس کے بعد پینچہ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی وادی شہیر پر لکھی کفن بہ دوش کے دوسرے اور آخری حصے پر جہاں بھارتی ظلم حد سے گزر گئے تو کفن بہ دوش مجاہدین نے ان کو ناکوں پنے چھو او لیے ہتا نہیں ادھر کتنے ہی کپٹن جنگوت جیسے جنم واصل ہو گئے مگر کبھی شہیر پر غلبہ نہ پاسکے۔ تاریخی کہانی سلسلے بغاوت کے بادشاہ اکبر نے جو حکومت کی سوادہ تو کی لیکن اس نے ایک نئے دین کی بنیاد رکھ کر رب تعالیٰ کا مجرم ٹھہرا۔ ناہید سلطانہ قصہ شہر شاہاں لے کر آئیں۔ صرف میٹرو و ملائی اور اور دیگر منصوبوں سے ترقی ممکن نہیں بلکہ لوگوں کو خصوصاً خریوں کو مفت علاج کی سہولت تعلیم و تربیت کی سہولت اور ظلم و ضبط پر چل کر ملک دو ترقی پاتے ہیں۔ امیر امیر ترقی اور غریب غریب تر ہونے سے جرم اور ظلم ترقی کرتے ہیں۔ تنویر ریاض کی کارنامہ میں جان نے اچھا کارنامہ انجام دیا۔ مرزا احمد بیگ کی بد طینت بیگ صاحب نے کیا جگڑا قانون کی رسی میں شاہ جی کو مزہ آ گیا۔ عمدہ تحریر۔ سلیم انور کی چلتر گزارہ کر گئی۔ محفل اشعار بھی عمدہ رہی۔ شرعباس کی تھنہ بہت ہی اچھی تحریر۔ مقبول حسین کی بے رنگ میں اسٹورٹ کار نے ڈکسن کو بچایا اور نہ وہ تو مرنے کے راستے پر تھا ہر اسٹورٹ نے بروقت ذہانت سے کام لے کر اصل مجرم کو پکڑوایا۔ ضیا نسیم کی قلب دوراں ابو الحسنی پڑھ کر دل کو سکون میسر ہوا۔ کاش ہم بھی نیک لوگوں کے نقش قدم پر چل کے اپنی زندگی آسان بناتے۔ کاشف ذہیر کی لہوا اثر میں روینہ کا کردار بہت عمدہ رہا۔ اس نے جس بہت سے زندگی کی تخیوں کا سامنا کیا وہ قابلِ داد ہے۔ منتر امام روٹیاں لے کر آئے۔ میں نے کئی دفعہ اس تحریر کو پڑھا تو میری آنکھوں سے ہر دفعہ آنسو پھسے۔ روٹی گول نہ بنا سکتے پروس گیارہ سالہ بچوں کی جیسی بچی کو مار ڈالا۔ یہ پڑھنے کے بعد ایرانکا کہ غضب الہی اب کے جب آنے کو ہے۔ ہم یہ سب راستے پر نہ چلے ظلم کی حد کو پہنچے یقیناً سزا تو جگھتی ہے۔ دنیا میں بھی، آخرت میں بھی۔ اللہ کے اعمال نامہ درست کرنے کی توفیق دے۔" (آمین..... بے شک ہمیں اپنے اعمال پر غور و فکر کی ضرورت ہے)

✽ محمد یوسف سائول انگڑیاں، لہور پور قتل ضلع خوشاب سے سے تشریف لائے ہیں "شمارہ اپنی روایات کے مطابق 19 کو ہی مل گیا۔"



حق کے پیامبر کا پیغام، نیکی پڑھا جسے پڑھ کر یہ سمجھ آئی کہ جردوں کو بڑا کہنا اور سمجھنا ہی بہت بڑی نیکی ہے۔ ادارہ پڑھا جہاں حسب روایات ان انصافوں کا رونا دھونا گیا اور ایک عظیم سامنے کی اطلاع ملی، دل بہت اداس ہوا۔ دیوتا جیسے دیو مالائی سلسلے کے خالق جناب شیخ الدین نواب صاحب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ہیں۔ نواب صاحب جیسے لوگ مرتے نہیں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں ایک زندہ یاد بن کر۔ خداوند کریم نواب صاحب کو جنت میں اٹلی مقام عطا فرمائے۔ محمد قدرت اللہ نیازی صاحب کا تمبر بہت پسند آیا۔ مرحا گل، بہن جی آپ تمبرہ کرتی رہا کریں۔ آپ کا تمبرہ میں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ رضوان بخولی صاحب بھی کافی عرصے سے غائب ہیں۔ پلیز آپ آتے رہا کریں۔ سب سے پہلے شیش محل پڑھی۔ اس کا دوری کی تحریر یہاں قاری کو اپنے سفر میں جکڑ لیتی ہیں۔ رہن اور اور فاروق کا کردار بہت پسند ہے اور جو لیت کی مال کی ڈائری دیکھو کیا اسرار نکھولتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ کوئی بہت بڑا سوڈ کہانی میں آنے والا ہے۔ اس کے بعد بارہوی پڑھی اور یہ جان کر دل بوجھل ہوا کہ اختتام تک نہ تکمیل رہے گا۔ کفن بہ دوش میں کشمیری نوجوان شیر علی کا کردار بہت پسند آیا اور بہت سے حقائق جو تقسیم برصغیر کے تھے ان سے آشنا کی ہوئی۔ سکھ ہندو گورکھا کے مظالم پر دل خون کے آنسو رہا اور عبدالرحمان جیسے کما ٹنڈر کا کردار بہت پسند آیا۔ سلسلے بغاوت کے دور اکبری کا مکمل احاطہ اور نصف صدی تک حکومت کرنے والے بے دین مسلمان بادشاہ کا احوال اور بغاوت کے اسرار و رموز سمجھ آئے۔ بد طبیعت بیگ صاحب کے ایک اور کامیاب کئیس کی کہانی ادارے سے پُروردہ ریکٹ کٹ ہے۔ ایک ایسی تحریر شائع کریں کہ جس میں بیگ صاحب مقدمہ ہار گئے ہوں کیونکہ ہندو یکسانیت سے آگیا جاتا ہے اور کوئی بھی فرد اپنے ذہن میں مکمل نہیں ہوتا کہیں نہ کہیں خامی رہ جاتی ہے۔ قصہ شہر شاہاں اسلام آباد کی مکمل عکس کشی کی گئی۔ ناہید سلطانہ اختر بھی ایک معاشرتی جراح ہیں۔ ان کے قلم کی کاٹ بھی بہت تیز ہے۔ میں عرصہ دس سال سے ان جردوں شہروں میں رہائش پذیر ہوں یعنی کہ جا ب کرتا ہوں اور ان دس سالوں کا منظر مصنف کی تحریر میں حقیقی طور پر نظر آیا۔ سلیم انور کی چلتر ایک عورت کی چلتر کا روی کا منظر کارنامہ جہاں ایک گاڑن اپنے فرض سے کوتاہی کرتا نظر آیا۔ مجھے ایسے لوگوں سے نفرت ہے جو اپنے فرض میں کوتاہی برتیں اور دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث بنیں۔ منظر امام صاحب کی روٹیاں نے خون کے آنسو لایا۔ بہت پُروردہ اور پُر اثر کہانی تھی۔ محمد ایک میاں بیوی کی محبت کا نہ سمجھ آنے والا قصہ۔ لیڈر معاشرتی کہانی ہمارے ارد گرد دیکھ کر بے کرداروں سے کاشف زبیر صاحب نے جو دیکھا وہ لکھا اور بہت عمدہ لکھا۔ بے رنگ ایک عمدہ مغربی کہانی۔ ابو الحسنی قطب دوراں اسلامی سلسلے کی ایک اور ہیر سے نکھرتی مالا جس کا ہر دانہ لا جواب اور مصنف کی کاوش کا منہ بولنا ثبوت ہوتا ہے۔ محفل شعر و سخن میں عمران حارف، محمد قدرت اللہ نیازی کا انتخاب بہت اچھا لگا۔ باقی کتر میں بھی اچھی تھیں اور ہاں نا کمال کی تعریف تو بھول ہی گیا جہاں لا جواب نا کمال جہاں حسینہ ماہرہ جیدہ تھیں کے سنگ کھیتی نظر آئی اچھا لگا۔ (دلچسپ تمبرہ..... شاعر انداز)

ابو بشری افضل، بہادر پور سے محفل میں شریک ہیں۔ نا کمال انتہائی خوب صورت اور دلکش تھا۔ مرحوم جنون الیٹیا کی (نیکی) پڑھی۔ خود تو طے گئے ہمارے لیے علم کا خزانہ ایک مٹھی انداز میں چھوڑ گئے۔ ہماری معلومات میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔ اپنی محفل میں پیچھے نکل کی باتیں نہیں۔ جناب شیخ الدین نواب کی موت کا بڑا دکھ ہوا۔ خدا ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین) کبریٰ صدارت پر محمد قدرت اللہ نیازی کو برا بھلا مانا یا جنہوں نے شعر سے ابتدا کی۔ تمبرہ قابل ستائش تھا۔ ہمارا خط تیسرے نمبر پر تھا شکر ہے ہمیں یاد رکھنے کا۔ شاکر لطیف چلیں روٹا ہند کر دیں اور کہانی لکھ ڈالیں، ہمارا ایش نہیں ہوتے اچھے بچے۔ محفل شعر و سخن میں با کمال اشعار تھے۔ شعروں کی تکمیل بہترین تھی، مزہ آ گیا پڑھ کر۔ جنید احمد ملک پہلا نمبر مبارک ہو۔ لوگ کتنے روپ بدل کر پھریا کرتے ہیں جس طرح چلتر میں اس لڑکی نے بوڑھی عورت کا روپ دھار کر چوری کی اور صاف بیچ لگی۔ منظر امام نے روٹیاں کے عنوان سے حقیقت بیان کی ہے ہمارے معاشرے میں یہی تو ہو رہا ہے۔ ہمارے معاشرے کی منظر کشی خوب صورت الفاظ میں کی ہے یہی تو ان کا خاصہ ہے۔ ٹر ہاں کی کہانی محمد بہت خوب صورت کہانی۔ شیر اکل تو اپنے شوہر سے زیادہ چالاک نکلی۔ بڑی خوب صورتی سے خود کو بچا لیتی تھی۔ مرزا امجد بیگ کی بد طبیعت، انداز و بیباں خوب صورت تھا۔ سسٹن اتنا کہ ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالی۔ کتر میں بھی بہت خوب صورت تھیں۔ (تمبرہ اچھا لگا..... آپ کی شمولیت محفل کی رونق ہے)

صداق معاویہ سعیدی، خان پور، ضلع رحیم یار خان سے تمبرہ کر رہے ہیں۔ تاریخ 2016ء کا سسٹن زیب نظر ہوا۔ سرورق کی روشنیہ جانے کو سارے فیمو لگا کے جو سزاقت تھی کہ جن کی ساری حسنین تھیں دیوانہ داروں کے گرد بندھ لاری تھیں۔ بدست ذاکر نکل..... جون الیٹیا نے ٹھیک کہا کہ برے کو برا کہنا اور برا بھلا بھی نیکی ہے۔ آپ ادارہ میں بے قاعدگی پر تھلا لے نظر آئے۔ خدا کرے یہی تو غریب عوام کے امیر حکمران، غریبوں کے لیے سنجیدگی سے سوچیں اور دکھ دینے والی خیر کہ ہمارے محبوب قلم کار شیخ الدین نواب جہاں قانی سے دل بجا کوسدھا گئے۔ حق تعالیٰ مغفرت کرے۔ میری قارئین سے گزارش ہے کہ ایک مرتبہ سورہ فاتحہ 3 مرتبہ سورہ اظہار پڑھ کر نکل نواب کو ایصال ثواب کریں۔ براہم قدرت اللہ نیازی تاریخ 2016ء کے لیے صدر بزم یاروں شہرے (مبارکوں سامنے مبارکوں) طرہ تخریر اور مضمون شاعر آپ کے ساتھ ہم بھی شریک دعا ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دہشت گردی کے حضرت سے نجات دے۔ اشفاق شاہین اور بشری افضل منظر گر جامعہ تخریر کے ساتھ وزارت اور مشاورت کی کرسی پر جلوہ افروز اور پھر آپ نے مجھے خوش آمدید کہا تو جناب میں بھی آپ کا شکر یہ ادا کرتا ہوں۔ اب ہماری اپنا یہ دیکھیے کہ تین دن میں ساہرا سالہ پڑھ ڈالا۔ اب سوچتا ہوں باقی 27 دن کیا کروں گا۔ (سعیدی ہی بات ہے۔ بہا افکار) محمد صفر

سانحہ ارتحال

پروفیسر ڈانجسٹ کی ایڈیٹر یعنی احمد کی ہمیشہ حنا و روح طویل علالت کے بعد 21 فروری 2016ء کو رضائے الہی سے انتقال کر گئیں۔ اللہ عزت انہیں جنت الفردوس میں جگہ اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین (قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے)



معاویہ پ نے ٹھیک کہا کہ پاکستانی ذہانت کا جواب نہیں مگر حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ کہا میں میں سب سے پہلے شیش گل پڑھی اور 3 مرتبہ پڑھی۔ پہلی مرتبہ شوق سے۔ دوسری مرتبہ تسکین کے لیے اور تیسری مرتبہ تہمیرہ کرنے کے لیے (کمال ہے) کیا تہمیرہ کر دیں گے تو یہ ہے کہ شیش گل پڑھتے ہوئے کرنے کے لیے میرے حلقہ خیال میں الفاظ نکلتے ہیں۔ دین دادا کا ہر جگہ معاملات سمجھانا اور ہر ایک کی تہمیرہ خواہی دیکھ کر دل میں خواہش آتی کہ کاش کرنا دھرتا بھی کوئی زمین دادا ہی بن جائے پھر بامدی پڑھتے ہوئے کئی مرتبہ آنکھیں جھپک گئیں کہ تو اب نکل اب ہم میں نہیں رہے لیکن دلوں میں ہمیشہ ہیں کے بانی کہا میں پر تہمیرے کی صورت میں یادانی محفل کی حق تلفی کا محظور ہے لہذا اس کرتا ہوں۔ حیات بانی۔ ملاقات بانی۔ (کالی بھعدار ہیں)

سید عبادت کاظمی، ڈیرہ اسماعیل خان سے چلے آ رہے ہیں، موسم گل کی دستک دینا سسپنس ہمارے دل میں بھی بہا رہی نکلا گیا۔ رنگ برنگی تیلیوں سے سجا سورتی، خوب صورت سے خوب صورت ترین تھا۔ نائل گرل پر لوکسٹس۔ جون ایلیا کی کڑوی باتیں سن کر شیشی سی محفل میں داخل ہوئے۔ محمد قدرت اللہ نیازی مجتوں کی صدارت کرتے نظر آئے۔ خاص کر ان کا انتخاب کروہ شہر دل کو چھو گیا۔ اشفاق شاہین بھائی و جاؤں کے لیے بہت شکر یہ بشری افضل کیا کریں، دوستوں کے ویسے ذمہ بھولتے نہیں ہیں نا۔ اب کچھ پرانے دوستوں سے گزارش ہے کہ وہ بھی محفل میں آئیں اور نہ ہم بھی جا رہے ہیں۔ اسماعیل خان سے کیا کر رہی ہیں۔ شیش گل میں چاند بانو موجودہ قسط میں غائب تھی۔ ماجد علی جیسے لوگ معاشرے میں رشتوں کے اعتباراً کو گوارا ہے ہیں۔ میں تو سسپنس بس شیش گل کی وجہ سے لیتا ہوں..... باروی کے رائٹر اس جہاں کو انوار کا کہہ گئے، بہت انوس ہوا۔ اللہ ان کو جنت نصیب فرمائے۔ اپنے محبوب رائٹر کی کہانی کہیں پڑوش پڑھی، بہت اچھی لگی۔ شیر علی کے ہمت اور حوصلے کی داد دینی چاہیے۔ رینو تھیں سوچ بر لڑکی کو آجائے۔ جان جائے پر عزت نہیں۔ کشمیری بھائیوں کے لیے دل میں درد اٹھتا ہے۔ خدا غافرت کرے ان بھارتیوں کو۔ کچھ کئی بارہ کئی چٹا نہیں کیوں۔ کاشف زبیر کی کہانی لہو اثر پڑا اثر تھی۔ منظر امام تو ہر وقت وہاں اس کر کے چھوڑتے ہیں۔ رو دنیاں ایک زبردست اور سبق آموز تحریر تھی۔ غریبوں کی زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ نیل کو کچھ نہیں کہا گیا کیونکہ وہ امیر گھرانے کی بیٹی اور اس بیٹی کو بس اللہ صاف کرے۔ سلسلے بغاوت کے مکمل نہیں پڑے پایا۔ شہر و سخن میں سید عباسی کا انتخاب دل کو چھو گیا۔ میرے والد صاحب ٹٹل ہیں ان کے لیے دعا کی درخواست ہے۔ (تہمیرے کا شکر ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے والد کو جلد از جلد صحت کا ملہ عطا فرمائے۔ آمین)

ایم عمر ان جوانی، رچھوڑ لائن، کراچی سے محفل میں حاضر ہیں، پچھلے ماہ بلیک لسٹ ہونے کے باوجود ایک سہی اور سہی۔ (ہوں..... یہ ہوئی نامات..... اچھا لگا) دو چشیاں ایک ساتھ ہوں تو سارے کام نٹا کر مٹا لے گا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ جامع و مختصر ادارے میں آپ نے 23 مارچ اور نواب صاحب کو خوب صورتی سے یاد کیا۔ میرے محفل نیازی صاحب، تہمیرہ خوب صورت ہے۔ صادق معاویہ، خوش آمدید، تفصیلی تہمیرے کی امید ہے اب۔ ذرین نے دوران ستر کلاسک خند لکھا۔ کورنگی کی تہمیرہ کی بڑھتی جا رہی ہے۔ خواجہ صاحب نے پورا شمارہ خوب صورتی سے کور کیا۔ مرا جا گل کا طویل تہمیرہ بہترین سے بھی بلند ہے۔ ایک رات میں رسالہ ختم کر کے عمر کی سے خط لکھا۔ ڈاکٹر ساجد کی تحریر میں تو معلومات کا خزانہ ہیں۔ اچھا تو جناب ہندو پنڈتوں نے حسین عورتوں کی سب سے خوب صورت جسم "پدنی" کو تارویا۔ پدنی کو لہا پوری یاد آگئی۔ گل بھی سورج نکلے گا، گل بھی پیچی گا میں گے اور جی یہ کہ میرے اجداد کے وطن کجرات کا پرانا نام "ماوہ" تھا۔ کیا منظر نگاری ہے اور یہ جملہ دیکھیں "لوحات اکبر کا چچا انسان کے رزق کی طرح کر رہی تھیں۔" تیر گل دانائی کے بڑے قصبے سے تھے۔ ان کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی نے اس کا کیا انجام کیا، یہ آج چانگا۔ چاند بی بی کی صحت و شجاعت نے لہو گر باویا۔ وہیں اس کی بے بس موت نے دل او اس کیا، اکبر کے پچاس سالہ دور کی اس جامع داستان نے مظہر سلطنت کے زوال کے اسباب کھول کھول کر بیان کیے۔ آج کے گل کرناہید سلطنت اختر کی خالص معاشرتی کہانی قصہ شہر شاہاں سے ملاقات انوکھی۔ منفرد پلاٹ نے اپنی گرفت میں لیے رکھا۔ اونچے خواب آنکھوں میں سجائے بڑے شہروں کی طرف کوچ کرنے والوں کے دل کی آواز ہے یہ۔ میرا ایک قریبی دوست حال ہی میں دو سال ورا حکومت کی خاک چھان کر کراچی یہ کہتا ہوا وہاں آ گیا کہ جی اپنا شمارہ چاہی ہوتا ہے۔ ناچیز کی رائے یہ ہے کہ نئے لکھار یوں کو ضرور موقع دیا جائے۔ انگریزی، فرنچ، بنگالی، اردی اور ہندی زبان کی کہانیوں میں ایسے ایسے تک موجود ہیں کہ قاری اس اس کا ٹھٹھے۔

ایم عمر جا گل، دہان، ڈیرہ اسماعیل خان سے شریک محفل ہیں، "درج کا نائل بہاروں کا ساتھ۔ رنگ برنگی تیلیوں کی طرح خوش شکل حسینہ بھی گویا ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ انار یہ سے مستفید ہوئے۔ وہاں اس خبر نے دل دکھ سے بھر دیا کہنگی الدین نواب ایک بہترین مصنفہ رضائے الہی سے وفات پا گئے۔ ان کی کہانی دیوتانے ایک عمر سے سحر میں جکڑا ہوا تھا۔ مصنفین ایسی کتابوں کی شکل میں اپنے مرنے کے بعد بھی اپنے چاہنے والوں کی لائبریری میں محفوظ رہتے ہیں۔ خدائے رب ذوالجلال انہیں مغفرت عطا فرمائے آمین۔ پآف وی اسٹ قدرت اللہ نیازی تھے، منفرد تہمیرہ تھا۔ حساسیت لیے ہوئے تھا۔ مبارکباد قبول کیجئے۔ بشری افضل ایک چھوٹے سے تہمیرے کے ساتھ موجود ہیں۔ صادق معاویہ کی جی باتیں اچھی لگیں۔ کڑوی محفل آف منصفہ مونچھ میں ہم بطور سویت ڈش بن کر اترتے ہیں۔ محمد خواجہ کو گئی کا تہمیرہ پسند آیا جیسے ٹھنڈی میٹھی پھول۔ مانا صاحب الرحمن کا تہمیرہ بے حد پسند آیا۔ خصوصاً نازک منصف کو تہمیرے کے ساتھ ہیکارے جانے کا اعزاز ویلڈن گاؤں میں 19 کوڈ انجسٹ پچھتا ہے اور ہم ایک رات میں پڑھ کر 20 کو لیزر شائع کر دیتے ہیں اتنی محنت سے لگتے ہیں مگر۔۔۔ حالانکہ ایک رات میں پڑھنے کا مزہ بھی نہیں آتا مگر محفل کی محبت میں کھینچے چلے آتے ہیں اور آپ ہیں کہ (اے اے اے) اس میں دل چھوٹا کرنے کی کیا بات ہے۔ ذرا دل بڑا (میں) سب سے پہلے نین پڑوش پڑھی۔ درج تک میرا ب ہوئی، اسکی زبردست تحریر پڑھ کر ویلڈن ڈاکٹر صاحب۔ شیش گل پور سے پور تہمیرہ جاری ہے۔ سب سے بہت کہانی منظر امام کی تھی۔ کہانی پڑھ کر دل بو محفل ہو گیا۔ بانی کہا میں پر تو تہمیرہ۔ ہمارے تہمیرے الفاظ تو یوں بھی کاٹ دیتے ہیں۔ پہلے محفل کی باتیں وری شائع ہو جائیں پھر اگلے ماہ پھر پور تہمیرے کے ساتھ حاضر ہوں گے۔ اپرل کے شمارے کو دیکھیں کہ میں کبھی ہو جائے گی کیونکہ اپرل میں 11 ماہ کی گرام ہیں۔

اس دفعہ اچھی باتیں اور کڑیوں میں محمد جاوید چھانے رہے۔ (شکر یہ جناب تمبرے کا۔۔ آپ کے گلے خط کا انتظار رہے گا)



معراج محبوب عباسی، ہری پور، ہزارہ سے حاضر ہیں۔ مارچ کا سینیس ڈائجسٹ تمہارا جلدی 19 کو حاصل ہو گیا۔
 جاسٹل حسین زنگوئی کا عکاس تھا۔ سب سے پہلے مدودی پڑھی (اللہ تعالیٰ اس شاہکار کے خالق جناب نواب صاحب کو جنت میں اعلیٰ مقام دے اور مرحوم کو اعلیٰ درجات اور دروٹا کو میر جیل دے کیونکہ جانا تو سب نے ہے) مراد علی منگی دشمنوں کو ناکوں پٹنے چھوڑا ہا ہے، وہ بھی نیٹل باڈی کے ساتھ دیکھ دو دیدہ زیب ڈیزائن دانے اور ساتھ میں گھر بھی بسا لیا ہے۔ لہذا، کاشف زیر ایک حساس تحریر کے ساتھ آئے۔۔۔ خرپوزہ، خرپوزے کو دیکھ کر رنگ، پکڑا ہے۔ رضامراد کے کربوت جس طرح کے تھے تو خون کا اثر تو ہونا تھا۔ مقبول حسین صاحب کی بے رنگ، خاصی دلچسپ تحریر تھی۔ سیکنڈ لاسٹ صفحے تک قائل ڈکسن تھا۔ پھر اچانک شک کو مات ہوئی۔ سکے کا دوسرا رخ سامنے آیا مگر یہ سب اتنی آسانی سے نہیں ہوا۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ ارے نہیں، بہت اچھا ہے وقف، بنانا مشرق قائل کو۔ منظر امام کی روٹیاں ہمارے بے حس معاشرے کا بھینک رخ اجاگر کرنی حساس تحریر تھی۔ احساس نامی جذبے کو ہم نے بے حس کے تاج محل کے اندر روٹن کر دیا ہے۔

بلقیس خان، دادکینٹ سے چلی آ رہی ہیں، محی الدین نواب کی یوں اچانک رحلت کی خبر آرزو کر گئی۔ یہ وہ قلم کار تھے جن کی تحریروں سے اختلاف رکھتی تھی۔ میں نے بھی یہ سوچا کہ رائٹر جب کچھ لکھتا ہے تو بقول منو، اپنے گھر کا روزنامہ نہیں لکھتا۔ ہو سکتا ہے کسی آپ کی ہوا اور آنسو آپ کی کسی دہکی بہن کے۔ معاشرے میں بڑھتی ہوئی بے راہ روی پر نواب صاحب جیسے بڑے لکھاری اگر قلم کی مار مارتے ہیں تو ہمیں کیوں تکلیف ہوتی ہے۔ میرادل بہت دکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر فضل و کرم کے دروازے کھولے اور تمام منزلیں آسان کرے۔ میری گزارش ہے کہ نواب صاحب کے سابقہ قلمی ناموں سے قارئین کو آگاہ کیا جائے۔ شکر یہ۔ محلی، جون ایلیا کی بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ اگر صرف اس ایک جملے پر لوگ عمل کر لیں۔ انسانیت ایک خاندان ہے نہ اس میں کوئی امتیاز ہے نہ کوئی تفریق۔۔۔ تو میں سمجھتی ہوں دنیا سے ساری کدورتیں، اداوتیں، تفرقتے اور اشتہار ختم ہو جائے۔ اذرا بے میں باوردی شخص کے کالے کربوت پر وردی دالوں کے لیے دل میں جو نفرت تھی اس میں کچھ اور اضافہ ہوا۔ کرسی صدارت پر خانیوال کے ایم کیو نیازی (جو اکثر اس کرسی پر قابض رہتے ہیں) برا جان تھے۔ خوب صورت شعر نے خوب سے تمبرے کو کئی جانہ چڑ دیے۔ اشتیاق شاہین کے ہاتھ دزارت اور بشری افضل کو سفارت کا ٹکڑا ملا۔ صادق معاد یہ سیدی کی پہلی شہادت لکھا ہی نہیں کہ پہلی ہے۔ اس دفعہ اسے دن بھرہ تھا۔ زرین آفریدی کی دوسری پوزیشن، محمد خواجہ اور تیسری پوزیشن محمد صفدر معاد کی رہی۔ مرحا گل اور سید عبادت بھی لیے ہاتھ مار رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ خوب لکھ رہے ہیں۔ شیش گل سے آغاز کیا۔ فیورٹ کردار بن دادا ہیں اگر اس طرح کے دو چار دادا پاکستان میں پیدا ہو جائیں تو سارا کچھ اعلیٰ صاف ہو جائے۔ انتہائی مضبوط کردار خوش رو قارون بھی کم نہیں ہے۔ جو لیٹ، جوزف کی بیٹی نہیں ہے۔ یہ شک تو جوزفین اور جوزف کی سوگوار آنکھوں نے پہلی قسط ہی سے دل میں بٹھا دیا تھا۔ اب قارون سے کیا رشتہ لکھا ہے جوزفین کا۔۔۔ انتظار ہے۔ اس کا قارون کی یہ تحریر گرداب سے زیادہ سحر انگیز ہے جو پڑھنے والے کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ قصہ شہر شاہاں 70 لیمڈ افراد کی نمائندہ ایسی درد انگیز تحریر جس نے بہت سوں کو میری طرح رلا رلا دیا ہوگا۔ لہذا کراچی ایڈ جلدی میں لکھا گیا۔ رضامراد کو اتنا "دست" کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ بد طبیعت، حسام بیٹ کی یاد رہ جانے والی کہانی ہے جس میں مظلوم کو اس کا حق ملا اور عالم انجام رسید ہوا۔ بے رنگ، ادوستی کے تقاضوں کو پورا کرتی ایک دلورہ انگیز کہانی تھی۔ ابو الحسن قلب دذراں سے روح سیراب ہوئی۔ کارنامہ، چلچرا اور روٹیاں گزرا بے لائق تھیں۔ آج کل بہت ساری پریشانیوں نے گھیرا ڈکھا ہوا ہے ہمارا۔ اس لیے بغاوت کے سلسلے، مادری اور کفن یہ دوش نہ پڑے۔ محمد جاوید، محی رحمان، رضوان جونی، مرحا گل، ریاض بیٹ اور اختر عارف شاہ کے مراسلے اچھے تھے۔ اشجار جنید احمد ملک نظرا اقبال، ظفر، محمد کمال، الور، جبران احمد ملک اور اشتیاق شاہین کے خوب رہے۔

محمد خواجہ، کورنگی، کراچی سے تمبرے کے ساتھ حاضر ہیں۔ مارچ کا شمارہ فوراً ہی ہاتھ میں آسوجھ ہوا۔ سردرق پر ایک خاتون شاید اپنے آنچل کی تھک پردہ پوش نظر آ رہی ہے اور تھک ہی شاید ایسی کہتیاں بھی اس پر منڈلا رہی ہیں۔ جون ایلیا کی پرمغز اور معنی خیز تحریر کو مختصر ہی سمی لیکن دل کو پھول لینے والی ہوتی ہے۔ اس دفعہ انہوں نے انسانیت اور انسانیت دشمنی اور اقتدار کی کشمکش پر اتنی سیر حاصل کرا رکھی ہے کہ ذہن روشن کر دیا۔ خللوٹ کی محفل دوستوں نے خوب سجاویں۔ میرے خط پر آپ کی پسندیدگی کا شکر گزار ہوں۔ محمد قدرت اللہ نیازی اس دفعہ میر کارواں ہونے پر مبارکباد قبول کریں۔ آپ کے شعر کا جواب نہیں۔ دانا حبیب اللہ پک کو اس مشکل سے آزادی دلائے۔ سلسلے بغاوت کے گوکہ زمین پر عذاب ہی زن، اذرت زمین کے وجود سے ہے۔ چاہے وہ عام آدمی ہو یا بادشاہ۔ مظہر دور کی یہ کہانی گوکہ کئی داستان کو لکھتے ہی رہے ہیں لیکن ڈاکٹر ساجد امجد نے بڑی شیرینی سے تحریر کی ہے۔ بہت سی نئی باتوں کا انکشاف ہوا۔ قصہ شہر شاہاں خاتون نے ہمارے ملک کے دار الخلافہ کے ماسی اور حال کی جو تصویر پیش کی ہے، اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میرے ذہن میں اس خوب صورت شہر کی جو تصویر تھی، اس میں دھندلاہٹ آ گئی ہے۔ کاش وہ شہر ہمارے سیاستدانوں کی گرفت سے آزاد ہو اور پہلے جیسا خوب صورت ہو جائے۔ شیش گل، بڑی روانی اور چابکدستی سے دواں دواں ہے۔ کہانی قدم قدم سے موزوں لگتی ہے لیکن معنی دہن کی اور رنگت کو قائم رکھتے ہوئے اس کو دلچسپ بنا دیتی ہے۔ کارنامہ، ایک گل کی داستان اور سراسر ماسی کی استھک کوشش۔ کامیابی کے نہ ہوتے ہوئے بھی ایک ایسا داد آرمایا جیسے کوئی استاد اپنا کوئی گر چھا کر رکھتا ہے۔ بد طبیعت، ویل صاحب کے کارنامے اس رسالے کی جان ہیں۔ بیگ صاحب اپنے کام کے مرد میدان ہیں۔ ایک تم رسیدہ عورت جو ایک مہموم چیز یا کسی طرح ایک مبادعت اور نیک شخص کے جال میں پھنس کر الجھتی تھی لیکن بیگ صاحب اور ایک نیک شخص نے رحمت کافرشتہ بن کر اس کو آزاد کیا۔ چلچرا، بہت مختصر لیکن اچھی تحریر۔ ایک عورت کی کمال چالاکی جس نے اپنا جرم نہ صرف چھپا لیا بلکہ سال بھی کما کر لے اڑی۔ روٹیاں نظیر اکبر آبادی کا شعر جو مدنی پر کہا گیا ہے۔ اس کا اشتہار بہترین ترجمہ اور تشریح اس مضمون میں مختلف اعداد اور کہانیوں کے ذریعے کیا گیا ہے کہ روٹی اور جامد کے تعلق کو بہت خوب صورتی سے اجاگر

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کپریڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1



کر دیا گیا۔ چند میاں بیوی کا سچایا ہوا گورکھ و سدا جس میں لوگ اپنی ہی انگلیاں گنوا بیٹھتے ہیں۔ کہانی گو کہ بڑی معمولی ہے لیکن شرماس کے قلم نے اس میں روح پھونک دی۔ محی الدین نواب جیسے عظیم کہانی نویس کا دارقالی سے کوچ کر جانا بڑا اندوہناک ہے۔ ایسے لوگ کہاں بار بار پیدا ہوتے ہیں اور ادب کے معراج تک پہنچتے ہیں۔ ایک شخص جو سارے شہر کو دیران کر گیا۔ خدام مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

(بے شک ڈائجسٹ کی دنیا میں ایک بہت بڑا اخلاقی پیدا ہو گیا ہے) بے رنگ، دو دوست، ایک کی عیب کا کل جو کیا کسی اور نے اور پھر جس گیا ایک دوست جو مقولہ کا محبوب تھا لیکن دوسرے دوست نے اپنی ذہانت اور ایک معمولی سراغ ڈھونڈ کر دوست کو بچایا اور دوستی کی لانچ رکھ لی۔ امیر ابو اعلیٰ قطب دو ماں، مظاہر دور میں ایک باکمال خدا کی بزرگ ہستی کی داستان حیات جو ایمان کو تازگی اور زندگی کی راہنمائی کرتی ہے۔ لہذا ایک عورت کی کہانی جو قدم قدم جیتی اور مرتی رہی لیکن پاک و آئین، نیک نیتی اور ذمے داریوں کا پورا پورا حسن طریقے سے اٹھاتی رہی۔ کئی جہول بھی نظر آتے ہیں لیکن پھر بھی کہانی نے بے مزہ نہ کیا۔ کفن بہ روش، کشمیر پر خاصانہ قبضہ اور حرمت پسندوں کی جنگ کی ایک ذمہ حقیقت کا پس منظر۔ ہندوستان کی ظلم و بربریت سے بھرپور داستان اور کشمیریوں کی مظلومیت اور جدوجہد آزادی، بہترین پس منظر واقعات کی ترتیب اور جگہ جگہ چالوں کی بے مثال عکاسی لیکن یہ کہانی تو اختتام پذیر ہوئی۔ مگر جدوجہد آزادی تقسیم برصغیر سے جاری ہے۔ کتر میں اور اشعار، ہمیشہ کی طرح پنڈارے دار، حکایتیں، لطائف اور لگا رنگ تحریریں۔ اگلے شمارے کے خوب سے خوب تر ہونے کی امید اور اس سے "آپ کے مغز و تہرے نے ایک بار پھر ول موہ لیا"

۱۲۱ ابرار وارث، سندھ لیا نوالی سے تشریف لائے ہیں "اس وفد کا شمارہ تو بہت ہی لیت ملا۔ بلکہ سبز رنگ پر بھورے رنگ میں ملیوں صف نازک ہمیشہ کی طرح اپنی حشر سامانوں سے صنف کرخت پر قیامت ڈھا رہی تھی۔ جلدی سے سرورق سے جان چھڑائی اور سیدھا آپ کی باتوں میں آئے تو آپ نے مختصر حال احوال بتا کے ایک بری خبر سنائی کہ محی الدین نواب جو کروڑوں دلوں کی دھڑکن و پونتا کے تخلیق کار تھے، وہ ہم میں نہیں رہے۔ سنی تو یہ خبر پہلے بھی تھی لیکن افواہ کے طور پر لی تھی لیکن یہ کیا؟ میں تو اتنی دیر تک سکتے نہیں رہ گیا۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا کہ ایسا ہو گیا ہے کہ اب تو وہ اللہ کے پاس چلے گئے ہیں۔ بے شک ہم نے ہی اللہ کی طرف جانا ہے۔ کاش کہ ایسا نہ ہوا لیکن ہونی کو کون نال سکتا ہے۔ بہت دیر بعد رسالے کی درق گروالی کی حالانکہ پڑھنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ ساتھیوں کے تہرے بوجھل دل کے ساتھ پڑھے۔ ان میں قدرت اللہ بجائی اللہ سے دعا کر رہے تھے کہ محی الدین نواب کو اللہ جلد شفا یاب کرے تو بے اختیار آسوا آئے۔ ماری کا کیا بنے گا وہ تو اب ہم سب میں مقبول ہو چکی تھی۔ ہم سب بشمول میں کب سے درخواست کر رہے تھے کہ نواب اگلے ماری کو ایڈ کروں لیکن یہ تو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں اختتام ہوگا۔ فہرست میں نظر دوڑائی تو تاریخی کہانی کے بعد کاشف زبیر قاسم، آگے دیکھا تو سینکڑا لاسٹ اسٹوری پڑھے۔ میری پسند کے رائٹر ہیں نا۔ ناہید سلطان کا قصہ شہر شاہاں پڑھا۔ ملکی حالات میں گھرے بے کس و معصوم لوگوں کی داستان۔ اسلام آباد اور لاہور میں کوئی فرق نہیں رہا۔ لوگ بھوک پیاس سے مر رہے ہیں اور ان لوگوں کو میٹروپس کے بعد اب اور جج ٹرین سے فرصت ہی نہیں مل رہی۔ کیا ان کو ستم رسیدہ، مظلوم، الحال، و غریب عوام کیوں نہیں دکھائی دیتے؟ ہمیشہ کی طرح حساس دلوں پر چھت کرتی ٹراٹھر رہی پڑھی تھی کہ بھائی کبیر عباسی کی کال آئی کہ کاشف زبیر صاحب بھی ہم میں نہیں رہے۔ میں تو حیران رہ گیا۔ ایک مہینے میں ادارے کے دو گورہرنا یاب۔ کچے بعد دیکھے کیسے ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ کاشف زبیر تو جاسوسی ڈائجسٹ کی جان تھے۔ ہر وفد جاسوسی اور سببسن میں ان کی تحریر نہ ہوتی تو مجھے تو یہ رسالے ہانگنل خالی لگتے تھے سچ میں۔... یا اللہ یہ کیا ہو گیا؟ بس اللہ پاک سے دعا ہے کہ مرحومین کی روجوں کو سکون و قرار پہنچائے کہ انہوں نے ہم سب کے لیے اتنی زیادہ سنی آموز تجاویز لکھیں۔ اللہ پاک ان لوگوں کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین) اللہ پاک سے دعا ہے کہ اللہ ہائی سب کلم کاروں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔"

۱۲۲ اشفاق شاہین، کراچی سے حاضر ہیں، موسم بہار کے آغاز کی مناسبت سے عائشہ بہت شاعر ار تھا۔ قلمی، پھول، بڑکی، موسم اور سہلس، واہمی خوش ہو گیا۔ جون ایلیا کے انشائیے نیکی میں جھجک مگر پڑھنے والوں کو جھنجھکی کی کوشش کی، من حیث القوم ہم میں بہت سی خامیاں ہیں لیکن جب تک ہم سچ کا پرچار نہیں کریں گے، نظام ہی رہیں گے ذہن۔ اپنی محفل میں پہنچے جہاں پہلی خبر محی الدین نواب کی وفات کی خبر نے دل کو گھمی کر دیا، بلاشبہ وہ کے تاریخی کی بعض کو اچھی طرح سمجھتے تھے، قارئین مد تو انہیں فراموش نہ کرنا چاہیں گے۔ کاشف زبیر کے لیے بھی دعائے صحت۔ (آپ کی دعا میں آخرت میں کاشف کے لیے اجر کا سبب ہیں) قدرت اللہ نیازی و کئی اسٹیڈ پڑھے۔ مخلوط کے آخر میں ایڈیٹر کے ریمارکس، مزہ دو بالا ہو گیا ہے، رونق اور مزید بڑھے گی۔ صادق سعیدی محفل میں آمد پر خوش آمدید۔ زرین آفریدی، محمد انعام، منفر و خط پسند کرنے کا شکر ہے۔ بلاشبہ سب سے پہلے شیش محل کا مطالعہ کیا۔ مخصوص رجم سے کہانی آگے بڑھ رہی ہے۔ ماجد انجام کو پہنچا، شکستہ کا معاملہ سلجھا۔ جو لیت دکھ دو رکھوں کی لپیٹ میں ہے، اس کے دن جانے کب پھریں گے اور قاروق جس خیال کو گورگہ جاں بنائے بیٹھا ہے، جانے کب اس کے سامنے جلوہ نما صورت جسم ہوتا ہے اور ایڈ پر ایک نئی اسٹری، دیکھیں اب کیا برآمد ہوتا ہے اس انتظار سے۔ سلیٹے بھاؤت کے، بہت شاعر تاریخی کہانی تھی۔ قصہ شہر شاہاں ایک دلچسپ کہانی تھی گڈ تاہید سلطانہ اختر، تو یہ ریاض کا کارنامہ شاعر ار تھا۔ بدظنیت، مرد احمد بیگ کا لا زوال شاہکار تھا۔ اجمل شاہ جیسے کردار آج بھی جگہ جگہ موجود ہیں اور موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسے ناخبر رول سے ہم سب کو محفوظ رکھے۔ سلیم اختر کی چلتر و اقتضا ہی بہت تیز اور شاطر لگی۔ گڈ۔ روٹیاں سنی آموز اور دلچسپ صحرائے میں لکھی گئی تحریر ہے بہت زبردست۔ محفل شعرو سخن سب انتخاب لاجواب خصوصاً انجم کمال اور عروہ۔ شرماس کا قصہ خوفناک اور عجیب تھا۔ ماری ہم زاو کے ساتھ محفل سے ماورا، مجر سہرے اور دیکھیں اب مراد کیا نیا لے کر آتا ہے۔ مقبول حسین کی بے رنگ عنوان کی مناسبت سے بہترین مکتبہ۔ امیر اعلیٰ قطب و وراں، ضیا نسیم ہمیشہ بہت اچھے اور خوب صورت انداز میں روح میں اتر جانے والے واقعات سے روشناس کراتے ہیں۔ امیر اعلیٰ کے حالات زندگی سے آگاہی ہوئی۔ لہذا کاشف زبیر کی پڑاؤ تحریر تھی۔ آخری صفحات پر کفن بہ روش کے ساتھ عبدالرب بھٹی بر اجمان تھے اپنے رنگ کے ساتھ، بہت خوب۔ اس ماہ کتر میں بھی لاجواب تھی۔" (دلچسپ تبصرہ تھا..... اجمالاً)



ادارہ رمضان یا شاہ گلشن اقبال، کراچی سے محفل کی زینت بنے ہیں۔ سب سے تعزیت، میرے پسندیدہ قلم کار محترم جناب محی الدین نواب صاحب کی رحلت کی اطلاع پڑھ کر دل کو ایک دھچکا لگا۔ اتنا صدمہ تو میرے استاد محترم کے انتقال پر بھی نہیں ہوا تھا، دعا ہے اللہ تعالیٰ نواب صاحب کو جنت میں بہترین جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ ابھی تو مرحوم کو بہت کچھ کہنا باقی تھا، ماری کو مکمل کرنا تھا اس کے بعد آج کا راجھا شروع کرنا تھا مگر شمس سب لاکھ عمل اچھوڑا گیا۔ ماری کی یہ قسط بہت زبردست تھی، کفن بہ دوش بھی دل و ہلانے والی تھی۔ چھوٹی طبع زاو کہانیوں میں لہواڑنے بہت متاثر کیا۔ قصہ شہر شاہاں یہ سر سے کوئی کہانی تھی نہیں تھی یہ تو ایک آرٹیکل مضمون تھا کہ پہلے اسلام آباد ایک حسین و جمیل شہر تھا، بعد ازاں اس کے برعکس ہو گیا۔ تاہم یہ سلطانہ اختر صاحبہ نے اس بار بہت مایوس کیا۔ البتہ اس کا قادی کی کہانی شیش گل نے کافی لطف ہم پہنچایا۔ کارنامہ بھی اچھی نہیں لگی۔ مرزا امجد بیگ کو اس بار ایک منفرد و کس مٹا سوہ بھی انہوں نے جیت ہی لیا۔ وہ ہارے کب ہیں؟ چلتے ہارے مری عورت، تو نے پوچھیں افسروں کو خوب الو بیٹا، وہ بھی امریکن پولیس والوں کو۔ مظر امام کی کہانی کے بارے میں اتنا ہی کہوں گا کہ انبہدوئیاں۔ تحفہ یا اللہ دینا میں وسنت جیسے عالم انسان بھی بستے ہیں۔ اشعار کی محفل میں رخصتا رضوی اور بیس احمد خان، زرین آفریدی کے اشعار قابلِ داد تھے۔ زرین آفریدی صاحبہ آپ کا شکر یہ کہ آپ نے اس ناچنے کا شعر پسند فرمایا۔ آخر میں میری جانب سے سپنس کے عملے کے تمام افراد کو درجہ بدرجہ دعائیں اور سلام۔“ (بہت شکر یہ)

سید محی الدین اشفاق، فتح پور، لیہ سے محفل میں شریک ہیں۔ میرے والد مرحوم دیوتا کو طویل عرصہ پڑھتے رہے۔ ان سے یہ شوق ہمارے اندر بھی بردان چڑھا اور دیوتا کا شعر ہمارے پورے گھر پر طاری رہا تا وہ اختتام۔ اندھیر گری، آدھا چہرہ، مقدر، والہ کی اور ان کے ابتدائی ادراختی صفحات کے ناول کی تعداد ان گنت ہے۔ وہ حقیقت میں قلم کے نواب تھے اور درحقیقت ان کو پوری دنیا میں جو نام و مقام نصیب ہوا، اس میں ادارے کے بانی جناب معراج رسول کا بہت بڑا کردار ہے۔ عذرا رسول صاحبہ جو کہ ادارے کی ڈے ڈار ہیں بڑے احسن انداز میں ہمارے ہیں، ان کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ محی الدین نواب کی ان فلمی کامیابیوں میں، ایک عظیم کہانی کار کے جانے کا دکھ تو ہے ہی مگر یہ خبر ہے کہ وہ ہمارے ادارے کے سب سے بڑے لکھنے والوں میں سے ایک تھے۔ ماری کی آخری ناول ہے اس امید پر کہ اس کو ضرور مکمل کیا جائے گا۔ ادارہ اور نواب مرحوم کے گھر والوں کو اداران کے چاہنے اور پڑھنے والوں کو خدا مبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔ مکمل کر لیں اور اس بھی مگر بہار آنے کا تاثر بھی نمایاں تھا۔ جون ایلیا ایک اور زندہ تحریر کے ساتھ شمس گل کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے نظر آئے۔ سید مراد علی بھی ملک کو گھر قرار دے رہی تھیں۔ سچ بات ہے کہ اگر ہم سب ایک قوم بن جائیں، تمام اصول و قوانین کی پاسداری کریں تو ہمارا ملک جلد ہی ترقی یافتہ اور وشت گردی سے پاک ملک بن جائے گا۔ قدرت اللہ نیازی صاحب نے اسے پی ایس اسکول کے بچوں کو ایک اچھا خراج تحسین پیش کیا ہے۔ کفن بہ دوش ہی پڑھ پایا ہوں بہت اچھی تحریر تھی۔“ (دیگر کہانیوں کے بارے میں آپ کی اپنی رائے ہے۔ البتہ مصنف کے خیالات میں مشابہت ہو سکتی ہے مگر نادر از حد ہوتا ہے)

محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ناؤن خانیوال سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ ابھی نواب محی الدین کی وفات کی خبریں کر لیاں کم نہ ہوا تھا کہ محبوب ترین مصنف کا شرف زہیر کی وفات کی خبر ملی۔ اللہ پاک فریق رحمت کرے۔ کسی بھی تحریر کے ساتھ ان کا نام و پچسپی، معلومات، تجسس اور سپنس کا ضامن ہوتا تھا۔ ان کی وفات نہ صرف ان کے عزیزوں بلکہ ادارے اور قارئین کے لیے بھی ناقابلِ حسانی نقصان ہے۔ سب سے پہلے شیش گل پڑھی۔ اس صاحبہ جو لیت کی تہائی دور کرنے میں معروف نظر آئیں جگہ ہمیں جو لیت کے ساتھ فاروق کے خامدانی نہیں سحر جانے کا بھی اشتیاق ہے۔ قیام پاکستان کا نہیں مظر بھی اس بار شامل رہا جو یقیناً معلوماتی رہے گا۔ تاریخی صفحات پر اکبر کے حالات زندگی پیش کیے گئے۔ نئے دین کی ایجاد کے جب سب سے بدنام ترین ٹھہرنے والے اکبر نے بڑے کور سے حکومت کی۔ بعض تاریخی کتب میں ہے کہ مرنے سے پہلے وہ نائب ہو گیا تھا اور اللہ کی وحدانیت کا اقرار کر چکا تھا۔ کا شرف زہیر کی لہواڑ پڑھتے ہوئے مرحوم کی یاد آتی رہی۔ مصنف نے شہزاد کی جبر مانہ حرکت کو خون کے اثر سے منسوب کیا جو درست لگا۔ قصہ شہر شاہاں میں تاہم سلطانہ اختر نے پاکستان کے حالات کی حقیقت سے قریب ترین حکایت پیش کی۔ کبھی پل بنانے کے لیے عوام کو معصیت میں ڈالا گیا تو کبھی میٹر اور اورنج ٹرین کے نام پر عوام کے گھروں کو سہارا کیا گیا اور اس سب میں کتنا کیشن کھایا گیا، فرشتے ہی بنا سکتے ہیں۔ مظر امام بیگ کی طرح مزاح کے پیرائے میں نثر زنی کرتے نظر آئے۔ جس طرح رویوں کی کارستانی بیان کی گئی، وہ قابلِ تحریف ہے۔ سچ کہا کہ امیر کے گھر میں ٹیڑھی میڑھی روئیاں بھی انجام کی حد اور ٹھہرتی ہیں اور غربت کے گھر میں اس کی سزا اللہ ہے۔ تحفہ میں شیراگل اور وسنت لوگوں کو بے وقوف بناتے نظر آئے۔ مصنف کو چاہیے تھا کہ ان کو کوئی سوا میر گرا ہی دیتے۔ مقبول حسین کی بے رنگ کچھ زیادہ ہی رنگ واد رہی۔ نیلا پیلا اور کئی دوسرے رنگ شامل تحریر رہے۔ اسٹورٹ کار کی بھاگ دوڑ کا راد رہی اور ڈکسن سچ جانے میں کامیاب رہا۔ آخری صفحات پر ڈاکٹر صاحب کی کفن بہ دوش کا آخری حصہ پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کشمیریوں کی مشکلات اور بے بسی کی بہت خوب صورتی سے وضاحت کی۔ محفل خلوط میں داخل ہوئے تو خود کو کرسی صدارت پر دیکھ کر عجیب مسرت سی ہوئی۔ زیادہ خوشی اس بات کی ہوئی کہ آپ نے ہماری تجویز کو نوٹ کر کے رسپانس دیا ہے۔ صادق مطابق ایہ ہمارے لیے اطلاع ہے کہ آپ کو 16 تاریخ بھی 3 دن لیٹ محسوس ہو رہی ہے ورنہ ہمارے یہاں تو 18 تک ہی ملتا ہے۔ زرین آفریدی محفل شعر و سخن میں تبدیلی کی وضاحت نہیں کی آپ نے؟ محمد خواجہ آپ کی آنکھوں کا آپریٹن کامیاب رہے اور اللہ آپ کو صحت دے۔ میر جاگل آپ کی بات بجا کہ یہ خوشیاں ہی محفل کے حسن کی ذمہ دار ہیں۔ رہی بات ٹیڑھے میڑھے الفاظ کی تو آپ کو قلعہ بھی ہوئی ہے۔ میرے الفاظ تو ٹیڑھیں کی طرح سیدھے ہیں۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔
 کوثر انوار، سید یوسف رضا کاظمی، لیہ، شاکر لطیف، لاہور۔ صداقت حسین ساجد، شورکوٹ۔ منشا، بیٹنوال، چہلم۔ اکرم محمود، لاہور۔
 احسان سحر، میانوالی۔ آصف محمود، حاتی محمد اسحاق انجم، قصور۔ مرزا طاہر الدین بیگ، میر پور خاص۔ احسان سحر، میانوالی۔ آصف محمود،

Downloaded From Paksociety.com

گریہ پیغم

النیا سیتا پوری

یہ اللہ کی مصلحت ہے کہ اس پاک ذات نے گزرے کل میں ہمیشہ آنے والے کل کے لیے کوئی نہ کوئی پیغام پوشیدہ رکھ چھوڑا ہے جسے سمجھنے کے لیے انسان کو شعور غطا کیا۔ تاکہ اس کی شان کو پہچان کر اس کی مصلحتوں کو سمجھ سکیں... قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا ایسا کلام ہے جس میں اس نے نہ صرف مکمل ضابطہ حیات دیا بلکہ اپنے پیغمبروں کی زندگی کا بھی ایسا احاطہ کیا جو رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لیے مشعل راہ ہے... انہی میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا بھی ذکر مبارک ہے... آپ کی تمام حیات اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں پر گامزن رہی اور ایسی آزمائش سے گزرتی رہی جس پر پورا اتر کر آپ نے اللہ کا قرب حاصل کیا۔ درج ذیل داستان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہزاروں سال گزرنے کے باوجود بھی انسان کے جذبات، احساسات اور خیالات وہی ہیں جس میں رشتک و حسد اور پھر کسی کا خاص طور پر اللہ پر توکل... بس یہی وہ نقطہ ہے جس سے اللہ کے عام اور خاص بندوں میں فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔

ماضی کا آئیہے با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے خیرات واقعات

حاران میں ایک بستی فدان ارم ٹائی ہے، اس بستہ میں تیرا باموں لائبن رہتا ہے۔ اس کی دو بیٹیاں ہیں، تو ان میں سے کسی ایک سے شادی کر سکتا ہے۔

کنعان میں لڑکیوں کی کمی نہیں تھی لیکن باپ کی ہدایت پر سعادت مند بیٹے نے حاران کی راہ لی۔ جس اونٹ پر یحییٰ سفر کر رہے تھے، اس پر اپنے آگے پیچھے کچھ ضروری سامان بھی رکھ لیا تھا۔ اونچے نیچے، سرسبز و بجز، آباد اور غیر آباد علاقوں سے گزرتے ہوئے جب آپ فرات

باپ نے اپنے بیٹے یعقوب کو خاص طور پر یہ نصیحت کر دی تھی کہ وہ کسی کنعانی لڑکی سے شادی نہ کرے۔ شریف بیٹے نے باپ سے پوچھا۔ ”پھر میں کس سے اور کہاں شادی کروں گا؟“

بوڑھے باپ نے کھڑے ہو کر اپنی گھنٹی ابرو اور بڑی بڑی پلکوں والی آنکھوں سے شمال مشرق میں دیکھا اور انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بیٹے یعقوب! تو ادھر چلا جا، یہاں تک کہ تو فرات کو عبور کر کے حاران میں داخل ہو جا۔“



READING
Section

کے کنارے پہنچے تو اسے پار کرنے میں خاصی زحمتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ فرات کے کنارے انہی کی طرح کچھ اور لوگ بھی کشتی کے انتظار میں کھڑے تھے۔

صبح سے سہ پہر تک کشتی کے انتظار میں کھڑے رہنے کے بعد جب وہ نظر بھی آئی تو یہ مشکل پیش آگئی کہ کشتی والا ان کے اونٹ کو دوسرے کنارے پر لے جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ یعقوب نے اپنا اونٹ سبکیں چھوڑا اور خود دوسرے کنارے پہنچ گئے۔ پھر وہاں سے فدان ارم کی راہ لی۔ یہ سفر بڑا دلچسپ تھا۔ انہوں نے جگہ جگہ کنوؤں پر عورتوں اور لڑکیوں کا جھنگٹا دیکھا اور آسودہ حال امیر زادوں اور شوقین مزاج نوجوانوں کو اپنے گھوڑوں پر سوار ادھر ادھر آتے جاتے دیکھا۔ کنوؤں پر موجود لڑکیاں انہیں مسکرا مسکرا کر دیکھتیں اور آپس میں سرگوشیاں کر کے بے معنی اشارے کرتی لگتی۔

راہ میں زیتون کے درختوں کی بھرمار تھی اور بھجور کے اونچے اونچے، سیدھے اور خمیدہ درخت تیز ہوا کے جھکڑوں سے مل جل کر یعقوب کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ ان وقت آپ کو بھوک اور پیاس مل کے پریشان کر رہی تھیں۔ آپ نے ایک چھوٹے سے نخلستان میں بیٹھ کر چند بھجوریں کھائیں اور پانی پی کر اپنی منزل کی طرف دیکھنے لگے۔ اس نخلستان سے ایک عورت نکلی۔ اس کے ہاتھوں میں بھجوروں سے بھرا ہوا ٹوکرا تھا۔ اس نے یعقوب کو ذرا غور سے دیکھا اور جھکتے ہوئے سوال کیا۔ ”کیا تو مسافر ہے؟“

یعقوب نے نرمی سے جواب دیا۔ ”ہاں، میں مسافر ہوں اے مہربان خاتون! جہانوں کا رب تجھے نیکی کی ہدایت دے، کیا یہ نخلستان تیرا ہے؟“

عورت نے جواب دیا۔ ”یہ میرا تو نہیں، میرے ناموں کا ہے۔“

”خوب!“ یعقوب کے ہونٹوں پر ہنسی آگئی۔ ”میں بھی اپنے ناموں لایبن کے پاس جا رہا ہوں۔“

عورت نے نہایت اشتیاق سے یعقوب کو دیکھا اور پوچھا۔ ”تیرا ناموں لایبن وہی تو ہے جو فدان ارم میں رہتا ہے اور جس کی دو بیٹیاں بھی ہیں، لیاہ اور راحیل۔ لیاہ شاید بڑی ہے اور راحیل چھوٹی۔“

یعقوب کا چہرہ خوشی سے تھمتھا اٹھا۔ جوش میں کھڑے ہوئے، بولے۔ ”بخدا تو تو ان سے بہت زیادہ واقف معلوم ہوتی ہے تو تو ان کے نام اور عروں تک سے واقف ہے۔“

اب ذرا تھکا ہوا لیاہ اور راحیل میں اچھی کون ہے؟ واقعہ

دراصل یہ ہے کہ میں اپنے باپ کی ہدایت پر ان دونوں میں سے کسی ایک سے شادی کرنے جا رہا ہوں۔“

عورت نے برا سامنہ بنا کر جواب دیا۔ ”لیاہ ذرا چندھی ہے، ہاں راحیل البتہ خوب صورت ہے لیکن کیا تو چندھی لیاہ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو جائے گا؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”پہلے میں ان دونوں کو دیکھوں گا اس کے بعد جو پسند آئے گی اس سے شادی کر لوں گا۔“

عورت نے طنزاً کہا۔ ”خدا تجھے تیرے ارادوں میں کامیاب کرے لیکن میں نہیں سمجھتی کہ تو جیسا سوچ رہا ہے تیرے لیے ویسا ہی ہو۔“

یعقوب نے چلنے کی تیاری کی۔ اپنا سامان اٹھا لیا اور عورت سے پوچھا۔ ”ہاں تو خدا تجھے ہمیشہ خوش رکھے، اب یہ اور بتا دے کہ فدان ارم یہاں سے کتنی دور ہے؟“

عورت نے شمال کے افق میں نظر آنے والی سبز پٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ جو حد نظر پر درختوں کی پٹی نظر آ رہی ہے، یہی فدان ارم ہے۔ اس خوب صورت بستی کو چاروں طرف سے باغات نے گھیر رکھا ہے۔“

یعقوب نے اسے خدا حافظ کہنا چاہا لیکن اس سے پہلے ہی وہاں ایک اور مرد آ گیا۔ یعقوب نے نخلستان سے نکل کر شمالی افق کی سبز پٹی پر نظر سے جا کر اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔

☆☆☆

شام سے ذرا پہلے یعقوب نے شمالی افق کی سبز پٹی کو پایا لیکن اب یہ سبز پٹی بڑے بڑے گھنے درختوں کے ظویل سلسلے کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ اس سے گزر کر یعقوب ایک کنوئیں پر پہنچ گئے۔ اس وقت کنوئیں پر بڑی بھجور تھی۔ ہر عمر اور اچھی بری شکل کی عورتوں اور لڑکیوں کا ہجوم تھا۔ انہوں نے یعقوب کے گرد آلود لباس، دھواں دھواں چہرے اور خاک اور دھول سے اٹے چہروں سے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ یہ اجنبی مسافر کسی لمبے سفر سے چلا آ رہا ہے۔

یعقوب نے ان بہت سارے چہروں کو سرسری نظر سے دیکھا اور ان سے پوچھا۔ ”اے فدان ارم کی عورتو اور لڑکیو! میں تمہارا مہمان ہوں، ذرا یہ تو بتاؤ یہاں لایبن کہاں رہتا ہے؟“

ایک نہایت حسین و جمیل، مجسمہ حسن درعنائی، ان عورتوں اور لڑکیوں کے ہجوم سے باہر نکلا اور موسیقی جیسی رسیلی آواز میں پوچھا۔ ”تو لایبن کے پاس کہاں سے آیا ہے اور اس سے تیرا کیا کام انکا ہے؟“

کہ ماموں لایبن کی دو بیٹیاں ہیں، راحیل اور لاء۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ راحیل بہت خوب صورت ہے۔ لیکن لیاہ کی آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی ہیں۔“

لیاہ کے دل کو سخت تکلیف پہنچی اور وہ منہ بنا کر سامنے سے ہٹ گئی۔ راحیل نے کہا۔ ”لیاہ تیری باتوں سے ماراٹھ ہو کر چلی گئی ہے۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”پھر کیا ہوا؟ اب تو میں یہیں رہوں گا، کبھی نہ کبھی من بھی جائے گی۔“

اس گھر نے یعقوب کو نہایت عزت اور محبت سے رکھا۔ یعقوب ان لوگوں سے بہت جلدی کھل مل گئے۔ رات کو کام دھندوں سے فرصت پانے کے لیے سب ایک جگہ اکٹھے ہوجاتے اور ویر تک خاندانی تذکرے چھڑے رہتے۔ لایبن کو اپنی بہن، یعقوب کی ماں کی یاد آجاتی اور وہ بتاتے کہ ان دونوں بھائی بہن میں کتنی زیادہ محبت ہوا کرتی تھی۔ لایبن کی آنکھیں بھیگ گئیں اور انہوں نے گلو گرنہ آواز میں کہا۔ ”اور جب وہ تیرے باپ اسحاق سے وابستہ ہو کر کنعان چلی گئی تھی تو میں کالی عرصے تک اس کے لیے بہت پریشان اور مضطرب رہا تھا۔“ پھر ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔ ”جہانوں کے رب نے ہمیں نسیان کی خوبی عطا فرما کر بڑا کرم کیا ہے ورنہ انسان اپنے ماضی کے غموں کے بوجھ ہرگز نہ اٹھا سکتا اور یہ پہاڑ اسے کھل کر رکھ دیتے۔“

یعقوب کچھ بولنے کے بجائے اپنے ماموں کی باتیں سنتے رہے۔ دونوں بیٹیاں بھی بے ولی سے اپنے باپ کی داستان سن رہی تھیں اور انہیں اس میں ذرا بھی مزہ نہ آ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ماموں لایبن نے خود بھی یہ محسوس کر لیا کہ ان کے سوا سبھی خاموش ہیں، انہوں نے ہنس کر کہا۔ ”ارے یہ صرف میں ہی بول رہا ہوں، یعقوب! تو بھی تو کچھ کہہ، کچھ اپنے ماں باپ کے قصے سنا، کنعان کے تذکرے چھیڑ۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”ماموں! جیسا کہ آپ خود بھی جانتے ہیں کہ آپ کی بہن اور میری ماں رقبہ ایک عرصے تک اولاد کی نعمت سے مایوس رہی تھیں۔ شادی کے بیس سال بعد میرے باپ اسحاق نے جب روردر خدا کی بارگاہ میں گریہ دزاری کی تو انہیں دو جڑواں بیٹے عطا کیے گئے۔ وہ جڑواں بیٹے میں اور میرا بڑا بھائی عیسو اور دم تھے۔“

ماموں نے کہا۔ ”ہاں، میں یہ ساری باتیں تجھ سے زیادہ جانتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تیرے باپ نے تیرا نام یعقوب کیوں رکھا تھا؟“

یعقوب کے دل پر اس حسین لڑکی نے کتنی ملاقات اور پہلی نظر ہی میں قبضہ جما لیا۔ یہ مہبت گم صم اس کی شکل ہی دیکھتے رہ گئے۔ دوسری عورتیں اور لڑکیاں آپ کی محویت پر کھلکھلا کر ہنس ویں۔ آپ نے لڑکی کا سوال تو سن ہی لیا تھا، جواب دیا۔ ”اے مہربان لڑکی! میں لایبن کی بہن کا بیٹا ہوں اور کنعان سے ملاقات کرنے آیا ہوں۔“

لڑکی کا چہرہ شرم و حیا سے گلزار ہو گیا، کچھ اور قریب چلی گئی، بولی۔ ”میں لایبن کی بیٹی راحیل ہوں، آمیرے ساتھ گھر چل۔ میرا باپ تجھ سے مل کر یقیناً بہت خوش ہوگا۔“

کنوئیں کی دوسری عورتیں اور لڑکیاں ایک دم سنجیدہ ہو گئیں، کیونکہ وہ لایبن کے بھانجے پر ہنسنے کی جرات نہیں کر سکتی تھیں۔

راستے میں یعقوب سے نہیں رہا گیا، راحیل کا ہاتھ پکڑ لیا اور فرط جذبات میں اسے چوم لیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”راحیل! تو یقین کر، میں نے تیرے حسن کا چرچا فدان ارم میں داخل ہونے سے پہلے ہی سن لیا تھا اور اب میں اپنے رب کی قسم کھا کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ تو اس سے کہیں زیادہ حسین ہے، جتنی تیری تعریف کی گئی تھی۔“

راحیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ یعقوب کو اپنے گھر لیے چلی گئی۔ یعقوب کے پوڑھے ماموں نے اپنے خوب صورت بھانجے کو گرم جوشی سے گلے لگا لیا اور کہا۔ ”یعقوب! اب تو یہیں رہ۔“

اس نئے مہمان کو دیکھنے اور ملنے کے لیے گھر کے دوسرے لوگ بھی وہیں آگئے۔ ان میں راحیل کی بڑی بہن لیاہ بھی شامل تھی۔ یعقوب نے دیکھا لیاہ کی آنکھیں واقعی بہت چھوٹی چھوٹی تھیں اور وہ انہیں کچھ دبا کر دیکھ رہی تھی۔ یعقوب نے ہنستے ہوئے لیاہ کو مخاطب کیا۔ ”غالبا تیرا نام لیاہ ہے اور تو راحیل کی بڑی بہن ہے؟“

ماموں لایبن، اپنے مہمان بھانجے کی رہائش کے لیے جگہ کا انتظام کرنے چلے گئے۔

چھوٹی آنکھوں والی لیاہ نے ناگواری سے تیوریاں چڑھائیں اور پوچھا۔ ”تو نے مجھے کس طرح پہچانا کہ میں لیاہ ہوں؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”تیری چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے، کیونکہ مجھے راستے کے ایک ٹکڑے میں ایک عورت ملی تھی، جب میں نے اس سے ماموں لایبن کا پتا پتلا کر لیا تو اس نے یہی پتا بتاتے ہوئے یہ بھی بتا دیا تھا۔“

پسند کر لے تو اچھا ہو۔"

ماموں کو فکروں نے گھیر لیا تھا اور یعقوب کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، آخر کچھ سوچ کر کہا۔ "لیکن اس کی ایک شرط ہے۔ تجھے میری ایک شرط پوری کرنا ہوگی۔"

یعقوب نے جواب دیا۔ "میں تیار ہوں، اپنی شرط بیان کیجئے۔"

ماموں نے کہا۔ "تجھے سات سال تک میری خدمت کرنا ہوگی۔"

یعقوب نے جواب دیا۔ "میں تیار ہوں۔"

جب اس معاملے کی دونوں بہنوں کو خبر ہوئی تو راحیل کو تو بہت خوشی ہوئی مگر لیاہ حسد و رقابت کی آگ میں جھلنے جھلنے لگی۔ یعقوب نے حسب وعدہ اپنی ذمے داریاں سنبھال لیں اور اپنے ماموں کی سپردگی ہوئی ذمے داریاں پوری کرنے لگے۔

☆☆☆

یعقوب نے جس لگن اور محنت سے اپنے ماموں کو اپنی خدمات انجام دیں اس سے سبھی خوش اور متاثر ہوئے۔ لیکن جیسے جیسے دن گزر رہے تھے لیاہ کی آتش حسد بھڑکتی جا رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی چھوٹی بہن راحیل پر گرم ہو جاتی اور تیج و ترش سنا دیتی۔ راحیل سب کچھ مبرا دل سے برداشت کر جاتی۔ یعقوب راحیل کو تسلیاں دیتے۔ "بس تھوڑے دنوں کی اور بات ہے، میں شادی کے بعد تجھے کھانا لے جاؤں گا جہاں تو نہایت آرام اور سکھ سے رہے گی۔"

سات سال پورے ہو گئے۔ یعقوب کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ انہوں نے راحیل سے کہا۔ "راحیل! سات سال پورے ہو چکے ہیں اور میں اپنے رب کا شکر گزار ہوں، جس نے مجھ سے میرا عہد پورا کر دیا۔"

راحیل نے کہا۔ "لیکن کتنی قیامت کے تجھے یہ سات سال!"

یعقوب نے ہنس کر جواب دیا۔ "مگر مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا ہے گویا یہ سات سال ہلکے چھپکتے ہی گزر گئے۔"

ماموں اپنے مویشیوں کے پاڑے میں ان کی گنتی کر رہے تھے، ان کے پیچھے یعقوب کھڑے تھے۔ ماموں نے پیچھے گھوم کر دیکھا اور کہا۔ "تو یہاں کھڑا کیا کر رہا ہے؟ کیا مجھ سے کوئی کام ہے؟"

یعقوب نے پوچھا۔ "کیا کوئی مویشی کم ہے؟"

ماموں نے جواب دیا۔ "نہیں تو۔"

یعقوب نے کہا۔ "ماموں! ایک بات اور بتائیے۔"

یعقوب کی دونوں ماموں زاد بہنوں نے بھی اب دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ راحیل تیز مشعل کی روشنی میں یعقوب کو نہایت اشتیاق سے دیکھ رہی تھی۔ راحیل کی بڑی بہن لیاہ اپنا اپنا دونوں کو رشک و حسد سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں اپنی چھوٹی بہن راحیل کے خلاف نفرت پائی جاتی تھی۔

ماموں کہہ رہے تھے۔ "اور چو تکہ تو اپنے بھائی کے بعد پیدا ہوا تھا، یعنی تو اس کے عقب میں تھا اس لیے تیرے باپ نے تیرا نام یعقوب (بعد میں نے آنے والا) رکھ دیا۔"

یعقوب نے کہا۔ "اور آپ کو میرے باپ اسحاق کی اس پیش گوئی کا بھی ضرور علم ہوگا کہ جب ہم دونوں بھائی اپنی ماں کے پیٹ میں تھے تو انہوں نے میری ماں سے کہا تھا کہ دو قومیں تیرے پیٹ میں ہیں۔"

ماموں نے پوچھا۔ "تو کہنا کیا چاہتا ہے، ذرا صاف صاف بات کر۔"

یعقوب نے جواب دیا۔ "دو قوموں سے میرے باپ کی یہ مراد تھی کہ ہم دونوں بھائیوں کی نسلیں آخر کار قوموں کی شکل اختیار کر لیں گی۔" وہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گئے۔

ماموں نے کہا۔ "ہاں ہاں کہو کہو جو کچھ کہتا ہے صاف صاف کہ دو۔"

یعقوب نے کرتے کا دامن پکڑ کے پلٹنا شروع کر دیا۔ بولے۔ "میں چاہتا تو کھانا ہی میں شادی کر لیتا کیونکہ وہاں بھی نہایت حسین لڑکیاں موجود ہیں لیکن میرے باپ نے کہا کہ مجھے اپنی ماموں زاد سے۔۔۔ سے شادی کرنا چاہیے اور اس سے جو قوم پیدا ہوگی وہ نہایت نامور اور اعلیٰ قوم ہوگی۔"

ماموں نے اپنے بھانجے کو ذرا غور سے دیکھا۔ مشعل کی روشنی میں یعقوب کے چہرے کی شرم و حیا کو اچھی طرح محسوس کیا جاسکتا تھا۔ دونوں لڑکیاں وہاں سے ہٹ کر ذرا دور جا بیٹھیں۔

ماموں نے نظہر نظہر کر جواب دیا۔ "تو میری کس لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے؟"

یعقوب نے غیر ارادی طور پر دونوں لڑکیوں کی طرف دیکھا اور راحیل پر مستقل نظریں ٹکا دیں، آہستہ سے جواب دیا۔ "راحیل سے۔"

لیاہ جیسے میں اٹھی اور اندر چلی گئی۔ ماموں کچھ دیر خاموش کچھ سوچتے رہے پھر کہا۔ "اگر تو راحیل کی جگہ لیاہ کو

کیا۔ ”شادی تو راحیل سے ہوئی تھی۔“
 ”نہیں، تیری شادی مجھ سے ہوئی ہے۔“
 وہ رات یعقوب نے نہایت بے چینی میں گزاری۔
 صبح ہوتے ہی اپنے ماموں لائین کے پاس پہنچ گئے اور
 نہایت نگلی سے پوچھا۔ ”ماموں! یہ معاملہ کیا ہے؟ آپ نے
 میری شادی کس سے کر دی؟“
 ماموں نے جواب دیا۔ ”لیاہ سے۔“
 یعقوب نے بے چینی سے کہا۔ ”لیکن میرا آپ سے
 طے تو ہوا تھا راحیل سے شادی کا، اور میں نے آپ کی سات
 سال خدمت راحیل کی خاطر کی تھی۔“

ماموں نے بے بسی سے جواب دیا۔ ”لیکن یعقوب
 میں بھی بہت مجبور تھا، اگر میں ایسا نہ کرتا تو کیا کرتا۔“
 یعقوب نے پوچھا۔ ”آخر وہ مجبوری کیا تھی؟“
 ماموں نے کہا۔ ”یعقوب! میں اپنے خاندانی رسم
 و رواج سے مجبور تھا۔ میرے لیے ضروری یہ تھا کہ میں پہلے
 اپنی بڑی لڑکی لیاہ کی شادی کرتا، اس کے بعد راحیل کی۔“
 یعقوب نے کہا۔ ”لیکن ہم دونوں کا عہد و پیمان تو
 راحیل کے سلسلے میں ہوا تھا۔“

”ہاں!“ ماموں نے تاسف زدہ آواز میں کہا۔
 ”لیکن بعد میں جب میں نے اس کے نتائج پر غور کیا تو میں
 نے یہ فیصلہ کیا کہ راحیل کی جگہ لیاہ کو تم سے وابستہ کر دوں۔“
 یعقوب نے صدمے سے سر جھکا لیا۔ ماموں کچھ دیر
 تک یعقوب کی شکل دیکھتے رہے، آخر کہا۔ ”تو ایک ہفتہ لیاہ
 کے ساتھ ہنسی خوشی رہ، اس کے بعد میں اپنا سا بھہ وعدہ بھی
 پورا کر دوں گا۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”اب لیاہ میری بیوی ہے
 اور خدا کے سامنے اس بات کا پابند ہوں کہ لیاہ کا پورا پورا
 خیال رکھوں لیکن راحیل مجھے ہمیشہ یاد آتی رہے گی۔“
 ماموں نے کہا۔ ”کیا مجھے تیرا کوئی خیال نہیں۔ مجھے
 اپنی بیٹی لیاہ کا بھی بڑا خیال ہے، وہ تیرے پاس سکون سے
 ہنسی خوشی رہے گی۔ میں نے تم دونوں کے آرام کی خاطر لیاہ
 کو ایک کتیز بھی دی ہے۔ کتیز زلفہ، وہ تم دونوں کی خدمت
 کرے گی۔“

یعقوب نے سکوت اختیار کیا۔ ماموں بھی کچھ سوچتے
 رہے، آخر انہوں نے ایک عجیب و غریب فیصلہ سنا دیا۔
 ”یعقوب! جیسا کہ میں نے ابھی کہا تھا تو لیاہ کے ساتھ
 ایک ہفتہ رہ، اس کے بعد میں راحیل کی شادی بھی تجھ سے
 کر دوں گا۔“

ماموں نے کہا۔ ”کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم دونوں
 یہاں سے چل کر، کہیں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں۔“
 یعقوب نے جواب دیا۔ ”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“
 یہ دونوں وہاں سے نکل کر گھر کے اس چوترے پر
 جا بیٹھے جہاں بیٹھ کر گھر اور بستی کے مسائل پر گفتگو ہوا کرتی
 تھی۔ شام تیزی سے رات میں بدلتی جا رہی تھی۔ ماموں نے
 مشرقی افق سے دوڑتی ہوئی سیاہی کو دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں، اب پوچھو تو کیا جاننا چاہتا ہے؟“

یعقوب نے پوچھا۔ ”میں اپنے سات سالہ عہد میں
 کس حد تک کامیاب رہا ہوں؟“
 ماموں نے جواب دیا۔ ”تو نے جس لگن اور محنت
 سے اپنی ذمے داریاں پوری کی ہیں، میں اس سے بہت
 خوش بھی ہوں اور مطمئن بھی۔“
 یعقوب نے کہا۔ ”اب وہ مدت پوری ہو چکی ہے،
 آپ اپنا وعدہ پورا کیجیے۔“

ماموں نے جواب دیا۔ ”میں اپنا وعدہ ضرور پورا
 کر دوں گا..... تو بالکل مطمئن رہ۔“
 شادی کا اعلان ہو گیا۔ رشتے داروں کو مطلع کر
 دیا گیا۔ اس خوشی کے موقع پر یعقوب نے راحیل کو بہت
 اداس دیکھا لیکن اس کی بڑی بہن لیاہ بہت خوش تھی۔
 یعقوب کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس خوشی کے موقع پر راحیل
 اداس کیوں ہے؟

اس موقع پر لیاہ کا رویہ بڑا جارحانہ ہو گیا تھا۔ وہ
 راحیل کو دیکھ کر طنز سے مسکراتے لگتی تھی۔
 یعقوب نے راحیل سے پوچھا۔ ”آخر تو اس کیوں ہے؟“
 راحیل نے نہایت کرب سے یعقوب کو دیکھا اور کوئی
 جواب دے بغیر اٹھ کر چلی گئی۔ ایک سادہ سی تقریب ہوئی
 اور یعقوب کی شادی کی رسم انجام پا گئی۔ یعقوب انتہائی
 اشتیاق سے جب اپنی بیوی کے پاس پہنچے تو یہ دیکھ کر
 پریشان ہو گئے کہ راحیل کی جگہ لیاہ دہن بنی بیٹھی تھی۔
 یعقوب نے غصے میں لیاہ سے پوچھا۔ ”لیاہ! تو یہاں کیا کر
 رہی ہے؟ راحیل کہاں ہے؟“

لیاہ نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے یعقوب کی
 طرف دیکھا اور خوشی سے بھرپور لہجے میں جواب دیا۔ ”میں
 تیری بیوی ہوں۔“

یعقوب نے پوچھا۔ ”اور راحیل کہاں ہے؟“
 لیاہ نے جواب دیا۔ ”راحیل اپنے بستر پر ہو گی۔“
 لیکن یہ ہوا کیا؟ ”یعقوب نے پریشان ہو کر سوال

یعقوب، لیاہ اور راحیل کے ساتھ خوش خوش رہنے لگے۔ اب ان کے سامنے ماموں کی خدمت گزاری کے سات سال اور تھے لیکن یہ سات سال ایسے تھے کہ مشروط چیز انہیں پہلے مل گئی تھی اور شرط بعد میں پوری کرنا تھی۔

☆☆☆

موشیوں کو چراتے اور دوسری خدمات انجام دیتے ہوئے انہیں کنعان کی یاد بہت ستاتی رہتی تھی۔ گھر میں ایک تنازعہ بھی رہتا تھا۔ لیاہ اور راحیل میں ذرا بھی نہیں جیتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف نفرت کا اظہار کرتی رہتی تھیں۔ یعقوب اکثر دیشتر ان دونوں کو ایک دوسرے سے متنفر اور بیزار دیکھتے۔

لیاہ کو شکایت تھی کہ یعقوب کو راحیل سے بڑی محبت ہے اور راحیل کا خیال تھا کہ یعقوب کو لیاہ سے بھی محبت ہوگئی ہے لیکن حقیقت یہی تھی کہ یعقوب کو راحیل سے بڑی محبت تھی۔

دن بھر کی محنت کے بعد رات کو یعقوب نے راحیل کو سامنے بٹھا کر بڑی پیاری پیاری باتیں کیں۔ اسے کنعان کے قصے سناتے رہے، اپنی ماں کی محبت کی داستانیں سناتے رہے اور یہ بھی بتایا کہ ان کے بوڑھے باپ اسحاق نے انہیں کیسی کیسی دعا میں دی ہیں۔ وہ راحیل کو کنعان کی فضا سے مانوس کر رہے تھے۔ لیاہ کی کنیز زلفہ دیوار کے پیچھے کھڑی یہ پیار و محبت کی باتیں سن رہی تھی، وہ بھاگی بھاگی اپنی مالکہ کے پاس پہنچی اور اسے پوری داستان سنا کے کہنے لگی۔ ”میری آقا زادی! میں تو یہ دیکھ رہی ہوں کہ راحیل نے تیرے شوہر کو اپنے قابو میں کر لیا ہے۔ وہ جتنا راحیل کو چاہتا ہے تجھ کو نہیں، کیا یہ نا انصافی نہیں ہے؟“

لیاہ نے صدمے سے جواب دیا۔ ”یقیناً میرے حق پر ڈاکا پڑا ہے اور میں خود بھی اپنے خلاف اس زیادتی کو برابر محسوس کر رہی ہوں۔“

اسی وقت راحیل کی کنیز بلہاہ، لیاہ کے پاس پہنچی اور کہا۔ ”تیرا شوہر تجھے بلا رہا ہے۔“

لیاہ کا غصے سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔ ”اپنے آقا سے کہہ دے کہ لیاہ کہہ رہی ہے تو پہلے میرا شوہر ہے، بعد میں راحیل کا لیکن اسے طور طریقوں سے تو یہ ثابت کر دیا ہے کہ تو راحیل کا شوہر پہلے ہے، بعد میں میرا اور اب میں اس زیادتی کو مزید نہیں برداشت کر سکتی۔“ جب کنیز نے لیاہ کا یہ جواب یعقوب تک پہنچایا تو یعقوب نے ہنس کر کہا۔ ”جا اپنی آقا زادی سے میری طرف

یعقوب نے اس فیصلے پر اپنی بے پناہ خوشی کا اظہار کیا۔ خوش ہو کر پوچھا۔ ”کیا سچ؟“ ماموں نے جواب دیا۔ ”میں جھوٹ نہیں کہہ رہا میں نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے لیکن اس کی شرط بھی سن لے۔“ یعقوب ماموں کی شرط سننے کے لیے گوش بر آواز ہو گئے۔

ماموں نے کہا۔ ”لیاہ کی شادی کے ٹھیک ایک ہفتے بعد راحیل بھی تیری بیوی بن جائے گی لیکن اس کے لیے تجھے مزید سات سال میری خدمت کرنا ہوگی۔“

یعقوب نے سعادت مندی سے جواب دیا۔ ”میں اس کے لیے تیار ہوں، بالکل اسی طرح جس طرح میں اپنے عہد پر پہلے پورا اترا ہوں۔ میرے رب نے چاہا تو ایک بار پھر پورا اتروں گا۔“

یہ ایک ہفتہ بھی جیسے تیسے گزر گیا اور یعقوب سے راحیل کی شادی بھی کر دی گئی اور جس طرح بڑی بہن کو کنیز زلفہ خطا ہوئی تھی، ماموں نے ازراہ عدل و انصاف راحیل کو بھی ایک کنیز عطا فرمائی۔ اس کا نام بلہاہ تھا اور یعقوب اس کنیز کو دیکھ کر دنگ رہ گئے، کیونکہ یہ وہی عورت تھی جو انہیں نعلستان میں مل چکی تھی اور جس نے انہیں لابن کے گھر کا پتا بتایا تھا۔

اس نے یعقوب سے مسکرا کر پوچھا۔ ”کیا میں نے تجھے پہلے ہی یہ نہیں بتا دیا تھا کہ لابن کی بڑی بیٹی لیاہ کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی ہیں اور راحیل بہت خوب صورت ہے۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”تو نے تو یہ سب کچھ پہلے ہی بتا دیا تھا لیکن اب تجھے یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ لیاہ بھی میری بیوی ہے اور تو نے اس وقت مجھ سے ایک بات چھپائی تھی۔“

کنیز بلہاہ نے پوچھا۔ ”کون سی بات؟“ یعقوب نے جواب دیا۔ ”یہ بات کہ تو راحیل کی کنیز بھی ہے۔“

کنیز بلہاہ نے کہا۔ ”لیکن راحیل کی کنیز تو میں اب ہوئی ہوں، پہلے تو نہیں تھی۔“

یعقوب نے کہا۔ ”لیکن اب لیاہ اور راحیل دونوں ہی میری بیویاں ہیں اور تجھے ان دونوں کا خیال رکھنا ہے۔“

کنیز بلہاہ نے جواب دیا۔ ”میں راحیل کی کنیز ہوں اس لیے میں راحیل ہی کی خدمت کروں گی اور اسی کا خیال بھی رکھوں گی اور زلفہ چونکہ لیاہ کی کنیز ہے اس لیے حق اور انصاف کی رو سے زلفہ کو لیاہ کا وفادار اور خدمت گزار رہنا چاہیے۔“

حق و انصاف کر۔“

یعقوب نے جب یہ دیکھا کہ راحیل ناراض ہو کر اپنے بستر پر دراز ہو گئی ہے تو اس پر الوداعی نظریں ڈالتے ہوئے لیاہ کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے دیکھا، لیاہ سجدے میں پڑی آہ وزاری کر رہی تھی۔ ”اے ابراہیم کے رب! تو میرا انصاف کر۔ میں یعقوب سے انصاف کی بھیج نہیں مانگوں گی۔ میں تجھ سے کہوں گی کہ راحیل اور میری طرف انصاف کی نظر سے دیکھ اور پھر جو زیادتی کر رہا ہے اسے سزا دے اور جو مظلوم ہے اسے اپنے کرم سے نواز دے۔“

یعقوب نے اس کے بائیں طرف کھڑے ہو کر آواز دی۔ ”لیاہ! میں تیرے پاس آ گیا ہوں، آخر تو اتنی پریشان کیوں ہے؟“

لیاہ گڑگڑاتی رہی۔ ”اے میرے رب! میں نے اپنے باپ سے یہ ہرگز نہیں کہا تھا کہ تو راحیل کے بجائے یعقوب سے میری شادی کر دے لیکن میرے باپ نے دنیا کی شرم اور دستور کے مطابق بڑی بہن ہونے کی وجہ سے میری شادی یعقوب سے کر دی۔ اب یعقوب مجھ سے یہ کہتا ہے کہ اس کی پہلی بیوی اصولی طور پر راحیل ہی ہے، میں اس کی دوسری بیوی ہوں۔ اگر یعقوب درست کہتا ہے تو تو راحیل کو اپنے لطف و کرم سے نوازنا رہ لیکن اگر اس میں کسی قسم کی زیادتی کا عنصر موجود ہے تو میں تجھ سے درخواست کروں گی کہ اس معاملے میں جو زیادتی کا مرتکب ہو رہا ہے، اسے زمانے کے سامنے شرمندہ کرادے۔“

یعقوب نے پھر آواز دی۔ ”لیاہ! کیا میں چلا جاؤں؟“

لیاہ نے پھر وہی سے جواب دیا۔ ”تیری مرضی، میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“

یعقوب نے کہا۔ ”لیکن اس وقت تو میں تیرے ہی پاس رہوں گا۔“

لیاہ نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”تیری خوشی۔“ یعقوب لیاہ کا دل بہلانے کی خاطر ویر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، پھر کہا۔ ”لیاہ! میں تجھ سے بھی محبت کرتا ہوں، اب تو اس پر یقین کرے یا نہ کرے۔“

لیاہ نے آزر وکی سے جواب دیا۔ ”میں نے اپنا معاملہ اپنے رب کے سپرد کر دیا ہے، وہی میرا انصاف کرے گا۔“

یعقوب نے کہا۔ ”میں بھی تیرے ساتھ انصاف ہی

سے پوچھ کہ جب میں اس کی بستی قدآن ارم میں داخل ہوا تھا تو یہاں میں سب سے پہلے کس سے ملا تھا؟ اور یہ بھی دریافت کر کہ میں نے پہلے سات سال تک جو اپنے ماموں لایمن کی خدمت کی ہے وہ کس کے لیے کی تھی؟ اس طرح تیری پہلی بیوی تو راحیل ہی ہے دوسری لیاہ۔“

جب کینز نے یعقوب کا یہ جواب لیاہ کو پہنچایا تو اس نے کہا۔ ”جا، میرے شوہر سے کہہ دے، اب میں اس سے کوئی شکایت نہ کروں گی، میں تو اپنے اللہ سے انصاف طلب کروں گی اور پھر جو حق پر ہوگا میرا رب اسی کو عزت بخشے گا اور جو حق پر نہیں ہوگا خدا اسے دنیا کے سامنے سبک سار کر دے گا۔“

کینز نے یہ پیغام بھی یعقوب تک پہنچا دیا۔ یعقوب نے اٹھ کر لیاہ کے پاس جانے کا ارادہ کیا لیکن راحیل نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا، بولی۔ ”ابھی نہیں، تو لیاہ کا بھی شوہر ہے، اس نے تیرا حکم نہ مان کر تیری بے عزتی کی ہے۔ کیا تو اس کے پاس جا کر مزید بے عزت ہونا گوارا کر لے گا؟“

یعقوب نے راحیل کی بات مان لی کیونکہ وہ راحیل سے واقعی محبت کرتے تھے۔ دوسرے دن یعقوب ٹھکے مارے جب گھر میں داخل ہوئے تو انہوں نے پہلے ہی سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آج لیاہ کے پاس وقت گزاریں گے۔ ان کے اس ارادے کی اطلاع راحیل کو بھی ہو گئی۔ اس نے آپ کا راستہ روکنا چاہا لیکن آپ نے جواب دیا۔ ”مجھے لیاہ کے پاس جانے سے مجھے روکنا نہیں چاہیے، وہ بھی میری بیوی ہے اور اپنا کر کے میرے انصاف کی راہ میں تو رکاوٹ بننے کی کوشش نہ کر۔“

راحیل نے جواب دیا۔ ”وہ مجھ سے حسد کرتی ہے۔“

”اور تو؟ کیا تو اس سے نہیں حسد کرتی؟“

راحیل نے کہا۔ ”نہیں، میں اس سے ذرا بھی حسد نہیں کرتی۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”اگر تو اس سے حسد نہیں کرتی تو پھر مجھے اس وقت اس کے پاس کیوں نہیں جانے دے رہی؟“

”لیکن کیا تو نے کل نہیں کہا تھا کہ حق اور انصاف کی رو سے میں تیری پہلی بیوی ہوں۔“

”میں اس سے انکار کب کرتا ہوں لیکن لیاہ بھی میری بیوی ہے۔“

راحیل ناراض ہو گئی۔ اس نے یعقوب کی راہ چھوڑ دی، بولی۔ ”جا، میں تجھے نہیں روکوں گی۔ جا، لیاہ کے ساتھ

کنیز نے جواب دیا۔ "لیاہ ایک بچے کی ماں بننے والی ہے اور اگر یہ بچہ لڑکا ہو تو لیاہ کو خدا کی طرف سے وہ عزت حاصل ہو جائے گی جس کی وہ ایک مدت سے تمنا کر رہی ہے۔"

راحیل کے دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ وہ پریشان ہو کر ادھر ادھر ٹھٹھنے لگی۔ راحیل کے باپ لابن نے جو راحیل کو پریشان اور افسردہ دیکھا تو قریب آ کر دریافت کیا۔ "راحیل! کیا بات ہے، تو اتنی پریشان کیوں ہے؟"

راحیل کا دل بھر آیا، وہ اپنے باپ کے سینے سے لگ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ باپ نے شفقت سے راحیل کے سر پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا، پوچھا۔ "راحیل! آخر ہوا کیا؟ تو رو کیوں رہی ہے؟ کیا یعقوب نے کوئی بات کہہ دی؟"

راحیل نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ "بادا جان! ہم دونوں بہنیں یکے بعد دیگرے ایک ایسے جھوٹے میں ڈال دی گئی ہیں جس کے ایک سرے پر خوشیاں ہیں، سرسٹن ہیں، لطف و انبساط ہے مگر اس کے دوسرے سرے پر حسد ہے، رقابت ہے، کڑھن ہے جلن ہے، دکھ ہے اذیتیں ہیں۔ اب عالم یہ ہے کہ جب ہم دونوں بہنیں اس جھوٹے میں جھولتی ہیں تو ہمیں جلدی جلدی ان دونوں کیفیتوں کا شکار ہونا پڑتا ہے۔"

باپ نے نرمی سے کہا۔ "صبر کر راحیل، صبر کر..... کیونکہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"

راحیل کی ہچکیاں بندھ گئیں، بولی۔ "اے کاش، ہم میں سے کسی ایک کی یعقوب سے شادی نہ ہوئی ہوتی۔"

باپ نے ڈھارس بندھائی، پوچھا۔ "آخر تجھے تکلیف کیا پہنچی ہے؟ تو رو کیوں رہی ہے؟ میں تیرے ساتھ ہوں، تیری مدد کروں گا، اپنی تکلیف مجھے بتا تو سہی۔"

"بادا جان! اس تکلیف کا مداوا آپ کے بس میں نہیں ہے۔"

"لیکن تو بتا تو سہی، مجھے بھی تو تیری تکلیف کا علم ہو!"

راحیل نے شرمائے جواب دیا۔ "کیا لیاہ پر خدا نے واقعی مہربانی کی ہے اور آپ نانا بننے والے ہیں؟"

باپ نے محبت سے بیٹی کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ "بس اتنی سی بات! اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟ یہی خوشی تیرے گھر میں بھی آسکتی ہے۔ تو افسردہ کیوں ہے، اپنے خدا سے مایوس کیوں ہوتی ہے؟"

راحیل نے شرمائے اشارتاً کہا۔ "میرے گھر میں اللہ کے اس کرم کا بہت کم امکان ہے کیونکہ دایہ نے یعقوب کو

کر رہا ہوں، کیا مجھے اپنے خدا کا خوف نہیں ہے؟" لیاہ نے اسی اداس لہجے میں کہا۔ "میں یہ کب کہتی ہوں کہ تو میرے ساتھ انصاف نہیں کرتا، مجھے تو اپنی بہن راحیل سے شکایت ہے جو خود کو حسین اور مجھے حقیر سمجھتی ہے۔ وہ تجھ پر مجھ سے زیادہ اپنا حق سمجھتی ہے۔"

یعقوب نے کہا۔ "راحیل کیا سمجھتی ہے، تجھے یہ سب نہیں سوچنا چاہیے۔ میں تو تیری اتنی ہی عزت کرتا ہوں جتنی راحیل کی۔"

لیاہ نے جواب دیا۔ "میں تو اپنے رب سے عزت چاہتی ہوں۔ وہ جس کو چاہے ذلت دے اور جسے چاہے عزت دے۔"

یعقوب نے ہر ممکن کوشش سے لیاہ کے دل پر چھائے ہوئے غم کو دور کرنے کی راہ اختیار کی لیکن لیاہ کے دل سے غموں کی ٹکٹی دور نہ ہو سکی۔

☆☆☆

لیاہ اور راحیل کا عناد بڑھتا ہی رہا اور اس عناد نے ان کی دونوں کنیزوں میں بھی حسد و رنج کی آگ بھڑکادی۔ زلفہ، لیاہ کی طرف دار تھی اور بلہاہ راحیل کی۔ یہ دونوں اس فکر میں بھی لگی رہیں کہ کون کیا کر رہا ہے اور ان میں ایک دوسرے کے خلاف کس قسم کی باتیں ہو رہی ہیں۔

ایک دن صبح ہی صبح راحیل کی کنیز بلہاہ نے نہایت افسوس سے اسے مخاطب کیا، بولی۔ "میری آقا زادی! اب تو جتنا بھی غم کرے تیرے لیے کم ہے۔ تو ہار گئی اور تیری بڑی بہن لیاہ جیت گئی۔"

راحیل بہت زیادہ گھبرا گئی، پوچھا۔ "کیا ہو گیا؟"

کنیز نے کہا۔ "آج صبح ہی صبح میں نے ایک ایسی خبر سنی ہے جس سے اب مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ تیرا شوہر یعقوب اب لیاہ کو زیادہ چاہنے لگے گا اور اس کے دل میں تیری محبت کچھ کم ہو جائے گی۔"

راحیل کو ایسا افسوس ہوا گویا اس کے جسم سے جان نکلی جا رہی ہے، بولی۔ "یعقوب مجھے بے حد چاہتا ہے اور میں یہ یقین کرنے کو تیار نہیں کہ اس کے دل میں میری محبت کم ہو جائے گی۔"

کنیز نے منہ بنا کر جواب دیا۔ "اب تو خود اپنے شوہر یعقوب سے یہ بات سن لے گی۔"

راحیل بگڑ کر کھڑی ہو گئی، بولی۔ "کہیں تیرا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا؟ تو صاف صاف بات کیوں نہیں بتاتی؟"

کنیز نے جواب دیا۔ "میں تو صاف صاف بات کیوں نہیں بتاتی؟"

گیا، میرا بڑا مذاق اڑایا جاتا رہا۔ میں نے وہ سب کچھ اپنے خدا کو منصف اور حاضر ناظر جان کر برداشت کر لیا تھا لیکن میں اپنے خدا کی شکر گزار ہوں کہ اس نے میرے دکھ کا احساس کر کے مجھے سرخرو اور شادیاں کر دیا۔ اب میں کسی کی بھی پروا نہ کروں گی۔ مجھے میرے رب نے جو خوشی بخشی ہے، اس کے مزے میں تمہا لوٹوں گی۔“

لابن نے لیاہ کو ڈانٹا۔ ”تجھے خوش ہونے سے کوئی بھی نہیں روک سکتا لیکن تیری خوشی میں اپنی چھوٹی بہن راحیل کو جلانے کا جذبہ نہیں شامل ہونا چاہیے۔ یاد رکھ، خدا دل آزاری نہیں پسند کرتا، تو اس گناہ کا ارتکاب نہ کر۔“

لیکن لیاہ خوش ہو ہو کے راحیل کو ذہنی اذیت پہنچاتی رہی۔ کچھ عرصے بعد لیاہ سے لڑکا پیدا ہوا۔ لیاہ نے اس کا نام راہن رکھا۔ بیٹے کی پیدائش نے لیاہ کو فخر و غرور سے کچھ زیادہ ہی بے خود اور مدہوش کر دیا۔ یعقوب کو بھی بے انتہا خوشی ہوئی تھی۔ لیاہ کی کنیز زلفہ بھی بہت خوش تھی لیکن راحیل پر غم کا پہاڑ سا ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ بہت زیادہ اداس رہنے لگی تھی۔ وہ اپنی بہن لیاہ کے سامنے جانے سے کتراتے تھی۔ اس کی کنیز بلہاہ اسے تسلی دلا سے دیتی رہتی لیکن راحیل پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔

راحیل اور لیاہ میں حسد و رقابت کی خلیج بڑھتی جا رہی تھی۔ بیٹے کی پیدائش نے اسے کچھ اور بڑھا دیا۔ لیاہ نے راحیل کو جلانے کے لیے اپنے بیٹے راہن کو اس کی گود میں لا کر ڈال دیا، ہتے ہوئے بولی۔ ”راحیل! تو کیوں کڑھتی ہے، اگر تیرے اولاد نہیں ہوتی تو اس میں فکر مند ہونے کی کیا بات ہے، تو میرے راہن سے دل بہلایا کر۔“

راحیل نے راہن کو گود میں لے تو لیا لیکن اسے گرم گرم جوش اور محبت سے کھلا نہیں سکی، کیونکہ وہ خوب اچھی طرح محسوس کر رہی تھی کہ لیاہ کی پیشکش اور گفتگو میں اسے جلانے کا جذبہ بھی کارفرما ہے۔ راحیل نے راہن کو دو چار بار انگلیوں سے چھیڑ چھاڑ کر کے کھلانے کی کوشش کی، جس میں ایک قسم کا کھٹک اور محرومی کا کرب شامل تھا۔

لیاہ کی کنیز زلفہ نے جوہ منظر دیکھا تو اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں اور لیاہ کو علیحدہ لے جا کر پوچھنے لگی۔ ”راحیل کو یہ بچہ کس نے دیا؟“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”خود میں نے۔۔۔ کیوں؟“ پھر خوشی سے بولی۔ ”اس طرح میں راحیل کو جلانا چاہتی ہوں اور اسے یہ جتکنا چاہتی ہوں کہ تیرا وہ غرور کہاں گیا کہ تو حسین ہے اور اصولی طور پر تو یعقوب کی پہلی اور پسندیدہ

میری طرف سے مایوسی کی خبر پہلے ہی سنا رکھی ہے۔“

باپ نے پیار سے اس کے دونوں گال تھپتھپائے اور کہا۔ ”لیکن واپہ خدا نہیں ہے، تو خدا سے مایوسی کیوں ہوتی ہے۔ خدا میں اتنی قدرت ہے کہ انسانوں کے تخمینوں کو غلط کر دے اور وہ کچھ ہو جائے جس کا کسی کے دل میں وہم و شبہ تک نہ ہو۔“

باپ کے تسلی دلا سوں نے راحیل کے دل میں کسی حد تک صبر و برداشت کی قوت پیدا کر دی۔ ان دنوں لیاہ کے چہرے پر ہر وقت مسرت و سرشاری کی کیفیت چھائی رہتی۔ وہ اپنی کنیز زلفہ سے خوب ہنس ہنس کر باتیں کرتی۔ مویشیوں کے باڑے میں چل جاتی اور ان سے اچھی باتیں کرنے لگتی۔ وہ راحیل کے سامنے سے اتر کر گزرتی، کبھی کبھی وہ کوئی طنز بھی کر جاتی اور راحیل کے دل میں ایک نشتر اتر جاتا یا پھر کاسٹے کی نوک ٹوٹ جاتی۔

رات کے کھانے پر لیاہ کی طبیعت میں بڑی جولانی تھی۔ یعقوب، راحیل، لیاہ اور لابن ایک ہی جگہ بیٹھے کھانے میں مصروف تھے۔ دونوں کنیزیں ان کے قریب ہی ادب سے کھڑی ان کے احکامات کی منتظر تھیں۔ لیاہ کی خوشی کا یہ حال تھا کہ وہ بات بات پر ہر ایک سے ہنسی مذاق کرنا چاہتی۔ راحیل اس کی خوشیوں اور چہلوں سے جل کر کڑھ رہی تھی۔ اس سے کھانا نہیں کھایا جا رہا تھا۔ ان دونوں کا باپ لابن، راحیل کی امداد کی کیفیات کو خوب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس سے راحیل کی بے بسی نہیں دیکھی گئی، لیاہ کو بھجایا۔ ”لیاہ! بیٹی کیا تو جانتی ہے دنیا کا بدترین گناہ کیا ہے؟“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”یہ میں نہیں جانتی لیکن اگر آپ یہ پوچھیں کہ دنیا کی سب سے بڑی خوشی کیا ہے تو میں انہی بتا سکتی ہوں۔“

لابن نے پوچھا۔ ”اچھا بتا دنیا کی سب سے زیادہ خوشی کس چیز میں ہے؟“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”اس بات میں کہ خدا کسی مجبور اور کمزور کو اپنی قدرت سے اچانک طاقتور بنا دے اور وہ کمزور اپنے طاقتور حریف کو کمزور اور بے بس بنا دے۔ اس میں جو خوشی اور لذت پنہاں ہے شاید یہ لفظوں میں بیان نہیں کی جاسکتی۔“

باپ نے کہا۔ ”اب تو یہ بھی تو پوچھو کہ دنیا کا بدترین گناہ کیا ہے؟“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”بادا جان! میری سمجھ میں اس کے ہوا کوئی بات نہیں آتی کہ اس گھر میں مجھ پر بہت ہنسا

راہن ابھی ایک سال کا بھی نہ ہوا تھا کہ لیاہ ایک بار پھر امید سے ہوئی۔ خوشی نے لیاہ کو پاگل کر کے رکھ دیا۔ اب اس کے قدم زمین پر نہیں، گویا آسمان پر پڑتے تھے۔ دایہ ہر روز لیاہ کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے آتی تو گھر میں خوشی کی لہری دوڑ جاتی اور لیاہ اپنی کینیز زلفہ سے اترا اترا کر اور زور زور سے اس قسم کی باتیں کرتی کہ راحیل کا برا حال ہو جاتا۔

راحیل اپنی کینیز بلہاہ سے کہتی۔ ”بلہاہ! کچھ تو ہی مشورہ دے کہ اب میں کیا کروں؟ یہ لیاہ تو مجھے جھینے نہ دے گی۔“ بلہاہ نے بے بسی سے جواب دیا۔ ”اے میری آقا زادی اس نازک معاملے میں، میں کیا مشورہ دے سکتی ہوں۔ میری اور ہر ایک کی نظر میں اس کا ایک ہی علاج ہے۔“

”وہ کیا؟“

بلہاہ نے جواب دیا۔ ”وہ یہ میری آقا زادی کہ آپ کوشش کیجیے کہ آپ بھی اولاد کی نعمت سے بہرہ یاب ہوں۔“

راحیل نے ٹھنڈی سانس بھری اور بے بسی سے کہا۔ ”افسوس کہ اگر یہ بات میرے بس میں ہوتی تو میں اتنی شرمندگی ہرگز نہ اٹھاتی۔ میں بے بس اور مجبور ہوں۔ ویسے اللہ جو چاہے کرے، میں اس کی رحمت سے مایوس بھی نہیں ہوں۔“

بلہاہ نے کہا۔ ”آپ اپنے شوہر یعقوب سے کہیے کہ وہ آپ کو بھی صاحب اولاد کریں۔“

راحیل نے جواب دیا۔ ”یعقوب کے اختیار میں ہوتا تو میں اتنی شرمندگی کبھی بھی نہ اٹھاتی۔“

بلہاہ نے کہا۔ ”پھر دایہ کو حکم دیجیے کہ وہ آپ کا خوب اچھی طرح تجزیہ کرے اور اگر اولاد کا امکان ہے تو پھر ہمیں مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جس خدا نے لیاہ کو سرخرو کیا ہے وہی ہمیں بھی شرمندگی اور بردامت سے بچائے گا۔“

راحیل نے بے دلی سے کہا۔ ”اچھا، ذرا دایہ کو بلا کے میرا معائنہ اپنی نگرانی میں کر اؤ اور مجھے سچ بتاؤ کہ میں کبھی اولاد پیدا کرنے کے لائق ہو سکوں گی یا نہیں؟“

بلہاہ نے تائید میں سر ہلا دیا، بولی۔ ”بہر حال میں آپ کی جتنی مدد کر سکتی ہوں اس سے گریز نہیں کروں گی اور اس سلسلے میں، میں اپنی جان تک دے سکتی ہوں۔“

اس دن دایہ جیسے ہی لیاہ کو دیکھنے آئی، بلہاہ نے اس سے کہا۔ ”دایہ! جب تم واپس جانے لگو تو اپنی آقا زادی سے ضرور مل لیا، انہیں تجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

بیوی ہے اور میں نے تیرا حق غصب کرنا چاہا تھا۔“

کینیز زلفہ نے مشورہ دیا۔ ”لیکن اے میری آقا زادی! آپ ایسا نہ کیجیے۔ آپ راہن کو راحیل کی گود سے فوراً لے لیجیے۔“

”کیوں؟“ لیاہ نے کہا۔ ”مجھے میرے رب نے راحیل کے مقابلے میں ادھچکا کیا ہے، اب یہ میرا کچھ بھی نہیں کر سکتی۔“

کینیز زلفہ نے جواب دیا۔ ”جس چیز نے آپ کو اپنی بہن راحیل پر برتری دلائی ہے، راحیل حسد سے اسے نقصان تو پہنچا سکتی ہے۔“

لیاہ ایک دم چونک گئی۔ وہ فوراً مڑی اور راحیل کی گود سے راہن کو چھین لیا اور نفرت سے بہن کو دیکھنے لگی۔

راحیل نے پوچھا۔ ”کیا ہوا لیاہ؟ تو پریشان کیوں ہوئی؟“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”راحیل! مجھے ایک بات تو بتا، کیا تو راہن کو دیکھ کر واقعی خوشی محسوس کرتی ہے یا پھر.....“

راحیل نے غمزہ آواز میں کہا۔ ”لیاہ! میں شرمندہ ہوں کہ ماضی میں، میں نے تیرے خلاف کچھ تہمتیں بائیں کی گھیس اور یہ جو کچھ ہو رہا ہے، میں سمجھتی ہوں مجھے اسی کی سزا دی جا رہی ہے۔“

لیاہ نے انتہائی غرور سے کہا۔ ”میں نے راہن کو پیدا کیا ہے، اب میں تجھ پر برتری رکھتی ہوں اور اب میں دیکھتی ہوں کہ اپنے شوہر یعقوب کی نظر میں تو زیادہ محترم رہتی ہے یا میں؟ یعقوب تجھے زیادہ چاہتا ہے یا مجھے؟“

راحیل نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”خدا جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کرے۔ میں تو اب رب پر شاکر ہوں اور اس سے توبہ و استغفار کرتی ہوں۔“

لیاہ نے کلکاری مارتے ہوئے راہن کو اپنی کینیز زلفہ کے حوالے کر دیا۔ بولی۔ ”زلفہ! تو اس کا خیال رکھ، کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اسے حاسدوں کی نظر کوئی نقصان نہ پہنچا دے اور یا خود حاسد ہی اس کے خلاف کوئی ایسی سیدھی حاسدانہ حرکت کر گزریں۔“

زلفہ راہن کو لے کر سامنے سے ہٹ گئی اور لیاہ اور راحیل دونوں تھوڑی دیر آنے سامنے کھڑی رہ کر کچھ سوچتی رہیں۔ ان میں سے ایک کے انداز اور تیور میں برتری اور تکبر شامل تھا اور دوسرے کے چہرے پر بے بسی کے آثار،

انہیں اور محرومی کا دکھ۔

☆☆☆

گی تو یہی کہوں گی جو ابھی پہلے معائنے کے بعد کہا ہے۔“
 راحیل بچوں کی طرح ہلکے ہلکے کر رہنے لگی۔ اس نے بلہاہ سے کہا۔ ”اب کیا ہوگا بلہاہ؟ کیا میری بڑی بہن لیاہ میرے مقابلے میں ہمیشہ کامیاب اور سرخرو رہے گی؟ کیا میں اپنے پھل سے ہمیشہ محروم رہوں گی؟“

بلہاہ نے ڈھارس بندھائی۔ ”اے میری آقا زادوی! اپنے رب کی مہربانیوں سے مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وانیہ انسان ہے اور انسانی تخمینے غلط بھی ہو سکتے ہیں۔“

راحیل نے دایہ اور بلہاہ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ بلہاہ، دایہ کو ایک طرف لے گئی اور تڑھی سے کہا۔

”اگر یہ بات تو نے واقعی سمجھ لی تھی کہ میری آقا زادوی راحیل کی قسمت میں اس کا پھل نہیں لکھا گیا تو تجھے یہ بات ان کے بجائے مجھے بتانی تھی، کیونکہ اچھے معالج اپنے مریض کے منہ پر اس کے خطرناک مرض کا ذکر نہیں کرتے۔ اس سے مرض میں، مریض کا خوف کچھ اضافہ کر دیتا ہے۔ یہ تو نے اچھا نہیں کیا۔“

دایہ سہم گئی، بولی۔ ”اگر میں نے غلطی کی ہے تو میں اس پر شرمندہ ہوں۔“

بلہاہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”اچھا، اب تجھے ایک بات کا پوری طرح خیال رکھنا ہے۔“

دایہ نے پوچھا۔ ”کس بات کا؟ میں اس کے لیے تیار ہوں۔“

بلہاہ نے کہا۔ ”اس کا علم زلفہ اور اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں والی آقا زادوی کو نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس خبر سے ان دونوں کو اتنی ہی خوشی ہوگی جتنی مجھے اور میری آقا زادوی کو اس سے دکھ پہنچا ہے۔“

دایہ یہ وعدہ کر کے چلی گئی اور بلہاہ اپنی آقا زادوی کے غم میں شریک ہو کر اسے تسلیاں دیتی رہی۔

اس دن رات کو راحیل اپنے شوہر یعقوب کے کاندھے پر سر رکھ کر خوب روئی۔ یعقوب حیران تھے۔

انہوں نے رونے کا سبب پوچھا تو راحیل نے دایہ والی بات اپنے شوہر کو نہیں بتائی۔ یعقوب نے سسکیاں لیتی ہوئی راحیل کا چہرہ اپنے چہرے کے سامنے کر لیا اور پوچھا۔ ”آخر تو رکیوں رہی ہے؟“

اس پرسش نے راحیل کو اور زیادہ غمزہ کر دیا اور زیادہ رونے لگی۔ یعقوب نے اصرار کیا۔ ”راحیل! تو جانتی ہے کہ میں تجھ سے کتنی محبت کرتا ہوں، آخر تو اپنا غم مجھے کیوں نہیں بتاتی؟“

زلفہ نے لیاہ کی طرف دیکھا اور سرکوشی میں کہا۔ ”آقا زادوی ذرا ہوشیار۔ کچھ دال میں کالا ہے، ورنہ راحیل کا اس سے کیا کام ہو سکتا ہے؟“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”تو نگرانی کر اور دیکھ کہ یہ راحیل سے یا راحیل اس سے کس قسم کی باتیں کرتی ہے؟“

”آپ مطمئن رہیں، یہ میں معلوم کر لوں گی۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔“

دایہ دیر تک لیاہ کے پاس موجود اس کی خدمت کرتی رہی اور اس دوران راحیل کی تیز بلہاہ مستحکم وہیں موجود ادھر ادھر کے چکر لگاتی رہی اور زلفہ بلہاہ کی نگرانی کرتی رہی۔

جب دایہ، لیاہ کے پاس سے رخصت ہو کے جانے لگی تو لیاہ نے دایہ کا ہاتھ پکڑ لیا، بولی۔ ”دیکھ یہ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تو یہاں سے راحیل کے پاس جائے گی۔“

دایہ نے جواب دیا۔ ”میری آقا زادوی! پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ راحیل بھی تو آپ ہی کی بہن ہے۔“

لیاہ نے کہا۔ ”ہاں، وہ میری بہن ہے لیکن تو یہ نہیں جانتی کہ وہ مجھ سے کس قدر حسد رکھتی ہے۔“

”میری آقا زادوی! آخر آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”میں چاہتی ہوں کہ راحیل سے تیری جتنی باتیں ہوں تو انہیں میرے علم میں ضرور لائے۔“

دایہ نے وعدہ کر لیا۔ بلہاہ دایہ کو لے کر راحیل کے پاس پہنچ گئی اور کہا۔ ”ذرا میری آقا زادوی کا خوب اچھی طرح معائنہ تو کر اور یہ بتا کہ یہ اپنے پھل سے کیوں محروم ہے؟“

دایہ نے راحیل کا خوب اچھی طرح معائنہ کیا اور منہ لٹکا کے یہ مایوس کن فیصلہ سنا دیا۔ ”اے میری آقا زادوی!

انہوں نے انسانوں کی قسمت لکھنے والے نے شاید تیرے شوہر کی اولاد میں تیری بڑی بہن کی قسمت میں لکھ دی ہیں اور شوہر کی بے پناہ محبت تیری قسمت میں لکھ دی ہے۔“

راحیل کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔

بلہاہ نے پوچھا۔ ”تو جو کچھ کہہ رہی ہے کیا تجھے اس پر پورا یقین ہے؟ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کیا تجھے اپنی باتوں کی صداقت پر پورا یقین ہے؟“

دایہ نے جواب دیا۔ ”میرا خاندانی تجربہ شاید مجھ سے کوئی غلط بات نہیں کہلو ازا ہے۔“

بلہاہ نے کہا۔ ”اگر تو ایک بار اور اطمینان کر لے تو

دایہ نے جواب دیا۔ ”اگر میں دس بار معائنہ کروں

بولی۔ "میں ہار بار یہی کہوں گی کہ میں کچھ نہیں جانتی، مجھے بھی اولاد دے، ورنہ میں مرجاؤں گی۔"

یعقوب کو غصہ آ گیا، بگڑ کر جواب دیا۔ "راہیل! تو ناوانوں میں سے نہ بن، کیا میں خدا کی جگہ ہوں جس نے تجھے اولاد سے محروم رکھا ہے۔ میں ایسی باتیں تیری زبان سے نہیں سنا چاہتا۔"

راہیل نے خاموشی اختیار کی۔ لیاہ نے دایہ سے یہ معلوم کر لیا کہ راہیل کی قسمت میں اولاد کا پھل لکھا ہی نہیں گیا۔ وہ بہت خوش ہوئی اور اس خبر نے دونوں بہنوں میں حسد و رقابت کی آگ اور زیادہ بھڑکا دی۔

لیاہ سے دوسرا بچہ بھی پیدا نہ ہوا۔ یہ بھی لڑکا تھا۔ لیاہ نے اس کا نام شمعون رکھا۔ خاندان کے لوگوں نے یعقوب کو دوسرے لڑکے کی پیدائش پر مبارکبادیں دیں اور لیاہ سے پیار و محبت کی باتیں کیں۔ اس موقع پر راہیل اور اس کی کینز بلہاہ اپنے کمرے میں روپوش رہیں۔

مبارکباد دینے والوں میں سے ایک بڑی بی بی نے پوچھا۔ "یہ راہیل کہاں ہے؟ کہیں دکھائی نہیں دے رہی۔"

لیاہ کی کینز زلف نے جواب دیا۔ "خدا کی یہ مہربانیاں جو میری آقا زادی کے حال پر ہیں، راہیل کو گران گزر رہی ہیں اس لیے وہ اپنی کوٹھری میں منہ چھپا کر بیٹھ رہی ہے۔"

لیاہ کے انگ انگ سے خوشی ٹپک رہی تھی، بولی۔ "جب میرے خدا نے یہ دیکھا کہ مجھ سے نفرت کی جارہی ہے تو اس نے مجھے یکے بعد دیگرے دو لڑکے عطا فرمائے اور دایہ سے یہ مایوس کن اعلان کروایا کہ خدا نے اس کی قسمت میں اولاد کا پھل لکھا ہی نہیں۔"

اس وقت راہیل کی حالت واقعی بہت خراب ہو رہی تھی اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر وہ کرے کیا؟

☆☆☆

شمعون کے بعد لیاہ کے ایک لڑکا اور ہوا اور اس نے اس کا نام لاوی رکھا۔ اس نے فخر یہ کہا۔ "لوگو! اب میں تین بیٹیوں کی ماں ہوں اور اب میں پوری طرح مطمئن ہو کر یہ کہہ سکتی ہوں کہ میرا شوہر مجھ سے بہت زیادہ محبت کرے گا، اتنی کہ لوگ حسد اور رقابت ہی محسوس کریں گے۔"

راہیل پر قیامت پر قیامت ٹوٹ رہی تھی۔ وہ اپنی اس غلطی پر بہت نادم تھی جب اس نے اپنے حسن و خوبی بصورتی پر ناز کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں والی بڑی بہن لیاہ اس کے مقابلے میں یعقوب کی محبت جیتنے میں ناکام رہے گی۔ اب خدا سے برابر شرمندہ

راہیل نے سسکتیاں لیتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ درست ہے کہ میری بہن لیاہ ایک بار پھر اپنی قسمت کا پھل پانے والی ہے؟"

یعقوب نے مسکرا کر کہا۔ "ہاں یہ درست ہے لیکن اس سے تو کیوں خوفزدہ ہو رہی ہے؟"

راہیل نے جواب دیا۔ "اگر لیاہ نے راہیل کے بعد ایک بیٹا اور پالیا تو تیری محبت کا زیادہ حصہ لیاہ کی قسمت میں چلا جائے گا اور میں اس سے محروم ہوتی چلی جاؤں گی۔"

یعقوب نے کہا۔ "تو بالکل غلط سوچ رہی ہے۔ تیرے اندیشے بیکار اور بے سرو پا ہیں۔ مجھے اللہ نے تم دونوں کے معاملے میں عدل و انصاف کا حکم دیا ہے پھر میں ظالم کیونکر بن سکتا ہوں۔"

راہیل نے کہا۔ "معلوم نہیں کیوں، اندر سے میرا دل بیٹھنے لگتا ہے اور مجھ پر وحشت کا دورہ سا پڑ جاتا ہے۔"

یعقوب نے اطمینان دلا یا۔ "راہیل! تو میری محبت پر یقین رکھ، میں ظالموں میں سے نہیں ہوں۔"

راہیل نے التجا کی۔ "تب پھر تو میرے ساتھ انصاف کر۔"

"بتا، میں اس کے لیے تیار ہوں۔"

راہیل نے کہا۔ "جس طرح تو نے میری بڑی بہن لیاہ کو اس کا پھل دیا ہے، اسی طرح میرا پھل مجھے بھی دے۔ میں اپنی قسمت کا پھل تجھ سے مانگ رہی ہوں، اب میں مزید ناخیر اور محرومی کو نہیں برواشت کر سکتی۔"

یعقوب نے پھر تسلی دی۔ "راہیل! تو مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہے، تو اپنی باری کا انتظار کر۔ اس باری کا، جو تیرے پھل کے لیے تیرے رب کی طرف سے مقرر کی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرا رب تجھے زیادہ دنوں تک محروم نہیں رکھے گا۔"

راہیل نے دایہ کا فیصلہ اپنے شوہر کو سنا دیا، بولی۔ "دایہ نے آج مجھے بتا دیا ہے کہ قسمتیں لکھنے والے نے میری قسمت میں کوئی پھل لکھا ہی نہیں۔"

یعقوب نے جواب دیا۔ "دایہ خدا نہیں ہے، تو اپنے رب کی رحمت سے مایوس کیوں ہوتی ہے؟"

راہیل نے اصرار کیا۔ "میں کچھ نہیں جانتی، میں اولاد چاہتی ہوں، میں بیٹا چاہتی ہوں۔"

یعقوب نے ذرا ناراضگی سے کہا۔ "راہیل! تو کتنی نادانی اور ناگہمی کی بات کر رہی ہے۔ آخر تجھے ہو کیا گیا ہے؟"

راہیل کسی بچے کی طرح بلک بلک کر رونے لگی،

اور میرے حاسد سے بے اثر بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔“

بلہاہ خاموش ہو گئی اور لیاہ کے گھر میں چوتھی ولادت کا انتظار کرنے لگی۔ یعقوب کی شب و روز کی محنت اور دیانت خوب رنگ لارہی تھی۔ ماموں لایبن کے موبیشیوں میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا تھا۔ کبھی کبھی جب ان موبیشیوں میں سے کوئی موبیشی کسی درندے کی خوراک بن جاتا تو ماموں لایبن کسی نہ کسی طرح یعقوب سے یہ نقصان پورا کرا لیتا۔ ایک دن یعقوب کے ریوڑ سے کوئی درندہ ایک بھیڑ دبوچ کر لے گیا۔ شام کو جب ان کی تعداد گنی گئی تو اس میں ایک بھیڑ کم تھی۔ ماموں لایبن نے ڈانٹ کر پوچھا۔ ”یعقوب! ایک بھیڑ کہاں چلی گئی؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”ماموں! اسے ایک بھیڑ یا اٹھالے گیا۔“

ماموں لایبن کو ایک دم غصہ آ گیا، بولے۔ ”ارے بھائی! یہ بھیڑ یا پہلے کیوں نہیں اٹھالے گیا تھا؟“

یعقوب نے مصیبت سے کہا۔ ”ماموں! یہ تو وقت وقت کی بات ہے لیکن میں ایک بات آپ کو ضرور بتا دیتا چاہتا ہوں۔“

”بتا، ذرا جلدی بتا۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”میں ہر اس نقصان کا ذمے دار ہوں، جو میرے ذمے سوئے ہوئے کاموں میں ہوگا اس لیے اس گمشدہ بھیڑ کی قیمت میں ادا کروں گا، آپ فکر مند نہ ہوں۔“

ماموں لایبن کی نارے خوشی کے باج میں کھل گئیں، بولے۔ ”تو کتنا سعادت مند ہے یعقوب! تو نے میرا دل خوش کر دیا۔“

یعقوب نے ایک بھیڑ کا نقصان واقعی پورا کر دیا۔ جب راحیل کو اس واقعے کا علم ہوا تو اس نے ہمدردی سے کہا۔ ”اگر تو میرے باپ کے موبیشی جراتا ہے اور ان کی خدمت کرتا ہے تو اس میں اس قسم کے نقصان بھی ہوں گے اور ان نقصانوں کا ذمے دار میرا باپ اگر تجھے شہر اتا ہے تو یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”میں نے صرف تیری خاطر مصیبتیں گوارا کی ہیں اور آئندہ بھی انہیں جھیلنے کو تیار ہوں لیکن اس کے باوجود میں بھی محسوس کرتا ہوں کہ تو ادا اس اور پریشان ہی رہتی ہے..... آخر یہ کیوں؟“

راحیل نے کہا۔ ”یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے لیکن

کیے جا رہا تھا۔ وہ ہر بار اپنی کینز بلہاہ سے یہی سوال کرتی۔“

”بلہاہ! اب کیا ہوگا؟“

بلہاہ جواب دیتی۔ ”اے میری آقا زادی! اپنے رب کے نام پر آپ صبر کریں، یہاں تک کہ آپ کا صبر آپ کا رب خود بخوبی محسوس کرے اور صبر کرنے والوں کے لیے رب کے پاس عظیم اجر ہے۔“

راحیل کہتی۔ ”بلہاہ! اعم اور صدے سے میرا سینہ پھٹا جا رہا ہے۔ برداشت اور صبر کی گرفت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ تو اس غم کی شکار نہیں ہے جس میں مبتلا ہوں اس لیے تیری عقل صحیح کام کر رہی ہوگی۔ تو اپنی صحیح عقل سے مجھے یہ مشورہ دے کہ میں کیا کروں؟“

بلہاہ نے بے بسی سے جواب دیا۔ ”اے میری آقا زادی! میں پریشان ہوں کہ صبر کے سوا میں آپ کو کیا مشورہ دوں۔“

راحیل نے کہا۔ ”اگر لیاہ کے چوتھی بار بھی لڑکا ہی ہوا تو پھر میں نے ایک تدبیر سوچ لی ہے۔ میں اپنے لیے کئی بھی قیمت پر اولاد حاصل کر کے رہوں گی۔“

بلہاہ نے تجب سے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“

”یہ میں ابھی نہیں بتاؤں گی، ذرا صبر کر۔“

بلہاہ نے کہا۔ ”اے میری آقا زادی! میں آپ کی رازدار ہوں، آپ کی کوئی تکلیف یا کوئی مصیبت مجھ سے چھپی ہوئی نہیں ہے پھر آپ اس میں بھی مجھے اپنا رازدار کیوں نہیں بتاتیں؟“

راحیل نے جواب دیا۔ ”بس تو چند دن تک خاموش رہ اور اس سلسلے میں مجھ سے کوئی سوال نہ کر میں کیا چاہتی ہوں یا کون سا قدم اٹھاؤں گی، تجھے بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔ ہاں میں اس معاملے میں اک ذرا تیری مدد ضرور چاہوں گی۔ اگر تو نے میری مدد کر دی تو میں تجھے دکھلا دوں گی کہ میں بھی اولاد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی ہوں۔“

بلہاہ نے کچھ ایسا محسوس کیا گویا شدت غم نے راحیل کو اتنا پریشان کر دیا ہے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، خود اسے بھی پتا نہیں۔ جو منہ میں آتا ہے کہہ دیتی ہے۔

بلہاہ نے پوچھا۔ ”اے میری آقا زادی! آپ مجھے ابھی سے وہ بات کیوں نہیں بتا دیتیں، جس کا کل بتا دینا ناگزیر ہوگا۔“

راحیل نے جواب دیا۔ ”نہیں بلہاہ! اگر وہ بات میں قبل از وقت بتا دوں گی تو اس کی افادیت مجروح ہو جائے گی

یعقوب نے جواب دیا۔ "یہ سوال تو مجھ سے نہیں، اپنے رب سے کرو، وہ شاید جواب دے دے۔"

راحیل نے کہا۔ "میں کچھ نہیں جانتی، میں اولاد چاہتی ہوں اور اگر ایسا نہ ہو تو میری بڑی بہن لیاہ، طے دے دے کر اور جلا جلا کر مجھے مار ڈالے گی۔ میں مر جاؤں گی۔ کیا تو بھی یہی چاہتا ہے کہ میں مر جاؤں؟"

یعقوب نے آگ بگولا ہو کر جواب دیا۔ "راحیل! تو کیسی باتیں کرتی ہے، یہ لین دین تو آسانوں میں رب کی طرف سے ہوتا ہے۔ کیا میں تیرا رب ہوں جس نے تجھے اولاد کی نعمت سے محروم کر رکھا ہے؟"

راحیل نے اسی وقت اپنی کنیز بلہاہ کو آواز دی۔ وہ بھاگی بھاگی آئی تو راحیل نے یعقوب سے کہا۔ "میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں بہر قیمت اولاد حاصل کر کے رہوں گی۔ میں اب زیادہ دنوں تک محرومیت کی شکار نہیں رہوں گی۔"

بلہاہ نے پوچھا۔ "آپ نے مجھے یاد کیا تھا؟"

راحیل نے جواب دیا۔ "ہاں، تو ایک طرف بیٹھ جا۔ میں نے تجھے ایک ضروری کام سے بلا یا ہے۔" پھر یعقوب سے پوچھا۔ "میں جو فیصلہ سنانے والی ہوں کیا تو بھی اسے منظور کر لے گا؟"

"پہلے تو اپنا فیصلہ تو سنا، اس کے بعد میں کوئی جواب دوں گا۔"

راحیل نے بلہاہ سے کہا۔ "بلہاہ! تجھے یاد ہے کہ ایک دن میں نے تجھ سے کوئی وعدہ لیا تھا؟"

بلہاہ نے جواب دیا۔ "مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے، آپ فرمائیں میں ہر طرح آپ کے کام آنے کو تیار ہوں۔"

راحیل نے یعقوب اور بلہاہ کو ایک ساتھ مخاطب کیا۔ "تم دونوں جانتے ہو کہ میں نے اپنے رب کی رحمت کا۔۔۔ بے حد انتظار کیا لیکن اس میں تاخیر ہوتی جا رہی ہے اور ادھر میری بڑی بہن لیاہ کے گھر میں اولاد کی پارٹی ہو رہی ہے۔ ان حالات میں، میں جس کرب و آذیت میں مبتلا ہوتی جا رہی ہوں اس کا تم دونوں کو معمولی سا احساس تک نہیں ہو سکتا۔" پھر بطور خاص یعقوب سے کہا۔ "اس لیے میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تجھ سے اولاد حاصل کر کے رہوں۔"

اس کے بعد بلہاہ سے کہا۔ "اور بلہاہ تو میری کنیز ہے، میرے جملہ دکھ درد میں شریک۔ میں تیری مرضی جانے بخیر تجھے اپنے شوہر یعقوب کے حوالے کر رہی ہوں، آج سے یعقوب کو تیرے جسم پر تصرف کا حق بھی حاصل ہوگا اور اس

اگر تو نے یہ ذکر چھیڑا ہی ہے تو اس کا جواب بھی سن لے۔ میں اس وقت تک خوش نہیں ہو سکتی جب تک کہ میں خود بھی صاحب اولاد نہیں ہو جاتی اور ایسا ناممکن نظر آتا ہے۔"

یعقوب نے جواب دیا۔ "خدا کے ہاں ناممکن کچھ بھی نہیں، تو مایوس کیوں ہوتی ہے؟"

راحیل نے کہا۔ "میں مایوس نہیں ہوں لیکن اپنے رب کی رحمت میں تاخیر سے تنگ ضرور آگئی ہوں۔"

باہر سے یعقوب کے کسی ایک بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ یعقوب نے بے چین ہو کر کہا۔ "راحیل! میں ابھی آتا ہوں، میرا کوئی بچہ رو رہا ہے۔"

یعقوب وہاں سے چلے گئے اور راحیل اپنے غم کی آگ میں جلتی جھلتی رہی۔

☆☆☆

لیاہ کو خدا نے ایک بار پھر نوازا دیا اور اس کے گھر میں چوتھا بیٹا پیدا ہوا۔ اس نے اس کا نام یہوداہ رکھ دیا۔ راحیل پر ایک بار پھر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ لیاہ نے راحیل کو جلانے کی خاطر اس کو اپنی خوشی میں شریک ہونے کی دعوت دی، بولی۔ "راحیل! تو کیوں اداس اور پریشان ہوتی ہے؟ تو خدا کی حمد و ثنا اور ستائش کر کہ اس نے تجھے حسن کی دولت سے مالا مال کیا ہے اور میں بھی خدا کی حمد و ثنا اور تعریف کروں گی کہ اس نے مجھے یکے بعد دیگرے سے چار بیٹوں سے نوازا دیا۔"

راحیل نے جواب دیا۔ "اے کاش! میں خوب صورت ہونے کے بجائے صاحب اولاد ہوتی۔"

لیاہ نے کہا۔ "تو کیا تو اپنے رب سے گلہ کر رہی ہے؟ مجھے دیکھ کہ میں چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے عیب کے باوجود ہر وقت اپنے رب کی شکر گزار رہتی ہوں۔"

راحیل سے باتیں نہیں کی جا رہی تھیں، ایک طرف جاتے ہوئے بولی۔ "میں اپنے رب سے اپنی محرومی کا گلہ ہرگز نہیں کر رہی ہوں۔ ہاں، اس کی رحمت کی تاخیر سے گھبرا ضرور رہی ہوں۔"

راحیل چلی گئی تو لیاہ نے طنزاً کہا۔ "تو گویا تو ابھی تک یہ امید رکھتی ہے کہ تو اولاد پیدا کر سکے گی حالانکہ وہ یہ بتا چکی ہے کہ تیری قسمت میں اولاد کا پھل لکھا ہی نہیں گیا۔"

اس رات یعقوب نے سے ایک بار پھر تلخ کلاہی ہوئی۔ راحیل کی آنکھیں مسلسل روتے رہنے سے سرخ ہو گئی تھیں، اس نے یعقوب سے کہا۔ "آخر میں کب تک انتظار کروں گی؟"

لیاہ نے اپنی سخت مٹانے کے لیے مہمانوں سے کہا۔ ”راہیل خواجواہ اتر رہی ہے، لڑکا بلہاہ سے ہوا ہے، اس میں راہیل کے خوش ہونے کی کیا بات ہے؟ میں تو تب جانوں جب راہیل کے لڑکا ہوتا۔ وہ تو وہی بے اولاد ہی رہی۔“

راہیل نے اڑ کر جواب دیا۔ ”بلہاہ کو میں نے اپنے شوہر کے حوالے کیا تھا اس لیے اس کی اولاد میری اولاد ہے۔ میری بڑی بہن لیاہ خواجواہ تکبر میں مبتلا تھی۔ بلہاہ کو پینا دے کر خدا نے میری فریاد سنی اور میرے ساتھ انصاف کیا۔ اب یہ میرا بیٹا ہے اور میں اس کا نام وان رکھ رہی ہوں۔“

اس دن دونوں بہنوں میں خاصی نوک جھجک رہی اور دیکھنے والے خوب اچھی طرح یہ اندازہ لگا سکتے تھے کہ اب لیاہ کی باتوں میں ایک قسم کی گھست خور ہو گئی پائی جاتی تھی اور راہیل کا اندازہ تھا نہ بلکہ جارحانہ تھا۔

لیاہ نے کہا۔ ”راہیل! تو زیادہ نہ اتر، اب بھی میری چار اولادیں ہیں اور میں آج بھی اپنے شوہر کی نظر میں تجھ سے زیادہ برگزیدہ اور چمکتی ہوں۔“

راہیل نے جواب دیا۔ ”جب میں نے غرور کیا تھا تو خدا نے مجھے بے اولاد رکھ کر بڑی کر بنا کر گھست دی تھی لیکن بعد میں مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور میں اپنے کیے پر تادم ہو کر اپنے رب سے توبہ و استغفار کرنے لگی اور پھر میرے رب نے ہی میرے دل و دماغ میں یہ تجویز ڈالی کہ میں اپنی کینیز بلہاہ سے اپنے لیے بیٹا طلب کروں، چنانچہ میں اس اشارے پر عمل کر کے صاحب اولاد ہو چکی ہوں اور بلہاہ کا بیٹا دان میرا بیٹا بیٹا ہے۔“

لیاہ ناراض ہو کر بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی اور راہیل اپنی کینیز بلہاہ سے محبت کی باتیں کرنے لگی۔ یعقوب نے لیاہ کو سمجھایا کہ راہیل اور بلہاہ کے مقابلے میں بہت زیادہ جذباتی ہونے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن لیاہ کا یہ کہنا تھا کہ وہ چونکہ یعقوب کے چار بیٹوں کی ماں ہے اس لیے بلہاہ اور راہیل کے مقابلے میں اس سے زیادہ ترجیحی سلوک ہونا چاہیے۔ یعقوب یہ کہتے تھے کہ ان کے نزدیک سبھی برابر ہیں۔ وہ کسی کو کسی پر فوقیت دینے کو تیار نہیں ہیں۔

لیاہ مہینوں اس انتظار میں رہی کہ خدا اس کی قسمت کو کھول دے اور وہ پانچواں بیٹا پیدا کر کے راہیل اور بلہاہ کو شرمندہ کر دے لیکن اس کے بے جا تکبر سے خدا اس سے روٹھ گیا تھا۔ یہاں تک کہ بلہاہ سے دوسرا بیٹا بھی پیدا ہو گیا

طرح تجھ سے جو اولاد ہوگی، وہ میری اولاد ہوگی۔ اسے میں اپنی اولاد کہوں گی۔ شاید میں اسی طرح اپنی بہن لیاہ کے مقابلے میں سرخرو ہو سکوں۔“

یعقوب اور بلہاہ نے ایک دوسرے کو سرسری نظر سے دیکھا۔ اس کے بعد دونوں راہیل کی طرف دیکھنے لگے۔ اس وقت راہیل کی حالت واقعی بڑی قابلِ رحم تھی۔

راہیل نے یعقوب سے پوچھا۔ ”کیا تجھے میرے اس فیصلے سے اختلاف ہے.....؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”اس کا اٹھارہ اس امر پر ہے کہ بلہاہ تیرے فیصلے کو کس حد تک مانتی ہے؟“

راہیل نے نہایت مطمئن لہجے میں کہا۔ ”بلہاہ سے میں نے پہلے ہی سے یہ وعدہ لے رکھا ہے کہ وہ میرے لیے قربانی دے گی۔“ پھر بلہاہ کو مخاطب کیا۔ ”کیوں بلہاہ! کیا تجھے میرے اس فیصلے سے اتفاق نہیں ہے؟ کیا تو میرے لیے یعقوب کے اشتراک سے اولاد نہیں پیدا کر سکتی؟“

بلہاہ نے سر جھکا لیا، آہستہ سے بولی۔ ”میں لیاہ کے مقابل آپ کو بھی خوش دیکھنا چاہتی ہوں اے میری آقا زادی۔“

راہیل نے یعقوب سے کہا۔ ”بلہاہ کو لے جا اور اس سے مجھے اولاد دے۔“

جب لیاہ کو اس بانٹ کا علم ہوا کہ اس کی چھوٹی بہن راہیل نے بلہاہ کو یعقوب کے حوالے کر دیا ہے اور اس سے اولاد حاصل کرنے کی فکر نہیں ہے تو خوب ہنسی اور راہیل کا مذاق اڑایا۔ ”واہ! خود تو ناکام رہی، اب اپنی کینیز کے ذریعے میرا مقابلہ کرنا چاہتی ہے۔ میں بلہاہ کو بھی گھست دے دوں گی، پھر دیکھوں گی کہ راہیل اور کون سا قدم اٹھاتی ہے۔“

بلہاہ کی حواگی کے بعد کا عرصہ پورے خاندان میں سب کے لیے تجسس اور سنسنی کا مرحلہ بنا ہوا تھا۔ ادھر لیاہ کو پانچویں بیٹے کا انتظار تھا لیکن راہیل اس دوران پورے اعتماد سے ایک بات کہنے لگی تھی، وہ کہتی تھی۔ ”اب میرا رب مجھے اور زیادہ شرمندہ نہیں کرے گا۔“

لیاہ کو یقین تھا کہ اس کے ہاں پانچویں اولاد بھی ہوگی لیکن اس وقت یہ غرور چکنا چور ہو گیا جب بلہاہ سے ایک لڑکا پیدا ہو گیا۔ اس دن راہیل کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا اور لیاہ سخت میں جھلا ہو گئی۔ راہیل اڑتی ہوئی بلہاہ کے پاس پہنچی۔ وہاں خاندان کے اور لوگ بھی موجود تھے اور یہ لوگ بلہاہ کے بچائے راہیل کو مبارکباد دے رہے تھے۔

ضرور دیکھ رہی ہیں۔ ایک خطرناک بات ایک افسوسناک منظر۔ تم لوگوں کی یہ باہمی منافرت، رنجش اور حسد تمہاری اولادوں میں پیدا ہو جائیں گی اور ایک زمانہ آئے گا جب تمہارے بیٹے، بلہاہ کے بیٹوں سے برس پیکار ہو جائیں گے لیکن میں یہ چاہتا تھا کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو بہت اچھا ہوتا۔“

یعقوب کے مایوس چلے جانے کے بعد لیاہ کا باپ لابن، لیاہ کے پاس پہنچ گیا۔ اس وقت لابن کے ساتھ اس کے دونوں بیٹے بھی آئے تھے۔ لیاہ اور راحیل کے دونوں بھائی ایک عرصے بعد اپنے گھر فدان ارم واپس آئے تھے اور انہوں نے اپنے باپ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔

لابن نے پوچھا۔ ”لیاہ! تو یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے، باہر کیوں نہیں چلتی؟ کیا تقریب میں شرکت سے تجھے کسی نے روک دیا ہے؟“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”اسکی کوئی بات نہیں باوا جان! میں سوچتی ہوں کہ اگر میں اپنے حاسدوں سے دور ہی رہوں تو زیادہ سکون سے رہوں گی۔“

”نہیں بیٹی! لابن نے کہا۔ ”تیرا اس طرح کوٹھری میں چھپ کر بیٹھ رہنا اچھی بات نہیں ہے۔“

دونوں بھائیوں نے کہا۔ ”نہیں بہن! ہم دونوں بھی تو وہاں موجود ہوں گے۔ کسی کی کیا مجال کہ وہ آپ کو پریشان کرے یا کسی قسم کا دکھ پہنچائے۔“

لیاہ نے سکتے ہوئے جواب دیا۔ ”میرے بھائیو! تم اس معاملے میں مت پڑو۔ ہم بہنوں اور کیتڑوں کے معاملوں میں تم دونوں کو نہیں پڑنا چاہیے۔ میں خود ہی مقابلہ کر لوں گی اور انہیں نچا دکھا کر رہوں گی۔“

لابن اور اس کے بیٹوں نے بڑی کوشش کی کہ وہ لیاہ اس کے چاروں بیٹوں اور کیتڑوں کو لے کر اس تقریب میں شریک ہوں لیکن لیاہ نہیں مانی۔ ضیافت بہت شاندار رہی اور بلہاہ کے دونوں بچوں کو ان کے رشتے داروں نے خوب خوب پیار کیا۔

عزیز رشتے داروں نے محفل میں لیاہ، اس کے بچوں اور اس کی کیتڑوں کو نہ دیکھ کر، ان کی عدم شرکت کی وجہ پوچھی تو راحیل نے چند عورتوں کو ساتھ لیا اور ان سے کہا۔ ”میں نے تو بڑی کوشش کی کہ میری بہن لیاہ، اس کے بچے اور اس کی کیتڑوں بھی میری اس خوشی میں شریک ہوں لیکن وہ معلوم نہیں کیوں مجھ سے ناراض ہیں۔ ذرا تم لوگ میرے ساتھ چل کر محفل میں شریک نہ ہونے کا سبب خود ہی معلوم کر لو۔“ راحیل نے دروازہ کھینچا دیا اور ہنستے ہوئے کہا۔

اور ایک بار پھر راحیل کو زبردست خوشی حاصل ہوئی۔ اس نے اس خوشی میں خاندان والوں کی شاندار ضیافت کی۔ اس میں قریب اور دور کے بہت سارے رشتے دار شریک ہوئے۔ ایک کھلی جگہ میں ان سب کو جمع کر کے حرے حرے کی باتیں کی جانے لگیں۔ لیاہ اور اس کی کیتڑوں نے اس ضیافت میں شریک نہیں ہوئیں۔ یہ دونوں اپنی کوٹھری میں، اپنے چاروں بچوں سمیت بند بیٹھی رہیں۔ جب یعقوب نے ان لوگوں کو محفل میں نہیں دیکھا تو وہ انہیں تلاش کرتے ہوئے ان کی کوٹھری تک پہنچ گئے۔ انہوں نے دروازے پر دستک دی۔ لیاہ کی کیتڑوں نے دروازہ کھول دیا۔ انہوں نے دیکھا، لیاہ منہ چھپائے بستر پر دراز ہے اور اس کے آس پاس اس کے چاروں بچے چپ چاپ بیٹھے ہیں۔ یعقوب نے در یافت کیا۔ ”تم لوگ محفل سے الگ تھک یہاں منہ چھپائے کیوں پڑے ہو؟ آخر عزیز رشتے داروں میں کیوں نہیں بیٹھتے؟“

لیاہ نے ترشی سے کہا۔ ”راحیل نے یہ محفل مجھے، میرے بچوں اور زلفہ کو جلانے کے لیے منعقد کیا ہے کیا تم بھی یہی چاہتے ہو کہ راحیل اور اس کی کیتڑوں بلہاہ کو خوش ہونے کا موقع فراہم کیا جائے؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”تیرے چار لڑکے ہیں اور اگر عورت کی برتری اور کمتری کا مرتبہ اس کی اولادوں ہی سے متعین ہوتا ہے تو تو ان دونوں پر اب بھی فوقیت رکھتی ہے، کیونکہ بلہاہ کے تو ابھی دو ہی لڑکے ہیں اور راحیل کے ایک بھی نہیں۔“

لیاہ نے بہت زیادہ تند و تیز لہجے میں کہا۔ ”اگر راحیل یہ سمجھتی ہے کہ میں اس طرح سے ہار مان لوں گی تو یہ اس کی نادانی ہوگی۔ میں چاہوں تو اب بھی اس کی اس معمولی سی فتح کو اس کی ہار میں بدل دوں۔ میرے رب نے مجھے بھی محفل دی ہے۔“

یعقوب نے کہا۔ ”اچھا تو تقریب میں تو چل، یہ باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”جب میں نے ایک بار یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اور زلفہ اپنے بچوں سمیت اس تقریب میں نہیں بیٹھیں گی تو اس میں شمولیت کے لیے کوئی ہمیں مجبور بھی نہیں کر سکتا۔“

یعقوب نے افسوس سے کہا۔ ”لیاہ! میں جبر سے بھی کام نہیں لے سکتا اور کسی کو اس کی مرضی کے خلاف کسی کام پر مجبور بھی نہیں کر سکتا لیکن میری دور بین نظریں ایک بات

لیا ہ نے اندر سے چیخ کر کہا۔ ”راجیل اتو اسی وقت یہاں سے چلی جا، ورنہ میں بری طرح پیش آؤں گی۔“
راجیل نے اپنی بہن کی دھمکی پر کوئی توجہ ہی نہ دی، اس نے اس کے مہمان عورتوں سے کہنے لگی۔ ”اے معزز عورتو! میں نے اپنی بڑی بہن لیاہ سے نہایت زور مار مار کر کشتی لڑی ہے اور تم سب دیکھ رہی ہو کہ آخر کار میں نے فتح پالی ہے۔ میں اپنے دوسرے بیٹے کا نام نکلتی رہ سکتی ہوں۔“

اندر لیاہ نے اپنی کینز زلفہ سے کہا۔ ”زلفہ! تو دیکھ رہی ہے کہ راجیل میرے ساتھ کس طرح پیش آرہی ہے۔“
زلفہ نے جواب دیا۔ ”اے میری آقا زادی! میں خوب دیکھ رہی ہوں، ہم سب کے رب کی مرضی یہی ہے کہ راجیل ہم پر ہنسے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔“
لیا ہ نے غصے سے کہا۔ ”لیکن میں یہ سب نہیں برداشت کر سکتی۔“

زلفہ نے کہا۔ ”آخر آپ کی بہن راجیل بھی تو ایک عرصے تک اس آگ میں جلتی رہی ہے۔“
لیا ہ نے اسے ڈانٹا۔ ”تو چپ رہ، اپنی زبان بند رکھ۔ کیا تو بھی راجیل اور بلہاہ سے مل گئی ہے؟“
زلفہ نے عاجزی سے جواب دیا۔ ”ایسی کوئی بات

”لیاہ! دروازہ کھول، میں تجھے لینے آئی ہوں۔ کیا تو ہماری خوشیوں میں نہیں شریک ہوگی؟“
لیا ہ نے اندر سے جواب دیا۔ ”راجیل اتو زیادہ نہ پریشان کر، کیا تو یہ چاہتی ہے کہ میں تیری اور بلہاہ کی موجودگی میں اپنے عزیزوں اور رشتے داروں میں شرمندگی اٹھاؤں؟“

راجیل نے ہنس کر کہا۔ ”نہیں، میں ایسا نہیں چاہتی بلکہ سارے رشتے دار تجھے اور تیرے بچوں کے لیے طرح طرح کے سوالات کر رہے ہیں اس لیے اس تقریب میں تیری شرکت ضروری ہے۔“
لیا ہ نے غصے میں جواب دیا۔ ”راجیل! تو چلی جا۔ میں نہیں آؤں گی، مجھے تنگ نہ کر۔“

راجیل نے ساتھ کی عورتوں سے کہا۔ ”دیکھاتم نے، میری بڑی بہن لیاہ حسد سے اندر بند ہے۔ جب اس کے کئے بعد دگرے چار بیٹے ہوئے تو وہ میرے ساتھ حسد سے پیش آئی اور میں پانچ چھ سال تک اس کے حسد کی آگ میں جلتی رہی۔ آخر میں نے یہ محسوس کر کے کہ میں خود پٹا نہیں دے سکتی تو میں نے اپنی کینز بلہاہ کو اپنے شوہر کے حوالے کر دیا اور اس سے میں نے دو بیٹے حاصل کر لیے۔“

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

موسم کی بدلتی دل رباوا میں
بارج کے شمارے کی منفرد کھتا میں

● **اولین سوغات**
خوب صورت جزیرے پر کھیلے جانے والے کھیل کے خطرناک
موز **محمی الدین نواب** کے قلم سے پراسرار سوز

● **انگاریے**
شریف آدمی کو بدعاش بننے پر مجبور کرنے والے قانون شکن عوام کی سیکھائی
جنم لینے والا ہولناک سلسلہ **طاہر جاوید مغل** کے قلم سے

● **آوارہ گرد**
چلچلاتی دھوپ میں بے آسرا تہنا مسافر کی آبلہ پانی۔۔۔
عبدالرب بسٹھی کی طبع آزمائی

● **بھلا رنگ**
سیروز کی کہانیاں
دو گرد پون کے سنسنی خیز ٹکراؤ سے جنم لینے والی کہانی
کے زاویے۔۔۔ **سلیم فاروقی** کا انداز نگارش

● **سوا رنگ**
ایسی مثلث جو برازیت جوڑ کے ساتھ اپنی جگہ مستحکم تھی۔
محمد فاروق انجم کا ٹیکھا سرورق



آپ کے تہرے...
مشاورے تجھیں...
اور نئی ڈھنگ سے باتیں... کھتا میں

نہیں اے میری آقا زوی! میں تو اس طرح آپ کو صبر و تحمل کی تلقین کر رہی ہوں۔“

لیاہ نے پوچھا۔ ”زلفہ! کیا تو میرا ساتھ دے گی؟“
زلفہ نے جواب دیا۔ ”بالکل ساتھ دوں گی اے میری آقا زوی!“

باہر راجیل اور دوسری مہمان عورتیں، لیاہ کی شرکت کی طرف سے مایوس ہو کر واپس جا رہی تھیں کہ یعقوب نے راجیل کو ڈانٹا۔ ”راجیل! تجھے لیاہ کو پریشان نہیں کرنا چاہیے۔“
راجیل نے کہا۔ ”پھر وہ میری خوشیوں میں شریک کیوں نہیں ہوتی؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”اچھا تو مہمانوں میں واپس جا، میں لیاہ، اس کے بچوں اور اس کی کینیز زلفہ کو اپنے ساتھ لے کر تیرے پاس آتا ہوں۔“
راجیل چلی گئی اور یعقوب کو طہری کا دروازہ کھلوا کے اندر داخل ہوئے۔

لیاہ نے کہا۔ ”آج مجھے راجیل نے بہت زیادہ شرمندہ کیا ہے۔ میری کینیز زلفہ اس بات کی گواہی دے گی۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم سب مل جل کر رہو اور حسد و رقابت سے توبہ کر لو۔“

لیاہ نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔ ”راجیل کہتی ہے کہ اس نے مجھ سے نہایت زور مار مار کر شتی لڑی ہے اور اس نے آخر کار مجھے پریشان پالی ہے۔ اب میں بھی اس سے اسی طرح زور مار مار کر شتی لڑتا چاہتی ہوں اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھوں گی جب تک کہ میں اسے شکست نہ دے دوں۔“

لیاہ کے چاروں بچے اپنی ماں کی آزرگی سے خود بھی آزرہ ہو رہے تھے۔

یعقوب نے کہا۔ ”ایک تو یہ طریقہ ہے کہ تم دونوں آپس کے اختلافات اور حسد دور کرو اور مل جل کر رہنے کی کوشش کرو اور اگر تم اس پر عمل کرنے سے قاصر ہو تو وہ دوسری تدبیر کیا ہے جس سے تمہاری آزرگی دور ہو سکتی ہے؟“

لیاہ نے زلفہ کو مخاطب کیا۔ ”زلفہ! ادھر آ میرے پاس۔“

زلفہ، لیاہ کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ اب لیاہ نے یعقوب کو مخاطب کیا۔ ”جس طرح میری بہن راجیل نے اپنی کینیز بلہاہ کو تیرے حوالے کر کے یہ جنگ جیتی ہے اسی طرح میں بھی اپنی کینیز زلفہ تیرے حوالے کرتی ہوں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرا رب کسی وجہ سے مجھ سے ناراض

ہو گیا ہے جس سے میں پانچواں بیٹا نہیں پیدا کر سکی۔ اب میں بھی اپنی کینیز زلفہ کے ذریعے پانچویں اولاد حاصل کروں گی۔ تو زلفہ کو یہی بتا اور اس سے اولاد پیدا کر۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”لیاہ! تو جیسا چاہتی ہے ویسا ہی ہوگا لیکن تو بیشمار رہ اور دل سے کدورتیں نکال دے۔“

لیاہ خوشی خوشی اٹھی اور یعقوب کے ساتھ راجیل کی ضیافت میں شریک ہوئی۔ اس کے چاروں لڑکے بھی اس کے ساتھ تھے اور اس کی کینیز زلفہ اس طرح یعقوب کے ساتھ کھڑی تھی جس طرح بیوی شوہر کے ساتھ کھڑی ہوتی ہے۔

راجیل کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ ایک دم اٹھی اور بھاگ کر یعقوب کے پاس آئی، پوچھا۔ ”یہ زلفہ تیری کون ہے؟ کیا میری بہن لیاہ نے اسے تیری دلہن بنا دیا ہے؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”ہاں، بالکل اسی طرح، جس طرح تو نے اپنی کینیز بلہاہ کو میری دلہن بنا دیا تھا۔“
راجیل نے اپنی بہن لیاہ کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”تو

تو میری اسی تدبیر سے میرا مقابلہ کرنا چاہتی ہے؟“
لیاہ نے جواب دیا۔ ”ہاں، لیکن یہ یاد رہے کہ پہلے تیری ہی طرف سے ہوئی تھی۔“

راجیل نے کہا۔ ”بہر حال کچھ بھی ہو، میں تو اپنے رب پر بھروسہ کروں گی، کیونکہ عزت اور ذلت اسی کی طرف سے ملتی ہے اور وہ اپنے بندوں کو مایوس نہیں کرتا۔“

☆☆☆

اگلے سال زلفہ سے بھی ایک لڑکا ہوا۔ لیاہ نے مارے خوشی کے نعرہ بلند کیا۔ ”بڑے قسمت!“

راجیل اور بلہاہ کو افسوس تو ہوا لیکن پہلے جیسا نہیں کیونکہ وہ دونوں اس مقابلے سے عاجز آ گئی تھیں۔ لیاہ نے اس لڑکے کو اپنے باپ لابن اور بھائیوں کی خدمت میں باری باری پھرایا اور عزیز رشتے داروں کو بلا کے مبارکبادیں وصول کیں۔ لیاہ نے اس کا نام جدر رکھا۔

دوسرے سال زلفہ سے ایک اور لڑکا پیدا ہوا۔ اب لیاہ کا خوشی سے برا حال ہو رہا تھا، اس نے کہا۔ ”آہ! میں کتنی خوش قسمت ہوں۔ عورتیں مجھے خوش قسمت کہیں گی۔“

لیاہ نے اس کا نام آشر رکھا۔ اس دوران لیاہ کے اپنے بیٹے بڑے ہو رہے تھے اور سب سے بڑا بیٹا رابن اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ کھیتوں میں جانے لگا تھا۔ راجیل اور بلہاہ نہایت صبر و شکر سے زندگی بسر کر رہی تھیں۔ اب پانسا پلٹ چکا تھا اور لیاہ جس انداز میں رہ رہی تھی اور اس نے جو روش اختیار کر رکھی تھی، اس سے ایک شانِ مکتنت جھلکتی تھی۔ وہ کسی

حق میں بہت بڑی خوشی کا باعث بن گئی کیونکہ اس شب کے عوض اسے پانچواں لڑکا عطا ہوا۔ اس لڑکے کا نام لیاہ نے اشکار رکھا۔ اس نے راحیل اور بلہاہ کو چڑانے کی خاطر یہ آواز بلند کہا۔ ”لوگو خدا نے میری اجرت عطا فرمادی۔ میں نے اپنے شوہر کو اپنی کیز زلفہ دے دی تھی۔ آج ایک عرصے بعد خدا نے مجھے پانچویں بیٹے سے سرفراز کیا جبکہ راحیل ابھی تک محروم ہے۔“

گو یار راحیل کو ایک بار پھر ذہنی کوفت کا سامنا کرنا پڑا لیکن اب اس نے صبر کو اپنا شعار بنا لیا تھا اور اپنی بڑی بہن سے لڑنا جھگڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور اپنے خدا سے کہا۔ ”اے میرے رب! میں نے تو یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تو مجھے جس حال میں بھی رکھے گا، خوش رہوں گی۔ میں اپنی قسمت اور قسمت کھنسنے والے سے نہیں لڑ سکتی۔“

بلہاہ کو سو گوار دیکھ کر اسے بھی تسلی دی، کہا۔ ”بلہاہ! تو اپنے دونوں بچوں میں تم ن رہ، تو کیوں اداس ہوتی ہے۔ میری طرح تو بھی صبر و شکر کو اپنا شعار بنا لے اور دیکھ کہ اس میں کتنا سکون ہے۔“

پانچویں بیٹے اشکار کے بعد لیاہ کے چھٹا بیٹا بھی پیدا ہو گیا۔ لیاہ نے اس کا نام زبولون رکھا۔ اس بار وہ بہت زیادہ اترائی۔ اس نے زور زور سے اعلان کیا۔ ”لوگو! کان کھول کر سن لو، میں اپنے تھلے بیٹے کو اپنے مہر کی جگہ بھرتی ہوں، جو خدا کی طرف سے مجھے عطا ہوا ہے۔ اب مجھے یہ حق خدا کی طرف سے مل چکا ہے کہ میں اپنے شوہر کو اپنے پاس ہی رکھ لوں۔“ پھر اس نے فخریہ کہا۔ ”لوگو! یہ کوئی مستمولی بات نہیں ہے کہ میں یعقوب کے چھ بیٹوں کی ماں ہوں۔“

ان تیز اور ترش باتوں سے تنگ آ کر بلہاہ نے اپنی آقا زادی راحیل سے کہا۔ ”اے میری آقا زادی! ہمارے مقابلے کی ددڑ میں لیاہ اتنا آگے نکل گئی ہے کہ اب یہ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی۔ اس نے ہم چاروں کے شوہر کو محض اپنا شوہر کہنا شروع کر دیا ہے۔ اس کے حسد اور غرور کو توڑنے کے لیے کوئی تدبیر سمجھیے، کوئی راہ نکالیے۔“

راحیل نے جواب دیا۔ ”اب تک میں نے جتنی تدبیریں کی ہیں ان سے میں نے کبھی کبھی ترقی حاصل کی ہے۔ شاید میرے رب کو میری یہ بات ناگوار گزرتی رہی ہو اس لیے اب میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ لیاہ جو کچھ کہتی یا کرتی ہے میں اس کا کوئی جواب نہ دوں اور اپنے رب پر تکیہ کیے رہوں کیونکہ میں خوب جانتی ہوں کہ میرا رب

کو خاطر ہی میں نہ لاتی تھی۔ وہ ہر ایک سے اس طرح پیش آتی گویا وہی گھر کی بڑی اور اہم شخصیت ہے۔

لیاہ کا بڑا بیٹا راہن گیارہوں کے کھیت میں گھسا ہوا مظلوم نہیں کیا کر رہا تھا کہ وہاں سے ایک خاص قسم کی گھاس مل گئی۔ اس گھاس کی شکل آدی سے ملتی جلتی ہے اس لیے اسے مردم گیاہ کہتے ہیں۔ راہن مردم گیاہ لے کر گھر میں جو داخل ہوا تو اس پر راحیل کی نظر پڑ گئی۔ وہ راہن سے تو کچھ بولی نہیں لیکن اپنی بڑی بہن لیاہ سے کہا۔ ”دیکھ، میں نے تجھ سے مفاہمت کر لی ہے اور اب میرا تیرا کوئی مقابلہ نہیں ہو رہا۔“

لیاہ نے چڑکے پوچھا۔ ”آخر تو کہنا کیا چاہتی ہے؟ اپنا مطلب بیان کر۔“

راحیل نے جواب دیا۔ ”تیرا بیٹا راہن مردم گیاہ لے کر آیا ہے، یہ مجھے بہت اچھے لگے، کیا تو ان میں سے چھ مجھے بھی دے دے گی؟“

لیاہ نے غصے میں جواب دیا۔ ”راحیل! اب تک تو میں خاموش تھی اور تو غصے دے دے کر مجھے چپ ہو رہے پر مجبور کیے ہوئے تھی لیکن اب میں خاموش نہیں رہوں گی۔ کیا یہ معمولی بات ہے کہ تو نے میرے شوہر پر پہلے ہی قبضہ جما رکھا ہے، اب تو میرے بیٹے کے مردم گیاہ سے بھی حصہ بٹرا کرنا چاہتی ہے۔“

راحیل نے کہا۔ ”میں نے پہلے ہی یہ کہہ دیا ہے کہ اب میں تجھ سے جھگڑنا نہیں چاہتی۔ میں یہاں تک مفاہمت پر آمادہ ہوں کہ اگر تو مردم گیاہ میں سے کچھ مجھے دے دے تو میں آج کی اپنی باری تجھے دے سکتی ہوں۔“

لیاہ نرم پڑ گئی، اس نے اپنے بیٹے کے لائے ہوئے مردم گیاہ میں سے کچھ راحیل کے حوالے کر دیا اور شام کو آتے ہوئے یعقوب کو راستے ہی میں روک لیا، بولی۔ ”آج تو میرے پاس رہے گا۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”یہ انصاف کے خلاف ہے، آج کی رات راحیل کی ہے اور میں عدل کے خلاف نہیں کر سکتا۔“

لیاہ نے پورا واقعہ سنا کے جواب دیا۔ ”میں نے راحیل سے تجھے آج کی رات مانگ لیا ہے اور اسے اس کی اجرت ادا کر دی ہے اس لیے اب انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ تو میرے ساتھ رہ۔“

تین دن کے بعد جب لیاہ کی بات کی تصدیق ہو گئی تو وہ لیاہ کے ساتھ چلے گئے۔ یعقوب کی یہ شب بسر لیاہ کے

خدمت گزاری آخر کس کے لیے گوارا کی؟ راحیل یہ کہتی ہے کہ تو اس کے حق میں بلاوجہ سا بھی بناوی گئی اور اب تو اپنے چھ بیٹوں کے زعم میں راحیل کو اپنے شوہر کا زبردستی کا حصے وار سمجھنے لگی ہے لیکن جہاں تک ہم سب کے رب کا معاملہ ہے، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کس نے کس کے ساتھ زیادتی کی اور اب کون کس کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔

لیاہ اپنے باپ سے بھی ناراض ہو گئی کہ وہ بھی راحیل کی طرف داری کر رہا ہے۔

☆☆☆

چھ بیٹوں کے بعد لیاہ سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لیاہ نے اس کا نام وینہ رکھا۔ بلہاہ نے اپنی آقا زادی راحیل کو یہ خوشخبری سنائی کہ شاید خدا لیاہ کی طرف سے منہ پھیر رہا ہے کیونکہ اس بار اسے بیٹی دے کر نال دیا گیا ہے۔

راحیل نے جواب دیا۔ ”بلہاہ! میں نے قسم کھالی ہے کہ اب میں اپنی بہن لیاہ سے نہیں الجھوں گی۔ میں نے اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا ہے۔ وہ لیاہ کو لڑکا دے یا لڑکی، میں اس سے حسد کروں گی نہ شامت۔ میں اپنے رب کے لیسلوں میں دخل دے کر گناہ گار کیوں ہوں۔“

لیاہ کے بھائیوں نے لیاہ کو متنبہ کیا۔ ”وہ کچھ تیری زیادتیوں نے خدا کو کچھ کچھ تجھ سے ناراض کر دیا ہے ورنہ وہ اس بار بھی تجھے پیٹا ہی دیتا۔“

لیاہ کے باپ لابن نے کہا۔ ”لیاہ! تو بھی میری بیٹی ہے اور راحیل بھی۔ میں کسی کی بے جا طرف داری نہیں کرتا لیکن اگر تو میری سچی بات سننا گوارا کرے تو میں یہی کہوں گا کہ خدا تجھ سے خوش نہیں ہے۔“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”اگر خدا مجھ سے خوش نہیں ہے تو پھر راحیل سے بھی وہ خوش نہیں ہے۔ اس نے مجھے ساتویں بار بیٹے کی جگہ بیٹی مرحمت فرمائی لیکن راحیل کو تو کچھ بھی نہیں دیا۔ اگر وہ مجھ سے ناخوش اور راحیل سے خوش ہے تو وہ راحیل کو اس کا پھل کیوں نہیں دیتا؟“

لابن کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا، وہ مزید کوئی بات کیے بغیر لیاہ کے پاس سے چلا گیا اور لیاہ خوشی سے پھولی نہ سائی کہ اس نے باپ کو لایا جواب کر دیا ہے۔

راحیل کی ادائیگی اور صبر کو جب ایک عرصہ گزر گیا تو خدا کو اس پر رحم آ گیا۔ پھر پورے خاندان میں ایک ایسی خبر گشت کرنے لگی جس کے سننے کی وہ امید تک نہ کر سکتے تھے۔ دایہ نے یہ حیرت انگیز خبر سنائی کہ راحیل کو اس کا پھل ملنے والا ہے اور کسی کو اس خبر پر یقین آیا ہو یا نہ آیا ہو لیکن لیاہ نے

مظلوموں کا ساتھی ہے۔ اگر میں حق پر نہیں ہوں تو مجھے میرا رب ہمیشہ مایوس رکھے گا لیکن اگر میں حق پر ہوں تو پھر میرا رب مجھے ہمیشہ مایوس بھی نہیں رکھے گا۔“

بلہاہ نے سوچا کہ یہ اس کی آقا زادی کو ہو کیا گیا ہے؟ یہ سرد کیوں پڑتی جا رہی ہے؟ اپنے چھ بیٹوں کو لے کر لیاہ جب راحیل کے سامنے سے اگڑتی ہوئی گزرتی تو وہ اپنی آنکھیں بند کر کے اپنے رب کو پکارتی کہ تو کہاں ہے؟ یعقوب نے لیاہ کو سمجھایا کہ دیکھ تو راحیل کو مت ستا، ورنہ اندیشہ ہے کہ خدا تجھ سے ناراض ہو جائے۔

لیاہ اور راحیل کے بھائی سمجھاتے۔ ”لیاہ! تو اپنی اولاد پر اتنی زیادہ نہ پھول، اپنے رب سے ڈر، جو مظلوموں کا ساتھی ہے اور بڑبڑیوں اور سرکشوں کا دشمن ہے۔“

اسی دوران میں ان کا باپ لابن بھی آ گیا اور اس نے اصل معاملے سے واقفیت حاصل کر کے لیاہ کو ڈانٹا۔ ”لیاہ! آخر تو یہ کیا کرتی ہے؟ اب راحیل نے خاموشی اختیار کر لی ہے اور خود کو صبر و تحمل کے حوالے کر دیا ہے۔ تو نے دیکھا کہ اس سے پہلے جب تو جھگڑتی تھی اور تجھ سے راحیل بھی بولتی تھی تو ہم سب خاموش رہتے تھے لیکن اب راحیل نے خاموشی اختیار کر لی ہے اور اپنا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا ہے تو اس کی طرف سے ہم سب یونے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ لیاہ اپنے رب سے ڈر کہ کہیں وہ تجھ سے ناراض ہو کر راحیل کا مددگار بن جائے۔“

لیاہ نے بگڑ کر جواب دیا۔ ”پاوا جان! میں کس طرح خاموش رہ سکتی ہوں۔ راحیل میرے شوہر کی جیسے وارین گئی مگر میں خاموش رہی، پھر میرے خدا نے مجھے چھ بیٹے دیے۔ کیا خدا یہ نہیں سمجھ رہا کہ کون کس کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے۔ اس نے کس خطا میں راحیل کو اس کے پھل سے محروم رکھا؟ آپ لوگ میری طرح کیوں نہیں سوچتے۔“

لیاہ کے باپ لابن نے کہا۔ ”میں نہیں کہہ سکتا کہ کس نے کس سے زیادتی کی، یہ سارا معاملہ تیرے سامنے کا ہے۔ تو خود ہی بتا کہ یعقوب نے پہلے سات سال جو میری خدمت گزار میں صرف کر دیے تھے تو وہ کس کی خاطر کیے تھے، کیا اس نے یہ خدمت راحیل کے لیے نہیں کی تھی لیکن میں نے زمانے کے دستور کے مطابق، یعقوب کو لایا رکھ کر اس سے تیری شادی کر دی جس پر یعقوب ناراض بھی ہوا، مجھے اس پر رحم آ گیا اور مزید سات سالہ خدمت گزار کی کا عہد لے کر دینے نے راحیل کی شادی بھی اس سے کر دی۔ اب تو ابی ایمان داری سے بتاؤ کہ یعقوب نے چودہ سالہ

کیا تو لیاہ، راحیل، ذلفہ، بلہاہ اور ان کی اولاد، سبھی کو کنعان لے جائے گا؟“

”ہاں، میں ان سب کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا، کیونکہ میں نے انہی کی خاطر آپ کی چودہ سال تک خدمت کی ہے اور آپ یہ بھی خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں نے آپ کی کیسی خدمت کی ہے۔“

لابن نے کسی قدر تامل سے جواب دیا۔ ”یعقوب! اگر تو پسند کرے تو ابھی کچھ اور رہ جا میرے پاس، کیونکہ میں ایک عرصے سے یہ بات محسوس کر رہا ہوں کہ تو بہت ہی بابرکت ہے۔ خدا نے تیری وجہ سے مجھے بھی برکت بخشی ہے۔ اگر تو اپنے دل میں یہ محسوس کرتا ہے کہ تیری نظر کرم میرے حال پر رہنی چاہیے تو میں تجھ سے درخواست کروں گا کہ تو یہیں رہ، اب میرے پاس کوئی بیٹی بھی نہیں ہے ورنہ میں وہ بھی تیرے حوالے کر دیتا لیکن پھر بھی میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تو مزید رہنا گوارا کرے گا تو میں اس کی اجرت ضرور دوں گا۔“

یعقوب نے پوچھا۔ ”اگر میں چند سال اور رہ جاؤں تو آپ اس کی کیا اجرت دیں گے؟“

لابن نے جواب دیا۔ ”اجرت تو ٹھہرائے گا، جو کچے گا میں دیا کروں گا۔“

یعقوب نے کہا۔ ”یہ تو آپ مانتے ہی ہیں کہ میرے آنے سے پہلے آپ کے پاس اتھوڑے سے جانور تھے لیکن اب یہ بہت ہو چکے ہیں لیکن اب چونکہ میں خود بھی ایک خاندان والا بن چکا ہوں اس لیے چاہتا ہوں کہ اپنے خاندان کے لیے بھی کچھ کروں۔“

لابن نے فراخ دلی سے اجازت دی۔ ”وہی تو میں تجھ سے پوچھتا ہوں کہ میں تجھے کیا دوں؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”اگر آپ میری تجویز مان لیں گے تو میں آپ کی مزید خدمت کے لیے تیار ہوں۔“

لابن نے سوالیہ نظروں سے یعقوب کو دیکھنا شروع کیا۔ یعقوب نے ذرا تامل کے بعد کہنا شروع کیا۔ ”میں آپ کے مویشیوں میں گھوم پھر کر اپنا معاوضہ الگ کر لوں گا۔ اگر آپ نے اس معاوضے کو پسند فرمایا تو میں آپ کی خدمت کروں گا، ورنہ پھر اپنے خاندان کو لے کر کنعان چلا جاؤں گا۔“

اس کے بعد یعقوب نے اپنے سر لابن کو ساتھ لیا اور مویشیوں کے گلے سے چٹلی و چکبری اور کالی بھیڑیں اور بکریاں الگ کر کے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ ”یہ میرے مویشی ہیں

دایہ کا غناق اڑایا۔“ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے جب خدا نے راحیل کی قسمت میں اس کا پھل لکھا ہی نہیں تو یہ صاحب اولاد کس طرح ہو جائے گی۔“

اپنی بڑی بہن لیاہ کی یہ بات جب راحیل نے سنی تو اس نے نہایت صبر و تحمل سے جواب دیا۔ ”میرا رب تو پتھر کی جوف تک میں جاندار اور اس کی غذا کا انتظام کر دیتا ہے پھر میں تو اس کی ایک بندی ہوں۔“

اور جب یہ بات دثوق سے معلوم ہو گئی کہ راحیل اپنا پھل پانے ہی والی ہے تو یعقوب، راحیل کے باپ لابن اور اس کے بھائیوں کو بڑی خوشی ہوئی اور انہوں نے کہا۔ ”خدا نے راحیل پر رحم کیا ہے اور اس نے اسے مسودہ ہونے کا صلہ عطا فرمایا۔“

راحیل سے ایک نہایت حسین بچہ پیدا ہوا، پورا گھر مسرت کدہ بن گیا۔ لیاہ نے جب اس حسین ترین بچے کو دیکھا تو حسد سے کہا۔ ”بچہ تو واقعی بہت خوب صورت ہے لیکن بات تو جب کی ہے، جب یہ بڑا ہو کر بھی حسین نکلے۔“

راحیل نے جواب دیا۔ ”لیاہ، بہن! میں یہ نہیں جانتی کہ میرا بچہ بڑا ہو کر کیسا نکلے گا، میں تو اپنے رب سے یہ دعا مانگتی ہوں کہ جس طرح تو نے اسے حسن و جمال کی دولت سے نوازا ہے، اسی طرح جب یہ بڑا ہو جائے تو اسے دولت کردار سے بھی نوازا دیجیو۔“

خاندان کی عورتوں نے راحیل کو مبارکبادیں پیش کیں تو اس نے ان سب سے کہا۔ ”میں تو اپنے رب کی اس لیے بہت زیادہ شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھ سے رسوائی دور کر دی۔“

راحیل نے اپنے اس حسین بچے کا نام یوسف رکھا۔ اب یعقوب کو لابن کی خدمت کرتے ہوئے چودہ سال پورے ہو چکے تھے۔ انہیں کنعان کی یاد بہت تازہ رہی تھی۔ جب راحیل کے بچے کی خوشی میں سارا خاندان ایک جگہ جمع ہوا تو یعقوب، راحیل کے باپ لابن کو تھلیے میں لے گئے اور کہا۔ ”جناب! اب مجھے رخصت کیجیے، میں اپنے وطن کنعان واپس جانا چاہتا ہوں۔“

لابن نے جواب دیا۔ ”تو شوق سے کنعان واپس جاؤ، میں نے تجھے روکا تو نہیں ہے۔“

یعقوب نے کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ میرے بیوی بچے، جن کی خاطر میں نے اب تک آپ کی خدمت کی ہے، میرے حوالے کر دیجیے۔ میں انہیں اپنے ساتھ کنعان لے جاؤں گا۔“

لابن نے ذرا تشویش سے کہا۔ ”تیرے بیوی بچے؟“

اور ان سے جو بچے پیدا ہوں گے، وہ میری اجرت ہوں گے ان کے علاوہ جو بچے ہوں گے وہ آپ کے ہوں گے۔“
 لابن نے وضاحت چاہی۔ ”ان کے وہی بچے جو انہی کی طرح چٹے، چمکیرے اور کالے ہوں گے، وہ تیرے ہوں گے باقی میرے۔“
 یعقوب نے تائید کی۔ ”پشنگ پشنگ، میں اس کی تائید کرتا ہوں۔“

یعقوب نے اسی دن سے اپنی خدمات سنبھال لیں اور وہ اپنے سسر لابن کی خدمت گزاری میں مشغول ہو گئے۔

☆☆☆

اس معاہدے کے بعد مویشیوں کے بیشتر بچے اسی رنگ میں پیدا ہونے لگے جو معاہدے کی رو سے یعقوب کے حصے میں جاتے تھے۔ چند سالوں میں یعقوب کی مالی حالت اتنی مضبوط ہو گئی کہ انہیں کسی چیز کی کمی نہ رہی۔ نوکر چاکر، مویشیوں کے ریوڑ غرض ہر چیز یعقوب کے پاس آ گئی۔
 اس آرام اور آسائش کے باوجود راحیل مطمئن نہیں تھی۔ خوش تو لیاہ بھی نہیں تھی لیکن اپنی ناخوشی کا اظہار بھی نہ ہونے دیتی تھی۔ راحیل نے لیاہ سے کہا۔ ”لیاہ! میں تجھ سے چند باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ تو ذرا خلوص کے ساتھ ان پر غور کر اور بتا کہ میں کئی پرہوں یا میرے بھائی وغیرہ۔“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”راحیل! تو میرے شوہر کی دوسری بیوی اور میری بہن ہے۔ ہم دونوں میں شدید اختلاف بھی رہا ہے لیکن اس کے باوجود میں تجھے خود سے بہت قریب محسوس کرتی ہوں، پول، تو مجھ سے کیا کہنا چاہتی ہے؟“
 راحیل نے کسی قدر پس و پیش سے کہا۔ ”کیا تو نے اپنے بھائیوں کی باتیں سنیں؟“

”کیسی باتیں؟“ لیاہ نے حیرانی سے پوچھا۔
 ”بھائیوں نے کیا باتیں کیں اور کس کے خلاف کیں؟“
 راحیل نے جواب دیا۔ ”آج وہ ہم دونوں کے شوہر کے خلاف کچھ باتیں کر رہے تھے۔“

لیاہ بھونچکارہ گئی، پوچھا۔ ”راحیل! تو مجھے سب کچھ صاف صاف بتا دے، مجھ سے کچھ چھپا نہیں۔“

راحیل نے جواب دیا۔ ”آج میرے بھائی ہم دونوں کے شوہر کے خلاف یہ کہہ رہے تھے کہ یعقوب نے ہمارے باپ کا سب کچھ لے لیا ہے اور اس کے سارے اثاثے اور اس کی پوری شان و شوکت ہمارے باپ کے مال کی بدولت ہے۔ تو جانتی ہے کہ ہمارے شوہر نے ہمارے باپ کی کتنی خدمت کی ہے، اس کی ان خدمات کے بعد

بھائیوں کا یہ کہنا بہت افسوس ناک ہے۔“
 لیاہ بھی فکر مند ہو گئی، پوچھا۔ ”پھر ہمیں کرنا کیا چاہیے؟“
 راحیل نے جواب دیا۔ ”اب ہم دونوں آپس کے اختلافات دور کرتے ہیں اور ان حالات میں ہمارا جو قدم بھی اٹھے گا، اتفاق رائے سے اٹھے گا۔“

لیاہ نے کہا۔ ”میں تیار ہوں۔“
 راحیل نے کہا۔ ”ہم دونوں یعقوب کو آمادہ کریں کہ وہ یہاں سے کٹھان واپس جائے، ہم بھی اس کے ساتھ ہی جائیں گے۔ بس یہی ایک فرار کی راہ رہ گئی ہے۔“

لیاہ نے پوچھا۔ ”یعقوب سے یہ بات تم کہو گی یا میں کہوں؟“
 راحیل نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں ہی لیکن الگ الگ وقتوں میں تاکہ یعقوب پر ہماری باتوں کا زیادہ اثر ہو۔“

یعقوب نے بھی اپنے سسر لابن اور لیاہ اور راحیل کے بھائیوں کی بدلی ہوئی نظریں محسوس کر لی تھیں۔ انہوں نے اپنے طور پر ہی دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ کٹھان واپس چلے جائیں گے۔

چودہ سالہ خدمت گزاری کے بعد چھ سال اور گزر گئے۔ اس طرح یعقوب نے اپنی بیویوں کے باپ لابن کی بیس سالہ خدمت کی۔

صبح طلوع آفتاب سے قبل یعقوب مویشیوں کو لے کر چراگاہ کی طرف چلے گئے۔ چند ساعتوں بعد یعقوب کا ایک غلام لیاہ اور راحیل کے پاس پہنچا اور کہا۔ ”تم دونوں کو یعقوب نے اپنے مویشیوں کے پاس بلا لیا ہے۔“

لیاہ اور راحیل ایک ساتھ یعقوب کے پاس پہنچ گئیں۔ یعقوب نے پوچھا۔ ”اس وقت تمہارا باپ لابن کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے؟“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”اپنی بھینڑوں میں گھسا ان کی ادن اتار رہا ہے۔“

یعقوب نے کہا۔ ”لیاہ اور راحیل! اس وقت میں تم سے ایک اہم مسئلہ پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

راحیل نے کہا۔ ”ہم تیار ہیں۔“
 یعقوب نے لیاہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لیاہ! یہ

مسئلہ لابن اور میری ذات سے تعلق رکھتا ہے، کیا تو اس پر آمادہ ہے کہ اپنے باپ کے بارے میں سچ حقیقتیں بھی برداشت کر لے؟“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں بہنیں ہر طرح آمادہ ہو کر آئی ہیں، تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہے آزادی سے کہو۔“

یعقوب نے دونوں کو باری باری دیکھا اور ان سے

جی ہاں اب بیٹیوں جگ بیٹیوں کے مثال مجموعہ



نمبر اپریل 2016

کی جھلکیاں

صاحبِ دل

برصغیر میں فردِ غ تعلیم کے لیے زندگی وقف کر دینے والی شخصیت کا زندگی نامہ

دلہا

فلمی دنیا کی پہلی سپر اسٹار کا تذکرہ، اس پر الزام تھا ہیرو کی جان لینے کا

دیوانی کرکٹ

کرکٹ کی دنیا میں انقلابی تبدیلیوں کا ذکر خاص کہ کس طرح کھیل تجارت میں بدلا

شہنشاہ سے دوستی

سیر پاکستان کے حوالے سے انتہائی دلچسپ تحریر

اس کی دلورہ

”سراب“ جیسی طویل سرگزشت اور چھوٹے بڑے بہت سارے تپے واقعات، دلچسپ تھے،

آنکھیں نم کر دینے والی سچے بیانیاں

بس ایک بار سرگزشت بر حقیقت پھر آت خود، اس کے بارے میں جاننے کے لیے

نظر میں ہٹا کر کہنا شروع کیا۔ ”لیاہ اور راحیل! تم دونوں جانتی ہو کہ میں نے تمہارے باپ کی کیسی خدمت کی ہے لیکن میں نے ہی نہیں، شاید تم دونوں نے بھی یہ محسوس کیا ہوگا کہ تمہارے باپ نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس نے بدرجہہ مجبوری چودہ سال کے بعد میری جو اجرت مقرر کی تھی، وہ اسے بہت پہلے دے دینی چاہیے تھی۔ اب میں نے اپنی چھ سالہ محنت اور خدمت کے عوض جو کچھ حاصل کیا ہے تمہارے باپ اور بھائیوں نے اس کے لیے آپس میں یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ میں نے انہیں لوٹ لیا ہے۔ میں ان سرگوشیوں اور چہ میگوئیوں سے تنگ تھا کہ رات خواب میں، میں نے دیکھا کہ میرا رب مجھے حکم دے رہا ہے کہ یعقوب! اپنی بیویاں، مویشی اور اپنا سب کچھ لے کر کشتان واپس جا۔“

انتا کہہ کر یعقوب نے سکوت اختیار کیا اور دونوں کے تاثرات جاننے کی کوشش کی۔

لیاہ نے پوچھا۔ ”تم مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہو؟“
یعقوب نے کہا۔ ”میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ تم دونوں مجھ سے کہاں تک متفق ہو؟“

لیاہ اور راحیل نے ایک ساتھ کہا۔ ”اب ہم دونوں کا اپنے باپ کے گھر میں کوئی حصہ یا میراث ہے بھی یا نہیں؟“
اور پھر روک کر بولیں۔ ”شاید کچھ بھی نہیں۔ ہمارے باپ کے پاس جو کچھ بھی ہے، بھائیوں کا ہے۔ ہم دونوں ہی ایک مدت سے یہ محسوس کر رہی ہیں کہ ہم اپنے ماں باپ کے گھر میں گویا دو اجنبی ہیں۔“

یعقوب نے خوش ہو کر کہا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ مجھے تم دونوں کو زیادہ سمجھانا نہیں پڑا۔“

لیاہ نے کہا۔ ”میرے باپ نے تو ہم دونوں بہنوں کو اپنی سات سات سالہ خدمات کے عوض تمہارے ہاتھ فروخت کر دیا تھا اور اجرت میں سے ہم دونوں کو کچھ بھی نہیں ملتا۔ اس لیے تمہارے پاس اب جو کچھ بھی ہے وہ ہمارا ہے، ہماری اولاد کا ہے۔“

یعقوب نے ان دونوں سے دریافت کیا۔ ”تب پھر میں اپنے خدا کے حکم کی تعمیل کروں؟“

لیاہ اور راحیل نے بیک آواز جواب دیا۔ ”ہاں، ہم دونوں تمہارے ساتھ ہیں۔“

یعقوب نے انہیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ”تب پھر، اوہرا آؤ، میرے ساتھ..... میں نے ساری تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔“

لیاہ سے کہا۔ ”لیاہ! کیا یہ نیا قافلہ تجھے اپنے باپ لابن کا نہیں محسوس ہو رہا؟ میں تو اپنے باپ کے ساتھ اپنے بھائیوں کو بھی دیکھ رہی ہوں۔“

لیاہ نے جواب دیا۔ ”میں نے تو ان کے شیخوں ہی سے پہچان لیا کہ یہ میرے باپ کے گھر کے خیمے ہیں۔“
ان دونوں کے ساتھ ان کی کنیزیں بھی کھڑی ہو گئیں۔ ان سب نے لابن اور ان کے ساتھیوں کو پہچان لیا تھا۔

یعقوب نے اصرار دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم دونوں کا باپ میرے ساتھ الجھنے آیا ہے؟ اگر ایسا ہے تب بھی میں خونزدہ نہیں کیونکہ میں نے اپنے رب کے علم سے یہ سفر شروع کیا تھا اور اس وقت بھی وہ میرا اور میرے ساتھیوں کا محافظ ہے۔“

یہ لوگ ان نئے آنے والوں کی طرف دیکھ ہی رہے تھے کہ انہوں نے لابن کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔
یعقوب نے چند قدم چل کر لابن کا استقبال کیا۔ اس نے ترجمانی نظروں سے یعقوب کو دیکھا اور نہایت درشت لہجے میں کہا۔ ”یعقوب! یہ تو نے کیا کیا کہ چوری سے چلا آیا؟“
یعقوب نے نرمی سے جواب دیا۔ ”کیا اس طرح میرا گھڑے باتیں کرنا مناسب ہے؟ میرے ساتھ میرے خیمے میں چلے تاکہ وہاں ہم دونوں نفسیاتی باتیں کر سکیں۔“

لابن نے کہا۔ ”چل اپنے خیمے میں چل۔ میں یہ باتیں ہر جگہ کرنے کو تیار ہوں۔“
دونوں ایک خیمے میں جا بیٹھے۔ ان کے آس پاس دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ لابن نے انہیں حکم دیا۔
”میری بیٹی لیاہ اور راحیل کے علاوہ ہر کوئی باہر چلا جائے۔“
اس حکم پر فوراً عمل کیا گیا۔

لابن نے اپنی بات پھر دہرائی۔ ”یہ تو نے کیا کیا کہ چوری سے چلا آیا؟ اگر تو فد ان ارم سے اتنا ہی اکتا گیا تھا اور تجھے اپنے آباؤ اجداد کی زمین اتنی ہی یاد آ رہی تھی تو تو ہنسا چلا آتا اور میری بیٹیوں کو وہیں چھوڑ آتا۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”لیاہ اور راحیل اب آپ کی بیٹی سے زیادہ میری بیٹیاں ہیں۔“
لابن اور زیادہ گرم ہو گیا، بولا۔ ”مجھے تو اس پر اعتراض ہے کہ تو ان دونوں کو اس طرح کیوں لایا گیا یہ تلوار کے تل پر اسیر کر لی گئی ہوں۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”میں انہیں اپنے ساتھ

وہ دونوں یعقوب کے ساتھ چراگاہ کے اس یاڑے میں داخل ہوئیں جہاں دھوپ کی تمازت سے بچانے کے لیے آسودہ مویشیوں کو کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ وہاں کا منظر بالکل اس قافلے جیسا تھا جس نے پڑاؤ کو چھوڑنے کی تیاریاں مکمل کر لی ہوں۔ یعقوب نے کہا۔ ”میں تمہارے باپ اور بھائیوں کو بتائے بغیر اسی وقت یہاں سے روانہ ہو جاتا چاہتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اگر انہیں میرے ارادے کا علم ہو گیا تو وہ رختہ ڈالیں گے اور میرے سامان میں سے معلوم نہیں کیا کچھ روک لیں اور نہ لے جانے دیں۔“

لیاہ اور راحیل نے کہا۔ ”ہم دونوں اپنے بچوں کو لے کر اسی وقت تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔“

چنانچہ اسی وقت ان دونوں نے اپنی اولاد، زلفہ، بلہاہ اور کنیزوں غلاموں کو ساتھ لیا اور یعقوب کے ساتھ ہی اپنے باپ کی سر زمین فد ان ارم کو چھوڑ دیا۔
لیاہ اور راحیل کے باپ لابن کو بھیڑوں کی اون کترنے میں تین دن لگ گئے۔ جب وہ گھر واپس آیا تو اسے یہاں کا نقشہ ہی عجیب دکھائی دیا۔ وہ تین کوس دور اس چراگاہ میں پہنچا جہاں یعقوب کے مویشی رہتے تھے تو وہاں اب خاک اڑ رہی تھی۔ اس نے کھان جانے والی راہ پر اپنا گھوڑا ڈال دیا تو آس پاس کے بستی والوں نے اسے بتایا کہ ہاں، ہم نے ایک ایسا قافلہ جنوب میں جاتے دیکھا ہے جس میں انسانوں سے زیادہ مویشی تھے۔

لابن نے واپس آ کے اپنے رشتے کے بھائیوں اور بیٹوں کو ساتھ لیا اور تیز رفتار گھوڑوں پر یعقوب کا تعاقب شروع کر دیا۔ لابن سخت مشتعل تھا اور اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ یعقوب کو کوئی سخت سزا دے گا۔

☆☆☆

یعقوب نے ساتویں منزل پر پہنچ کر، کوہ جلعاد پر ڈیرا ڈالا اور یہاں ڈیرا ہی دیر میں ایک چھوٹی سی بستی قائم ہو گئی۔
لابن ان کا پیچھا کرتا ہوا جب کوہ جلعاد کے نشیب میں پہنچا تو اس نے بلندی پر ایک ایسی بستی فروکش دیکھی، جس کے سامنے مویشی چلے، چکبرے اور کالے تھے تو اس نے پورے یقین سے یہ سمجھ لیا کہ یہ یعقوب ہی کا قافلہ ہے۔ وہ اپنے بیٹوں اور بھائیوں کے ساتھ کوہ جلعاد پر چڑھ گیا اور یعقوب کے خیموں کے مقابل ڈیرا قافلے پر اپنے خیمے نصب

راہیل نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی بہن

یعقوب نے تلخی سے پوچھا۔ ”میرے سامان میں سے آپ کو کوئی اپنی چیز ملی؟“

لابن نے جواب دیا۔ ”نہیں۔“

یعقوب کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”ابھی تک تو میں خاموش تھا لیکن اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آخر میرا وہ کیا قصور تھا جس کی وجہ سے آپ نے میرا پیچھا کیا، مجھ سے سچ کلامی کی اور میرے سامان کی تلاشی لی؟ اب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ نے میرے سامان میں سے اپنی کوئی چیز ڈھونڈ لگالی ہے؟ اگر ایسی کوئی چیز آپ کو ملی ہے تو اسے اپنے بیٹوں اور بھائیوں کے سامنے رکھیے تاکہ وہ انصاف کریں۔“ پھر افسوس ناک لہجے میں کہا۔ ”میں نے بیس سال تک آپ کی خدمت کی ہے اور آپ ہی کے بقول، میں آپ کے لیے بہت ہی بابرکت ثابت ہوا۔ میں نے گرمیوں میں گرمی اور سردیوں میں سردی جھیلی اور آپ کو نقصانات سے بچاتا رہا۔ کیا میری ان خدمات کا یہی صلہ ہے جو آپ دے رہے ہیں؟“

لابن نے جواب دیا۔ ”اچھا اب بس بھی کر۔ یہ جو کچھ بھی خیرے پاس نظر آ رہا ہے، سب میرا ہے لیکن اس کے باوجود میں تجھ سے ایک عہد کرنا چاہتا ہوں۔“

یعقوب نے پوچھا۔ ”کیسا عہد؟“

لابن نے جواب دیا۔ ”پہلے عہد کا پتھر تو کھڑا کر، پھر عہد کی تفصیل بھی بتا دوں گا۔“

یعقوب نے کوہِ جلعاد کا ایک پتھر لے کر اسے سیدھا سیدھا کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد دوسروں نے بھی بہت سارے پتھر اس کے گرد جمع کر دیے، پھر اس ڈھیری کے گرد بیٹھ کر سب نے کھانا کھایا۔

آخر میں لابن کھڑا ہو گیا اور اس نے یعقوب سے کہنا شروع کیا۔ ”یعقوب! یہ پتھر میرے اور تیرے درمیان اس عہد نامے کے گواہ رہیں گے جو ہم دونوں ایک دوسرے سے کر رہے ہیں۔“

یعقوب نے کہا۔ ”عہد نامے کے الفاظ دہرایئے تاکہ اس کی تفصیل معلوم ہو؟“

لابن نے کہا۔ ”یعقوب! ہم دونوں یہاں سے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے۔ جب ہم دونوں ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہوں گے، تو ہمارا خدا ہماری نگرانی کرے گا۔ یعقوب! تو قسم کھا کر یقین دلا کہ تو میری بیٹیوں کو دکھ نہیں دے گا اور ان کے علاوہ اب اور شادیاں نہیں کرے گا۔“

لانے کا حق رکھنے کے باوجود ان کی مرضی سے لایا ہوں۔ یہ دونوں آپ کے سامنے موجود ہیں، آپ ان سے معلوم کر سکتے ہیں۔“

لابن نے اپنی بیٹیوں کی طرف دیکھا بھی نہیں، کہا۔ ”میں تو اس پر برہم ہوں کہ تو چوری سے کیوں آیا؟ تو نے مجھے بتایا کیوں نہیں، اگر تو مجھے بتا دیتا تو میں ان دونوں کو تیرے ساتھ ڈھول اور بریل کی آوازوں کے ساتھ خوشی خوشی رخصت کرتا۔ تو نے مجھے اپنی بیٹیوں کو الوداعی پیار بھی نہیں کرنے دیا۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”مجھے اندیشہ تھا کہ.....“

لابن نے طیش میں کہا۔ ”اندیشہ وندیشہ کچھ نہیں، تو نے بہت غلط کام کیا۔ اب جبکہ میں نے تجھے پالیا ہے، میں اتنی قدرت رکھتا ہوں کہ تجھے نقصان پہنچاؤں لیکن میں کل رات سے خود کو مجبور محسوس کر رہا ہوں۔“

یعقوب نے پوچھا۔ ”وہ کیوں؟“

لابن نے جواب دیا۔ ”میں نے کل رات خواب میں دیکھا، خدا مجھے منع کر رہا ہے کہ میں تجھے کوئی دکھ نہ پہنچاؤں۔“

یعقوب نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور لیاہ اور راحیل کے چہروں پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

لابن نے مزید کہا۔ ”اگر تو میرے گھر سے چلا آیا تو خیر کوئی بات نہیں لیکن مجھے افسوس ہے کہ تو نے میرے بت کیوں چرائے؟“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”میرے چوری سے چلے آنے کا سبب یہ تھا کہ میں خوفزدہ تھا کہ کہیں آپ اپنی بیٹیوں کو مجھ سے چھین نہ لیں۔ رہا، توں کے چرانے کا معاملہ، تو مجھے اس بات کا کوئی علم نہیں۔ آپ تلاشی لے لیجئے، جس کے پاس سے آپ کے بت نکلیں گے اس کے لیے میری پیش گوئی یاد رکھیے کہ اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے۔“

لابن نے کہا۔ ”میں تمہارے سامان کی تلاشی لوں گا۔“

یعقوب نے جواب دیا۔ ”شوق سے..... اور میں آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ میرے سامان میں سے جو چیز بھی آپ کی نکلے، آپ اسے اپنے قبضے میں کیجیے۔“

لابن دیر تک یعقوب کے سامان کی تلاشی لیتا رہا اور اس میں سے ایک بھی چیز ایسی نہ نکال سکا جسے وہ اپنی

دیکھ بھال کے بعد راحیل کو مطلع کیا۔ "میری آقا زادی آپ پریشان نہ ہوں۔ خدا آپ کو دوسرے پھل سے بھی نواز رہا ہے اور یہ پھل بھی لڑکا ہی ہے۔"

اس غریب الوطنی میں لیاہ اپنی بہن کو بہت چاہنے لگی تھی، پوچھا۔ "راحیل اب تو کیسی ہے؟"

راحیل نے جواب دیا۔ "مجھے نہیں معلوم کہ جب میں اس درد سے نجات پاؤں گی تو میں ہوش میں بھی ہوں گی یا نہیں، اگر میں بے ہوش ہو جاؤں اور لڑکا پیدا ہو تو لیاہ! تم اس کا نام بن ڈینی رکھنا۔"

لیاہ نے روتے ہوئے جواب دیا۔ "بہت اچھا۔ ایسا ہی ہوگا تو فکر نہ کر۔"

راحیل نے دھندلائی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "میرا بیٹا یوسف کہاں ہے؟"

یعقوب نے یوسف کو راحیل کے روبرو کھڑا کر دیا۔ راحیل نے یوسف کو پے درپے کئی بوسے دیئے، پھر پوچھا۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟"

یعقوب نے جواب دیا۔ "اس جگہ سے قریب ہی بیت لحم ہے، ویسے اس جگہ کا کوئی نام نہیں۔"

راحیل کی تکلیف میں اضافہ ہو گیا۔ دایہ نے بڑی کوشش کی کہ راحیل اور اس کے نومولود کو بچالیا جائے

لیکن وہ راحیل کو بچانے میں ناکام اور نومولود کو بچانے میں کامیاب ہو گئی۔

لیاہ نے اپنی بہن کا خوب خوب ماتم کیا۔ بلہاہ زار دقتا روئی۔ یوسف کا دل پھٹنے لگا۔ یعقوب نے ماچشم نم لوگوں کو صبر کی تلقین کی۔

یعقوب نے بیت لحم سے ذرا قافلے پر راحیل کو زمین کے حوالے کر کے، اس پر ایک ستون کھڑا کر دیا۔ دریائے فرات ان کے سامنے بہ رہا تھا اور انہیں یہیں سے کھان کی خوشبو محسوس ہو رہی تھی اور ان کے تصور کی آنکھیں ماضی کے

ماہ و سال کے ایک درختے سے کھینچ کر عورتوں کے ہجوم میں راحیل کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھیں اور کھان کا غریب

الندیا رو رہے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑے بوسہ لے رہا تھا۔ دقت اور اتفاق کی یہ کتنی بڑی تم نظری تھی کہ پہلی ملاقات پر

بھی آنکھیں جھپک گئی تھیں اور دائمی رخصت نے بھی دونوں آنکھوں کو تر کر دیا تھا۔

یعقوب نے لاین کی خواہش کے مطابق قسم کھا کر عہد کیا۔ لاین نے مزید کہا۔ "اور میں عہد کرتا ہوں کہ اس ڈھیری کے دوسری طرف میں تجھے نقصان پہنچانے نہیں آؤں گا۔"

یعقوب نے کہا۔ "اور میں بھی آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ اس حد کے اس پار بھی آپ کو نقصان پہنچانے نہیں آؤں گا۔"

اس عہد و پیمان کے بعد یعقوب نے سب کو کھانا کھلایا۔ وہ رات ان سب نے پہاڑ پر ہی کاٹی۔ لاین

ٹی الصباح اٹھا اور اپنی بیٹیوں کو الوداعی بوسہ دیا اور دعا مانگ دیتا ہوا ندان ارم واپس چلا گیا۔

☆☆☆

لاین کے چلے جانے کے بعد لیاہ اور راحیل بہت اداس ہو گئیں۔ اس رات یعقوب نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ ایک نوری شعاع یعقوب کو مطلع کر رہی تھی۔

اس نے یعقوب سے پوچھا۔ "تیرا نام کیا ہے؟"

یعقوب نے جواب دیا۔ "یعقوب۔"

یعقوب کو مطلع کیا گیا۔ "لیکن اب تو یعقوب نہیں اب تو اسرائیل (خداوند ساتھ چلنا ہے یا خداوند قوت بخشا ہے) ہے۔ میں تجھے برومند کرتا ہوں، تجھ سے ایک قوم تو کیا

قوموں کے جتنے پیدا ہوں گے اور بادشاہ تیرے حلب سے ہوں گے۔"

جب یعقوب نے لیاہ اور راحیل کو اس بشارت سے مطلع کیا تو لیاہ تو بہت خوش ہوئی لیکن راحیل اداس ہی رہی۔

یعقوب نے پریشان ہو کر دریافت کیا۔ "کیا بات ہے راحیل! تو پریشان کیوں ہے اور تیرا منہ کیوں

بن رہا ہے؟"

راحیل نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کراہتے ہوئے پوچھا۔ "دریائے فرات کتنی دور ہے؟ کیا یہ مراب جیسا منظر

دریائے فرات ہی کا ہے؟"

یعقوب نے جواب دیا۔ "ہاں، یہ دریائے فرات ہمارے سامنے ہی بہ رہا ہے۔"

راحیل نے پوچھا۔ "ہماری دایہ کدھر ہے؟ اسے بلاؤ۔"

یعقوب نے کہا۔ "اب میں سمجھا۔"

اس کے بعد دایہ بلا لی گئی۔ اس نے خوب اچھی طرح

قرآن پاک. عهد نامہ قدیم و جدید. کتاب الہدی، یعقوب حسن الہدی، قرآن محمد جمیل احمد قصص القرآن مولانا حفظ الرحمن بیوہاردی.

قیمت

کاشف زبیر

قدرت کا نظام ہے تو بڑا پیچیدہ مگر... منصفانہ اصولوں پر رائج ہے... کبھی بیول کے بیج سے گلاب کا پودا نہیں پھوٹ سکتا۔ اپنی غرض میں اندھی ہو کر اس نے بھی جو کچھ حاصل کرنا چاہا اس کی وہی قیمت ادا کرنا تھی جس کا اس نے عہد کیا تھا... اب ادائیگی آسان ہو یا مشکل، کیے گئے عہد کا تو پاس بہر حال رکھنا تھا ورنہ اونچ نیچ کی صورت میں معافی کا کوئی امکان نہ تھا۔ منصفانہ اصول کے مطابق اس سے بھی وہی قیمت وصول کی گئی جس سے بچنے کی خاطر اس نے اپنی جان کی بھی پروا نہ کی مگر جان کی قیمت پھر بھی جان ہی رہی۔

سفاکانہ طرز عمل اختیار کرنے والی ایک خود غرض صنف نازک کا قصہ

Downloaded From
Paksociety.com

فاصلے پر واقع ہل اسٹیشن پر اپنے ہوٹل کے ساتھ بنے گھر میں رہتے تھے۔ عمیر کے نانا سول سرونٹ تھے اور صبا ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ کیونکہ اس کا ایک بڑا بھائی عین تو جوانی میں بیس سال کی عمر میں اچانک ہی مر گیا تھا۔ صبا اس سے پانچ

عمیر دو مہینے بعد گھر آیا تھا مگر اسے لگ رہا تھا جیسے وہ عرصے بعد گھر آیا ہو۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی وہ ابھی چھ سال کا تھا۔ یہی کلاس میں تھا اور مانی کے پاس ہی رہتا تھا۔ اس کے نانا باپ اور بڑے بہن بھائی دارالحکومت سے کچھ

گئی۔ ثانی شام سے بہت خوف زدہ اور پریشان تھیں۔ انہوں نے گھر کی تمام کھڑکیاں اور دروازے اندر سے بند کر لیے۔ عمیر ان سے بار بار پوچھ رہا تھا کہ ثانی کیا بات ہے مگر وہ جواب دینے کے بجائے اسے لے کر کمرے میں آگئیں۔ رات کا کھانا بھی انہوں نے کمرے میں کھایا۔ باہر گرج چمک کے ساتھ بارش جاری تھی۔ کھانے کے بعد عمیر بستر پر لیٹ گیا۔ ثانی اپنی کرسی پر بیٹھی تھیں۔ رات کسی وقت عمیر کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ ثانی کرسی پر سناکت بیٹھی ہیں۔ وہ بستر سے اتر اور ان کے پاس آ کر انہیں ہلایا تو اچانک ہی ان کے منہ سے تیز چیخ نکلی اور جسم یوں ہلنے لگا جیسے زلزلے کی زد میں آیا ہوا ہو۔ عمیر ڈر کر پیچھے ہٹا۔ اس نے کہا۔ ”نانو... آپ کو کیا ہوا؟“

مگر جب ثانی نے اس کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھیں بالکل سیاہ ہو رہی تھیں۔ عمیر ڈر کر بھاگا اور لاؤنج میں رکھا فون اٹھا کر صبا کو کال کی۔ اس کا نمبر اسپنڈ ڈائل میں تھا اور اس نے خاص طور سے عمیر کو سکھایا تھا کہ اگر کوئی مسئلہ ہو جائے تو وہ اسے کیسے کال کر سکتا ہے۔ صبا نے سوتے سے اٹھ کر کال ریسیو کی۔ وہ فکر مند ہو گئی۔ ”کیا ہوا عمیر؟“

وہ روتے ہوئے اسے ثانی کی طبیعت کی خرابی کا بتانے لگا۔ صبا نے اسی وقت اپنے کزن عبداللہ کو کال کی اور اسے گھر جانے کو کہا۔ عبداللہ، صبا کا چچا زاد بھائی تھا۔ وہ نزدیک ہی رہتا تھا اس لیے دن منٹ میں پہنچ گیا۔ اس وقت تک عمیر ڈر کے مارے گھر سے کی طرف نہیں گیا۔ کال بتل گئی تو اس نے جا کر دروازہ کھولا۔ عبداللہ کے ساتھ ڈاکٹر بھی تھا۔ اس نے اندر جا کر بے ہوش ثانی کو چیک کیا اور انہیں اسپتال لے جانے کو کہا۔ صبح کے قریب جب اسپتال میں ثانی کے مختلف ٹیسٹ ہو رہے تھے تو صبا اور عمیر بھی پہنچ گئے۔ ثانی ہوش میں آگئی تھیں مگر وہ یک ٹک سامنے دیکھے جا رہی تھیں۔ شو کسی کی بات کا جواب دے رہی تھیں اور نہ ہی کوئی دوسرا ڈاکٹر ظاہر ہوتا تھا۔ وہ تین دن اسپتال میں رہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے انہیں گھر لے جانے کی اجازت دے دی وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ کسی وجہ سے وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو گئی تھیں اور ان کی کیفیت نوزائیدہ بچے جیسی تھی جس کی ساری دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ انہوں نے تجویز دی کہ انہیں کسی ایسے ادارے میں داخل کر دیا جائے جہاں ذہنی طور پر مفلوج افراد کی دیکھ بھال ہوتی ہو۔ صبا اور عمیر انہیں ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے اس لیے انہوں نے انہیں ایک

سال چھوٹی اور اس وقت میٹرک میں تھی۔ اس نے گریجویٹیشن کے بعد ہوٹل مینجمنٹ کا کورس کیا اور اسی کورس کے دوران اس کی ملاقات سمیر سے ہوئی۔ جلد یہ ملاقات پسند میں بدل گئی اور عمیر کے نانا، ثانی نے اس رشتے کو پسند کر لیا کیونکہ سمیر اچھے خاندان کا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکا تھا۔ وہ ایم بی اے کر چکا تھا اور اب ہوٹل لائن میں آنے کے لیے یہ کورس کر رہا تھا۔ شادی سے پہلے وہ جا ب کر رہتا تھا مگر شادی کے بعد اس نے اور صبا نے مل کر اپنا ہوٹل کھولنے کا ارادہ کیا۔ کچھ رقم ان کے پاس تھی۔ ایل اسٹیشن پر ہوٹل قائم کیا۔ اس وقت صرف عمیر کا بڑا بھائی شامیر تھا۔

وہ شامیر کو نانا، ثانی کے پاس چھوڑ گئے۔ شامیر کے دو سال بعد سو نیا ہوئی عمیر سو نیا سے ڈھائی سال چھوٹا تھا۔ صبا کے تمام بچے بچپن میں نانا، ثانی کے پاس ہی رہتے تھے۔ البتہ جب عمیر ان کے پاس آیا تو اس کے نانا کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت وہ ڈھائی سال کا تھا۔ ان کا گھر زیادہ بڑا نہیں تھا مگر بہت خوب صورت اور سنبھلا ہوا تھا۔ مکان کے چاروں طرف کیماریوں میں پھول دار پودے اور پیلین گلی ہوئی تھیں۔ مکان جس گلی میں تھا، اس کے ساتھ ہی جنگل شروع ہو جاتا تھا مگر یہ قدرتی جنگل نہیں تھا بلکہ دارالحکومت کے مختلف سیکٹرز کے ساتھ لگائے جانے والے جنگلوں میں سے ایک تھا۔ عمیر اکثر اپنے مکان کی چھت سے اس جنگل کو دیکھتا تھا مگر اسے کبھی جنگل میں جانے کا موقع نہیں ملا کیونکہ ثانی جنگل میں جانے کی سخت مخالف تھیں۔

اگرچہ ثانی اس کا بہت خیال رکھتی تھیں اور اسے باہر بھی لے جاتیں۔ وہ ثانی سے اس قدر قریب تھا جب والدین نے اسے لے جانا چاہا تو اس نے صاف انکار کر دیا لہذا اسے یہیں ایک اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ مگر اب صبا اور سمیر اسے اپنے پاس لے جانا چاہتے تھے مگر وہ ثانی کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا تھا اس نے ثانی سے کہا۔ ”میں آپ کے پاس رہنا چاہتا ہوں، مجھے یہیں اسکول میں پڑھنے دیں۔“

”نہیں میری جان۔“ ثانی نے اسے پیار کیا۔ ”اب تمہیں جانا ہوگا۔“

”کیوں؟“ اس نے پاؤں پیچ کر پوچھا۔

”بس میرے بچے، اب وقت آ گیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے ثانی فکر مند نظر آنے لگیں۔ انہوں نے جیسے خود سے کہا۔ ”ہاں، اب وقت قریب آ رہا ہے۔“

موسم سرما کا آغاز ہو گیا تھا۔ خزاں رسیدہ پتے جھڑ رہے تھے۔ اچانک بادل گھر کر آئے اور تیز بارش شروع ہو

وقت وہ اسے اجنبی سا لگ رہا تھا۔ ثانی کی آنکھیں کھلی تھیں مگر وہ ایک تک چھت کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ عمیر نے نزدیک آکر ان کی آنکھوں میں دیکھا چاہا۔ اچانک ثانی نے سر گھما کر اسے دیکھا اور بولیں۔

”عمیر تو یہاں کیوں آیا ہے، یہاں سے چلا جا۔۔۔۔۔ وہ آنے والا ہے۔“

عمیر ایک لمحے کو ڈرا پھر اس نے ہمت کر کے پوچھا۔ ”کون تالو؟“

”عمیر۔“ باہر سے صبا کی آواز آئی تو ثانی نے سر سیدھا کر لیا اور چھت کی طرف دیکھنے لگیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے انہوں نے نہ تو اس کی طرف دیکھا ہو اور نہ ہی کوئی بات کی ہو۔ عمیر باہر آیا۔ وہ ماں کو بتانے کے لیے بے تاب تھا کہ ثانی نے ابھی اس سے بات کی ہے مگر صبا مصروف تھی۔ اس نے کہا۔

”تم کھانا کھا لو، ابھی مجھے بہت سے کام سنبانے ہیں۔“

”ماما تالو نے مجھ سے بات کی ہے۔“

شامیر ہنسا۔ ”تمہیں خواب آیا ہوگا۔“

”جانتے میں۔“ سونیا نے بھائی کی تائید کی۔ وہ دونوں ساتھ رہتے تھے اس لیے ان میں ذہنی ہم آہنگی تھی اور عمیر ان کے ساتھ اجنبیت محسوس کرتا تھا۔ وہ اس سے الگ انداز میں پیش آتے تھے۔

”عمیر پلیز! کھانا کھا لو۔“ صبا نے ٹھکے ٹھکے انداز میں کہا۔ صاف لگ رہا تھا کہ اس نے عمیر کی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ عمیر نے دیکھا کہ ماں اس کی بات سننے اور ماننے کو تیار نہیں ہے تو وہ کھانے کی میز پر چلا آیا جہاں شامیر اور سونیا موجود تھے۔ صبا نے ان کے لیے سینڈ وچز بنائے تھے۔ انہیں کھاتا چھوڑ کر صبا ماں کو کھانا کھلانے چلی گئی۔ عمیر نے بے دلی سے سینڈ وچز کھائے اور پھر ثانی کے کمرے میں آ گیا۔ صبا نے انہیں کھانا کھلا دیا تھا اور اب خود کھانے گئی تھی۔ عمیر کرسی گھسیٹ کر ثانی کے پاس بیٹھ گیا۔

شامیر اور سونیا بھی وہیں تھے اور وہ برابر میں دراز پر رہی ان کی دو انیاں اٹھ کر چپک کر رہے تھے اور آپس میں مذاق کرنے کے انداز میں بات کر رہے تھے کیونکہ وہ عرصے سے ثانی کے ساتھ نہیں رہے تھے اس لیے ان کے لیے وہ فکر اور محبت نہیں تھی جو عمیر میں تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ دونوں جلد از جلد یہاں سے چلے جائیں تاکہ وہ ثانی سے بات کرنے کی کوشش کرے۔ وہ تجسس تھا کہ ثانی کس کے بارے میں کہہ رہی تھیں کہ وہ آنے والا ہے۔ خدا خدا کر کے شامیر اور سونیا کمرے سے نکلے تو عمیر جلدی سے ثانی کے پاس آیا۔

ادارے میں داخل کر دیا جو ایسے معبر افراد کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں تربیت یافتہ عملہ تھا جو ہر طرح سے دیکھ بھال کر سکتا تھا۔ ماحول اچھا اور صاف سمرا تھا۔ اس لیے صبا نے یہاں کی بھاری فیس بھی گوارا کر لی۔ ان دنوں وہ ہوٹل کے توسیعی منصوبے پر کام کر رہے تھے اور اس کی تکمیل تک سیزن میں صبا کا دہاں رہنا ضروری تھا۔ وہ بچت کر رہے تھے اور زیادہ ملازمتیں نہیں رکھ سکتے تھے۔ اسکول سے آنے کے بعد شامیر بھی بہت سے کاموں میں صبا کا ہاتھ بٹانے لگا تھا۔

عمیر بھی ان کے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ صبا نے گھر بند کر دیا تھا۔ جب عمیر آخری بار سامان لینے آیا تو وہ در در رہا تھا۔ وہ بار بار ماں سے پوچھتا کہ تالو ٹھیک ہو جائیں گی۔ صبا سے تسلی دینی کہ جلد تالو ٹھیک ہو جائیں گی اور وہ ان کے ساتھ رہ سکے گا مگر صبا حقیقت جانتی تھی کہ ایسا شاید کبھی نہ ہو سکے کیونکہ ڈاکٹروں نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ ان کی ذہنی کیفیت شاید ان کے مرتے دم تک جاری رہے۔ عمیر کا یہ سال ضائع جاتا مگر صبا نے سوچ لیا تھا کہ وہ اسے خود پڑھانے کی اور اگلے سال اسے دوسری جماعت میں جانے کے قابل کر دے گی۔

سرمایہ میں جب شامیر اور سونیا کے اسکول تین مہینے کے لیے بند ہوتے اور ہوٹل کا بزنس بھی نہ ہونے کے برابر رہ جاتا تو صبا بچوں سمیت ماں کے پاس آ جاتی تھی۔ ان تین مہینوں میں گھر میں بہت رونق ہوتی تھی مگر اس بار جب وہ سردیوں میں گھر آئے تو سب کے ہوتے ہوئے بھی رونق نہیں تھی۔ صبا نے دو مہینے کے لیے ماں کو ادارے میں داخل کر لیا تھا۔ اس نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ جب وہ اور بچے یہاں آئیں گے تو وہ ماں کو گھر لے آئے گی۔

ادارے کے عملے نے اسے تمام احتیاطی تدابیر اور

دوا لیں بتا دی تھیں جو انہیں ہر روز اندہ کی بنیاد پر یا دورہ پڑنے کی صورت میں دینا ہوتی تھیں صبا نے فرسٹ ایڈ کورس کیا

ہوا تھا۔ ثانی کو ہمپیر باندھا جاتا تھا کیونکہ انہیں اپنا ہوش نہیں تھا۔ یہ ظاہر ہوش میں ہونے کے باوجود وہ ساکت پڑی رہتی تھیں۔ صبا ایسیو نرس میں ماں کو گھر لے کر آئی۔ دو مہینے سے بند ہونے کی وجہ سے گھر گرد سے اٹا ہوا تھا۔ صبا، ماں پر بچوں کی ڈیوٹی لگا کر خود صفائی کرنے میں لگ گئی۔ اس نے سب سے پہلے ماں کا کمر صاف کیا۔ انہیں ان کے صاف

سختی سے ہسٹریز لٹا کر صبا گھر کے دوسرے حصوں کی صفائی میں لگ گئی۔ عمیر ثانی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ غور سے ان کا

چہرہ دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ چہرہ بچپن سے دیکھتا آیا تھا مگر اس

آئی۔ یہ تین بیڈروم کا گھر تھا۔ اس میں سے ایک مستقل صبا کے لیے مخصوص تھا۔ وہ جب آئی تو یہیں رکتی تھی۔ تیسرا۔۔۔ بیڈروم بچوں کے استعمال میں آتا تھا۔ تین بیڈروم کے علاوہ اس میں ایک بڑی سی نشست گاہ تھی اور لاؤنج بھی جس کے ساتھ ہی کچن بھی تھا۔ شروع میں جب یہ گھر صبا کے والد کو الاٹ ہوا تھا تو اس میں صرف تین کمرے تھے اور وہ بھی پرانی طرز کے۔ پلاٹ سات مرلے کا تھا۔ اس کا بیشتر حصہ صحن پر مشتمل تھا۔ رفتہ رفتہ وہ اسے بڑھاتے گئے اور امان کی موت سے کچھ پہلے ہی یہ مکمل ہوا تھا۔ صبا اور اس سے پہلے امان اسی گھر میں پیدا ہوئے اور لپے بڑھے تھے۔ صبا کو امان کی موت کا دن یاد تھا جب ان کے گھر میں قیامت برپا تھی۔ جوان اولاد کی موت ماں باپ کے لیے قیامت ہی ہوتی ہے۔ صبا نے اس کے بعد اپنے باپ کو بہت ہی کم مسکراتے دیکھا تھا اور ایک دن امان کے غم میں وہ گھلتے گھلتے دنیا سے رخصت بھی ہو گئے۔

باپ کا خیال آیا تو صبا کا دل بوجھل ہو گیا۔ وہ اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ کچھ دیر بعد اسے شامیر اور سونیا کا خیال آیا۔ وہ باہر گئے تھے اور سردی کے دن چھوٹے اور جلد تارک ہو جانے والے تھے۔ وہ گیٹ تک آئی اور باہر جھانکا تو وہ اسے نظر نہیں آئے۔ وہ باہر جانے کا سوچ رہی تھی کہ اندر سے آنکھیں ملتا ہوا عمیر آیا۔ صبا نے اس سے پوچھا۔ "شامیر اور سونیا کہاں گئے ہیں؟"

"ماما، وہ جنگل میں گئے ہیں۔"

صبا پریشان ہو گئی۔ اگرچہ یہ روایتی خطرناک جنگل نہیں تھا مگر وہاں ویرانی تو تھی۔ عمیر کو گیٹ کے پاس رہنے کا کہہ کر وہ باہر آئی اور جنگل کے کنارے سے ہی انہیں آواز دی۔ "شامیر..... سونیا! کہاں ہو تم؟"

دوسری بار آواز دینے پر وہ اندر سے برآمد ہوئے۔ دونوں بہت خوش اور شوخ ہو رہے تھے۔ صبا نے انہیں ڈانٹا کہ وہ جنگل میں کیوں گئے تھے۔ وہ ماں کی ڈانٹ کو خاطر میں لائے بغیر ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے اس کے ساتھ چلے آئے۔ گھر آ کر صبا نے انہیں اور ڈانٹا تو عمیر نے کہا۔ "ماما! نانو جنگل میں جانے سے منع کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے کبھی جنگل میں جانے نہیں دیا۔"

"نانو کا چچہ۔" سونیا نے آہستہ سے کہا مگر عمیر نے سن لیا۔ اس نے ماں سے شکایت کی۔

"ماما! سونیا مجھے چچہ کہہ رہی ہے۔"

"سونیا! بری بات ہے۔ ایسا کسی کو نہیں کہتے اور یہ

"نانو! آپ کیا کہہ رہی تھیں؟"

مگر نانی ساکت رہیں۔ ان کی کھلی آنکھیں چھت پر مرکوز تھیں اور چہرہ سپاٹ تھا۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عمیر نے پھر پوچھا اور اس بار بھی جواب نہیں ملا تو وہ مایوس ہو کر واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد شامیر نے اندر جھانکا۔ "ہم باہر جا رہے ہیں، چلو گے؟"

عمیر نے ٹٹی میں سر ہلایا۔ "میں نہیں جا رہا، میں نانو کے پاس ہوں۔"

"کیا فائدہ۔" سونیا بھی آگئی۔ "ان کو پتا تھوڑی ہے کہ کوئی ان کے پاس ہے۔"

"ان کو پتا ہے۔" عمیر نے یقین سے کہا۔ "نانو نے مجھ سے بات کی ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ ہم یہاں کیوں آتے ہیں۔ وہ کسی کے بارے میں کہہ رہی تھیں کہ وہ آنے والا ہے۔"

شامیر اندر آیا۔ "تمہیں لگا ہوگا۔ نانو تو ہوش میں ہی نہیں ہیں، وہ بات کیسے کر سکتی ہیں؟"

"یہ تھوڑا رہا ہے۔" سونیا ہنسی۔

"میں جھوٹ نہیں کہہ رہا، نانو نے کہا تھا۔" اسے غصہ آ گیا۔

"اچھا، تم بیٹھو، ہم جا رہے ہیں۔"

سونیا بولی۔ "ہم جنگل میں بھی جائیں گے۔"

"نانو وہاں جانے سے منع کرتی ہیں۔" عمیر نے خبردار کیا۔ "وہ کہتی ہیں، وہاں کوئی بری چیز ہے۔"

"تم کبھی گئے ہو؟" سونیا نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"تب تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"نانو نے کہا تھا..... اور نانو غلط نہیں کہتی ہیں۔" عمیر کی بات پر وہ دونوں ہنسے اور پھر اس کا مذاق اڑاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ عمیر نے پہلے سوچا کہ ماں سے کہے لیکن پھر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ صبا مصروف تھی اور ایسے میں اسے چھیڑا جاتا تو اسے غصہ آ جاتا۔ اس لیے عمیر صبر کر کے رہ گیا۔

وہ بہت صبح سویرے اہل اسٹیشن سے روانہ ہوئے تھے اور جلدی اٹھنے کی وجہ سے عمیر ٹھکن اور نیند محسوس کر رہا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ کچھ دیر بعد صبا کمرے میں آئی تو اس نے عمیر کو سوتا پاتا کر محبت سے اسے دیکھا۔ اس نے جھٹک کر اسے چوما۔ "نانو کا دیوانہ۔"

صبا نے اسے گود میں اٹھایا اور اپنے کمرے میں لے

ریفریٹمنٹ دستیاب ہوتی۔ توسیع کا کام اس سرمایہ میں مکمل ہو جاتا۔ اب ان کے پاس اتنی گنجائش تھی کہ زیادہ اسٹاف رکھ سکتے تھے۔

اب تک صبا نے سمیر کا پورا ساتھ دیا تھا مگر بچے بڑے ہو رہے تھے اور ہل اسٹیشن کے آس پاس زیادہ اچھے اسکول نہیں تھے اس لیے اس نے سمیر سے کہہ دیا تھا کہ وہ اب دارالحکومت میں رہے گی اور بچوں کو یہیں اسکول میں داخل کرائے گی۔ ہل اسٹیشن ایک گھنٹے کی ڈرائیو پر تھا اس لیے وہ ہر ہفتے ہی ایک دوسرے کے پاس آ جا سکتے تھے۔ وہ یہیں رہتی تو ماں کی دیکھ بھال بھی خود کر سکتی تھی۔ درحقیقت اس کی یہاں منتقلی کے فیصلے میں ماں کی بیماری کا ہاتھ بھی تھا۔ وہ ماں سے بہت محبت کرتی تھی اور اس کی خدمت کرنا چاہتی تھی مگر نئی الحال انہوں نے بچوں کو یہ بات نہیں بتائی تھی۔ چھٹیاں ختم ہونے کے بعد اسے اس وقت تک کے لیے واپس جانا پڑتا جب تک بچوں کے بہم نہیں ہو جاتے اور اس دوران میں وہ ماں کو دوبارہ دیکھ بھال کرنے والے ادارے میں چھوڑ کر جاتی۔ بچوں کے بہم پرز کے بعد وہ مستقل یہاں آ سکتی تھی۔

صبا و رنگ دو مین تھی اور وہ سارے کام کر سکتی تھی۔ اس کے پاس چھوٹی کورے کاڑھی اور وہ خود ڈرائیو کرتی تھی۔ ہوٹل کے بہت سے کاموں کے ساتھ بچوں کو اسکول سے لانے لے جانے کا کام بھی وہی کرتی تھی۔ اس لیے اکیلے رہ کر گھر اور بچوں کی ذمے داریاں پوری کرنا اس کے لیے مسئلہ نہیں تھا۔ اس نے سمیر کو اطمینان دلایا تھا کہ وہ سب کرنے گی اور وہ اپنی ساری توجہ ہوٹل پر لگانے۔ ڈزنیار کر کے اس نے بچوں کو آواز دی تو وہ اوپر سے دوڑے آئے۔ سردی سے ان کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ شام ہوتے ہی درجہ حرارت بہت تیزی سے گرتا تھا۔ انہیں اندر لانے کے بعد صبا نے تمام کپڑے کیاں اور دروازے بند کر لیے تھے۔ اس نے حیرت سے کہا۔ ”تم اوپر گئے تھے اور وہ بھی اتنی سردی میں؟“

”ہاں ماما، شامیر ہمیں.....“ سونیا بتانے جا رہی تھی کہ شامیر نے اسے کئی ماری اور جلدی سے بولا۔

”ماما! میں انہیں از پورٹ پر اتارنے والے طیاروں کی روشنیاں دکھا رہا تھا۔“

”اب شام کے وقت باہر مت جانا۔ یہاں بھی بہت سردی ہوتی ہے۔“

”لیکن ماما وہاں جیسی تو نہیں ہوتی ہے اور اسنو بھی نہیں مگرتی۔“ سونیا نے شکوہ کیا۔ شامیر نے اسے اصل بات

آپ کا چھوٹا بھائی ہے۔“

”یہ میرا بھائی نہیں ہے۔“ سونیا نے چڑانے کے انداز میں کہا۔ ”میرا بھائی صرف شامیر بھائی ہے۔“

”سونیا.....“ صبا نے خبردار کرنے کے انداز میں کہا تو سونیا جلدی سے کان پکڑ کر مسکرانے لگی۔ اس کے چہرے پر ایسی معصومانہ شہزادگی تھی کہ صبا بھی مسکرانے لگی۔ ”نانی گرل۔“

صبا نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ سمیر اپنے بہن بھائی سے دور ہے اور وہ بھی اسے زیادہ لفت نہیں کراتے ہیں۔ اس لیے اس نے سمیر سے کہا۔ ”اب آپ نانو کے پاس نہیں جائیں گے، سونیا اور شامیر کے ساتھ کھلیں گے۔“

”ماما! اسے کھیلنا نہیں آتا ہے۔“

”مجھے لوڈو اور کیرم آتا ہے۔“ سمیر نے فخر سے کہا۔ ”میں نانو کے ساتھ کھیلتا تھا اور انہیں ہرا بھی دیتا تھا۔“

”وہ نانو ہیں۔“ شامیر نے اسے گھورا۔ ”مجھے ہرا کر دکھاؤ۔“

لاڈلج میں کیرم بورڈ موجود تھا۔ وہ بورڈ پر آگئے۔ شامیر بھی اچھا کھیلتا تھا مگر چھ سالہ سمیر زیادہ ذہر نکلا اور اس نے شامیر کو لگا ہار دو کیم ہرا دیے۔ وہ حیران رہ گیا۔ شامیر ہتھیلا یا تھا مگر سونیا نے سمیر کی سائڈ لی۔ ”یہ تم سے اچھا کھیلتا ہے اس لیے جیت گیا اس میں رونے کی کیا بات ہے۔“

”میں رو نہیں رہا ہوں۔“ شامیر غصے سے بولا۔

”تو اور کیسے روتے ہیں۔“ سونیا ہنسی اور پھر شامیر سے بچنے کے لیے ماں کے پاس بھاگی۔ شامیر اٹھا تھا مگر پھر بیٹھ گیا اور اس نے سمیر سے کہا۔

”تم کھیلتا جانتے ہو۔“

”میں اور بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔“ سمیر نے آہستہ سے کہا۔ ”یہ بتاؤ تم لوگوں نے جنگل میں کچھ دیکھا؟“

شامیر نے ماں کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ ”بتاتا ہوں لیکن یہاں نہیں۔“

صبا بچن میں ڈزنیار کر رہی تھی۔ وہ تھک گئی تھی مگر اس کا دل نہیں مان رہا تھا کہ اپنے بچوں کو دوسرے وقت بھی سیٹھ وچڑ کھلائے۔ وہ افتخانی پلاؤ بنا رہی تھی۔ ہوٹل میں یہ ڈش اور چند اور ڈشیں وہ خود تیار کرتی تھی۔ اب تک بیشتر کام وہ اور سمیر کرتے رہے تھے۔ سیزن کے پیک دنوں میں صبا نے لائڈری تک کی ہوئی تھی۔ اس محنت اور بچت کا صلہ انہیں یہ ملتا کہ ان کا بارہ کمروں والا ہوٹل توسیع کے بعد تیس کمروں کا ہو جاتا اور انہوں نے ڈائمنگ والا حصہ بھی بڑھا کر اسے باقاعدہ ریستوران کی صورت دے دی تھی۔ اب وہاں تینوں وقت کا کھانا اور صبح چھ سے رات بارہ بجے تک

بتانے سے روک دیا تھا۔ جب وہ جنگل میں گئے تھے تو وہاں انہوں نے ایک بہت پرانی اور ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی دیکھی تھی۔ اس میں بہت بوٹھی اور وہاں دیواروں پر عجیب عجیب کی چیزیں لگی ہوئی تھیں جیسے کپڑے کی بنی گڑیاں اور مٹی کے بنے ہوئے پتے، ہڈیاں اور پرندوں کے پر۔ وہاں ایک ڈھانچا ہو جانے والا سانپ بھی تھا۔ شامیر نے عمیر کو سب بتایا وہ بھی متحس تھا۔ شامیر نے اس سے اگلے دن وہاں چلنے کو کہا مگر عمیر راضی نہیں تھا۔ اسے اب بھی خیال تھا کہ نانی نے وہاں جانے سے منع کیا تھا۔ سونیا اور شامیر نے اسی وقت طے کر لیا تھا کہ ماما کو یہ بات نہیں بتانی ہے ورنہ ان کے باہر جانے پر بھی پابندی لگ سکتی تھی۔ عمیر نے ان سے کہا۔ ”نانو ٹھیک کہتی تھیں کہ جنگل میں کوئی بری چیز ہے۔“

”پانگل، وہ صرف ایک جھونپڑی ہے۔“ شامیر نے مذاق اڑانے کے انداز میں کہا۔

”وہاں کوئی نہیں تھا نہ اچھی چیز اور نہ بری چیز۔“ سونیا نے یقین سے کہا۔ ”مجھے بہت مزہ آیا، میں پھر جاؤں گی۔“

ڈنر کی میز پر وہ خاموش رہے۔ کھانے کے بعد صبا نے برتن سمیٹتے ہوئے ان سے کہا۔ ”آپ سونے کی تیاری کریں۔“

”ماما ابھی تو آٹھ بجے ہیں۔“ شامیر نے احتجاج کیا۔ ”آپ نے وعدہ کیا تھا کہ آپ ہمیں امان ماموں کی تصویریں دکھائیں گی۔“

”اوکے آپ سب چیخ کر کے برش کر دو اور بستر پر لیٹو میں الہم لے کر آتی ہوں۔“

وہ خوش ہو گئے اور کمرے کی طرف بھاگے۔ صبا نے ان کی لمبائی سیٹ کر دی تھی جس میں ان سب کے ٹائٹ سوٹ لگے ہوئے تھے انہوں نے کپڑے لگالے اور باری باری ہاتھ روم جا کر تبدیل کیے۔ برش کیا اور پھر بستر پر لیٹ کر ماں کا انتظار کرنے لگے۔ شامیر اور سونیا پر جوش ہو رہا تھا۔ البتہ عمیر سکون سے لیٹا ہوا تھا کیونکہ اس نے یہ الہم بہت بار دیکھے ہوئے تھے۔ شامیر اور سونیا چونکہ کم آتے تھے اور انہیں ایک دو بار ہی ان الہم کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ کچھ دیر بعد صبا اپنے لیے چائے کا گگ اور تین بڑے مالہز لے کر آگیا اور وہ تینوں ماں کے گرد جمع ہو گئے۔ صبا نے خبردار کہا۔ ”سکون سے دیکھنا میری چائے نہ گر جائے۔“

صبا نے پہلے الہم سے شروع کیا جب صرف امان تھا اور نانا نانی ان وقت جو ان تھے۔ پہلے الہم میں ان کی شادی

کی تصویریں بھی تھیں۔ ان تصویروں میں صرف وہی دونوں تھے۔ اچانک عمیر نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ ”ماما! نانو اور نانا کے پیچھے یہ کیا ہے؟“

صبا تیزی میں صحنے پلٹ رہی تھی اور پھر اس نے یہ تصویریں کئی بار کی دیکھی ہوئی تھیں اس لیے اس کا دھیان نہیں گیا تھا۔ اس نے رک کر دیکھا، یہ ان دنوں کی تصویر تھی جب امان پیدا ہونے والا تھا۔ تصویر میں نانی کے دائیں طرف ایک دھندلا سا سیاہی مائل جہولا تھا اور یوں لگ رہا تھا کوئی ان کے ساتھ کھڑا ہو۔ ظاہر ہے وہاں کوئی نہیں تھا اور یہ تصویر کی ڈیولپنگ میں آنے والی خرابی تھی یا شاید اتنے عرصے میں کاغذ خراب ہو گیا تھا۔ یہ کوئی چالیس سال پرانی تصویر تھی۔ اس نے عمیر سے کہا۔ ”کوئی نہیں کھڑا ہے بیٹا، تصویر میں دھبہ آ گیا ہے۔“

”ماما یہ پہلے یہاں نہیں تھا۔“ عمیر نے یقین سے کہا۔ ”میں نے دیکھا تھا۔ یہ ابھی آیا ہے۔“

صبا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کیا کہہ رہے ہو..... کون ابھی آیا ہے؟“

”یہ آدمی جو نانو کے پیچھے کھڑا ہے۔ یہ پہلے یہاں نہیں تھا۔“

شامیر اور سونیا ہنسنے لگے۔ صبا نے ایک بار پھر تصویر کو غور سے دیکھا اور اسے احساس ہوا کہ جہولا کچھ انسانی لگ رہا ہے مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ یہ یقیناً تصویر کی خرابی تھی۔ اس نے نرمی سے عمیر کو سمجھایا۔ ”تصویر بہت پرانی ہے اور اس میں دھبہ آ گیا ہے اب یہ اتفاق سے آدمی جیسا لگ رہا ہے۔“

عمیر ماں کی بات سے متفق نہیں تھا مگر اس نے پھر کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے تصویریں دیکھنے لگا۔ پھر امان کی تصویریں شروع ہوئیں۔ کچھ تصویروں میں وہ بچہ تھا۔ جیسے جیسے الہم آگے بڑھ رہا تھا، وہ بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ آخری تصویر اس کے انتقال سے دو دن پہلے کی تھی۔ وہ پڑھنے کے لیے باہر جانا چاہتا اور اس نے دو دن پہلے ہی ایک اسٹوڈیو میں خاص طور سے تیار ہو کر پاسپورٹ سائز تصویر بنوائی تھی۔ بعد میں ان لوگوں نے ان تصویر کو اٹلارج کرا کے اس الہم میں شامل کر لیا تھا۔ جیسے ہی تصویر سامنے آئی تو اس بار صبا بھی چونک گئی۔ امان کے عقب میں بھی وہی جہولا نما دھبہ تھا اور یہ بھی سیاہی مائل تھا۔ عمیر نے جوش سے کہا۔ ”ماما اوکھیں ماموں کے پیچھے بھی وہی آدمی ہے۔“

”یہ آدمی نہیں ہے۔“ اس بار صبا کا لہجہ تیز تھا۔ ”جہیں بتایا ہے کہ تصویر پر اس طرح کا اسپاٹ آ جاتا ہے۔“

مطلب ہے۔ آپ نے کل بھی مجھ سے بات کی تھی۔ میں نے ماما کو بتایا مگر انہوں نے یقین نہیں کیا۔ تالو! آپ کیوں بات نہیں کرتیں؟

”میں بات نہیں کر سکتی۔“ انہوں نے بے بسی سے کہا۔ ”میری زبان بند کر دی گئی ہے۔ عمیر میرے بچے یہاں سے چلے جاؤ۔“

”کیوں تالو؟“

”وہ پھر آ رہا ہے جان لینے کو۔“ تانی کو کہتے ہوئے جھٹکانگ اور وہ سراپہ کر کے تھمت کو گھورنے لگیں۔ عمیر انہیں بلانے لگا۔

”تالو! مجھ سے بات کریں۔ مجھے بتائیں کون آ رہا ہے؟“

اسی لمحے صبا نے کمرے میں جھانکا اور تیزی سے اندر آئی اس نے عمیر کو دکھا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”ماما! تالو بات کر رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کوئی آ رہا ہے اور ہم یہاں سے چلے جائیں۔۔۔۔۔“

صبا نے ماں کو دیکھا مگر ان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس نے عمیر سے کہا۔ ”بیٹا تالو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ ابھی بات نہیں کر سکتیں۔“

”مجھ سے بات کی ہے اور تالو ہمیں جانے کو کہہ رہی تھیں۔“ عمیر نے یقین دلانے کی کوشش کی مگر صبا نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے ساتھ واٹش روم میں لے آئی۔ اپنے سامنے۔۔۔ منہ ہاتھ دھلوا یا اور برش کر کے باہر جانے کو کہا مگر تانی کے کمرے میں جانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ واٹس اپنے کمرے میں آیا اور بستر میں کھس گیا۔ وہ کڑھ رہا تھا کہ ماما اس کی بات کیوں نہیں مان رہی ہیں۔ دو بار تالو نے اس سے بات کی اور دونوں بار ماما نے اس کی بات پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر وہ سوچنے لگا کہ تالو نے دونوں بار انہیں یہاں سے جانے کو کیوں کہا؟ کیا انہیں ان کا یہاں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ عمیر کا ننھا سا ذہن اس بارے میں زیادہ سوچ نہیں سکتا تھا مگر اسے لگ رہا تھا کہ کچھ انوکھی بات ہے جو صرف تالو جانتی ہیں اور دوسرا کوئی اس سے واقف نہیں ہے۔ وہ اس وقت تک لیٹا ہوا سوچتا رہا جب تک صبا نے کمرے میں جھانک کر سب سے اٹھنے اور ناشتے کے لیے تیار ہونے کو نہیں کہا۔ وہ اس دوران میں ماں کو صاف کر کے اور ان کو ناشتا کرا کے آچکی تھی۔

سونیا اور شامیر بھی اٹھ گئے اور کچھ دیر بعد سب

”لیکن ماما! یہ بالکل ویسا ہی ہے۔“ عمیر نے اصرار کیا تو صبا نے الیم بند کر دیا۔ وہ جھنجھلا رہی تھی اور خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شامیر اور سونیا نے عمیر کو گھورا۔ سونیا بولی۔

”تم منہ بند کر کے نہیں بیٹھ سکتے؟“

”اب کوئی نہیں بولے گا۔“ صبا نے دوبارہ الیم کھولتے ہوئے کہا۔ وہ تصویریں دکھانے لگی اور اس بار سب خاموش تھے۔ صبا انہیں تصویریں دکھاتی رہی اور ان کے بارے میں بتاتی رہی۔ عمیر اب یور ہو رہا تھا، وہ ذرا سرک کر لیٹا اور کسی وقت سو گیا۔ جب صبا نے آخری الیم بند کیا تو وہ گہری نیند میں تھا۔ سونیا کو اپنے بستر پر بھیج کر صبا نے عمیر کو سیدھا کیا اور پھر اسے پیار کیا۔ اسے ندامت ہو رہی تھی کہ اس نے عمیر پر غصہ کیا۔ شامیر شرارت سے بولا۔

”کیا بات ہے ماما، آپ کو اس پر زیادہ ہی پیار آ رہا ہے۔“

”کیونکہ یہ میرا بیٹا ہے اور مجھ سے اتنے عرصے دور رہا ہے۔“ صبا نے عمیر کو دوبارہ چوما۔ ”اب میں اسے خود سے دور نہیں کروں گی۔“

صبا باہر آئی اور اس نے ماں کے کمرے میں جھانکا۔ وہ خاصی دیر سے ایک کروتھ پر تھیں، اس نے انہیں دوسری کروتھ پر کیا۔ موسم سرد تھا اور امکان نہیں تھا کہ انہیں پینٹا آئے گا، اس کے باوجود انہیں ہر چند گھنٹے بعد کروتھ دلائی جاتی تھی۔ صبح عمیر کی آنکھ کھلی تو سب سو رہے تھے۔ وہ جلد اٹھ جانے کا عادی تھا اور سات بجے تک بستر سے نکل آتا تھا۔ اس نے ماں کے کمرے میں دیکھا صبا سو رہی تھی۔ پھر وہ تانی کے کمرے میں آیا۔ وہ جاگ گئی تھیں اور چھت کو دیکھ رہی تھیں۔ عمیر بستر پر چڑھ کر ان کے پاس بیٹھ گیا اور انہیں گل کی رووا دستانے لگا۔ اس نے شامیر اور سونیا کے بارے میں بھی بتایا کہ وہ جنگل میں گئے تھے۔ حالانکہ اس نے انہیں منع کیا تھا۔ پھر اس نے تصویروں کے بارے میں بتایا اور جب اس نے تصویروں میں نظر آنے والے پیدلوں کا ذکر کیا تو اچانک تانی نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا اور سرگوشی نما لہجے میں بولیں۔

”وہ آ گیا ہے، تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔“ وہ کہتے ہوئے رکیں اور پھر کھر کھرائی آواز میں کہا۔ ”یہاں سے چلے جاؤ، مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ۔“

”تالو! آپ بول رہی ہیں۔“ عمیر خوش ہو گیا۔

اسے پروا نہیں تھی کہ تانی نے کیا کہا ہے اور اس کا کیا

بستر کے پاس کھڑے ہو کر کہا۔
 ”نانو! گھر میں کوئی نہیں ہے۔ ماما شاپنگ پر گئی ہیں
 شامیر اور سونیا جنگل میں گئے ہیں۔ وہاں بری چیز ہے نا؟
 نانو پلیز مجھ سے بات کریں۔“

نانی ساکت رہیں۔ عمیر نے دوبارہ کہا اور جواب
 نہیں ملا تو وہ مایوس ہو کر باہر جانے لگا۔ اچانک عقب سے
 ہلکی سی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو نانی بستر پر بیٹھی ہوئی
 تھیں اور ان کا چہرہ عمیر کی طرف تھا۔ ان کی آنکھیں
 بالکل اسی طرح سیاہ ہو رہی تھیں جیسے دورہ پڑنے والی رات
 ہو گئی تھیں۔ وہ بولیں تو ان کی آواز چھٹی ہوئی اور کرخت
 تھی۔ ”میں آ گیا ہوں۔“

عمیر بے ساختہ باہر کی طرف بھاگا۔ وہ اتنا ڈرا ہوا تھا
 کہ چھوٹا گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔ اس کا سانس دھونکی کی
 طرح جھل رہا تھا اور دل بہت رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ اسے
 لگ رہا تھا کہ نانو بستر سے اٹھ کر اس کے پیچھے نہ آجائیں۔
 اسی لیے وہ بہت تیزی سے بھاگا۔ گیٹ پر کھڑے ہو کر وہ
 خوفزدہ نظروں سے مکان کے داخلی دروازے کی طرف دیکھ
 رہا تھا۔ اس کی ساری توجہ اسی طرف تھی اس لیے وہ شامیر
 اور سونیا کو آتے نہیں دیکھ سکا۔ شامیر وہ بے قدموں اس کے
 پاس آیا اور عمیر کے کان میں زور سے بولا۔ ”ہاؤ۔“

عمیر کی چیخ نکل گئی۔ اس موسم میں بھی اسے پسینا آیا
 ہوا تھا اور رنگت سفید ہو رہی تھی۔ اس کی صورت اور حالت
 دیکھ کر شامیر اور سونیا کو احساس ہوا کہ انہوں نے اسے زیادہ
 دی ڈرا دیا ہے اور اس ڈر سے وہ اس سے سوری کرنے لگے
 کہ کہیں وہ ماما کو ان کے جنگل میں جانے کا نہ بتا دے۔ عمیر
 ان کی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اندر آئے اور لاؤنج میں
 چلے گئے مگر عمیر صحن میں ہی رہا۔ اسے اندر جاتے ہوئے ڈر
 لگ رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ نانو کی آواز کیسے بدل گئی۔
 وہ نانو نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ ان سے محبت کرتا تھا اور اسے
 کبھی ان سے خوف محسوس نہیں ہوا تھا مگر آج وہ ایسا ڈرا تھا
 کہ اب تک خود پر قابو نہیں پاسکا تھا۔ شامیر اور سونیا کے
 ہوتے ہوئے بھی اسے اندر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا
 تھا۔ کچھ دیر بعد شامیر اندر سے فٹ بال لے آیا اور اسے بھی
 دعوت دی مگر عمیر کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔
 ”تم اسی جگہ گئے تھے؟“

”ہاں، آج ہم وہاں سے ایک چیز بھی لائے
 ہیں۔“ شامیر نے کہا اور نزدیک آتے ہوئے اپنی چٹلون کی
 جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چیز نکالی اور عمیر کے سامنے کی۔

ناشتے کی میز پر تھے۔ صبا نے ان کے سامنے ابے ہوئے
 انڈے، جام اور جینی لگے تو اس اور دودھ کے گلاس رکھے
 تھے۔ آج اسے سامان بھی لانا تھا۔ اس لیے وہ جلدی کر رہی
 تھی۔ اس نے خود برائے نام ناشا کیا۔ جیسے ہی بچے ناشتے
 سے فارغ ہوئے، صبا نے اپنی چادر اور گاڑی کی چابی
 اٹھائی۔ اس نے جانے سے پہلے ان تینوں سے کہا کہ وہ نہ
 باہر جائیں گے اور نہ ہی چھت پر جائیں گے اور نانی کا خیال
 رکھیں گے۔ اگر کوئی مسئلہ ہو تو فوری اس کے موبائل پر کال
 کریں گے۔ جیسے ہی صبا کی گاڑی باہر نکل۔۔۔ شامیر نے
 گیٹ بند کیا۔ اس نے عمیر سے کہا۔ ”جنگل چلو گے؟“
 عمیر نے انکار کیا۔ ”نہیں، گھر میں نانو کے پاس کوئی
 نہیں ہوگا۔“

”یہ ڈر پوک ہے۔“ سونیا نے اسے جڑانے والے
 انداز میں کہا۔ ”نانو نے اسے ڈرایا ہے کہ وہاں بری چیز ہے
 اس لیے یہ ڈر کر نہیں جا رہا۔“
 ”میں ڈرتا نہیں ہوں۔“ اس نے غصے سے
 کہا۔ ”مجھے نانو کا خیال ہے۔“
 ”ہم جا رہے ہیں۔“ شامیر نے کہا۔ ”لیکن تم ماما
 کو کچھ۔۔۔ نہیں بتاؤ گے۔“

عمیر جانتا تھا کہ جھوٹ یوننا اتنی ہی بری بات ہے جتنی
 کہ ماں باپ کا حکم نہ ماننا۔ اس نے ہچکچا کر کہا۔ ”اگر ماما نے
 پوچھ لیا تو؟“

”تب بھی تم نہیں کہو گے ورنہ ہم تمہیں اپنے ساتھ نہیں
 کھلائیں گے۔“ شامیر نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ وہ اور
 سونیا گیٹ کے چھوٹے دروازے سے باہر نکل گئے۔ انہیں
 معلوم تھا کہ ماں سودا لینے گئی ہے اور اسے آنے میں دیر لگے
 گی۔ عمیر دروازہ بند کر کے اندر آیا اور نانی کے کمرے میں
 جھانکا تو وہ ساکت لہنی تھیں۔ عمیر صبا کے کمرے میں آیا۔
 اس نے ڈریسنگ ٹیبل کی پٹیا وراڑ کھول کر اس میں رکھے اہم
 باہر نکالے اور وہ اہم کھولا جس میں بیولے والی تصویریں
 تھیں۔ اہم بھاری تھا اور اس سے سنبھالا نہیں جا رہا تھا اس
 لیے اس نے نیچے قالین پر رکھ کر اسے کھولا اور صفحے پلٹا ہوا
 نانی اور نانا کی اس تصویر تک آیا۔ تصویر والا صفحہ کھول کر وہ
 چند لمحے کے لیے اسے گھورتا رہ گیا۔ تصویر میں نظر آنے والا
 بیولا اب غائب تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے امان ماموں کی
 تصویر نکالی مگر اس میں بھی بیولا نہیں تھا۔ کاغذ بالکل صاف
 اور پہلے کی طرح چمک رہا تھا۔ اس نے اہم واپس وراڑ میں
 رکھے اور دروازہ بند کر کے نانی کے کمرے میں آیا۔ اس نے

آواز سن کر وہ روڑھے ہوئے باہر آئے۔ شامیر نے گیٹ کھولا اور گاڑی اندر آ کر رکی تو وہ تینوں ماں کے ساتھ مل کر سامان اٹھانے لگے۔ صابنکی ہوئی مگر خوش تھی۔ ہر عورت کی طرح اسے بھی شاپنگ کرنا اچھا لگتا تھا اور خاص طور سے اپنے گھر اور بچوں کے لیے۔ وہ بھی سامان اندر لارہی تھی اور ساتھ ہی ان سے پوچھ رہی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں وہ کیا کرتے رہے؟ شامیر اور سونیا نے ماں سے کہا کہ وہ گھر میں رہے اور کھیتے رہے۔ جب صابانے عمیر سے پوچھا تو ان دونوں نے اسے مٹنی خیز انداز میں دیکھا جیسے خبردار کر رہے ہوں کہ ماں سے مت کہنا۔ سونیا ایک شاپر لے کر اندر جا رہی تھی اور شامیر تھک کر لاؤنج کے صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا ہاتھ پتلون کی جیب میں تھا۔ اچانک سونیا نے چیخ ماری اور اس کے ہاتھ سے شاپر چھوٹ گیا۔ ساری چیزیں فرش پر بکھر گئیں۔ صابان کی طرف لگی۔

”کیا ہوا میری جان؟“

”ماما! میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔“

”کیسا درد اور کہاں ہو رہا ہے؟“

”یہاں۔“ سونیا نے ناف کی جگہ ہاتھ رکھا۔ شامیر

اور عمیر بھی اس کے پاس آن کھڑے ہوئے تھے عمیر نے ماں کو بتایا۔

”اسے کارٹون دیکھتے ہوئے بھی درد ہوا تھا۔“

”لگتا ہے تم نے کچھ الٹا سیدھا کھایا ہے۔ آؤ میں

تمہیں دوادوں۔“ صابانے اندر لے گئی اور ان سے سامان کچن میں رکھنے کو کہا۔ شامیر فکر مند تھا۔ اس نے عمیر سے کہا۔

”اب یہ ماما کو سب بتا دے گی۔“

”ماما سے چھپانا اچھی بات نہیں ہے۔“ عمیر نے کہا۔

پھر اسے خیال آیا کہ اس نے نانی کو کس حال میں دیکھا تھا

اور وہ سوچ میں پڑ گیا کہ ماما کو بتائے یا نہیں۔ اس نے نانی

کے حوالے سے انہیں پہلے بھی جو بتایا تھا انہوں نے اس پر

یقین نہیں کیا تھا۔ شامیر سامان کچن میں ترتیب سے رکھ رہا

تھا تو عمیر نانی کے کمرے کی طرف آیا۔ اس نے ڈرتے

ڈرتے اندر جھانکا۔ نانی حسب معمول بستر پر سیدھی لیٹی

ہوئی تھیں۔ ان کی کھلی آنکھیں چھت پر مرکوز تھیں لیکن اب

آنکھیں نارمل تھیں۔ عمیر بستر کے پاس آیا اور دروازے کی

طرف دیکھتے ہوئے اس نے جھک کر نانی سے کہا۔ ”پلیز

مجھ سے بات کریں، مجھے بہت ڈر لگا تھا۔ آپ کی آنکھیں

کالی ہو گئی تھیں۔ نانا! آپ کی آواز بھی بدل گئی تھی۔“

نانی کے سپاٹ چہرے پر کھٹکھٹ کے آثار نمودار

اس کی ہتھیلی پر ایک چھوٹا سا پتلا دکھا ہوا تھا اور اس پتلے کے پیٹ میں ایک چھوٹی سی سوئی بیست تھی۔ پتلا شاید آنے سے بنا تھا اور بہت پرانا تھا کیونکہ سوئی بری طرح زنگ آلود ہو رہی تھی اور اس کا پچھلا حصہ ٹوٹ بھی گیا اب معمولی سا حصہ باہر نکلا ہوا تھا۔ پتلا بہت گندا ہو رہا تھا اور شامیر اسے کوشش کے باوجود صاف نہیں کر سکا۔ عمیر کو نہ جانے کیوں اس سے خوف محسوس ہوا۔ شامیر نے اس کی طرف بڑھایا تو اس نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ شامیر نے ہاتھ واپس کر لیا۔ ”کیسا ہے؟ میں اسے اپنے پاس رکھوں گا۔“

”یہ گندے اسے پھینک دو۔“

”پائٹل! یہ ایک یونیک چیز ہے۔ میں واپس جا کر اپنے دوستوں کو دکھاؤں گا۔“

شامیر نے پتلا واپس جیب میں رکھ لیا اور اکیلے ہی

فٹ پال کھینچنے لگا۔ عمیر کو بیاس لگ رہی تھی اور پانی اندر کچن

میں تھا۔ وہ ہمت کر کے اندر آیا۔ سونیا وی آن کر کے

کارٹون بہت روک دیکھ رہی تھی۔ عمیر نے کولر سے پانی پیا

اور اس کے پاس آیا۔ اس نے سونیا سے پوچھا۔ ”تم بھی کچھ

لائی ہو؟“

”نہیں۔“ اس نے منہ بنا کر کہا۔ ”وہاں سب گندا

تھا۔ میں نے شامیر بھائی کو منع کیا تھا مگر انہوں نے اٹھا لیا۔“

”میں نے ان سے کہا وہ پھینک دیں مگر وہ نہیں مان

رہے۔“

”وہ مجھے ملا تھا۔“ سونیا نے انکشاف کیا۔ ”میں نے

اس کے پیٹ سے سوئی نکالنے کی کوشش کی تو وہ ٹوٹ

گئی۔ مجھے چیبی تھی، تھوڑا سا خون بھی نکلا تھا۔“ سونیا نے

اپنی انگلی آگے کی جس پر ہلکا سا سرخ نشان تھا۔ ”پھر

شامیر بھائی نے مجھ سے لے لیا۔“

عمیر کو کارٹون اچھے لگتے تھے۔ وہ سونیا کے ساتھ

کارٹون دیکھنے میں لگ گیا۔ اچانک سونیا صوفے سے اچھلی

اور اس نے اپنا پیٹ پکڑ لیا۔ عمیر نے اسے دیکھا۔ ”کیا

ہوا؟“

”میرے..... پیٹ میں تکلیف ہو رہی ہے۔“ وہ

کراہتے ہوئے بولی۔

”تمہارا پیٹ خراب ہے۔“

”میرا پیٹ ٹھیک ہے۔ عجیب سا درد ہے۔“ سونیا

نے کہا اور جا کر پانی پیا تو اسے سکون آیا۔ وہ پھر سے کارٹون

دیکھنے میں لگی اور کچھ دیر میں بھول گئی کہ اس کے پیٹ

میں تکلیف ہوئی تھی۔ صبا دوپہر تک واپس آئی۔ ہارن کی

”جانتیں، مانو نے مجھ سے بات کی تھی۔“

”احق، وہ ہوش میں نہیں ہیں۔“

”وہ ہوش میں ہیں۔“ عمیر نے دھیمی آواز میں کہا پھر اس نے شامیر کو بتایا کہ مانو نے بہت کوشش کے بعد اسے کیا کہا تھا۔

”سرخ سوٹ کیس۔“ شامیر نے پُر خیال انداز میں کہا۔ وہ جس اسکول میں پڑھتا تھا، وہاں معیارِ تعلیم زیادہ اچھا نہیں تھا مگر شامیر ماں باپ کے ساتھ ہوگے میں ہوتا تھا اور کم عمری میں اس نے بھانت بھانت کے لوگ اور ان کے رویے دیکھ لیے تھے اس لیے ساڑھے گیارہ سال کی عمر میں وہ اپنی عمر سے زیادہ عقل مند ہو گیا تھا۔ اس نے عمیر سے کہا۔ ”اگر یہاں کوئی سرخ سوٹ کیس ہو تو تمہاری بات سچ ہوگی درنہ تم کسی لمبی چوڑے رہے ہو۔“

نیچے کا پورا پورا مشن عمیر کا دیکھا بھالا تھا اور اسے ایک ایک چیز کا علم تھا۔ اس نے بھی یہاں کوئی سرخ سوٹ کیس نہیں دیکھا تھا۔ البتہ ادپری منزل پر ایک کمرہ تھا اور اس کے دروازے پر ہمیشہ تالا لگا رہتا تھا۔ عمیر بھی اس کمرے میں نہیں گیا تھا۔ نانی نے ہمیشہ اسے یہی بتایا کہ اس کمرے میں کاٹھ کھاڑ ڈالا جاتا ہے مگر عمیر نے بھی اس میں کاٹھ کھاڑ ڈالنے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے شامیر کو اس کمرے کے بارے میں بتایا۔ اس نے کہا۔ ”اگر سوٹ کیس ہے تو وہیں ہوگا۔“

”مگر اس پر تالا لگا ہوا ہے۔“

”احق، کھر کی چابھن میں اس کی چابی بھی ہوگی۔“ شامیر نے کہا۔ ”جب ماما سچ کے بعد ہمیں کمروں میں بھیج دیں گی، تب ہم چکے سے ادھر جائیں گے۔“

عمیر ڈر گیا۔ ”اگر ماما کو پتا چل گیا تو؟“

”تو کچھ نہیں۔“ شامیر کے لہجے میں بے پردائی تھی۔ ”ماما بس ڈانٹتی ہیں، مارتی نہیں ہیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ عمیر نے کہا۔ ”پر ڈانٹ سنا بھی تو اچھا نہیں ہے۔“

”ماما کو پتا نہیں چلے گا۔“ شامیر نے یقین سے کہا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے سچ کیا اور صبا نے انہیں اپنے کمرے میں جانے کو کہا۔ سونیا کو وہ اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ نانی کو دن میں دو بار کھانا دیا جاتا تھا کیونکہ وہ بستر پر لیٹی رہتی تھیں اور ان کا نظام ہضم زیادہ خوراک برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لیے ڈاکٹرز نے ان کی خوراک دن میں دو بار کر دی تھی۔ انہیں ایک انجکشن صبح شام دیا جاتا تھا اور دورہ پڑنے کی صورت میں انہیں ایک اور دو انجکشن دیا جاتا تھا۔

ہوئے جیسے وہ بولتا چاہ رہی ہوں مگر یوں نہیں پار رہی تھیں۔ کچھ دیر کوشش کرنے کے بعد وہ تھک گئیں اور تیز تیز سانس لینے لگیں۔ اس دوران میں عمیر مسلسل انہیں بولنے پر اکسارہا تھا۔ انہوں نے کسی قدر سرگھا کر عمیر کی طرف دیکھا اور زیر لب کچھ کہنے کی کوشش کرنے لگیں۔ عمیر نے کان قریب لے جا کر سننے کی کوشش کی۔ ان کی آواز بہت مدھم مدھی۔ وہ بہ مشکل اتنا سن سکا۔ ”سرخ سوٹ کیس۔“

”سرخ سوٹ کیس پتہ اس نے تصدیق کے لیے پوچھا مگر اس دوران میں نانی کا سر دوبارہ ادپر کی طرف ہو گیا تھا اور چہرہ ساٹ ہو چکا تھا۔ عمیر نے انہیں ہلایا۔ کوئی ردعمل نہیں ہوا۔ عمیر نے مایوسی سے انہیں دیکھا۔ ”نانو! آپ کو کیا ہوا ہے، پلیز جلدی سے ٹھیک ہو جائیں اور میرے ساتھ رہیں۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پلیز نانو پلیز۔“ عمیر روتے لگا۔ اسی وقت صبا ماں کے کمرے کی طرف آ رہی تھی اور کمرے کے دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے عمیر کو اس طرح روتے دیکھا تو اس کا دل بھر آیا اس نے عمیر کو بازوؤں میں لے لیا۔

”میری جان! نانو ٹھیک ہو جائیں گی۔ اب ہم یہاں آگئے ہیں۔ ہم سب مل کر ان کی دیکھ بھال کریں گے تو یہ ٹھیک ہو جائیں گی۔“

”ماما! نانو ٹھیک ہیں، ان کے ساتھ کچھ ہوا ہے۔“ عمیر نے معصومانہ انداز میں کہا۔ ”نانو نے ابھی مجھے کچھ بتانے کی کوشش کی تھی۔“

صبا نے اسے پیچھے کیا اور غور سے اسے دیکھا۔ ”عمیر کیا کہہ رہے ہو؟ نانو ہوش میں نہیں ہیں۔“

”ماما! وہ میری بات سنتی ہیں اور کبھی کبھی جواب بھی دیتی ہیں۔“ عمیر نے زور دے کر کہا۔ ”ابھی انہوں نے مجھے سرخ سوٹ کیس کہا ہے۔“

صبا چونگی۔ ”سرخ سوٹ کیس؟“

”ہاں ماما! نانو نے بہت کوشش کے بعد بتایا ہے۔“

صبا کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے عمیر کو گود میں اٹھایا اور کمرے سے باہر لے آئی۔ اس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ سونیا اب ٹھیک تھی اور لاؤنج میں اپنی گڑیوں کو لے کر بیٹھی ہوئی تھی۔ صبا نے عمیر کو بھی صوفے پر بٹھا دیا۔

”اب تم سب بٹھیں رہو گے جب تک میں سچ نہیں بتاؤں گی۔ کوئی باہر یا جھپٹ پر نہیں جائے گا۔“

شامیر نے آہستہ سے عمیر سے پوچھا۔ ”ماما نے نانو کے کمرے کا دروازہ کیوں بند کیا ہے؟“

دیکھ رہا تھا۔ ایک طرف چند پرانے سوٹ کیس رکھے تھے مگر ان میں کوئی سرخ رنگ کا نہیں تھا اور دوسرے یہ سب کھلے ہوئے اور خالی تھے۔ شامیر نے کہا۔ ”دیکھ لو یہاں کوئی سرخ سوٹ کیس نہیں ہے۔“

”تو نے کہا تھا..... پھر پتا نہیں وہ کہاں ہو گا؟“ عمیر نے مایوسی سے کہا..... مگر وہ تلاش کر رہا تھا۔ ایک طرف کچھ پرانے قالین تھے اور ان پر مٹی سی جم گئی تھی مگر قالین اس طرح اوپر اٹھے ہوئے تھے جیسے ان کے نیچے کچھ ہو۔ عمیر نے انہیں ہٹانا چاہا مگر یہ خاصے وزنی تھے اور چھ سالہ بچے کے بس کا روگ نہیں تھے۔ اس نے شامیر سے کہا۔ ”میرے ساتھ انہیں اٹھاؤ۔“

شامیر آگے آیا اور اس نے عمیر کے ساتھ مل کر قالین اوپر کیے۔ عمیر نے نیچے جھانکا تو اسے ایک چھوٹا سوٹ کیس نظر آیا۔ اس نے شامیر سے قالین پکڑے رہنے کو کہا اور خود سوٹ کیس باہر کھینچنے لگا۔ نیم تاریکی میں اس کا رنگ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کسی نہ کسی طرح اس نے ٹیلا ساسوٹ کیس باہر کھینچ لیا اور شامیر نے قالین چھوڑا تو وہاں گرد و غبار کا ایک بادل سا اٹھا جو سانس کے راستے ان کے حلق میں گیا اور وہ کھانسنے لگے۔ عمیر نے سوٹ کیس اٹھایا۔ یہ وزنی نہیں تھا مگر ان میں کچھ تھا۔ شامیر نے سوٹ کیس عمیر سے لے لیا۔ اس نے سوٹ کیس کو جھانکا تو اس پر موجود گرد ہٹ گئی اور نیچے سے اس کا سرخ رنگ جھلکنے لگا۔ عمیر نے جوش سے کہا۔ ”وہی ہے۔“

شامیر اور عمیر سوٹ کیس باہر لائے۔ یہ کھلنے سے بند ہونے والا سوٹ کیس تھا مگر لاک نہیں تھا۔ شامیر نے کھلکا ہٹا کر اسے کھولا اور دونوں نے بیک وقت اندر جھانک کر دیکھا تو اس میں ایک گڑیا اور اس کے نیچے کسی بیگی کی بہت پرانی فیراک تھی۔ گڑیا بھی پرانے انداز کی اور پکڑے سے بنی ہوئی تھی۔ گڑیا اور فیراک دونوں کا رنگ خراب ہو چکا تھا۔ عمیر نے گڑیا اٹھائی اور شامیر نے فیراک تو ان کے نیچے سے سیاہ جلد والی ایک چھوٹی سی ڈائری نکل آئی۔ اچانک نیچے سے صبا کی آواز آئی۔ ”شامیر اور عمیر..... تم لوگ کہاں ہو؟“

انہوں نے جلدی سے دونوں چیزیں واپس سوٹ کیس میں ڈالیں اور شامیر نے اسے بند کر کے جلدی سے کمرے میں رکھ دیا۔ اس نے دروازہ بند کر کے اس میں تالا لگایا۔ عجلت میں اس نے ٹیل والی بیگی بھی اندر کمرے میں چھوڑ دی تھی۔ ادھر وہ تالا لگا کر وسط میں کھڑے عمیر کے پاس آیا اور ادھر نیچے سیزجیوں سے صبا نمودار ہوئی۔ اس

ادارے والوں کا کہنا تھا کہ انہیں جتنے بھی ایک ہار دورہ پڑتا تھا۔ صبا نے دونوں دوائیں کمرے میں رکھی تھیں تاکہ دورہ پڑنے کی صورت میں فوری دی جا سکیں۔ جب صبا سونیا کو لے کر اپنے کمرے میں گئی تو شامیر اور عمیر دبے قدموں کمرے سے باہر آئے۔ انہوں نے لادڑج میں لٹکے کی ہولڈر سے چابیوں کا گچھا اتارا اور اسی طرح دبے قدموں سیزجیوں سے اوپر آئے۔ شامیر نے عمیر سے کہا۔

”چھت پر زور سے مت چلنا، مانا کو پتا چل جائے گا۔“ شامیر کی ہدایت کے مطابق وہ دبے قدموں سیزجیوں سے مخالف آخری حصے میں واقع کمرے تک آئے۔ یہ خاصا پرانا سا کمرہ تھا اور کیونکہ اسے اسٹور کے طور پر بنایا گیا تھا اس لیے اس کا دروازہ لوہے کا تھا۔ اس پر ایک پرانا رنگ آلود تالا لگا ہوا تھا۔ شامیر چابیوں میں سے اس کی چابی تلاش کرنے لگا اور پھر اس نے ایک چابی لگائی۔ یہ واحد چابی تھی جو تالے میں فٹ آئی مگر تالا نہ جانے کب سے بند تھا۔ کھل ہی نہیں رہا تھا۔ شامیر نے عمیر کو گچھا دیا۔ ”تم رکو، میں نیچے سے آکل لاتا ہوں۔ اس میں آکل ڈالیں گے تو یہ کھل جائے گا۔“

شامیر نیچے سے جا کر مشین آکل کی ٹیپی لے آیا اور اس نے چند قطرے تالے کے سوراخ میں ڈالے پھر چابی لگا کر اسے بار بار کھمانے لگا۔ اس کی ترکیب نے کام کیا اور تالا کھل گیا۔ وہ دونوں خوش ہو گئے لیکن جب رنگ آلود دروازہ کھلا اور اندر تازگی نظر آئی تو عمیر ہم گیا۔ اسے لگا کہ اندر تاریکی میں کوئی ہے مگر شامیر نے بے فکری سے پورا دروازہ کھول دیا اور وہ اندر داخل ہو گئے۔ باہر تیز دھوپ سے اندر سائے میں آئے تو چند لمحوں کے لیے انہیں کچھ نظر نہیں آیا اور پھر عمیر کی نظر ایک کونے میں کھڑے آوی پر گئی تو اس نے چیخ مار کر شامیر کا بازو پکڑ لیا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”وہ آدی.....“ عمیر نے اشارہ کیا۔ شامیر نے دیکھا مگر ڈر نہیں۔ وہ آگے بڑھا اور ہنس کر بولا۔ ”اتحق، تانا جان کا اور کوٹ ہے۔“

اب عمیر کو بھی نظر آنے لگا تھا۔ وہ جھینپ گیا۔ ”ہاں یہ تو تانا ابو کا اور کوٹ ہے۔“ شامیر اب وہاں دوسرا سامان دیکھ رہا تھا اور چیزیں ادھر ادھر کر رہا تھا۔ اس کی توجہ سرخ سوٹ کیس کے بجائے دوسری چیزوں پر زیادہ تھی۔ سرخ سوٹ کیس وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ بہت کم روشنی اندر آ رہی تھی۔ عمیر سوٹ کیس

چلانے کی آواز آئی۔ صبا اس سے پوچھ رہی تھی کہ اسے کیا ہوا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اس کے پیٹ میں پھر تکلیف ہو رہی ہے۔ صبا پریشان ہو کر باہر آئی تو شامیر نے جلدی سے پتلا دو صوفوں کے درمیان خلا میں ڈال دیا کہ ماں اس کے ہاتھ میں نہ دیکھے۔ اگر صبا دیکھ لیتی تو وہ لازمی اس سے سوالات کرتی اور پھر وہ اس سے اصل بات اگلا کر ہی رہتی۔ وہ فریج سے دوا کی شیشی لینے آئی تھی۔ سونیا اب خاموش تھی اور جب صبا دوا لے کر گئی تو اس نے کہا کہ اس کی تکلیف اب ختم ہو گئی ہے۔ اس کے باوجود صبا نے اسے پیٹ روکا میرپ پلا دیا۔ عمیر یہ سب غور سے دیکھ رہا تھا۔ ماں کے جانے کے بعد شامیر نے صوفوں کے درمیان سے پتلا نکالنے کی کوشش کی اور ناکام ہونے کے بعد اس نے ارادہ ملتوی کر دیا اور صحن کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھاگتا ہوا آیا اور اس نے سنسنی خیز لہجے میں اطلاع دی۔

”باول آرہے ہیں، بارش ہوگی۔“

شامیر کو بارش پسند تھی اور وہ نہانا پسند کرتا تھا مگر یہ سرما کی بارش تھی۔ اسے نہانے کی اجازت نہیں ملتی۔ اس کے باوجود وہ خوش تھا۔ موسم تاریک ہوا تو صبا باہر آئی۔ اس نے باہر جھانکا اور کھڑکیاں دروازے بند کرنے لگی۔ شامیر نے التجائی۔ ”ماما! کیا میں برا آمدے میں جا سکتا ہوں؟“

”نہیں، آج سردی بہت ہے اور بارش کے بعد مزید ٹھنڈ ہو جائے گی۔ تم باہر نہ رہو تو بیمار پڑ سکتے ہو۔ میں پہلے ہی سونیا کی وجہ سے پریشان ہوں۔“

شامیر کا منہ نلک گیا۔ عمیر نے اسے تسلی دی۔ ”تم کھڑکی سے دیکھ سکتے ہو۔“

”ہاں لیکن میں اسے محسوس تو نہیں کر سکتا۔“ وہ جھنجھلایا۔

عمیر صبح سے ایک دو بار ہی نانی کے کمرے میں گیا تھا اسے ڈر لگ رہا تھا۔ صبا نے اسے آواز دی اور اس سے کہا کہ وہ نانی کے پاس رہے تو عمیر نانی کے کمرے میں آ گیا۔ اس نے بستر سے ذرا دور اپنی کرسی رکھی اور دروازہ کھلا رکھا تھا۔ نانی ساکت لہٹی تھیں۔ اچانک باہر سے باول گرے تو عمیر ڈر گیا۔ لائٹ ایک لمحے کو بند ہوئی اور پھر ٹھیک ہو گئی۔ عمیر کی توجہ نانی کے ہاتھ پر گئی، ان کی انگلیاں ابل رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر ان کے پاس آیا اور غور سے انگلیاں دیکھنے لگا۔ انگلیاں یوں بار بار کھل اور مڑ رہی تھیں جیسے کسی چیز کو اپنی گرفت میں لینا چاہتی ہوں۔ عمیر نے ڈرتے ڈرتے انگلیوں کو چھوا تھا کہ نانی کا ہاتھ مڑا اور انہوں نے عمیر کا ہاتھ پکڑ لیا۔

نے آتے ہی انہیں غور سے دیکھا اور بولی۔ ”تم دو صوفوں یہاں ہو، میں نے آواز دی تو جواب کیوں نہیں دیا تھا؟“

شامیر نے چابی پتلون کی جیب میں ڈال لی تھی۔ ”سوری ماما! ہمیں سنائی نہیں دیا۔“

صبا نے چھت کا جائزہ لیا اور بولی۔ ”نیچے چلو۔“

وہ نیچے آئے تو صبا کے کمرے سے سونیا کے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ وہ پریشان ہو کر گئی اور اس کے جاتے ہی شامیر نے چابی نکال کر واپس کی ہولڈر پر ٹانگ دی۔ عمیر نے سرگوشی میں کہا۔ ”میں نے ٹھیک کہا تھا نا..... نا تو مجھ سے بات کرتی ہیں۔“

”ہاں لیکن وہ ہم سے کیوں نہیں کرتیں؟“

اپنی بات تسلیم کیے جانے پر عمیر اتنا خوش ہوا کہ اس نے صبح والا واقعہ بھی شامیر کے گوش گزار دیا جب نانی نے اپنی سیاہ آنکھوں کے ساتھ بستر سے اٹھ کر کہا تھا کہ وہ آ گیا ہے۔ شامیر حیران ہوا۔ ”نانو نے یہ کہا؟“

”ہاں اور ان کی آنکھیں بالکل سیاہ ہو رہی تھیں جیسے کپے ہوتے ہیں۔ مجھے بہت ڈر لگا اسی لیے تو میں گیٹ سے باہر آ گیا تھا۔“

”تم نے ماما سے کہا؟“

”نہیں، ماما کو دو بار بتایا تو انہوں نے میری بات کا یقین نہیں کیا تھا۔“

سونیا کے چلانے کی آواز رک گئی تھی۔ عمیر سوچ رہا تھا کہ نانو نے جنگل میں جانے سے منع کیا تھا۔ شامیر اور سونیا کو وہاں ایک جھونپڑی ملی تھی اور انہوں نے اسے سبز بوٹ کیس کا بتایا جو اوپر کمرے میں نہ جانے کب سے رکھا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد صبا اندر سے آئی۔ وہ پریشان لگ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”پتا نہیں سونیا کو کیوں رہ رہ کر پیٹ میں درد اٹھ رہا ہے۔“

”ماما! اس نے زیادہ کھا لیا ہوگا۔“ شامیر نے کہا۔

”نہیں، اسے دوپہر سے درد ہو رہا ہے، جب اس نے کچھ نہیں کھا یا تھا اور ہم کارٹون دیکھ رہے تھے۔“ عمیر نے بتایا۔

”شاید اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہوگا۔“ صبا نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”خیر ابھی تو وہ ٹھیک ہے۔“

صبا پھر اندر چلی گئی۔ شامیر صوفے پر بیٹھا ہوا ٹانگیں ہلا رہا تھا۔ اس نے جیب سے آنے کا پتلا نکالا اور اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے پتے کے پیٹ میں لگی سوئی نکالنے کی کوشش کی اور جیسے ہی اس نے سوئی ہلائی، اندر سے پھر سونیا کے

دیا۔ چند لمحے بعد نانی ڈھیلی پڑنے لگیں اور ان کا لرزہ کم ہو گیا۔ ایک سنٹ بعد وہ ساکت ہو گئیں اور ان کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ شامیر اور عمیر نے انہیں چھوڑ دیا اور بستر سے نیچے اتر آئے۔ صبا نے ماں کے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے اور سر کے نیچے تکیہ درست کیا۔

باہر گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اندر بھی اتنی سردی ہو گئی تھی کہ صبا نے ہیٹر آن کر دیے۔ اس نے تمام بچوں کو اپنے کمرے میں جمع کر لیا کیونکہ وہ گیس ہیٹر صرف اپنی نگرانی میں چلاتی تھی۔ نانی کے کمرے میں اس نے الیکٹرک فین ہیٹر آن کر دیا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور ابھی اسے رات کا کھانا بھی بنانا تھا۔ وہ بچوں کو کمرے میں رہنے کا کہہ کر باہر آئی۔ شامیر اور عمیر آپس میں بات کر رہے تھے اور سونیا سن رہی تھی۔ جب انہوں نے اوپر دانے کمرے میں موجود سرخ سوٹ کیس کی بات کی تو وہ چونک گئی۔ اس نے پوچھا۔ ”تم دونوں اوپر گئے تھے؟“

”وہاں ایک سوٹ کیس میں ایک گڑیا اور ایک فراک ہے۔“ عمیر نے انکشاف کیا۔

”ماما کی ہوگی۔“ سونیا نے یقین سے کہا۔ ”جب وہ چھوٹی ہوں گی تو گڑیا سے کھلتی ہوں گی۔ میں ماما سے کہوں گی کہ وہ گڑیا مجھے دے دیں۔“

”تم ماما کو نہیں بتاؤ گی کیونکہ ہم نے انہیں نہیں بتایا ہے۔“ شامیر نے کہا۔ ”اگر تم نے بتایا تو ماما کو پتا چل جائے گا۔“

”اچھا میں نہیں کہوں گی لیکن تم مجھے گڑیا دکھانا۔“

”وہ خراب اور بیکار ہے۔“ شامیر نے اسے ٹالنا چاہا مگر جب وہ مصررہی تو مجبوراً شامیر مان گیا کہ وہ اسے اگلے دن گڑیا دکھائے گا۔ سردی زیادہ ہو رہی تھی اس لیے صبا نے ڈنرسات بیچے ہی تیار کر لیا۔ ڈنر ڈانٹنگ ٹیبل پر کیا جاتا اور یہاں سردی زیادہ تھی۔ اس نے بچوں کے گرم کپڑے نکال لیے تھے۔

کھانے کے بعد صبا نے بچوں کو کمرے میں بھیج دیا اور ماں کے کمرے میں آئی۔ انکشن لگنے کے سات آٹھ گھنٹے تک وہ بیٹے ہوش کی نیند سوتیں۔ اس کے بعد انہیں ہوش آیا تو وہ انہیں کھانا کھلا سکتی تھی۔ انہیں شام پانچ بجے درد پڑا تھا اور اس کا مطلب تھا کہ وہ بارہ یا ایک بجے سے پہلے ہوش میں نہیں آسکتی تھیں۔ پہلے صبا نے سوچا کہ کچھ دیر آرام کر لے مگر وہ یہ سوچ کر رک گئی کہ اگر اس کی آنکھ لگ گئی تو وہ سوتی رہ جائے گی۔ وہ جا کر اپنے کمرے سے ایک

اس نے ہاتھ چھڑانا چاہا مگر نانی کی گرفت بہت سخت تھی اور اچانک ہی وہ بستر پر اٹھ بیٹھیں۔ انہوں نے سر جھما کر عمیر کی طرف دیکھا تو ان کی آنکھیں ویسی ہی سیاہ ہو رہی تھیں۔

عمیر نے چیخ ماری مگر وہ بادل کی گرج میں دب گئی۔ اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو نانی نے دوسرا ہاتھ بڑھا کر عمیر کا گلا پکڑ لیا۔ اس نے چلانے کی کوشش کی مگر گرفت اتنی سخت تھی کہ عمیر کی آواز ہی نہیں نکلی اور اب بادل رہ رہ کر گرج رہے تھے۔ عمیر کی سانس رکنے لگی۔ وہ خود کو چھڑانے کے لیے پھل رہا تھا مگر چھوٹا ہونے کی وجہ سے وہ چھڑا نہیں پا رہا تھا۔ نانی کی گرفت بہت سخت تھی۔ خود کو چھڑانے کی کوشش میں وہ نیچے بیٹھا تو نانی کا بستر پر توازن خراب ہوا اور وہ نیچے لڑھک گئیں۔ عمیر کی گردن اور ہاتھ دونوں ان کی گرفت سے نکل گئے۔ اس کی گردن آزاد ہوئی تو اس کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں اور وہ فرش سے اٹھ کر دیوانہ وار بھاگتا ہوا باہر آیا۔ اس کی چیخیں اتنی بلند ضرور تھیں کہ صبا کے کانوں تک پہنچ گئیں اور وہ پریشان ہو کر کمرے سے باہر آئی۔ ”عمیر! کیا ہوا؟“

مگر وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ اس کے منہ سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ البتہ اس نے ہاتھ سے نانی کے کمرے کی طرف اشارہ کیا تو صبا اس طرف لپکی۔ ماں کو فرش پر گرے اور لرزتے دیکھ کر وہ تیزی سے ان کے پاس پہنچی اور انہیں فرش سے اٹھانے کی کوشش کی مگر ان کا وزن خاصا تھا۔ اس نے چلا کر شامیر کو آواز دی۔ شور سن کر وہ پہلے ہی آ گیا تھا۔ اس نے صبا کی مدد کی اور انہوں نے نانی کو اٹھا کر بستر پر ڈالا۔ وہ بری طرح لرز رہی تھیں صبا کو لگا کہ اگر اس نے انہیں چھوڑا تو وہ پھر نیچے نہ گر جائیں اس نے شامیر سے کہا۔ ”اوپر چڑھ کر انہیں قابو کر دو۔ عمیر! تم بھی آؤ۔“

”میں نہیں آؤں گا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ اس نے انکار کیا وہ دروازے پر کھڑا تھا۔

”پلیز بیٹا، مجھے انکشن بنانا ہے۔ تم بھائی کے ساتھ مل کر نالو کو پکڑے رکھو۔“ صبا نے التجائی تو وہ بادل نا خواستہ۔۔۔۔ آگے آیا اور اس نے شامیر کے ساتھ مل کر نانی کے ہاتھ پکڑ لیے۔ وہ اب بستر پر سردا میں بائیں مار رہی تھیں۔ صبا نے جلدی سے دراز سے سرخ نکالی اور اس کا پیر کھول کر دوا کی شیشی اٹھائی۔ صبا نے شیشی رکھ کر سرخ سے ہوا خارج کی۔ اس دوران میں شامیر اور عمیر نانی کا جسم دبا دبا ہوئے تھے۔ صبا نے ان کا ایک بازو کس کر پکڑا اور دبا دبا ہوئے جسے بھی نہیں اٹھایا اس نے سوتی داخل کر کے پشن دبا

”میں ہانا“ عمیر نے کہا۔

”آپ نالو کا خیال رکھنا اور کوئی بات ہو تو مجھے فون کرتا۔“ صبا نے کہا اور باہر نکل گئی۔ عمیر نے دروازہ اندر سے بند کیا اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ صبا گھر کی چابیاں لے گئی تھی۔ اس نے شامیر کو گیٹ کھولنے کو کہا اور خود سونیا کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لٹایا۔ جب تک وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آئی اور گاڑی اشارت کی شامیر نے گیٹ کھول دیا۔ گاڑی باہر نکلنے کے بعد اس نے باہر تالا لگا یا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ پر آ گیا۔ سونیا بدستور رو رہی تھی اور تکلیف کی شکایت کر رہی تھی۔ صبا نے اسے تسلی دی۔ ”بس میری جان، ابھی ہم ڈاکٹر کے پاس جائیں گے تو تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔“

گاڑی گیٹ سے آگے نکلی تو عمیر نے کھڑکی کا پردہ برابر کر دیا اور لاؤنج کے صوفے پر آ گیا۔ اس کی خوفزدہ نظریں تانی کے کمرے پر مرکوز تھیں۔ اگرچہ صبا نے انہیں بتایا تھا کہ تانی اب بارہ بجے سے پہلے ہوش میں نہیں آئیں گی، اس کے باوجود عمیر ڈر رہا تھا کہ کہیں تانی جاگ نہ جائیں اور ان کی آنکھیں سیاہ نہ ہوں۔ اس لیے وہ ماں کی ہدایت کے باوجود ان کے کمرے میں نہیں گیا اور لاؤنج میں بیٹھا رہا۔ ابھی ان لوگوں کو گئے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ اچانک بادل زور سے گرجے اور بجلی کی چمک ایسی خیز تھی کہ پورا لاؤنج روشنی سے بھر گیا۔ انرجی سپورز کی روشنی اس کے آگے مائل پڑ گئی تھی۔

پھر جیسے ہی چمک ختم ہوئی، اچانک ہی تاریکی چھا گئی۔ عمیر خوف سے چلا اٹھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ لائٹ چلی گئی تھی اور اب اندر گھپ اندھیرا تھا۔ باہر سے تیز بارش کی آواز آئی، اس کی شدت پہلے سے زیادہ تھی۔ عمیر کچھ دیر ساکت بیٹھا رہا پھر وہ ہمت کر کے اٹھا اور چکن کی طرف بڑھا۔ اس کی ایک دراز میں نارنج رکھی تھی۔ وہ نارنج کی مدد سے ایمر جنسی لائٹس تلاش کر سکتا تھا۔ وہ ٹوٹا ہوا چکن کی دراز تک پہنچا اور اسے کھول کر اندر سے نارنج نکال کر روشن کی۔ اس کی روشنی سے عمیر کو حوصلہ ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ ایمر جنسی لائٹس صبا کے بیڈ روم کے ساتھ ایک رپک پر رکھی ہوتی ہیں۔ وہ رپک نکال آیا اور ایک بڑی ایمر جنسی لائٹ اٹھا کر آن کی اور ایسے لاکر لاؤنج میں رکھ دیا۔ اس کی روشنی ہر طرف جارہی تھی۔ اس نے نارنج بند کر دی لیکن اسے اپنے پاس ہی رکھا۔

وہ سونیا کی تکلیف کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اچانک اسے اس پتے کا خیال آیا جو شامیر لایا تھا اور جس

کتاب لے آئی اور بستر کے برابر میں کرسی رکھ کر پڑھنے لگی۔ نو بجے وہ جا کر اپنے لیے چائے بنا لائی۔ اس وقت بارش رک گئی تھی مگر موسم بدستور بارش دالا ہو رہا تھا۔ آسمان پر گہرے بادل تھے اور زور پھاڑوں کی طرف بجلی چمک رہی تھی۔ صبا نے جان بوجھ کر چائے اسٹرائنگ بنائی تاکہ اس کی نیند بھاگ جائے کیونکہ وہ سارا دن مصروف رہتی تھی اس لیے اسے جلدی سونے اور جلدی اٹھنے کی عادت تھی۔

چائے بھی اس کی نیند بھگانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ گیارہ بجے تک وہ باقاعدہ اوتھنے لگی۔ کسی وقت اس کی آنکھیں بند ہوئیں اور پھر اسے لگا جیسے کوئی اس کے آس پاس سرگوشی کر رہا ہے۔ ”میں آ گیا ہوں..... میں آ گیا ہوں۔“ وہ چونک کر بیدار ہوئی تو وہاں کوئی نہیں تھا اور ماں بدستور بستر پر ساکت لیٹی ہوئی تھی۔ اچانک بچوں کے کمرے سے صبا کو چیخ سنائی دی۔ صبا بے اختیار اٹھ کر بھاگی۔ اس نے بچوں کے کمرے کا دروازہ کھولا تو سونیا اپنے بستر پر گھسری سی بنی پڑی تھی اور اونچی آواز میں جلا رہی تھی۔ صبا اس کی طرف پہنچی۔ ”کیا ہو سونیا؟ کیا ہو میری جان؟“

”ماما! میرا پیٹ.....“ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”بہت درد ہو رہا ہے۔“

صبا اس کا پیٹ ٹٹولنے لگی۔ پیٹ نرم تھا اور بہ ظاہر کوئی اور علامت بھی نہیں تھی مگر سونیا بہت تکلیف میں تھی۔ صبا نے پوچھا۔ ”کیسا لگ رہا ہے؟“

”ماما! ایسا لگ رہا جیسے کوئی گیلی چیز چھو رہا ہے۔“ شامیر اور عمیر بھی بستر پر اٹھ بیٹھے تھے۔ عمیر سونیا کی بات پر چونکا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ اونچی آواز میں رو رہی تھی۔ صبا کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر اس نے کہا۔ ”اٹھو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہوں۔“

عمیر بہم گیا۔ ”ماما! ہم اکیلے رہیں گے؟“

”ہم نہیں، آپ یہاں رہیں گے۔“ صبا نے سونیا کو گرم کپڑے پہناتے ہوئے کہا۔ ”شامیر! آپ تیار ہو آپ میرے ساتھ جاؤ گے۔ راستے میں آپ سونیا کو دیکھو گے۔“

عمیر اکیلا رہنے کے لیے تیار نہیں تھا مگر وہ ماں کی پریشانی کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں سکا۔ شامیر تیار ہونے لگا۔ سونیا کو تیار کر کے صبا نے اپنا گرم کوٹ پہنا اور پرس و چابیاں لے کر سونیا کو گود میں اٹھالیا۔ عمیر شامیر کے ساتھ لگا ہوا دروازے تک ساتھ آیا مگر صبا نے اسے باہر آنے سے روک دیا۔ ”آپ یہیں سے دروازہ بند کر لیں اور جب تک میری آواز نہیں دروازہ مت کھولے گا۔“

انکار ہی سمجھوں

ایک میرانی کے لڑکے کو ایک زمیندار کی لڑکی سے محبت ہو گئی، تو اس نے باپ کو مجبور کیا کہ چودھری صاحب سے میرے لیے رشتہ مانگ آئے۔ آخر کار باپ تھا، بیٹے کی خاطر رشتہ مانگتے چلا گیا۔ چودھری صاحب مہمانوں کے درمیان بیٹھے تھے۔ میرانی نے آداب سے سلام کیا۔ بلند آواز میں کہا۔

”چودھری صاحب! میں اپنے بیٹے کے لیے رشتہ مانگنے آیا ہوں۔“ چودھری صاحب یہ بات سن کر جلال میں آگئے۔ کہاں میرانی اور کہاں میں علاقے کا زمیندار۔ چودھری صاحب نے اپنے حواریوں کو اشارہ کیا۔ حواریوں نے میرانی کو اتنا مارا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو کہا۔

”چودھری اسی ہوں انکار سمجھے۔“

برسلہ۔ محمد انعام، لودھراں

کہہ رہے ہو؟“

”ماما! انوکھی آنکھیں بلیک ہو جاتی ہیں اور انہوں نے عمیر کا گلا بھی دبایا تھا۔ جمی وہ بستر سے نیچے گری تھیں۔ عمیر نے مجھے سب بتایا ہے۔ ابھی جب ہم آرہے تھے، تب بھی وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اسے اکیلا چھوڑ کر نہ جائیں۔“

صابانے اور باتوں پر تو توجہ نہیں دی تھی مگر یہ سن کر وہ پریشان ہو گئی کہ اس کی ماں نے عمیر کا گلا دبایا تھا اور اس وقت عمیر ان کے ساتھ گھر میں اکیلا تھا مگر اس نے خود کو تسلی دی کہ ماں انجکشن کے زیر اثر ہیں اور انہیں رات بارہ بجے سے پہلے ہوش نہیں آئے گا۔ وقت پر اسے گھڑی کا خیال آیا اور اس نے ڈیش بورڈ میں لگی گھڑی دیکھی تو اس میں پونے بارہ ہو رہے تھے۔ اس کا اطمینان ہوا ہو گیا۔ بارہ تو بجتے والے تھے اور انہیں کسی وقت بھی ہوش آسکتا تھا۔ صابانے اپنا موبائل نکالا اور گھر کے فون پر کال کرنے لگی۔ نکل جا رہی تھی مگر دوسری طرف سے کوئی ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ وہ بے تاب ہونے لگی کہ عمیر کال کیوں نہیں ریسیو کر رہا تھا۔ پھر کسی نے کال ریسیو کی۔

☆☆☆

کے پیٹ میں سوئی چھپی ہوئی تھی۔ وہ لاؤنج میں دو چھوٹے صوفوں کے درمیان کر گیا تھا۔ عمیر نے جھک کر دونوں صوفوں کے درمیان خلا میں دیکھا اور پھر نارچ روشن کر کے اس میں جھانک رہا تھا کہ اچانک ہی نانو کے کمرے سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی شیشہ فرش پر گرا ہوا اور ٹوٹ گیا ہو۔ چھتا کے نے عمیر کو سہا دیا۔ پھر وہ ہمت کر کے اٹھا اور نارچ آن کر کے نانو کے کمرے تک آیا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے نارچ سے روشنی اندر ڈالی تو نانو کا بیڈ خالی تھا۔ نارچ اس کے ہاتھ میں لرز گئی۔ نانو کہاں تھیں؟ اس نے جلدی سے پورے کمرے میں نارچ گھمائی مگر نانو وہاں کہیں نہیں تھیں۔ عمیر نے کبھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”نانو! آپ کہاں ہیں؟“

کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ ڈرتے ڈرتے اندر آیا تو اچانک کسی نے اسے عقب سے دھکا دیا۔ وہ بستر کے قریب جا کر اپنی اس نے پلٹ کر دیکھا تو نانو دروازے کے پیچھے کھڑی تھیں اور وہیں سے انہوں نے اسے دھکا دیا تھا۔ اس کے ہاتھ سے نارچ چھوٹ گئی اور گر کر بند ہو گئی مگر باہر سے آتی ایئر چنسی لائٹ کی روشنی میں نانو کا بیڈ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ چہرے تک ساکت کھڑی رہیں اور پھر پلٹ کر کمرے سے نکل گئیں۔ عمیر فرش سے اٹھا اور اس نے نارچ اٹھائی پھر باہر آیا۔ نانو چکن کی طرف جا رہی تھیں۔ عمیر جھکا ہوا لاؤنج میں آیا اور عقب سے چھوٹے صوفوں کے پیچھے آ گیا۔

☆☆☆

صابانہ گھر بند تھی کیونکہ سونیا مسلسل رو رہی تھی اور وہ پچھلی نشست پر گول مول سی ہو کر لیٹی ہوئی تھی۔ ان کے روانہ ہونے کے چند منٹ بعد ہی بہت تیز بارش شروع ہو گئی تھی۔ اس نے دائر چلا دیے تھے اور ہیڈ لائٹس فل کر دی تھیں۔ اس کے باوجود اسے گاڑی بہت دھیمی رفتار سے چلائی پڑ رہی تھی کیونکہ اوپر سے جیسے پانی کی چادر گر رہی تھی۔ شامیر جو سونیا کے پاس بیٹھا تھا۔ اسے عمیر کی ٹکر ہو رہی تھی۔ اس نے ماں سے کہا۔ ”ماما! عمیر نانو کے بارے میں ٹھیک کہتا ہے۔ وہ اس سے بات کرتی ہیں۔“

سونیا چونکی۔ ”کیا مطلب؟“

”ماما! نانو نے اسے سرخ سوٹ کیس کا بتایا اور وہ پچھلی اوپر اسٹور والے کمرے میں ملا۔ اس میں ایک پرانی گزیا، ایک فراک اور ایک بلیک ڈائری تھی۔“

صابانہ نے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ”شامیر اتم کیا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

آیا جس میں پلاس تھا اور وہ اس کی مدد سے سوئی نکال سکتا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ سونیا کی تکلیف اور نانو کی اس کیفیت کی وجہ سے یہی پتلا اور اس کے پیٹ میں ہیوست سوئی تھی۔ اس لیے وہ اسے نکالنے کے لیے بے تاب تھا۔

وہ اٹھ کر وہ قدموں آرج والے دروازے تک آیا اور لاؤنج میں جھانک کر دیکھا تو نانو فون کے پاس کھڑی تھیں۔ پھر انہوں نے ریسیور اٹھایا اور اسے ایک طرف رکھ دیا۔ ان کی پشت عمیر کی طرف تھی۔ وہ تیزی سے باہر نکلا اور فریج کی سائڈ میں چلا گیا۔ وہ فریج سے بالکل لگ کر کھڑا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد نانو اس کے سامنے سے گزر کر نشست گاہ کی طرف چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی وہ فریج کی سائڈ سے نکلا اور جھک کر پین کی اس دراز تک آیا جس میں اوزار رکھے ہوتے تھے۔ اس نے آہستہ سے دراز کھولی اور اس میں پلاس ٹولے لگا۔ اوپر دوسرے اوزار تھے اور اسے پلاس نہیں مل رہا تھا۔ وہ زیادہ ہاتھ مارتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ کہیں آواز نہ پیدا ہو۔ بالآخر اسے پلاس مل گیا۔ اس نے ذرا جھلت سے کام لیا اور اسے کھینچ کر نکالنے لگا تھا کہ چند اوزار آپس میں ٹکرائے اور آواز پیدا ہوئی۔

عمیر کا سانس ایک لمحے کورک گیا اور اس نے پلاس کر دیکھا مگر نانو نشست گاہ میں ہی تھیں۔ اس نے جلدی سے پلاس پکڑا اور پتلے کے پیٹ سے سوئی نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک اسے لگا کہ اس کے عقب میں کوئی ہے اور وہ بے ساختہ آگے ہوا۔ اسی لمحے چھری آکر کینٹ سے لگی۔ نانو کب وہاں آئیں اسے پتا نہیں چلا تھا۔ انہیں اتنے پاس دیکھ کر عمیر گھبرا کر پیچھے ہوا تو اس کے ہاتھ سے پلاس چھوٹ گیا۔ اس نے پلاس اٹھانا چاہا مگر نانو نے پاؤں کی ٹھکڑے سے اسے دور پھینک دیا۔ عمیر چلا یا۔

”نانو! یہ کیا کر رہی ہیں؟“

”میں آگیا ہوں۔“ نانو نے کھر کھرائی آواز میں

کہا۔ ”مجھے قیمت چاہیے۔“

نانو کہتے ہوئے آگے آنے لگیں۔ عمیر پیچھے سرکا۔ ”کون ہو تم؟“

”میں وہی ہوں جس سے معاہدہ کیا تھا۔ میں اس کی قیمت لینے آیا ہوں۔“

”میں آپ کا عمیر ہوں۔“ وہ بولا۔ اس کے ہاتھ میں پتلا موجود تھا۔ اب پلاس نہیں رہا تھا کہ وہ اس سے سوئی نکالے۔ اچانک اسے خیال آیا اور وہ پتلا منہ تک لایا۔ نانو اس کی طرف جھپٹیں مگر وہ جھکا کی دے کر بچا اور تیزی سے

عمیر صوفوں کے پیچھے دبکا ہوا تھا۔ نانو جین میں کچھ تلاش کر رہی تھیں اور پھر وہ پلاس تو ان کے ہاتھ میں ایک چھری تھی۔ چھری سے زیادہ خوفناک ان کے چہرے کے تاثرات تھے۔ ان کی آنکھیں پوری سیاہ اور چہرہ جیسے پتھر کا ہو رہا تھا۔ عمیر کو لگا وہ اس کی نانو نہیں کوئی اور ہیں۔ وہ چھری لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھیں۔ جیسے ہی وہ کمرے میں گئیں، عمیر صوفوں کے درمیانی خلا میں ہاتھ ڈال کر پتلا نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک ہی اس کے ہاتھ سے نارچ چھوٹے کہچے گری اور خاصی آواز ہوئی۔۔۔ فوراً ہی دروازے پر نانو نمودار ہوئیں۔ وہ لاؤنج کا جائزہ لے رہی تھیں جیسے تعین کر رہی ہوں کہ آواز کہاں سے آئی تھی۔ عمیر نے نارچ پکڑ لی اور پھر خلا میں ٹولے لگا۔ صوفے کے نیچے سے وہ دیکھ رہا تھا کہ نانو اسی طرف آ رہی تھیں اور جیسے ہی وہ صوفوں کے پچھلے حصے میں نمودار ہوئیں، عمیر کا ہاتھ پتلے سے ٹکرایا۔

عمیر اسے پکڑتے ہوئے میدھا ہوا اور اٹھ کر تیزی سے دوڑ لگی۔ وہ جین کے پاس سے ہوتا ہوا نشست گاہ میں آیا اور اس کے بڑے صوفے کے پیچھے دبک گیا۔ خوف سے اس کا سانس تیز ہو رہا تھا اور اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ یہاں نیم تار کی تھی۔ اس نے ٹول کر پتلے کے پیٹ میں ہیوست سوئی تلاش کی اور اسے نکالنے کی کوشش کرنے لگا مگر سوئی کا بہت کم حصہ اب باہر تھا جو اس کی انگلیوں کی گرفت میں نہیں آ رہا تھا۔ نشست گاہ کی کھلی آرج پر نانو کا بیولا نمودار ہوا اور وہ کھڑے ہو کر نشست گاہ میں دیکھنے لگیں۔ یہاں سے ایک دروازہ پیچھے راہداری میں کھلتا تھا جس میں بیڈ رومز تھے۔ نانو نے عجیب کھر کھرائی سی آواز میں کہا۔ ”عمیر! تم کہاں ہو، سامنے آؤ میرے پیچھے۔“

عمیر نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ اسے ڈر تھا کہ اس کی آواز نہ نکل جائے اور نانو کو پتا چل جائے کہ وہ صوفے کی سائڈ میں موجود ہے۔ نانو آگے آئیں اور انہوں نے پہلے چھوٹے صوفوں کے پیچھے جھانکا جب وہاں عمیر نظر نہیں آیا تو وہ بڑے صوفے کی طرف بڑھیں اور جب اس کے بالکل نزدیک آگئیں تو عمیر نے پکڑے جانے کے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک ہی فون کی تیل بجی اور نانو رک گئیں۔ فون لاؤنج میں رکھا ہوا تھا۔ وہ پلٹیں اور لاؤنج کی طرف جانے لگیں۔ ان کے جانے کے بعد عمیر نے نہ جانے کب سے رکا ہوا سانس لیا اور دوبارہ پتلے سے سوئی نکالنے کی کوشش کرنے لگا مگر جلد اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس طرح نہیں نکالے گی۔ اسے جین میں اوزاروں والی دراز کا خیال

چھری دیکھی اور خود سے سوال کیا۔ "میں کیا کرنے والی تھی؟ اپنی ہی اولاد کو اپنے ہاتھوں سے ختم کرنے والی تھی۔" "نانو! آپ کو کیا ہوا تھا؟" عمیر کا خوف کچھ کم ہونے لگا۔

"مجھ پر شیطان حاوی آ گیا تھا۔ جیسے بہت سال پہلے آیا تھا۔" انہوں نے جھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ اسی لمحے باہر سے کار کے ہارن کی آواز آئی تو عمیر اچھل پڑا۔ اس نے چلا کر کہا۔

"ماما آئیں۔"

عمیر باہر کی طرف بھاگا۔ نانی اسے جاتا دیکھ رہی تھیں پھر انہوں نے آہستہ سے کہا۔ "اب یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیے۔ میرے کسی اور بچے کو میرے گناہ کی بجینٹ نہیں چڑھنا چاہیے۔"

نانی پلٹیں اور صبا کے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

☆☆☆

صبا کے ہاتھ میں سیاہ ڈائری تھی۔ اس نے ڈائری کھولی۔ اس کے شروع کے صفحات خالی تھے مگر ایک صفحے پر کچھ لکھا ہوا تھا اس کے بعد اسی طرح سے وقفے وقفے سے آج سے بیس سال پہلے تک کی تاریخوں میں ایک روداد لکھی تھی جو جیران کن بھی تھی اور عبرتناک بھی۔ صفیہ اور احمد اللہ کی شادی آج سے پچاس سال پہلے ہوئی تھی۔ اس وقت صفیہ پندرہ سال کی اور احمد اللہ بیس سال کا تھا۔ وہ کچھ مہینے پہلے ایک سرکاری محکمے میں ملازم ہوا تھا۔ شادی کے بعد وہ اور صفیہ دارالحکومت میں آ کر رہنے لگے۔ وقت گزرتا گیا اور اولاد کی شدید چاہ کے باوجود ان کے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔ پانچ سال گزر گئے تب احمد اللہ کو یہ گھر ملا تھا۔ اس وقت یہاں بہت کم لوگ تھے اور نزدیک ہی جنگل تھا۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کے بعد وہ پیروں فقیروں کے چکر میں پڑ گئی۔ احمد اللہ اسے منع کرتا تھا اور کہتا کہ چپ نصیب میں ہوگی تو اولاد ملے گی، وہ کیوں غیر اللہ سے مانگتی ہے مگر اپنی چاہ کے آگے صفیہ کو کچھ سمجھائی نہیں دیتا تھا۔

ایک دن وہ دروازے پر ریزھی دالے سے سبزی لے رہی تھی کہ ایک عجیب سے حلیے کا آدمی وہاں سے گزرنے لگا اور صفیہ کو دیکھ کر رک گیا۔ جب سبزی والا آگے بڑھ گیا تو اس آدمی نے اچانک کہا۔ "اولاد چاہتی ہے؟"

یہ صفیہ کی دکھتی رنگ تھی۔ اس نے تڑپ کر کہا۔ "ہاں بابا۔"

"تب اوپر جنگل میں آجانا۔" آدمی نے پیچھے جنگل

لاؤنج کی طرف بھاگا۔ نانو اس کے پیچھے گھبران کی رفتار اتنی زیادہ نہیں تھی۔ ان کی پہنچ سے دور جاتے ہی عمیر نے دانتوں سے سوئی بکڑ کر پوری فوت سے کھینچی اور وہ پتلے سے نکل گئی۔ نانو چھری سمیت اس پر جمپٹ رہی تھیں۔

☆☆☆

"ہیلو..... ہیلو۔" صبا بول رہی تھی۔ "کون ہے....."

فون کس نے ریسو کیا ہے؟ عمیر! یہ تم ہو بیٹا..... بولتے کیوں نہیں ہو؟"

مگر دوسری طرف مکمل خاموشی تھی۔ صبا نے کار سائڈ پر روک دی اور کال کاٹ کر دوبارہ ملائی مگر اس بار اٹیچ ٹون آرہی تھی۔ سونیا کی حالت بدستور خراب تھی مگر اب صبا کو زیادہ بڑے مسئلے کا سامنا تھا۔ اس نے سوچا اور کار واپس موڑ لی۔ شامیر نے اس سے پوچھا۔ "ماما! کیا ہم واپس جا رہے ہیں؟"

"ہاں کسی نے گھر میں کال ریسو کر کے ریسو فون سے الگ رکھ دیا ہے۔ وہاں گڑ بڑ ہے۔ سونیا! تم کیسی ہو؟"

"ماما! تکلیف ہو رہی ہے۔" وہ کراہتے ہوئے بولی۔

"بہن بیٹا، میں جلد تمہیں اسپتال لے جاؤں گی۔" صبا نے اسے تسلی دی۔ "تمہوڑا صبر کرو۔"

اس بار صبا بارش کی پروا کیے بغیر کسی قدر تیز ڈرائیو کر رہی تھی اور اسے رہ رہ کر عمیر کا خیال آ رہا تھا۔ اچانک سونیا چلائی۔ "ماما....."

"کیا ہوا میری جان؟"

"میری تکلیف ٹھیک ہو گئی ہے۔" وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ "ماما! بالکل بھی درد نہیں ہے اور نہ ہی چھین ہے۔"

صبا نے سکون کا سانس لیا اور پوری توجہ سے ڈرائیو کرنے لگی۔ ساتھ ہی وہ سب خیریت سے ہونے کی دعا مانگ رہی تھی۔

☆☆☆

عمیر نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں۔ چھری اس سے زیادہ دور نہیں تھی۔ بس ایک لمحہ لگتا اور وہ اس کے ننھے جسم میں اتر جاتی مگر جب کچھ نہیں ہوا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ نانو سامنے ہی ساکت کھڑی تھیں اور ان کا چھری والا ہاتھ بھی ساکت تھا۔ عمیر نے ڈرتے ڈرتے ان کا چہرہ دیکھا تو ان کی آنکھیں اب نارمل تھیں اور چہرہ بھی ٹھیک لگ رہا تھا۔ پھر بھی عمیر ڈر رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "نانو! آج آپ ٹھیک ہیں؟"

نانو نے سر ہلایا پھر انہوں نے اپنے ہاتھ میں موجود

کی طرف اشارہ کیا۔ ”جوگی کا ٹھکانا ادھر ہے۔“ اور ہاں
 ڈرامت، بے لگہر ہو کر آتا۔“

جوگی کہہ کر چلا گیا۔ اگر معاملہ اولاد کا نہ ہوتا تو صفیہ
 ساری دنیا کے خزانوں کے بدلے بھی چند سو قدم دور جوگی کی
 جھونپڑی تک نہ جاتی مگر اولاد کی خواہش نے اسے پاگل کر
 دیا تھا۔ وہ اگلے ہی دن احمد اللہ کے دفتر جاتے ہی وہاں پہنچ
 گئی۔ جوگی کی جھونپڑی میں وہی سب کچھ تھا جو شامیر اور
 سونیا نے دیکھا تھا مگر اس وقت یہ سب تازہ تھا۔ جوگی جوان
 آدی تھا۔ اس نے صفیہ کو دیکھ کر کہا۔ ”اچھا ہوا تو آگئی ورنہ
 میں یہاں سے جانے والا تھا۔“

”جوگی بابا مجھے بچے کی خواہش ہے۔“
 ”ہر خواہش کی ایک قیمت ہوتی ہے وہ دے گی؟“
 ”کیسی قیمت بابا؟“ صفیہ نے لگہر مند ہو کر پوچھا اور
 جنب جھگی نے اسے قیمت بتائی تو وہ مرجھا گئی تھی۔
 ”میں ایسا نہیں کر سکتی بابا، کسی کی گود کا پھول کیسے
 لاؤں۔“

”اگر اپنی گود بھرنا چاہتی ہے تو ایسا کر لے
 تیرے پاس بس دو دن ہیں۔“

صفیہ بایوس سی گھر واپس آگئی اگر جوگی اس سے پیسا
 مانگا تو وہ اپنے پاس موجود ہر چیز اسے دے دیتی مگر اس نے
 تو بچہ مانگا تھا وہ کہاں سے لاتی۔ اگلے دن دوپہر میں وہ محسن
 کی صفائی کر رہی تھی کہ باہر سے کسی بچی کی آواز آئی۔ وہ اپنی
 گڑیا سے باتیں کر رہی تھی۔ صفیہ نے دروازہ کھول کر باہر
 جھانکا تو ایک چار پانچ سال کی پیاری سی بچی کپڑے کی گڑیا
 لیے کیاری کے کنارے بیٹھی اس سے باتیں کر رہی تھی۔ بچی
 نے خوب صورت فراک پہن رکھی تھی۔ اسے دیکھ کر صفیہ کے
 دل میں خیال آیا اور اس نے بچی کو اندر بلا لیا۔ وہ مصومیت
 میں اندر آگئی۔ اس وقت صفیہ پر شیطان پوری طرح حاوی
 آ گیا تھا۔ اس نے اچانک بچی کا منہ دبا دیا اور اس وقت
 تک دبائے رکھا جب تک وہ بے ہوش نہیں ہوگئی۔ پھر اس
 نے اسے اپنی چادر تلے لیا اور جوگی کی جھونپڑی تک لے
 آئی۔ وہ باہر ہی موجود تھا۔ ایسا لگا جیسے اسے صفیہ کی آمد کا علم
 تھا۔ اس نے ہاتھ آگے کیے اور صفیہ نے بچی اس کے حوالے
 کر دی۔ وہ بچی کو لے کر جھونپڑے میں گیا اور کچھ دیر بعد
 آ کر اس نے بچی کی فراک اس کے حوالے کی۔ ”یہ لے لے اور
 یہاں سے جا..... ایک گھنٹے بعد آتا، تیرا کام ہو جائے گا۔“

صفیہ دھڑکتے دل کے ساتھ واپس آئی۔ اس وقت
 بچہ بچہ میں شور نہیں اٹھا تھا۔ شاید بچی کسی اور گلی کی تھی اور

کھینچتے ہوئے یہاں تک آگئی تھی۔ ایک گھنٹے بعد صفیہ پھر
 جوگی کی جھونپڑی تک آئی۔ جوگی باہر ایک بڑا سا جھولا لیے
 کھڑا تھا۔ اس میں نہ جانے بچی کئی یا کچھ اور تھا۔ جوگی نے
 ایک پڑیا اس کے حوالے کی۔ ”اسے پھانک لینا..... اور
 ہاں اگر تجھے کچھ نظر آئے تو اس سے اولاد کا کہنا۔ پھر وہ تجھے
 اپنی قیمت بتائے گا۔“

صفیہ نے جوگی سے پوچھنا چاہا کہ اسے کیا نظر آئے گا
 مگر وہ اس کی بات سے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ صفیہ گھر آئی
 اور اس نے بچی کی فراک اور گڑیا ایک ایسی جگہ چھپا دیں
 جہاں احمد اللہ کی نظر نہیں جاسکتی تھی۔ رات سونے سے پہلے
 اس نے پڑیا کھائی اور رات جب وہ باتھ روم جانے کے
 لیے کمرے سے نکلی تو اسے محسن میں ایک سیاہ بیولا نظر
 آیا۔ صفیہ کو جوگی کی بات یاد تھی اس لیے وہ ڈری نہیں۔
 ہولے نے اس سے پوچھا۔

”کیا چاہتی ہے مجھ سے؟“
 ”مجھے بچے کی خواہش ہے۔“
 ”اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی۔“
 ”مجھے منظور ہے۔“ صفیہ نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

”جتنی اولاد اتنی قیمت..... ہر ایکس سال
 بعد..... یاد رکھنا۔“ ہولے نے کہا اور اچانک غائب ہو
 گیا۔ اس واقعے کے ایک سال کے اندر صفیہ کے ہاں پہلی
 اولاد بیٹے کی صورت میں ہوئی۔ وہ اتنی خوش اور مگن ہوئی کہ
 سب بھول گئی۔ پانچ سال بعد بیٹی ہوئی تو اسے لگا کہ اس کا
 گھر مکمل ہو گیا ہے۔ وقت گزرتا رہا۔ جب بیٹا تیس سال کا
 ہونے والا تھا تو صفیہ نے خواب میں اسی ہولے کو دیکھا جو
 کہہ رہا تھا کہ قیمت لینے آرہا ہے اور قیمت ایک انسانی جان
 تھی۔ صفیہ ڈری مگر اس نے اسے خواب قرار دیا۔ البتہ جب
 وہی بیولا اسے رات کی تاریکی میں سچ سچ نظر آیا تب وہ جان
 گئی کہ یہ حقیقت ہے مگر وہ اسے کہاں سے انسانی جان کی
 قربانی دیتی۔ اس کے لیے تو اس گھر کی ہر جان قیمتی تھی۔ وہ
 کیسے کسی کی قربانی دیتی۔ ان دنوں اس کی طبیعت بہت
 خراب ہوگئی تھی اور اسے رہ رہ کر وہ بیولا نظر آتا۔ آخری بار
 جب وہ نظر آیا تو اس نے کہا۔

”تم نے جان نہیں دی لیکن میں نے جن لی ہے۔“
 اس سے اگلے دن ہی اس کے بیٹے کی طبیعت خراب
 ہوئی اور اس نے اسپتال میں ڈاکٹروں کے سامنے تڑپ
 تڑپ کر جان دے دی۔ صفیہ پاگل ہوگئی۔ جب وہ اولاد کی
 چاہ میں پاگل ہو رہی تھی اور اس نے قیمت دینے کی ہامی

کُلُّ مَرَجٍ عَلِيهَا قَائِمٌ ۝



جو پیدا ہوا ہے، اسے لوٹ کر اپنے رب کی طرف ہی جانا ہے۔ آج کوئی اور، توکل ہماری باری ہے۔ ادارے سے اپنا قلمی کیریئر شروع کرنے اور مسلسل وابستہ رہنے والے ہونہار، نوجوان، باشرع، پیروں سے معذور مگر عزم و حوصلے کے پیکر اور صاحب طرز کہانی نگار، کاشف زبیر کنٹی ہفتوں تک علالت سے نبرد آزما رہنے کے بعد 22 فروری کی سہ پہر خالق حقیقی سے جا ملے۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝

ادارہ اور اس کے جملہ اراکین مرحوم کے پسماندگان کے اس صدمے اور غم میں برابر کے شریک ہیں۔ قارئین مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا فرمائیں کہ رب العزت انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

بھری تھی مگر جب قیمت دینا پڑی تو اسے اندازہ ہوا کہ اس نے کیا سودا کیا تھا۔ کتنے دن صفیہ سنبھل نہیں سکی اور وہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتی تھی اس لیے اندر ہی اندر کھٹکتی رہی۔ پھر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اس نے یہ ڈائری لکھی۔ اس نے اعتراف کیا کہ اس سے کیا گناہ سرزد ہوا تھا۔ اس نے کسی کی گودا جاڑی تھی اور نتیجے میں اس کی گودا جڑ گئی۔ اس نے ڈائری، بچی کی فراک اور کپڑے کی گڑیا ایک چھوٹے سرخ سوٹ کیس میں رکھ کر اسے اوپر کیا ڈالے کمرے میں ڈال دیا تھا کبھی کبھی وہ وہاں جا کر ڈائری نکالتی اور اس میں اپنے احساسات تحریر کرتی۔ جب بیٹے کی موت کو اکیس سال ہونے کو آئے تو اس خوف سے اس کی حالت خراب ہونے لگی کہ پھر اس کی واجدہ جانے والی اولاد کی شامت آئے گی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ ایسا ہونے سے پہلے مر جائے مگر موت بھی اپنی مرضی سے کہاں آتی ہے۔

صبا نے گہری سانس لے کر ڈائری بند کر دی۔ اس کی ماں یعنی صفیہ کو بالآخر اس کی مرضی کی موت آگئی اور اس نے اپنی جان دے دی۔ اس نے کمرے میں جا کر گیس ہیٹر کھول دیا اور بستر پر لیٹ گئی۔ جب تک صبا کو احساس ہوتا اور وہ دروازہ تڑوا کر اندر داخل ہوتی، گیس نے صفیہ کی جان لے لی تھی۔ شامیر نے اسے پتلے کے بارے میں بتایا اور عمیر نے جب اس کی سوئی نکالی تو نہ صرف صفیہ ٹھیک ہو گئی تھی بلکہ سونیا کے پیٹ کی تکلیف بھی ٹھیک ہو گئی تھی۔ صبا نہیں جان سکی کہ یہ سب کیسے ہوا۔ اپنی ماں کا تو اس معاملے سے تعلق سمجھ آ گیا تھا مگر سونیا کا اس سے کیا تعلق تھا جو اس کے پیٹ میں درد ہوا؟ پھر عمیر نے پتلے سے سوئی نکال دی تو وہ ٹھیک ہو گئی۔ صبا ان چیزوں کی قائل نہیں تھی۔ اس کا عقیدہ تھا کہ سب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور اس کی مرضی کے بغیر کوئی کسی کو نہ تو نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ فائدہ۔ اس نے بچوں کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ ان باتوں کا ذکر کسی سے نہ کریں۔ صفیہ کی موت اس کی نفسیاتی کیفیت کے پیش نظر حادثاتی قرار پائی۔ ماں نے جو کیا وہ غلط تھا اور شاید اسی کی سزا بھی بھگتی لیکن صبا اور اس کی اولاد بے گناہ تھی۔ اس لیے اوپر والے نے ان کی حفاظت کی۔ صبا نے فیصلہ کیا کہ وہ اس بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گی اور سرخ سوٹ کیس میں موجود چیزیں ضائع کر دے گی۔ ساتھ ہی اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ یہاں نہیں رہے گی۔ صفیہ کے بعد مکان اس کی ملکیت تھا اور اس نے اسے فروخت کرنے کا سوچ لیا تھا۔

Downloaded From
PAKSOCIETY.COM

شیش محل

اسماء تادری

قسط: 8

جہاں پر انسان کی بے بسی کی ابتدا ہو... وہیں سے رپ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گہری مختصر بسی فانی زندگی کے پیچ و خم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین و فطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کر دیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جیسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و خیر کے پردوں میں شوق و آرزوئوں کی آگ کا شوق و آستان

READING
Section

سپینس ڈائجسٹ 64 اپریل 2016ء



یہ قیام پاکستان سے قبل کا زمانہ ہے۔ جو لیٹ ایک مقامی عیسائی لڑکی ہے جس کے والدین نے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے کے باوجود اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی ہے اور وہ ایک اخبار کے دفتر میں ملازمت کر رہی ہے۔ اس کا محبوب اور نکاح نیلو حارف بھی اس کا کونیک ہے۔ مذاہب کے فرق کے باوجود وہ ایک دوسرے سے شادی کے خواہش مند ہیں لیکن عارف پہلے اپنی بہنوں کے فرض سے فارغ ہونا چاہتا ہے۔ زمانہ طالب علمی میں ان کی ایک سانھی شا بھی رہی ہے جو عارف کو پسند کرتی ہے لیکن عارف کے جو لیٹ کی طرف جھکاؤ اور طبقاتی فرق کی وجہ سے مکمل ٹراٹھار نہیں کرتی اور ایک جاگیر دار و سیاست داں ولد دار آغا سے شادی کر لیتی ہے۔ ولد دار آغا کا گھر گیس سے تعلق رکھتا ہے۔ جو لیٹ اپنے اخبار کی طرف سے ولد دار آغا کا انٹرویو لینے جاتی ہے۔ ولد دار آغا اچھے کردار کا مالک نہیں ہے۔ اس کے انٹرویو کے بعد جو لیٹ مشکل میں پڑ جاتی ہے۔ آغا کی طرف سے پیغامات اور تحائف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور ان حربوں میں ناکامی کے بعد بالآخر جو لیٹ کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ حالت بے ہوشی میں اسے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ آغا سے نکاح پر راضی ہو جائے۔ جو لیٹ کے انکار کو خاطر میں لائے بغیر نکاح کے انتظامات جاری ہوتے ہیں کہ شا اس کی مدد کے لیے پہنچ جاتی ہے اور اسے فرار کر دیتی ہے۔ لٹی پٹی جو لیٹ گھر پہنچتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے لٹنے کی داستان اس سے پہلے گھر پہنچ چکی ہے اور اس کی ماں جو زین حریکتو قلب بند ہونے سے مرگئی ہے۔ باپ جوزف بھی بیٹی اور بیوی کے دکھ میں بستر سے لگ جاتا ہے۔ ان مشکل حالات میں جو لیٹ عارف سے جذباتی اور اخلاقی سہارے کی خواہش مند ہوتی ہے لیکن عارف ایک روایتی مرد کی طرح داغ و آرائی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں جو لیٹ اپنے مجرم سے انتقام لینے کا فیصلہ کرتی ہے اور اس سلسلے میں محلے کے ایک بد معاش فاروق کی مدد لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ فاروق رین دادا کے اڈے سے وابستہ ہے اور جو لیٹ کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ جو لیٹ اس کے جذبات سے واقف ہے لیکن ظاہر ہے ایک فنڈے کی محبت کو قبول نہیں کر سکتی۔ وہ اس کے ایک سانھی سے ایک مہنگ چاقو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس چاقو کی مدد سے وہ ولد دار آغا کو قتل کرنے کی خواہش مند ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ان جلسے جلوس میں پابندی سے شرکت کرتی ہے جن میں آغا کی موجودگی کا امکان پایا جاتا ہے لیکن اسے تمام تر کوشش کے باوجود اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہو پاتی۔ کشمکش کے اس عرصے میں اس کے باپ جوزف کی حالت خرید خراب ہو جاتی ہے اور سرنے سے قبل وہ جو لیٹ کو بتاتا ہے کہ اس کی ماں جو زین نے اس کے لیے ایک صندوق میں کچھ چیزیں رکھ چھوڑی ہیں۔ جو لیٹ صندوق کھولتی ہے تو اس میں سے ایک ڈائری، ہیرے جڑا ایک لاکٹ اور دھندلائی ہوئی ایک بلیک اینڈ وائٹ تصویر برآمد ہوتی ہے۔ تصویر جو زین اور ایک اجنبی مرد کی جوانی کی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

کیا کہ بھلا کا جو لہجہ اسے ناگوار گزر رہا تھا، وہ ایک طرح سے اس کا حق تھا۔ وہ بھائیہ کی بیٹی تھی اور ظاہر ہے اپنے باپ کے بیٹکے کے باہر کسی اور کو راستے میں ڈٹا سوال جواب کرنا دیکھ کر خود اس نے ناگواری محسوس کی ہوگی۔

”اب آپ مجھے اندر جانے کا راستہ دیں گے یا نہیں؟“ اس نے فاروق کو مخاطب کیا تو وہ چونک کر ایک طرف ہو گیا۔ بھلا خوشبو کے جھونکے کی طرح اس کے قریب سے گزر کر اندر داخل ہو گئی۔ ولایتی لباس کے ساتھ ہی اس نے کسی ولایتی خوشبو کا بھی استعمال کر رکھا تھا۔ اس کے نظروں سے غائب ہو جانے کے بعد فاروق نے بے ساختہ ہی اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ پہلی نظر میں بھلا اسے بہت کم عمر لگی تھی اس لیے اسے سامنے پا کر اسے ذرا بھی یہ گمان نہیں گزرا تھا کہ وہ بھائیہ سینٹھ کی بیٹی ہوگی کیونکہ بھلا کے متعلق جو معلومات اسے حاصل تھیں، ان کے مطابق وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس کا شوہر مرچکا تھا اور وہ

”آپ نے جواب نہیں دیا۔ کون ہیں آپ اور یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ فاروق ابھی حیران ہی کھڑا تھا کہ اس نے تیز لہجے میں دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔

”خاکسار کو فاروق کہتے ہیں۔ اس بیٹکے کے مالک مسٹر بھائیہ کا مہمان ہوں اور ظاہر ہے ان ہی کی اجازت سے یہاں مقیم ہوں۔“ فاروق کی حیرت پر وہ ناگواری غالب آگئی جو اس نے لڑکی کے حکمانہ لہجے پر اپنے دل میں محسوس کی تھی۔

”اوہ، آئی سی۔“ جواب میں اس نے ایک ادا سے ہونٹ سکڑے اور پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا تعارف کر دینے لگی۔

”میں بھلا بھائیہ ہوں۔ مسٹر بھائیہ کی اکلوتی بیٹی اور اس بیٹکے کی مالک۔“

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“ تعارف سن کر فاروق کو یہ روایتی جملہ ادا کرنا پڑا اور دل ہی دل میں تسلیم

کی اور اس لڑکے کی خاطر باپ کی اتنی بڑی جائداد کو ٹھوک مار کر چلی گئی۔ بد قسمتی سے اس کا شوہر ایک حادثے کا شکار ہو کر ہلاک ہو گیا اور بیوہ ہونے کے بعد سیٹھ نے کوشش کی کہ وہ اس کے پیچھے منوہر سے شادی کر لے لیکن اس بار بھی بھلانے باپ کی خواہش سے انحراف کیا اور دوسرے شہر جا کر کالج میں ملازمت کرنے لگی۔ اب جبکہ منوہر مر چکا تھا تو ایسا لگتا تھا کہ باپ بیٹی کے بیچ کوئی سمجھوتا ہو گیا ہے جب ہی بھلا یہاں نظر آرہی تھی۔ ان ہی سوچوں کے درمیان اس نے چائے ختم ہی کی تھی کہ کیتھرائن اور گولو بھی وہاں چلے آئے۔ صبح کے سلام کے بعد ان دونوں نے بھی ڈائننگ ٹیبل کے گرد رکھی کرسیاں سنبھال لیں۔

”مس صاحبہ کہتی ہیں وہ آپ لوگوں کے ساتھ ہی ناشتا کریں گی۔ کیا آپ ان کے آنے تک انتظار کرنا پسند کریں گے؟“ ملازم نے نہایت مؤدب لہجے میں فاروق سے دریافت کیا۔

”کیوں نہیں۔ نہیں آنے دو۔ ہمیں ناشتے کی ایسی جلدی بھی نہیں ہے۔“ فاروق نے اسے جواب دیا تو ملازم واپس ہلٹ گیا جبکہ اس کے سامنے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگے کہ یہ صبح صبح کن مس صاحبہ کا تذکرہ ہے۔

”مسٹر بھائیہ کی بیٹی مس بھلا بھائیہ کی سواری سویرے سویرے ہی تشریف لائی ہے اور اب غالباً وہ ہمیں اپنی میزبانی سے نوازنے کے موڈ میں ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے ان کو اطلاع دی۔ اس اطلاع کو سن کر گولو اور کیتھرائن نے اس سے بھلا کے سلسلے میں سوال جواب شروع کر دیے۔ وہ اپنی معلومات کی حد تک ان کے سوالوں کے جوابات دیتا رہا۔ تھوڑی دیر میں بھلا سیزھیاں اتر کر نیچے آئی دکھائی دی۔ اس وقت اس نے سفید رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی جو اس کی سروقامت اور گندی رنگت پر بچ رہی تھی۔ ساڑھی کے ساتھ ہی اس نے سرمئی رنگ کی ایک ہلکی سی شال بھی اپنے شانوں پر ڈال رکھی تھی۔ یہ سردی کا موسم نہیں تھا لیکن بہر حال شملہ کی صبح تھپی اور صبح صبح غسل کرنے والا ہلکی سی خشکی محسوس کرتا تھا۔ بھلانے بھی سفر کی گرد اتارنے کے لیے غسل کیا تھا۔ اس کے سیاہ بال پشت پر کھلے ہوئے تھے اور ان میں اچھی خاصی نمی تھی۔ فاروق کو وہ اس بھلا سے خاصی مختلف نظر آئی جس سے آتے کے ساتھ ہی اس کا کھراؤ ہوا تھا۔ وہ بھلا ماڈرن اور کم عمر نظر آتی تھی جبکہ اس وقت جو بھلا اس کے سامنے تھی، وہ خاصی گریس فل اور میچور خاتون محسوس ہو

ایک کالج میں پیکچر تھی۔ پہلی نظر میں بہت کم عمر نظر آنے والی بھلا اس کے ذہن میں بسی ایک پختہ عمر عورت کے خیال پر پوری نہیں اترتی تھی اس لیے وہ خطا کھا گیا تھا۔ اپنی اس غلط فہمی پر کچھ کچھ جھینپا ہوا وہ ملازم کو گاڑی کی ڈکی سے بھلا کا سامان اتارتے ہوئے دیکھنے لگا۔ ملازم بھلا کے اندر جانے کے فوراً بعد ہی باہر آیا تھا اور اب ڈکی سے اس کا بھاری بھر کم سوٹ کیس نکال رہا تھا۔

”آپ کی چائے ریڈی ہے سر۔ آپ کدھر پینا پسند کریں گے؟“ سوٹ کیس میں پیسے لگے ہوئے تھے لیکن ملازم نے اسے پیوں پر چلا کر لانے کے بجائے اپنے کاندھے پر اٹھا رکھا تھا اور فاروق کے قریب سے گزرتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا۔

”اندرو ڈائننگ ٹیبل پر ہی لے آؤ۔“ فاروق نے اسے جواب دیا اور اس کے پیچھے ہی خود بھی اندر جانے کے لیے قدم اٹھائے۔ ڈرائیور کے علاوہ اس پتکے میں یہی ایک مستقل ملازم تھا جو باورچی خانہ بھی سنبھالتا تھا۔ البتہ صفائی اور برتنوں اور کپڑوں کی دھلائی کے لیے مقامی آبادی سے صبح و شام ایک عورت وہاں آتی تھی۔ ملازم ہی سے اسے علم ہوا تھا کہ کسی خاص موقع پر جب مہمانوں کی تعداد زیادہ ہو تو وہ عورت اس کے کہنے پر اس کی مدد کے لیے بھی رک جاتی تھی۔ ظاہر ہے یہ خاص موقع بھائیہ سیٹھ کے یہاں قیام کے دنوں میں ہی آتا ہوگا اور سیٹھ شاید سال میں ایک آدھ بار ہی یہاں آ پاتا تھا۔

بھلا کا سوٹ کیس اس کے کمرے میں پہنچانے کے بعد ملازم نے فاروق کو چائے پیش کی۔ وہ چائے اچھی پاتا تھا بلکہ اس کے ہاتھ میں ہی ڈالٹھ تھا کیونکہ اس نے اب تک جو کچھ بھی پکا کر کھلایا تھا ان لوگوں کو پسند آیا تھا۔ وہ فاروق کو چائے پیش کر کے پلٹا ہی تھا کہ اوپری منزل سے بھلانے اسے پکارا۔ وہ فوراً سیزھیوں کی طرف دوڑ گیا۔ یہاں رہتے ہوئے یہ بات پہلے ہی فاروق کے علم میں آ چکی تھی کہ پتکے کی اوپری منزل پر مالکوں کے کمرے ہیں۔ مالکان سے مراد بھلا، منوہر اور بھائیہ سیٹھ خود تھا۔ مہمانوں کو عام طور پر چھٹی منزل کے کمروں میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ چائے پینے کے دوران فاروق بھلا کی یہاں آمد کے بارے میں غور کرنے لگا۔ بھائیہ کی زبانی جو حالات اس نے علم میں آئے تھے، ان کے مطابق بھلا اچھی خاصی باغی لڑکی تھی جس نے پہلے باپ کی مرضی کے خلاف اپنی پسند سے اپنے سے کم مافی حیثیت رکھنے والے لڑکے سے شادی

رہی تھی۔ ”آئی ایم سوری۔ آپ لوگوں کو انتظار کرنا پڑا۔ اصل میں، میں ناشتے سے پہلے فریش ہونا چاہتی تھی۔ آئی ہوپ کہ آپ لوگوں نے ماسٹرنہیں کیا ہوگا۔“ ڈائمنگ میبل کی سربراہی کرسی پر براجمان ہوتے ہوئے اس نے یہ چند جملے ادا کیے۔ اس کا لہجہ بہت ٹھہرا ہوا اور دلکش تھا۔ یقیناً جب وہ کلاس میں لپکھرتی ہوگی تو طلباء بہت دھیان سے اس کی بات سنتے ہوں گے۔

”اٹس اوکے۔ ہم میں سے کسی کو بھی آپ کا انتظار گراں نہیں گزرا۔“ فاروق نے اسے جواب دیا اور اپنے ساتھیوں کا تعارف کروانے لگا اس دوران میں ملازم نے میز پر ناشا لگانا شروع کر دیا تھا۔

”ہوں..... کرشن نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کچھ بیمار ہیں اور ڈاکٹر کے دیے گئے تہدیلی آپ وہاں کے مشورے پر یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“ تعارف سننے کے بعد اس نے اپنی معلومات کا اظہار کیا۔ ظاہر ہے وہ بالکل سچی اس لیے ملازم نے اس کے پوچھے بنا بھی پتھلے میں موجود ان اجنبی افراد کے بارے میں اسے معلومات فراہم کر دی ہوں گی۔ ناشتے کے دوران ہی اس نے فاروق کی بیماری کی نوعیت کے بارے میں سوال وجواب کیے اور پھر اس کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کرتی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اس نے بے حد مختصر ناشا کیا تھا۔ کھن لگا ایک سلائس اور جوس کا گلاس بس یہ اس کا ناشا تھا۔

”معاف کیجیے گا۔ میں تھکی ہوئی ہوں اور آرام کرنا چاہتی ہوں اس لیے آپ لوگوں کو زیادہ وقت نہیں دے سکتی۔“ وہ ان سے معذرت کرتی ہوئی ڈائمنگ روم سے رخصت بھی ہو گئی۔

”کچھ بھی نہیں کھایا۔“ گولو نے ڈائمنگ میبل پر موجود ڈھیروں ویسکا و بدلیسی ناشتے کے لوازم پر ایک نظر ڈال کر گویا ہلاکی کا قدری پرفانسوس کا اظہار کیا۔

”وہ کہہ تو گئی ہیں کہ تھکی ہوئی ہیں اور تھکن میں انسان سے زیادہ کھایا پیا کب جاتا ہے۔ تم جو ہوان چیزوں سے انصاف کرنے کے لیے۔ تم مزے کرو۔“ فاروق نے اسے جواب دیا۔

”ایسن تو کھائے گائیں۔ مالک نے کھانے کے لیے ہی یہ ساری نعمتیں اوپر سے اتاری ہیں۔“ گولو نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا اور ایک ڈش کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ فاروق اس کا جواب سن کر مسکرایا اور چائے کا

☆☆☆

خوب صورت پھولی وار لانگ اسکرٹ میں ملبوس جوزفین کے چہرے پر خوشیوں کے رنگ تھے۔ بڑی مدت بعد ملنے والا یہ نیا جوڑا کھن کر وہ کالی ویرنگ آئینے کے سامنے کھڑی رہی تھی۔ کھن کا دور بس ختم ہوا ہی جاتا تھا اور نوجوانی کی آمد آتی تھی اور اسی حساب سے اس کے چہرے پر وہ روپ نظر آنے لگا تھا جو کسی منہ بند نوجوانی کا خاصہ ہوتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ آج اسے خود بھی اپنا آپ اچھا لگا تھا اور وہ اپنے اندر کسی تبدیلی کی آہٹیں سن رہی تھی۔ یہ آہٹیں آتی جوانی کی آمد کا اعلان تھیں لیکن عموماً بدرنگ و بوسیدہ لباس سے تن ڈھانپنے والی جوزفین کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ خوب صورت ہے اور ہرگز رتا دن اس کی خوب صورتی میں اضافہ کرنا چاہا ہے۔ اپنے آپ سے بے نیاز دن بھر وہ یا تو اپنی پڑھائی میں مصروف رہتی یا اپنے اور جوزف کے گھر کے کام نمٹاتی رہتی۔ اسے تو یہ بھی اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ ہمیشہ ہی سے اس کی محبت کا دم بھرنے والے جوزف کی محبت کے رنگ بدلنے لگے تھے اور وہ کچھ خاص نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

اس کے لیے تو اب بھی جوزف ایک ایسا دوست تھا جس سے وہ خود بھی بے حد محبت کرتی تھی لیکن جوزف کی طرح ابھی اس کے دل نے اس محبت کو کوئی عنوان نہیں دیا تھا۔ وہ اس سے بڑی بے زیا محبت کرتی تھی اور جانتی تھی کہ جوزف بھی اسے بے تحاشا چاہتا ہے اور جوزف کی محبت سے تو سب ہی واقف تھے اسی لیے تو کسی نے جوزف کے اس کے لیے کرسس کا خصوصی تحفہ لانے کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا، نہ ہی اس بات میں کوئی مستحق خیزی محسوس کی تھی۔

”یو آر لٹل سو پرٹی۔“ تو لیا فیکٹری میں دن بھر مشقت کرنے والی اس کی ماں کو بھی آج بہت عرصے بعد فرصت ملی تھی کہ اس کی طرف غور سے دیکھ سکے اور دیکھا تھا تو بے ساختہ ہی تعریف بھی کر ڈالی تھی۔

”تھیک یو سوچ مام۔ جوزف کی چوائس اچھی ہے۔ وہ میرے لیے اتنا بیوٹی فل ڈریس لایا ہے کہ اسے کھن کر مجھے اچھا لگتا ہی تھا۔“ اس نے ماں کی بات کا جواب دیا اور بیروں میں جوتے پہننے لگی۔ یہ جوتے پچھلے کرسس پر اسے دلوائے گئے تھے لیکن بے حد احتیاط سے پہننے کے بعد اب بھی اچھی حالت میں تھے۔ جوتے کھن کر

جہاں سائنس کا زکا بھی مشکل ہی سے اپنی شکل دکھاتا تھا۔ مشتری سے وابستہ افراد کو اگر اس محلے کا خیال آجاتا تھا اور وہ چندے کی رقم سے تنائف سے لدے پھندے سائنس کا زکا اس طرف روانہ بھی کر دیتے تھے تو سائنس کے پاس موجود تھے اس محلے میں بے سہارا پھرتے تنگ دھڑنگ بچوں کی کثیر تعداد کے مقابلے میں کم پڑ جاتے تھے اور یہ تھے کوئی ایسے قیمتی بھی نہیں ہو کرتے تھے۔ سستے چاکلیوں کا بیکنگ، کریم لگے بسکٹ، رنگ برنگی گولیاں، گچی پلسلس، لکھنے کی تختیاں، پلاسٹک کے ہار بندے بس بھی کچھ ہوتا تھا سائنس کے پاس ان کے لیے۔ بچے ان تھنوں پر بھی ٹوٹ پڑتے تھے کیونکہ انہیں کوئی تحفے دینے والا تھا ہی نہیں۔ زندگی کے پیسے کو کسی نہ کسی طرح متحرک رکھنے کی مشقت میں جتنا ان کے والدین کی اتنی استطاعت ہی نہیں تھی کہ کریمس منا سکیں۔ وہ کرسس کی صبح جاگنے پر اپنے بچوں کو ان کی کوئی من پسند شے یہ کہہ کر تختیاں نہیں دے سکتے تھے کہ رات سائنس ان کے لیے یہ تحفہ دے گیا ہے۔ باپ کی زندگی میں جوزفین کے لیے پھر بھی چھوٹے موٹے تحفے آجاتے تھے لیکن اس کے بعد اب کہیں جا کر اسے کسی نے کچھ دیا تھا اور اسے یہ تحفہ بہت پسند آیا تھا۔ اس کی پسندیدگی کا یہ عالم تھا کہ سردی کا موسم ہونے کے باوجود اس نے اپنے لباس پر کوئی گرم سویٹر یا شال نہیں لی تھی۔ اصل میں وہ اس بوسیدہ لباس پر اپنا گھسا ہوا، رنگ اڑا سویٹر پہن کر اس کی شان نہیں نکھاتا چاہتی تھی اس لیے سردی برواشت کرنا قبول کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ چلتے جوزف نے البتہ گرم کپڑے پہن رکھے تھے یہ اور بات کہ کپڑے اپنی بد رنگی اور خراب فننگ کے باعث خود یہ گواہی دے رہے تھے کہ انہیں لنڈا بازار سے خرید گیا ہے۔ لنڈا بازار سے اس گھسے ہوئے سوٹ کی خریداری اس لیے ممکن ہو سکی تھی کہ ماں کا بخار غیر متوقع طور پر جلد اتر گیا تھا اور وہ دوا کے خرچے سے بچ جانے والے روپوں سے اپنے لیے یہ لباس خرید لایا تھا۔ باقی کے چند روپے اس نے اس سرس میلے میں جانے کے لیے بچا لیے تھے جو خصوصاً کرسس کی وجہ سے لگا تھا اور وہ جوزفین کو اس میں گھمانا چاہتا تھا۔

”تم نے بھی سرس دیکھا ہے جوزف؟“ اس کے ساتھ ساتھ چلتی جوزفین نے اس سے اشتیاق سے پوچھا۔

”ہاں دیکھا ہے۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

وہ سیدھی کٹری ہوئی اور دیوار میں نصب انوکھے انداز سے آئینے میں ایک بار پھر اپنا چہرہ دیکھا۔ آئینہ لمبائی کے رخ چٹا ہوا تھا چنانچہ جب وہ اس میں اپنا عکس دیکھتی تھی تو وہ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا تھا۔ اس کے باوجود سچائی اپنی جگہ قائم تھی اور آئینہ یہی کہہ رہا تھا کہ وہ بہت اچھی لگ رہی ہے۔ اسے آواز دینا ہوا جوزف گھر کے اندر آیا تو اس کی آنکھوں نے بھی یہی سچ کہا جسے اپنی دھن میں من جوزفین سن نہیں سکی۔

”تم ریڈی ہے جوزفین تو اب چلنے کا ہے۔ لیٹ ہو گیا تو پورا انجوائے نہیں کر سکے گا۔“ جوزف نے اسے مخاطب کرتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”یہ تو کب سے ریڈی ہے۔ بس مر میں خود کو دیکھنے میں بڑی ہے۔ کہتی ہے مئی جوزف نے اتنا ہیوٹی فل ڈریس گفٹ کیا ہے کہ اس کو پہن کر میں بھی ہیوٹی فل لگنے لگی ہوں۔“ جوزفین کی ماں نے ہنس کر جوزف کو بتایا۔ جوزف اس بات کو سن کر محض ہنس پڑا اور اسے یہ کہنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ خریدتے وقت اسے یہ ڈریس جتنا اچھا لگا تھا جوزفین کے تن پر جتنے کے بعد اس سے کئی گنا زیادہ خوب صورت لگ رہا ہے۔ اسے جوزفین کی سوچ اور طبیعت کا اچھی طرح علم تھا۔ وہ پڑھ لکھ کر اپنے حالات بہتر بنانے کی خواہش رکھتی تھی۔ اس کے لیے اس طرح کے براہ راست اظہار بہت مشکل از وقت بات ہو جاتی اور ممکن تھا کہ وہ ڈسٹرب ہو جاتی اس لیے جوزف کچھ کہنے میں احتیاط ہی کرتا تھا۔ پھر وہ خود بھی تو ابھی ایک نو عمر سالز کا ہی تھا جس کی اپنی بھی ایسی بات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ اس نے اپنے ہم عمر لڑکوں کو کٹی کے کٹڑ، وکالوں کے تھڑوں اور اسکول کے گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر لڑکیوں سے متعلق بہت کھلی گفتگو کرتے سنا تھا لیکن وہ خود جوزفین کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے لیے بہت خاص اور مقدس تھی۔

”اب چلو بھی۔ کیا ہمیں کھڑے بیٹھے رہو گے؟“ جوزفین کو مئی کے تبصرے اور جوزف کی ہنسی نے جھینپ میں جلا کر دیا تھا اور اسی جھینپ کو مٹانے کے لیے وہ جوزف سے تیز لہجے میں بولی تھی۔

”ہاں چلو، چلتے ہیں۔“ جوزف اس کے لہجے پر بوکھلا تا ہوا فوراً باہر کی طرف لپکا۔ جوزفین اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ وہ دونوں اپنے کرسس کو انجوائے کرنے جا رہے تھے۔ وہ ایسی غریب بستی کے باشندے تھے

اسے اسٹالز کے درمیان لیے کھوتا رہا تھا۔ خریداری تو دونوں ہی کو نہیں کرنی تھی کہ جیب اجازت نہیں دیتی تھی لیکن وہاں موجود ہر شے کو انہوں نے بہت شوق سے دیکھا اور ان کی ہمتیں بھی معلوم کیں۔

”تو ادھر بیٹھ جوڑفین۔ اپنا تیرے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہے۔“ جب وہ اسٹالز کے درمیان بہت دیر تک گھوم چکے تو جوڑف نے اس سے کہا۔ وہ اس چھوٹا بھاری کے قریب بیٹھ گئی جس میں سنا تھا کہ جل پری یعنی پھل کی دھڑ والی عورت رکھی گئی تھی۔ اس عورت کو دیکھنے اور اس سے باتیں کرنے کے شوق میں کئی من چلے اس چھوٹا بھاری کا رخ کر رہے تھے۔ یہاں تپالوں کی مدد سے کئی ایسے پارٹیشن بنائے گئے تھے جن کے باہر بڑے بڑے ہاتھ پیر اور ڈالگے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی ایک بندہ بھوپور پر اعلان بھی کرتا جاتا تھا کہ تپال کے اس پار آنے والوں کے لیے کیسی حیرت و مسرت سے بھرپور لمحے فکریں ہیں۔ کہیں موت کا کنواں تھا تو کہیں ری پر چلتے بازی گر..... کہیں بات بات پر مجھتے کو ہنسی سے لوٹ پوٹ کر دینے والے جو کر کا تڑ کرہ تھا تو کہیں آگ کے دائروں سے گزر جانے والے ماہر انسان و حیوان کے قصے۔ اس نے اور جوڑف نے سرکس کے اس میدان میں گھومتے ہوئے ہر طرح کا اعلان سنا تھا۔ ان کے دل اندر ہی اندر لپکائے بھی تھے کہ وہ بھی اپنی آنکھوں سے ایسے عجیبوں کو دیکھیں لیکن ایسے ہر تماشے کو دیکھنے کے لیے الگ سے ٹکٹ لینا پڑتا اور ٹکٹ کے لیے رقم ان کی جیبوں میں نہیں تھی۔ خالی جیبیں رکھنے والوں کے دل نا تمام خواہشات سے بھرے انہیں دبائے رکھنے میں ماہر ہوتے ہیں سوان و دونوں نے بھی اپنی خواہش کو دل میں دبا لیا تھا۔

جل پری والی چھوٹا بھاری کے قریب بیٹھی جوڑفین نے جوڑف کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی اپنی جگہ سے حرکت کی اور اس اسٹال پر پہنچ گئی جہاں اس نے مختلف رنگوں کے گھون والی انگوٹھیاں دیکھی تھیں۔ پلاسٹک کے ٹکینوں والی ان انگوٹھیوں کے نرخ ایسے تھے کہ وہ ان میں سے ایک عدد انگوٹھی خرید سکتی تھی۔ انگوٹھی اس نے پہلے ہی پسند کر لی تھی لیکن جوڑف کی موجودگی میں خریدنے سے گریز کیا تھا۔ اب جو موقع ملا تو جھٹ پھٹ جا کر خرید ڈالی۔ سلور کے ہلکے سے دھاتی رنگ میں جڑا کچی جیسے رنگ کا بیضوی ٹکینہ دیکھنے میں آنکھوں کو پھلا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ انگوٹھی خرید کر واپس آئی تو جوڑف ابھی واپس نہیں آیا تھا۔

”وہاں بہت مزہ آتا ہے کیا؟“ جوڑفین نے دریافت کیا۔

”ہاں، بہت مزہ آتا ہے۔“ اس کے مصحوم اشتیاق کا جواب دیتے ہوئے وہ کبھی بھی یہ بتانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ وہ سرکس مزہ کرنے نہیں، جزوقتی کام کرنے جاتا تھا جس سے اپنی آمدنی میں کچھ اضافہ کر سکے۔ ان کاموں میں سب سے اہم کام صنائی کا ہوتا تھا اور یہ صنائی کوئی معمولی نہیں ہوتی تھی۔ اسے انسانوں کے پھیلائے گند سے لے کر سرکس کے جانوروں کی غلاظت تک سب کچھ صاف کرنا پڑتا تھا۔

”تم کو یوئے ہونے کا بہت بینیفٹ ملتا ہے جوڑف۔ تمہارا جوبل چاہتا ہے کرتے ہو اور جہاں دل چاہتا ہے چلے جاتے ہو۔“ جوڑفین نے اس پر رشک کیا۔ اس بار بھی جوڑف بس مدبرانہ انداز میں مسکرا کر رہ گیا۔ راستے بھر جوڑفین اس سے ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی رہی اور پھر جب وہ سرکس والے میدان میں داخل ہوئے تو جوڑفین کو یا جہان حیرت میں داخل ہو گئی۔ مختلف کھانے پینے کی اشیاء کے اسٹال، آرائش و زیبائش کی سستی اشیاء کی دکائیں اور مختلف تماشوں کے لیے اعلان کرتے سرکس کے مختلف دھاریوں کے علاوہ جھولوں والے ڈول والے جھولے کے قریب پہنچ کر تو جوڑفین کا دل چل چل گیا۔ کڑی کی ڈولیاں جن میں چھوٹی بڑی عمروں کے بچے بیٹھے ہوئے تھے، جھولے والے کے ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ یہ ڈولیاں اوپر نیچے حرکت کرتی تھیں اور لٹھوں میں اوپر والے نیچے اور نیچے والے اوپر پہنچ جاتے تھے۔ حرکت کرتی ڈولیوں میں بیٹھے بچے پُرسرت چہنیں مار کر اور بھی جوڑفین کے دل کو بھاتے تھے لیکن وہ اس جھولے پر بیٹھنے کی اپنی خواہش کو اس لیے پورا نہیں کر سکتی تھی کہ اس کی منشی میں گنتی کے چند ہی سکے دبے تھے جو اس کی ماں نے اسے اس میلے سے لطف اندوز ہونے کے لیے عنایت کیے تھے لیکن وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ ان سکوں کو کس مقصد کے لیے استعمال کرنا ہے چنانچہ اپنی خواہش کو دل میں ہی دبانے کی کوشش کرتے ہوئے آگے بڑھنا چاہا مگر جوڑف نے اس کی خواہش کو اس کی آنکھوں میں پڑھ لیا تھا چنانچہ اصرار کر کے اسے جھولے میں بٹھایا اور پیسے اپنے پلے سے دیے۔ خود وہ یہ دیکھ کر ساتھ نہیں بیٹھا تھا کہ میں بڑا ہو گیا ہوں اور ایسے بچوں والے شوق نہیں رکھتا۔ جھولا جھلانے کے بعد وہ

ہو گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔“ اس نے فوراً ہی انکار کر دیا۔

”اور جو میرا گلا خراب ہو گیا؟“ چنا چاٹ اور سوڈے کی بوتل کے خوشگوار تجربے سے لطف اندوز ہوتی اس بار وہ ذرا سی کھنگلی اور جوزف کو غور سے دیکھتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

”نہیں ہوگا..... تو آرام سے پی۔“ جوزف نے اسے تسلی دی۔

”نہیں۔ اگر تم نہیں کھاؤ پو کے تو میں بھی کچھ حلقے سے نیچے نہیں اتاروں گی۔“ وہ مضبوطی سے منہ بند کر کے بیٹھ گئی۔

”تجھے بولا ہے تاکہ اپن کے پیٹ میں گڑ بڑ ہے۔“ جوزف نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”یہ سب میں نہیں جانتی۔ بس تمہیں بھی میرے ساتھ کھانا پینا ہوگا۔“ اس نے ضد کی کیونکہ وہ سمجھ گئی تھی کہ ہمیشہ

اس کی خاطر قربانی دینے والا جوزف اس وقت بھی قربانی دے رہا ہے۔ یعنی طور پر اس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی کہ وہ

دونوں کے لیے الگ الگ چیزیں خرید سکتا اس لیے صرف جوزف کے لیے لے آیا تھا اور خود اس لیے حصے دار نہیں بن رہا تھا کہ وہ دل بھر کر کھا پی لے۔

”کبھی کبھی تو بہت تنگ کرتی ہے۔ لا کھلا اور اگر میرے پیٹ کا درد بڑھانا تو تم ذمے دار ہوگی۔“ جوزف کو

تھمسیار ڈالنے پڑے۔ ان دونوں نے مل کر چنا چاٹ کی پلیٹ اور سوڈے کی بوتل ختم کی۔ جوزف کا خیال تھا کہ اس کے بعد وہ گھر چلے کو کہے گا لیکن اس نے یہ بتا کر حیران کر دیا

کہ وہ اسے ایکروٹ (بازی گر) کے کرتب دکھانے لے جا رہا ہے۔

”تمہارے پاس اس کے لیے پیسے ہیں؟“ جوزف نے اس کا پردرگام سن کر تنگ سے پوچھا۔

”نہیں پر اپن کی، ٹکٹ دیکھ کر پبلک کو اندر چھوڑنے والے لڑکے سے فرینڈ شپ ہے۔ اس نے اپن کو بولا تھا کہ

آجانا۔ موقع لگا کر وہ اپنے کو ایسے ہی اندر بھیج دے گا۔“ جوزف نے اسے بتایا۔ بغیر ٹکٹ کے تماشا دیکھنے جانے کا

تجربہ جوزف کے لیے انوکھا تھا۔ اسے آخری لمحے تک یہ ڈر رہا تھا کہ کوئی انہیں اندر جانے سے روک لے گا۔ وہ ذرا

سیدھے سیدھے راستے پر چلنے والی کچھ کچھ ڈر پوک لڑکی تھی۔ اگر اسے کرتب دیکھنے کی اتنی شدید خواہش نہ ہوتی تو

شاید کبھی اتنا خطرہ نہ مول لیتی۔ اندر جاتے ہوئے اس کے دل میں یہ خواہش بھی جاگنی تھی کہ کاش جل پری کے ٹکٹ چیکر

اس نے دیکھا تھا کہ کھانے پینے کی اٹھیا کے اسٹالز پر بہت زیادہ رش ہے، اس رش میں کچھ خرید کر لانے میں وقت تو

لگتا ہی تھا چنانچہ وہ اطمینان سے بیٹھی جل پری سے متعلق بھونپو پر کیے جانے والے انکشافات سنتی رہی۔ بھونپو میں

بولنے والے کا زور یہاں ایسا تھا اور اس نے جل پری کی اتنی خصوصیات گنوا ڈالی تھیں کہ لوگ اس طرف کھینچے چلے

آ رہے تھے۔ جوزف نے جتنے پیسوں سے انگوٹھی خریدی تھی اسے جل پری کو بھی دیکھ سکتی تھی لیکن اسے اپنی

خریدار ڈرا پر کوئی بچھتاوا نہیں تھا۔ یہ انگوٹھی اس نے جوزف کے لیے لی تھی اور جوزف کے لیے اتنی ہی قربانی دینا کوئی

بڑی بات نہیں تھی۔

”لے پکڑ، اسٹیکل چنا چاٹ کی پلیٹ بنا کر لایا ہوں تیرے لیے۔ ساتھ یہ ٹھنڈی سوڈے کی بوتل بھی ہے۔“ وہ

اردگرد پھیلی رونق دیکھنے میں گمن تھی کہ اپنے قریب سے جوزف کی آواز سن کر چونکی۔ وہ چینی کی سفید پلیٹ

اور سوڈے کی ہری بوتل ہاتھوں میں لیے کھڑا تھا۔ جوزف نے چینی کی پلیٹ کو تمام لیا۔ اس میں چنا چاٹ موجود تھی۔

پلیٹ میں رکھے سلور چمچے سے اس نے چاٹ کا مسالا ملا یا اور پہلا چمچہ منہ میں ڈالا۔ پتلی دال، موسم کی سب سے سستی

سبزی، موٹے چادل اور بے چھنے آنے کی روٹی کھانے کی عادی جوزف کی زبان کو اس تیسرے درجے کی چنا چاٹ کا

ذائقہ بھی بہت عمدہ معلوم ہوا۔

”بہت نیسی ہے۔ تم بھی کھاؤ۔“ بے ساختہ تعریف کرتے ہوئے اس نے پلیٹ جوزف کی طرف بڑھائی جو

سوڈے کی بوتل ہاتھ میں پکڑے اب اس کے برابر میں ہی بیٹھ گیا تھا۔

”تو کھا۔ اپن کا پیٹ ذرا گڑ بڑ ہے تو اپن یہ نہیں کھا سکتا۔“ جوزف نے انکار کیا۔

”یہ تو بڑا برا ہوا۔“ جوزف کو افسوس ہوا کہ جوزف کو اتنے مزے کی چیز سے محروم رہنا پڑے گا خود اسے چاٹ

تہی پسند آئی تھی کہ یکے بعد دیگرے تین چارجے منہ میں ڈالتی ہی چلی گئی۔ مرچیں ذرا زیادہ تیز تھیں، اس کی زبان

چلنے لگی۔ جوزف نے فوراً اس کی طرف سوڈے کی بوتل بڑھائی۔ اس نے جلدی سے ایک بڑا سا گھونٹ لیا پھر خیال

آنے پر یوں۔

”تم سوڈا تو لی سکتے ہو جوزف۔ سوڈے سے تو سنا ہے کہ پیٹ کی خرابی ٹھیک ہو جاتی ہے۔“

”نہیں۔ اپن نہیں پیتا سوڈا اووڈا۔ پی کر گلا خراب

خود سے جدا نہیں کیا تھا۔

☆☆☆

"قاروق بھائی کی طبیعت کیسی تھی؟ وہ ٹھیک تو تھے نا؟" ربن کو شربت کا گلاس پیش کرتے ہوئے جو نے اس سے ور یافت کیا۔ ربن کو کبھی پہنچے چند گھنٹے ہی ہوئے تھے۔ اس کی صورت دیکھ کر اڈے پر موجود افراد کھل اٹھے تھے۔ بس نہیں چلتا تھا کہ خوب سمجھ بھجھ کر اس سے گلے ملیں لیکن اول تو ربن کا احترام اور دوسرے رامو کی سختی نے انہیں اپنے جذبات پر بند باندھنے پر مجبور کر دیا۔ رامو نے ان سب کو ربن کے گرد جمع ہوتے دیکھ کر ڈپٹ دیا تھا کہ دادا ابھی سفر سے تھکا ماند ادا پس آیا ہے اس لیے اسے نہاد دعو کر سفر کی وصول اور گرد اتارنے اور آرام کرنے کا موقع دیا جائے۔ ربن بھی شاید ابھی میل ملاقات کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے اس نے رامو کو انہیں ڈپٹے پر نہیں ٹوکا۔ وہ سارے خاموشی سے منتظر ہو گئے۔ اس کے بعد ربن سچ سچ غسل کر کے اپنے کمرے میں سونے کے لیے چلا گیا۔ دو گھنٹے بعد اس نے رامو کو اپنے کمرے میں بلوایا اور اپنی غیر موجودگی میں پیش آنے والے حالات و واقعات کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا۔ رامو اس کے کمرے میں آنے سے قبل سب کو ہدایت دے کر آیا تھا اس لیے وہ ٹرنے میں شربت کے گلاس اور کھانے کے دو تین ہلکے پھلکے آسٹم رکھ کر لے آیا تھا۔ کھانے کا وقت ہونے میں ابھی خاصی دیر تھی اور رامو کا خیال تھا کہ راستے میں کھانا کھالینے کا بتا کر آنے کے بعد کچھ کھائے پیے بغیر سو جائے والے ربن کو بھوک محسوس ہو رہی ہوگی۔ جو نے نہایت پھرتی سے اس کے حکم کی تعمیل کی تھی اور اب شربت کا گلاس ربن کو پیش کرتے ہوئے اس سے اپنے دل کی بات پوچھ رہا تھا۔

سے جوزف کی دوستی ہوتی تو وہ کہاویوں میں سنی چل پری کو اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیتی لیکن وہ نکٹ چیکر تو کوئی پڑھا پھونس تھا۔ اس سے بھلا جوزف کی کیسے دوستی ہو سکتی تھی۔ یہاں تو اس نے تقریباً اپنے ہی ہم عمر نکٹ چیکر سے یارانہ گھاٹ کر مطلب پورا کر لیا تھا۔ بازی گروں والے حصے میں آ کر اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ بازی کرنے ایسے ایسے کرتب دکھائے کہ اسے کئی بار اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بغیر کسی سہارے کے تھی ہوئی رسی پر چلنا اور مختلف کرتب دکھانا کوئی مذاق نہیں تھا۔ بازی کر کے نن نے اس کا دل موہ لیا اور جب وہ وہاں سے باہر نکل رہی تھی تو اس کے دل سے چل پری کو نہ دیکھ پانے کا غم نکل چکا تھا۔ واپسی کے راستے میں وہ جوزف سے بازی کر کے ایک ایک کرتب کو ڈسکس کرتی رہی اور وہ مدبرانہ انداز میں مسکراتا رہا۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر اسے جوزف کے لیے خریدی گئی انگوٹھی یاد آئی۔

"پہی کر سس جوزف۔" اس نے انگوٹھی اس کی طرف بڑھائی۔
"یہ کیا؟" جوزف انگوٹھی کو دیکھ کر بیک وقت حیران اور خوش ہوا۔

"میں نے تمہارے لیے کر سس کا گفٹ لیا ہے۔ میرے پاس پیسے کم تھے نا تو بس یہی لے سکی۔" اس نے کچھ جھینپے ہوئے شرمندہ سے انداز میں بتایا۔
"اپن کے لیے تو یہ بھی بہت قیمتی ہے کیونکہ یہ تو نے اپن کے لیے لیا ہے۔" جوزف کی آنکھیں جھلملا سی گئیں اور اس نے انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لی۔

"بہت بھولی فل ہے۔" ساتھ ہی اس نے تعریف بھی کی۔
"سچ۔" جوزفین اس کی تعریف پر کھل اٹھی۔
"بالکل سچ۔ اپن اسے ہمیشہ سنبھال کر رکھے گا۔"
جوزف نے اسے یقین دلایا۔ وہ اپنے قول میں کتنا سچا تھا، اس کی گواہ ڈائری پڑھتی جو لیت خود تھی۔ لڑکپن کے دور میں جوزفین کی طرف سے تحفہ ملی وہ انگوٹھی جس کا سلور رنگ کالا پڑ چکا تھا، ہمیشہ جوزف کے پاس رہی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس دور میں جو انگوٹھی اس کی درمیانی انگلی میں آتی تھی، وہ تنگ ہو جانے کے باعث بعد میں اپنی چھوٹی انگلی میں پہننے لگا تھا۔ مرتے وقت بھی وہ انگوٹھی اس کی انگلی میں موجود تھی اور باوجود کوشش کے اتاری نہیں جاسکتی تھی کیونکہ اس انگلی میں بھی وہ بے حد تنگ ہو چکی تھی۔ وہ اپنے دعوے میں اتنا سچا اور رکھا تھا کہ جوزفین کی دی ہوئی اس انگوٹھی کو مر کر بھی

"ٹھیک ہی ہے رے۔ پوری طرح ٹھیک ہو جائے گا تو لوٹ کر ادھر ہی آئے گا۔ کاہے کو اتنا پریشان ہوتا ہے۔" ربن نے اسے تسلی دی۔
"اور گولو..... وہ کیسا ہے؟"

"مڑے میں ہے سالہ۔ پر تم لوگوں کو یاد بھی کرتا ہے۔" ربن نے ہنس کر بتایا۔

"یہ اپنا سب سے چارہ اداں ہو گیا ہے۔ اس کے قاروق بھائی اور گولو یہاں نہیں ہیں تو اس کا من ہی نہیں لگتا ہے۔ سچ بولوں استاد تو جب سے تم لوگ گئے ہو، اس کے بعد

آج رسوئی سے خوشبو نہیں اٹھ رہی ہیں۔ ورنہ تو اپن لوگوں کو تو یہ کیا پکا جلا بھنا پتا نہیں کیسا کیسا پکا کر کھلا رہا تھا۔“ رامو کا انداز چیخنے والے تھا۔ سب نے اس پر خفا سی نظر ڈالی اور احتجاج کے انداز میں بولا۔

”جیا ذتی تو نہیں کرو استاد۔ اپن روزم سے پوچھ کر تمہاری مرضی کا کھانا ہی پکا رہے تھے۔ ابھی کل ہی بکرے کا بھنا گوشت نہیں پکا کر کھلایا تھا کیا؟“

”سالے وہ خالی بھنا گوشت کہاں تھا۔ وہ تو جلا بھنا گوشت تھا۔“ رامو کا انداز چیخنے والے تھا۔ اس بار سب کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات ابھرے اور وہ آہستہ سے بولا۔

”وہ تو اپن ذرا فاروق بھائی کی طبیعت کے بارے میں سوچنے لگ گیا تھا تو وحیان ہنڈیا پر سے تھوڑی دیر کو ہٹ گیا اور ذرا سی لگ گئی۔“

”دیکھا دادا! یہاں سب کیسے دیوانے ہیں اس راج مہاراجے کے۔ پکانے والے سے ڈھنگ سے پکایا نہیں جاتا اور کھانے والوں کے حلق سے چیخ اترنا مشکل ہو جاتا ہے کہ دادا اور فاروق بھائی کے بغیر کھانے میں سواد نہیں آ رہا۔“ رامو نے ہنستے ہوئے رین کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

”اپنا ہیرو ہے ہی ایسا۔ اللہ نے کسی خاص مٹی سے اسے بنایا ہے کہ جو دیکھے اور لے اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔“ رین کا لہجہ بھی فاروق کی محبت سے نچر رہا تھا۔

”بھگوان اسے جلدی اچھا کر دے تاکہ اپنے اڈے کی رونق لوٹ آئے۔“ رامو نے غلوں دل سے دعا کی جس پر سب اور رین دونوں ہی کے دل آئین پکار اٹھے۔ دعا مانگنے والا کس کو پکار رہا تھا انہیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کیونکہ ان کے لیے اصل اہمیت اس غلوں اور محبت کی تھی جو وہ فاروق کے لیے اپنے دل میں رکھتا تھا۔

”جولی کا کیا حال ہے۔ باپ کے مرنے کا تو بہت اثر لیا ہوگا اس نے؟“ سب کو کمرے سے چلا گیا تو رین نے رامو سے دریافت کیا۔

”وہ تو لیٹا ہی تھا۔ جانی بتا رہا تھا کہ بالکل کم صدم ہو گئی تھی۔ اپن کا تو اس سے ملنا ہوا ہی نہیں، بس کر یا کرم میں باہر کے باہر ہی گیا تھا۔ جانی ہی ادھر کی ساری دیکھ رکھ کر تا رہا۔ اپن کا تو ایک پیر ادھر تھا تو دو جا ادھر جو والے اڈے پر بلکہ ادھر تو ذرا کم ہی رہا، زیادہ ادھر ہی نیم گزارا۔ مجو جے جیسے چوٹی پر بیٹھ گیا تھا، پر اڈا چلانے کا ڈھنگ اسے نہیں آتا تھا۔ بہت کم ڈھنگ کے بندے ہیں اس کے اڈے پر،

سارے حرام خوردوں کو جمع کر رکھا ہے۔ ایسے بے تحشے نیلوں کو ٹیکل ڈال کر رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ سالے بار بار سی تراتے ہیں۔ سویرے جلدی اٹھنا، درزش کرنا، چاقو اور خنجر زنی کی پریکٹس کرنا سب انہیں کھلتا ہے۔ علاقے میں بھی بڑی دھاندلی مچا رکھی تھی انہوں نے۔ جس کا جیسے من کرے اپنی چلا رہا تھا۔ پھل، سبزی اور گوشت والے سے لے کر ٹائی اور لوہا تک سب کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اپنا راج جان کر جدھر من بولے منہ مارتے پھر رہے تھے۔ مجو نے کھلا چھوڑ رکھا تھا کہ اسے اس کا حصہ پورا لاکر دے دیں پھر جو چاہے موج مستی کریں۔ ایسے بے لگاموں کو اب حساب کتاب دینا پڑ رہا ہے اور اصول قاعدے سے چلنا پڑ رہا ہے تو بول کھلائے ہوئے ہیں۔ تمہارے نام کا ڈنڈا سر پر نہیں ہوتا تو رسی تڑوا کر بھاگتے۔ ابھی سبھو سالے مجبوری میں دے ہوئے ہیں پر کتنوں کے من میں کالک ہے کہنا مشکل ہے۔ ایک ایک پر نظر رکھنی پڑ رہی ہے۔“ رامو نے اسے تفصیلی جواب دیا۔

”اپنے کو بھی یہ سب پتا ہے پر اپنے کو بھی چاہیے تھا مگر سرکش گھوڑوں کو قابو کرنا آتا ہے۔“ رین نے اسے جواب دیا اور حقے کی منہ سے لگا کر ایک ساتھ دو تین کش لیے۔ یہ حقہ سبھی کمرے میں رکھ کر گیا تھا۔ رین کو اس کے استعمال پر بھی اور دوسرے معاملات کی طرح زبردست قابو حاصل تھا۔ پتا تو یوں کہ بڑے بڑے عادی حقے بازوں کو مات دے دیتا لیکن پینے کے مواقع میسر نہ آتے تو بھی اس پر کوئی اثر نہیں دکھائی دیتا اور نہ ہی وہ عادی افراد کی طرح طلب کے ہاتھوں ستایا ہوا نظر آتا۔

”جو زف کا افسوس کرنے اپن جولی کے پاس جائے گا۔ محلے داری میں بھی اپن کو اس کا خیال رکھنا ہی تھا، پر اپنے شہزادے کے دل کی رانی ہے تو اس کا حق اور بھی زیادہ بنتا ہے۔ یاد رکھنا رامو..... اپن بھی آگے پیچھے ہو بھی جائے تو جولی کے معاملے میں کوئی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔ کل کو شہزادہ شکایت نہ کرے کہ کوئی کمی رہ گئی۔“

”ٹھیک ہے دادا۔“ رامو نے اس کی ہدایت سن کر فرمانبرداری سے کہا۔

”اور یہ اپنی ثریا بالو کا کیا حال ہے۔ کوئی پریشانی تو نہیں اسے؟“ جولی کے بعد اسے ایک اور اہم معاملہ یاد آیا۔

”ٹھیک ہے وہ بھی۔ اپن نے اس کی طرف راشن دے کر بندہ بھیجا تھا پر اس نے شکر یہ کہہ کر واپس بھجوا دیا۔ بولتی تھی سلائی کڑھائی کا کام کر کے اپنی روزی کما رہی ہے

گولڈن نمبر

سردار گھر میں داخل ہوا۔
بیوی۔ ”یر آپ کے چہرے پہ کیا ہوا ہے؟“
سردار۔ ”کبھی تندرہ والوں نے مارا ہے۔“

بیوی۔ ”کیوں؟“
سردار۔ ”ارے پتا نہیں، لگتا ہے پاگل ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ شہتی کارڈ کے گولڈن نمبر دکھاؤ تو پٹائی شروع کر دی..... ہائے بہت درد ہو رہا ہے۔“

☆...☆...☆

وہم

ٹیچر۔ ”بیچو! فعل ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی مثال دو۔ جیسے میں خوب صورت تھی۔ میں خوب صورت ہوں۔ میں خوب صورت رہوں گی۔“
بیچہ۔ ”مس! آپ کو وہم تھا، آپ کو وہم ہے، آپ کو وہم رہے گا۔“

☆...☆...☆

ایک سردار کو نیند نہیں آرہی تھی، سوچا سگریٹ پی لے۔ ماچس کی تلاش میں پورا گھر چھان مارا۔ بالآخر بائیس ہو کر موم بتی بجھا کر سو گیا۔
مرسلہ۔ معراج محبوب عباسی، ہری پور، ہزارہ

تنبیہ

اسکول کے کوریڈور میں اکثر بچے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ میں نے ڈانٹتے ہوئے تنبیہ کی۔ ”اگر اب کوئی بچہ مجھے بھاگتا ہوا نظر آیا تو میں نے پکڑ لیتا ہے اور دو لگانے ہیں۔“
تھوڑی دیر بعد ایک چھوٹا بچہ اکیلا بھاگتا ہوا آ رہا تھا کہ میں نے پکڑ لیا۔ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی بچے نے مصیبت سے کہا۔ ”دو لگائیں میم بی..... دو لگائیں پھر مجھے جانے دیں، مجھے جلدی ہے۔“

مرسلہ۔ عذرا ہاشمی، الائیڈ اسکول گڑھ موڑ

اس لیے اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ رامو نے اسے رپورٹ دی۔

”اچھی بات ہے۔ بندہ کسی کا دیا لے کر کھانے کے بجائے اپنے ہاتھ کی تھوڑی بھی کھائے تو زیادہ خوش رہتا ہے۔“ رین کوثر یا لونا کو کاراشن لونا دینا برا نہیں لگا۔

”ہاں دادا یاد آیا۔ وہ غلامو آیا تھا۔ یوں تھا کلکتے میں اس کے دور کے رشتے داروں میں ایک لڑکا ہے۔ اس کی بیوی بچی کو جنتے ہوئے مر گئی تھی۔ چھوٹی بچی گوماں کے بنا پالنے میں اسے سخت مشکل ہو رہی ہے اس لیے چاہتا ہے کہ دوسری شادی کر لے۔ شادی کے لیے اس کی بس اتنی شرط ہے کہ عورت سمجھ دار اور ہمدرد ہو۔ بچی کی اچھی تربیت بھی کرے اور اس سے محبت سے بھی پیش آئے۔ غلامو یوں تھا شاید یا تو کے لیے یہ رشتہ اچھا رہے گا۔ اپن بولا دادا آجائے تو اس کے کالوں میں بات ڈالتے ہیں۔ پھر جو دادا کی مرضی۔“

”اپنی کیا مرضی۔ اصل ہاں نہ تو ثریا بالو خود یا اس کے ماما ماما کر سکتے ہیں پر تو غلامو سے کہنا کہ اپن سے آکر مل لے۔ اپن پہلے لڑکے کے بارے میں ساری جانکاری کر لے پھر بات آگے بڑھائیں گے۔“ رین نے اسے جواب دیا پھر دوسرے موضوع پر آ گیا۔
”بھائیہ سیٹھ کا کام کیسا چل رہا ہے۔ کوئی شکایت تو نہیں ہے اسے؟“

”ارے نہیں دادا۔ سیٹھ تو بڑا خوش ہے۔ یوں تھا تم لوگوں نے تو کمال کر دیا۔ ایسے ایسے لوگوں سے بھاڑا نکلا لیا جنہوں نے سال سوا سال سے ایک پائی بھی نہیں دی تھی اور جگہ خالی بھی نہیں کرتے تھے۔ اپن بولا سیٹھ چننا نہ کر دو۔ تم نے یہ ذمے داری رین دادا کے اڈے کو دے دی ہے تو اب کسی مائی کے لال میں اتنی ہمت نہیں ہوگی کہ دم بھی مار سکے۔ ہر مہینے پابندی سے کرایہ تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔“ رامو نے رپورٹ دی۔ بھائیہ سیٹھ نے اپنے اس قسم کے سارے کام رین کے حوالے کر دیے تھے۔ وہ اچھے خاصے کاروبار سے حاصل ہونے والے تنگڑے منافع کو عمارتیں اور دکانیں خرید کر مزید منافع کما رہا تھا لیکن بعض کرائے دار کرایہ دینے کے معاملے میں بڑی آنا کانی کرتے تھے۔ سیٹھ کو شک تھا کہ کرائے داروں کی ہٹ دھرمی سے زیادہ یہ اس کے منشی کی نااہلی تھی جو ان لوگوں سے کرایہ وصول کرنے میں ناکام رہتا تھا چنانچہ اس نے منشی سے چارج لے کر یہ کام رین کے حوالے کر دیا تھا۔

کیوں کیا ہے۔“ رامونے جیسے اس کی دل جوئی کی۔

”اوسر گورے کی بھی کوئی خبر ہے کہ نہیں۔ حرام کا جتا انگلستان سے واپس لوٹا کہ نہیں؟“ اس نے انگریز افسر ولیم کے بارے میں دریافت کیا۔ ولیم وہ شخص تھا جو مجو دادا کے ساتھ چاند بانو کے کوشے پر اس وقت پہنچا تھا جب فاروق چاند بانو کی پُرزور دعوت پر وہاں اس سے ملنے گیا تھا۔ کئی نظر کی محبت کا شکار ہونے والی چاند بانو نے فاروق کی موجودگی میں کسی سے بھی ملاقات سے صاف انکار کر دیا تھا۔ مجو اور ولیم نے اس انکار کو اپنی بے عزتی جانا اور مرنے مارنے پر آگئے۔ فاروق نے اکیلے ہونے کے باوجود بہت بہادری اور ذہانت سے ان لوگوں پر قابو پایا اور انگریز افسر ولیم کو پرغمال بنا کر وہاں سے نکل گیا لیکن بعد میں ولیم نے اپنے تعلقات کا استعمال کرتے ہوئے فاروق کو گرفتار کروا لیا۔ تمھانے میں فاروق کو بے حد تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اس تشدد کی ایک نشانی اس کے سر کی چوٹ بھی تھی۔ فاروق کے ساتھ اس سلوک کا بدلہ لینے کا رہن نے عہد کر رکھا تھا۔ مجو دادا کو اس کے اڈے پر اس کے لوگوں کے سامنے خاک چٹا کر اڈے کی گدی سے بے دخل کرنے کے علاوہ ساری عمر کے لیے جاقو پکڑنے سے محروم کرنے کی سزا دی جا چکی تھی جبکہ ولیم اپنے انجام سے اس لیے بچ گیا تھا کہ وہ فاروق والے واقعے کے فوراً بعد اپنے خاندان کو ہندوستان سے نکل کرنے کے لیے انگلستان چلا گیا تھا۔ بگڑتے ہوئے سیاسی حالات کے باعث اپنے خاندان کو انگلستان واپس منتقل کر دینے والا ولیم خود واپس ہندوستان آنے کا ارادہ رکھتا تھا اور رہن اس کی واپسی کا منتظر تھا۔

”یہی کدھر سے لوٹے گا دادا۔۔۔ انگلستان کوئی قریب رکھا ہے کیا۔ سنا ہے ساتھ میں بہت سامان تھا اس واسطے پانی کے جہاز سے گیا ہے۔ واپس پھر کر آنے میں اسے ٹیم تو لگنا ہے نا۔“ رامونے اسے جواب دیا تو وہ ذرا جھینپ گیا اور بولا۔

”یہ جو سینے میں آگ لگی ہے نارامو، اس نے ساری عمل ماروی ہے۔ سامنے کی بات بھی نظر نہیں آتی۔“

”چٹا نہیں کرو دادا..... بدلہ تو اپنے کو لینا ہی ہے۔ وہ گورا افسر ہے تو اپن لے اپنے شہزادے کی چوٹ، سنا تھوڑی کروے گا۔ پورا حساب دینا ہوگا اسے۔“ رامونے اسے تسلی دی۔ اس کے بعد بھی وہ دونوں مختلف امور پر ایک

بھائیہ کا شمار ان دولت مندوں میں ہوتا تھا جو باقاعدہ کسی ججرمانہ سرگرمی میں ملوث نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کے ذرائع آمدنی ایسے ہوتے ہیں جن پر قانون گرفت کر سکے لیکن وہ پیسے پر جان بھی دیتے ہیں اس لیے ان کی خواہش ہوتی ہے کہ آتا ہوا پیسہ کسی صورت رکھنے نہ پائے۔ اب چاہے اس پیسے کے حصول کے لیے انہیں کسی ٹی گردن پر بھری کیوں نہ رکھنا پڑے، اس کی انہیں پروا نہیں ہوتی۔ بے شمار ذرائع سے پیسا کمانے والے اس سا ہونکار کو اس بات سے بھی تکلیف ہوتی تھی کہ وہ کمروں کے فلیٹ میں رہنے والا خاندان جس کا سربراہ بیمار یا بے روزگار ہے، چند سو کی رقم ادا کرنے سے رہ جائے۔ وہ انسانی ہمدردی یا فلاحی کاموں میں پیسا خرچ کرنے کا قائل نہیں تھا۔ ہاں ذاتی آرام اور عیاشی کے لیے بے دریغ دولت لٹا سکتا تھا جب ہی تو ہمیشگی کی فلم نگری میں بھی اپنا پیسا لگا رکھا تھا۔ بڑے بڑے پروڈیوسرز اس کے آگے پیچھے گھومتے تھے کہ وہ ان کی فلم پر پیسا لگائے کیونکہ وہ بہت دل کھول کر پیسا لگاتا تھا، یہ اور بات کہ اس کے لگائے گئے پیسے کا تاوان فلم کی ہیروئن یا کسی دوسری خوش شکل اداکارہ کو ادا کرنا پڑتا تھا۔ معذور ہونے سے قبل تو وہ بہت ہی عیاش تھا البتہ اب معذوری اور آئے دن کی بیماری نے اسے لگام ڈال دی تھی۔

”سینٹ خوش ہے تو یہ اپن کے لیے اچھا ہے۔ وہ بھڑی پارٹی ہے، اس سے بنا کر رکھنے میں اپنا فائدہ ہے۔ اب دیکھو کہ اسی کی وجہ سے فاروق شملہ میں کتنے مزے سے رہ رہا ہے۔ ان سینٹ لوگوں کے بہت اوپر تک تعلقات ہوتے ہیں۔ اپنے کو کوئی مشکل ہوئی تو سینٹ اپنا ساتھ دے گا۔ فاروق کی گرفتاری کا ٹیم یا وہ ہے نا تجھے۔ کیسے رات بھر خوار ہوئے تھے تب جا کر اس کا پتا چلا تھا۔ دیری ہو جانے کی وجہ سے اس کا اتنا نقصان بھی ہوا۔ سر کی چوٹ کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔ اپن کا سینہ چلنے لگتا ہے اس وقت کو سوچ کر۔ اپنے پر ایسی نہیں گزرتی تو کبھی سینٹ کی آفر کو نہیں مانتے والے تھے۔ اپنے جیسے آزاد طبیعت کے بندے کے لیے یہ ڈیوٹی بڑی بھاری ہے پر اپن فاروق کے لیے اور تم سب کے لیے راضی ہو گیا۔ حالات ویسے بھی بہت خراب ہیں۔ ایسے میں اپن بھی ذرا احتیاط سے چلے تو اچھا ہے۔“ رہن کچھ ادا اس تھا۔

”اپن سب سمجھتا ہے دادا۔ اپن نے اتنا ٹیم تمہارے ساتھ گزرا ہے۔ اپن کیسے نہیں سمجھے گا کہ تم نے کوئی کام

READING Section

گیا تھا، اس پر کہاں اس حسن کا جادو چلتا تھا۔ اس نے اگر اس پر کبھی سناٹھی نظر ڈالی بھی تو وہ نظر ایسی ہی تھی جیسی کسی خوب صورت منظر، تصویر، زیور، کپڑے یا برتن پر پڑنے والی نظر ہوتی ہے۔ جذبات سے خالی صرف اور صرف سٹائش سے پر نظر..... اور اس نظر کی بے اعتنائی نے اس کے لیے اس کا حسن بے معنی کر دیا تھا۔

”میں قربان جاؤں۔ یہ میری چاند بانو ہے۔ اللہ اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔ کتنی حسین لگ رہی ہے۔ جادو میاں جا کر پر ڈیو سر صاحب سے بولو کہ کوئی بکرا وغیرہ منگوا لیں بے بی کا صدقہ دینے کے لیے۔“ زمر د بانی جو کسی کام سے تھوڑی دیر کے لیے میک اپ روم سے باہر گئی تھی، اسی وقت واپس آئی اور چاند بانو کو دیکھ کر صدقہ داری جانے لگی۔ حقیقت تھی بھی یہی کہ چاند بانو معمول سے کئی گنا بڑھ کر خوب صورت لگ رہی تھی حالانکہ آج وہ کوئی پہلی بار نہیں بنی سنوری تھی۔ ان کے پیٹے میں توکیل کانتوں سے لیس ہو کر ہی میدان مارنے کو اترا جاتا ہے لیکن اس تیاری اور اس تیاری میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ آج اس کا حسن فلم نگری کے مصروف مشاق آرٹسٹ کے ہاتھوں سنور کر ایسی اچھوتی چھب دکھنا رہا تھا کہ زمر د بانی بھی دنگ رہ گئی تھی۔

”مانتی ہیں نا بانی جی ہمارے فن کو۔“ میک اپ آرٹسٹ اس کے بے ساختہ تبصرے کو سن کر فخر سے بولا۔

”کمال تو ہمارا ہے جو ہم نے ایسا نایاب ہیرا آپ کے حوالے کیا۔“ زمر د بانی نے اس کی بات کا جواب دیا۔

”ہیرا جتنا نایاب ہو، اس کو تراشنے والے ہاتھوں کو اتنا ہی مانر ہونا چاہیے بانی جی۔ نایاب ہیرا اگر کسی اناڑی جوہری کے ہاتھ لگ جائے تو اس کی قدر و قیمت بڑھنے کے بجائے گھٹ جاتی ہے۔ ایسے نایاب ہیروں کو تراشا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔“ اپنے فن پر نازاں اس نے اپنے حق میں دلیل دی۔

”شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔“ زمر د بانی نے بات کو زیادہ طول نہیں دیا اور دیوار گیر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”شارٹ شروع ہونے ہی والا ہوگا۔ تم تو ریڈی ہونا بے بی؟“ اس بار اس کی مخاطب چاند بانو تھی۔ چاند بانو نے فقط اثبات میں سر کو جنبش دے کر اس کے سوال کا جواب دیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے فلم نگری میں قدم رکھنے پر زمر د بانی کتنی خوش ہے۔ اس کا تو جیسے یہ برسوں پرانا کوئی خواب تھا

دوسرے سے گفتگو کرتے رہے۔ سوجنے کھانا کھانے کی اطلاع دی تو وہ اٹھ کر سب کے درمیان آئے۔ دسترخوان پر کچھ بڑی روٹی تھی اور سارے کمرے میں اشتہا انگیز خوشبوئیں چکرار ہی تھیں۔ رہن کو اپنے درمیان پا کر کمرے میں موجود تمام افراد کے چہرے کھل اٹھے۔ کھانے کے دوران رہن سب کا حالی احوال پوچھتا رہا اور انہیں فاروق کی طبیعت کے بارے میں سلی وی۔ اس کی طرف سے بولنے کی اجازت پا کر سب ہی اپنی اپنی کھانا سنانے لگے۔ باتوں باتوں میں کھانا کیسے ختم ہوا پتا ہی نہیں چلا۔ خالی ڈونگے اور ڈشیں دیکھ دیکھ کر سب کا خون بڑھتا رہا۔ وہ خوش تھا کہ آج بہت دنوں بعد اڈے پر رہنے والوں نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا تھا۔

☆☆☆

چاند بانو نے سرخ بنا رہی چوڑی دار پا جاے پر خوب گھیر دار سفید فراک پہنی ہوئی تھی۔ فراک کے دامن، آستینوں اور گلے پر سرخ موتیوں اور سنہری کلا توکا کام بنا ہوا تھا۔ میک اپ آرٹسٹ نے لباس کے رنگ کے حساب سے اس کا شوخ میک اپ کیا تھا اور شوخ چمکتی سرخ لپ اسٹک میں اس کے بھرے بھرے ہونٹ نمایاں ہو رہے تھے۔ لباس ہی کی مناسبت سے اسے زیور بھی پہنایا گیا تھا۔ دو دھیا کلائیوں میں بھر کر پہنی گئیں سرخ اور سنہری چوڑیاں، کانوں میں موجود سرخ گلیٹونوں والے بڑے بڑے جھکے، صراحی دار گردن میں موجود سنہری گلوبند اور ہاتھ پر پورے چاند جیسا ٹیکا جس کے درمیان میں ایک بڑا سا نگ لگا تھا اور نیچے کے حصے میں چھوٹے چھوٹے سرخ موتی لگ رہے تھے۔ میک اپ آرٹسٹ نے اسے بہت دل لگا کر تیار کیا تھا کہ ایسی پیاری شکل اور کھل حسن فلم نگری سے وابستہ ہونے کے باوجود بھی اسے کم ہی دیکھنے کو ملتا تھا۔ ہر ہر زاویے سے اس کی تیاری کو جانچنے کے بعد سب سے آخر میں اس نے چاند بانو کے سر پر سرخ رنگ کا سنہری کام سے جھلملاتا دوپٹا لٹکایا۔ دوپٹا اس انداز سے اوڑھایا گیا تھا کہ صرف سر پر لگا ہوا تھا اور دونوں پلو پیچھے کی طرف گر رہے تھے۔

”اب گھڑی ہو کر خود کو آئینے میں دیکھو۔“ اوجیز عمر میک اپ آرٹسٹ نے اسے قدم آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس کے کہنے پر چاند بانو نے ذرا کی ذرا آئینے کی طرف دیکھا اور نظریں داہیں پھیر لیں۔ اسے اپنے حسن سے آگیا تھی لیکن اس کے لیے یہ بے تحاشا حسن اس لیے اہمیت نہیں رکھتا تھا کہ وہ اس کے ذریعے اپنے من کی مراد پانے کی امید نہیں رکھتی تھی۔ وہ جو پہلی نظر میں ہی اس کے دل میں کھب

جس کی تعبیر ہاتھ میں آنے پر وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ انہیں قلم اسٹوڈیو لانے کے لیے اٹل کمار روزانہ گاڑی بھجواتا تھا۔ وہ گاڑی آنے سے پہلے خود بھی جاگ جاتی تھی اور چاند بانو کو بھی جگا دیتی تھی کہ مہادادیر ہو جائے اور اٹل کمار کو شکایت ہو۔ خود وہ اس کی حماقت کے لیے ساتھ ہی آتی تھی۔ اٹل کمار نے کہا بھی تھا کہ وہ اپنے دھندے کا نقصان نہ کرے اور کوٹھے پر بیٹھ کر اپنا کاروبار چلاتی رہے۔ چاند بانو کا خیال وہ اپنی ذمے داری پر رکھے گا لیکن اسے یہ بات منظور نہیں ہوئی تھی۔ وہ اپنے درنا یا اب کو بغیر چوکیداری کے ہرگز بھی تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی کہ اسے علم تھا ہر طرف چور اور لٹیروں کا گھوم رہے ہیں۔ کسی بھی وقت کوئی ہاتھ دکھا سکتا ہے۔ اس کے نہ ماننے پر اٹل کمار نے زیادہ زور بھی نہیں دیا تھا کہ یہ تو فلمی دنیا کی ریت تھی کہ یہاں آنے والی لڑکیوں کے سر پرست ان پر کڑی نگرانی رکھتے تھے کہ کہیں کوئی ان کی سونے کا انڈا دینے والی مرئی کو اڑانہ لے جائے۔

”مس چاندنی! آپ کا شارٹ ہے۔“ اسپاٹ بوائے نے ڈریسنگ روم میں جھانک کر چاند بانو کو اطلاع دی۔ اٹل کمار کے مطابق چاند بانو ذرا غیر فلمی سا نام تھا اس لیے اس نے اس کے نام کو ذرا تبدیل کر دیا تھا۔ اس سے قبل چاند بانو کے لیے کوئی اور نام بھی تجویز کیا گیا تھا لیکن پھر چاندنی پر دونوں طرف کے لوگوں کا اتفاق ہو گیا اور اب وہاں سب اسے چاندنی ہی کہہ کر پکارتے تھے۔

”تم چلو ہم آتے ہیں۔“ اسپاٹ بوائے کے لائے پیغام کا جواب زمر دہائی نے دیا اور پھر چاند بانو کی طرف دیکھا۔ اس نے سر کو اثبات میں جنبش دے کر اپنے تیار ہونے کا اشارہ دیا اور پھر سچ کچ قدم اٹھاتی زمر دہائی کے پیچھے چل پڑی۔ چلنے سے اس کے پیروں میں پڑی سنہری پازیب کے ٹھکر دہکتے لگے تھے۔ زمر دہائی کے پیچھے چلتی وہ سیٹ پر پہنچی تو عملے کو ہدایات دیتا اٹل کمار اس کی طرف متوجہ ہوا اور اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ اسے مکمل حسن نے اسے سحر زدہ کر دیا تھا۔

”کیا دیکھ رہے ہیں اٹل جی۔ اپنی چاندنی بے بی ہے یہ۔“ زمر دہائی کو اس کی حالت نے مفلوظ کیا اور وہ ذرا تقاصر سے بولی۔

”یہ تو سچ سچ کی چاندنی ہے پائی جی۔ اس کی چکا چوند کے آگے تو سیٹ پر لگی لائیں پھینکی پڑ گئی ہیں۔“ اٹل کمار اسے وارفتہ نگاہوں سے دیکھتا ہوا بولا تو زمر دہائی کھلکھلا کر ہنس دی البتہ چاند بانو نے کسی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ

اسی طرح نظریں جھکائے کم صم سی کھڑی رہی۔
”ارے یہ اپنی چاندنی اتنی اداس کیوں ہے؟“
اٹل کمار نے فوراً اس کی عدم دلچسپی کو محسوس کیا۔
”یہ تو ہے ہی خاموش طبیعت۔ کھل کر بہت کم ہنستی ہے۔“ زمر دہائی نے فوراً وضاحت کی۔

”اچھا ہی کرتی ہے۔ جس کی اداسی ایسی من میں کھب جانے والی ہے، وہ کھلکھلا کر ہنسنے کی تو دیوانوں کا توکل عام ہو جائے گا۔“ اٹل کمار ذرا عاشقانہ موڈ میں تھے۔

”شارٹ ریڈی ہے سر۔“ اس کے اسٹنٹ نے اطلاع دی تو وہ سنجیدہ ہوا اور چاند بانو کو سین کے متعلق مختصر بریفنگ دینے لگا۔ اسکرپٹ وغیرہ تو پہلے ہی اسے دے کر ریہرسل کر دائی جا چکی تھی۔ چاند بانو کی صورت میں اپنی اس تازہ دریافت پر وہ بہت خوش تھا۔ کوٹھوں سے اٹھ کر لڑکیوں کا فلمی لائسن میں آنا کوئی انوکھی بات نہیں لیکن چاند بانو جیسا تراشا ہوا بہتر المنا خوش قسمتی تھی۔ اس کا لب و لہجہ دل نشین تھا اور وہ بھنگی کی عام طوائفوں کی طرح کھڑی بولی نہیں بولتی تھی بلکہ وہ تو اتنی باتنڈیب تھی کہ اس پر لکھنؤ کی نواب زادی کا گماں ہوتا تھا۔ رقص اور موسیقی پر عبور تو چلو بہت سی طوائفوں کو ہوتا ہے لیکن وہ حرف آشنا بھی تھی۔ اپنے لیے نیکے گئے مکالمے نہ صرف ہانکل صحیح تلفظ سے ادا کرنا جانتی تھی بلکہ ان کے مفہوم کو بھی روح کے ساتھ سمجھتی تھی، اس لیے اس کی ادائیگی بہترین تھی۔ اٹل کمار نے ابھی تک اس کے ایک دو مناظر ہی فلمائے تھے لیکن اس کی صلاحیتوں کو اچھی طرح بھانپ گیا تھا۔ اس نے اپنی قلم کے لیے جو کہانی منتخب کی تھی وہ بڑی اچھوتی سی تھی۔ چاند بانو کو جدید دور کی ایک ایسی لڑکی دکھایا گیا تھا جو پچھلے کسی جنم میں مثل شہزادی رہی تھی اور اپنے موجودہ جنم میں وہ بار بار ایسے خواب دیکھتی تھی جس میں اس کے پچھلے جنم کی باتیں سامنے آتی تھیں۔ اٹل کمار نے اس کے پہلے جو دو مناظر فلمائے تھے، ان میں اس نے موجودہ جنم کی کالج گرل کا کردار ادا کیا تھا جبکہ آج اسے پچھلے جنم والی شہزادی کا منظر شوٹ کر دانا تھا۔ اسی لیے تیاری بہت خاص تھی۔ منظر کی عکس بندی شروع ہوئی تو مثل شہزادی کے عالی شان کمرے کے سیٹ میں وہ انگوٹھی میں تمکین کی طرح فٹ بیٹھ گئی۔ ایک ایسی شہزادی جس کا شوہر شادی کی پہلی رات ہی ہنگامی وجوہات کی بنا پر اسے چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو گیا تھا۔ شاہی خاندان کے وقار کی خاطر شہزادی نے اس صورت حال پر لب سی لیے تھے لیکن اپنے محبوب سے عین طمن کی کھڑی میں جدائی پر وہ جس آرزو کی اور کرب کا

شکار تھی، اس کا ہر تاثر اس کی آنکھوں میں تحریر تھا۔ کمرے کے درستیچے میں کھڑی شہزادی رخصت ہوتے ہوئے محبوب کو افسردہ لگا ہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اپنی آنکھوں میں افسردگی اور غم کے یہ تاثرات سجانے کے لیے چاند بانو کو اداکاری نہیں کرنا پڑی تھی۔ یہ سب تو یوں اسی اس کی آنکھوں میں لکھا تھا۔ نارسائی، جدائی، محرومی ایسی ہر شے سے وہ عمر کے اسی حصے میں واقف ہو گئی تھی۔

”شاندار۔“ سین شوٹ ہو گیا تو انیل کمار نے اسے واوی۔ اس کے بعد اس کا دوسرا سین بھی اسی سیٹ اور اسی لباس میں تھا۔ یہ سین شہزادے کی ماں کے ساتھ تھا۔ اس کی عکس بندی بھی کامیابی کے ساتھ ہو گئی۔ اس سین کے بعد انیل کمار نے زمر و بانو اور چاند بانو کو اپنے ساتھ اپنے دفتر میں آنے کو کہا۔

”ہم پہلے لباس وغیرہ تبدیل کر لیتے ہیں۔“ چاند بانو اپنی سچ و سچ سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ اس کا دل اب صرف اپنے محبوب نظر کے سامنے ہی سچ سنور کر آنے کی خواہش رکھتا تھا لیکن تم یہ تھا کہ ایک وہی نہیں تھا اور دسیوں لوگ اس کے حسن کی تائید کیوں سے مکتوظ ہو رہے تھے۔ فلم بن کر ریلیز ہو جاتی تو دیوانوں کی تعداد بے شمار ہو جاتی۔

”ابھی رہنے دو۔ مجھے کہیں باہر جانا ہے اس لیے تمہارے پیسے کرنے کا اہتمام نہیں کر سکتا۔“ انیل کمار نے بھانہ بنایا۔ وہ چاند بانو کو اسی روپ میں اپنے سامنے رکھنا چاہتا تھا اس لیے اسے پیسے نہیں کرنے دے رہا تھا۔ چاند بانو نے بے بسی سے زمر و بانو کی طرف دیکھا اور اس کے اشارے پر انیل کمار کی بات ماننے پر مجبور ہو گئی۔

”ٹھنڈی بوتلیں لے کر آؤ چھوٹے۔“ انیل کمار نے آواز لگا کر اسپاٹ بوائے سے کہا پھر انہیں اپنے ساتھ لے کر اپنے دفتر کی طرف چلا۔ اپنی مخصوص کرسی سنبھال کر ان دونوں کو اپنے سامنے والی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور باری باری ان دونوں کے چہرے غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں چاند بانو کو ابھمن میں جلا کر رہی تھیں چنانچہ اس کی جانب دیکھنے کے بجائے اپنی نظریں جھکا کر بیٹھ گئی۔ چند لمحوں کے جائزے کے بعد انیل کمار نے ایک گہرا سانس لیا اور زمر و بانو کی طرف متوجہ ہو کر اس سے مخاطب ہوا۔

”میں نے آپ کو ایک آفر کی تھی بانو جی..... اس کا کیا ہوا؟ آپ نے اس پر غور کیا؟“

”کیسی آفر؟“ زمر و بانو نے تجاہل برتا۔
”وہی ہیر وکن کی ماں کے رول کی آفر۔ سچ کہتا ہوں

بانو جی آپ اس رول کے لیے ہانکل پرفیکٹ ہیں۔“ وہ جانتا تھا کہ زمر و بانو جان بوجھ کر تجاہل برتا رہی ہے پھر بھی بڑے سکون سے اسے یاد دہانی کر دوائی۔

”اس کا تو ہم نے آپ کو جواب دے دیا تھا انیل جی۔ ہمیں فلموں میں کام کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، بس آپ ہماری چاند بانو کو بڑی ہیر وکن بنا دیں۔“ زمر و بانو نے بھی بے حد اخلاق سے اسے جواب دیا۔

”اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔ چاند بانو کو ہندوستان کی سب سے بڑی ہیر وکن نہ بنایا تو میرا نام بدل دیجیے گا لیکن آپ خود تو کام کرنے کی ہامی بھریں۔“ انیل کمار اپنے مطالبے پر ڈٹا ہوا تھا۔

”اس بات کو جانے دیجیے انیل جی۔ ہم ریٹائرڈ لوگ ہیں۔ اب کوئی کام کرنے کا دل نہیں چاہتا بس ان بچیوں کی سرپرستی کر لیتے ہیں وہی بہت ہے۔“ زمر و بانو اپنے انکار پر قائم رہی۔

”سرپرستی نہیں چوکیداری کرتی ہو تم چالاک عورت۔“ انیل کمار نے دل میں تپ کر سوچا لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ ہی سجائے رکھی اور خوشامدی لہجے میں بولا۔

”آپ نے بڑی جلدی کی بانو جی ریٹائرمنٹ لینے میں۔ ابھی کہاں آپ کا شباب ڈھلا ہے۔“

”یہ تو آپ کی نظر کا کمال ہے ورنہ اب وہ پہلے سی بات کہاں۔“ زمر و بانو نے بھی مسکرا کر اسے جواب دیا۔ البتہ چاند بانو کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ اس گفتگو کے دوران سخت بیزاری محسوس کر رہی تھی۔ زمر و بانو نے اس کی بیزاری کو بھانپ لیا اور اسپاٹ بوائے کی لائی ہوئی ٹھنڈی بوتل کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے موضوع گفتگو بدلا۔

”آپ نے بتایا نہیں انیل جی کہ کس مقصد کے لیے ہمیں یہاں لائے تھے..... باتوں باتوں میں آپ کا خاصا وقت ضائع ہو گیا۔ آپ کو تو کہیں جانے کی جلدی تھی نا۔“

”ادہاں۔“ انیل کمار جس کی نظریں چاند بانو پر جمی تھیں ذرا سا چونکا اور پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ”میں آپ لوگوں کو یہ اطلاع دینا چاہتا تھا کہ فلم کے کچھ مناظر اور گانے کسی خوب صورت فلم انٹیشن پر فلمانے کا پروگرام ہے اور ظاہر ہے چاندنی کو فلم پونٹ کے ساتھ جانا ہوگا تو یہ تیار رہے۔“

”اچھی بات ہے، ہم تیاری کر لیں گے۔ آپ بس یہ بتادیں کہ کتنے دن بعد جانے کا پروگرام ہے اور کتنا عرصہ وہاں قیام رہے گا؟“

”پندرہ دن بعد ملنا ہے اور تقریباً پندرہ سے بیس دن

مہکتے موتی

☆ جس نے رب کے آگے جھکتا سیکھ لیا وہی علم والا ہے کیونکہ علم والے کی پہچان عاجزی ہے اور جاہل کی پہچان تکبر۔

☆ زندگی جینے کے دور استے۔ بھول جاؤ ان کو جن کو معاف نہیں کر سکتے اور معاف کرو ان کو جن کو بھول نہیں سکتے۔

☆ مصیبت کا مقابلہ صبر سے کرو اور نعمت کی حفاظت شکر سے۔

☆ جس طرح بیمار ہونے کی صورت میں کھانے کی لذت محسوس نہیں ہوتی، اسی طرح گناہوں کی موجودگی میں عبادت کی لذت محسوس نہیں ہوتی۔

☆ جو لوگ اپنی دعاؤں میں دوسروں کو شامل رکھتے ہیں خوشیاں سب سے پہلے ان کے دروازے پر دستک دیتی ہیں۔

مربلہ۔ جاویدا اختر رانا، الفریڈ کارڈن، پاکپتن شریف

پر چونک گئی تھی۔

”تم کہاں جانا چاہتی ہو؟“ اس کی دلچسپی کو محسوس کر کے اٹل کمار نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”شملہ“ اس نے بے ساختگی سے جواب دیا۔ اٹل اسٹیشن کا ذکر سنتے ہی اسے خیال آیا تھا کہ فاروق شملہ گیا ہوا ہے اور کیا ہی اچھا ہو کہ فلم پونٹ بھی شملہ پہنچ جائے تو ملاقات کی کوئی سبیل نکل آئے گی۔

”خوش ہو جاؤ۔ ہم شملہ ہی جا رہے ہیں۔“ اٹل کمار نے ہنس کر اسے بتایا تو اس کا چہرہ گل اٹھا۔ اس میں آنے والی اس تبدیلی کو اٹل کمار نے بہت اچھی طرح محسوس کیا۔

”لگتا ہے کہ شملہ میں کچھ خاص ہے جو ہماری ادا اس ہیروئن کے لیوں پر مسکراہٹ آگئی ہے۔“

”نن..... نہیں۔ وہ بس ہم نے شملہ کی خوبصورتی کے بارے میں بہت سن رکھا ہے تو اس لیے وہاں جانے کا سن کر خوش ہوئی۔“ اس نے گڑبڑا کر وضاحت کی۔

”چلو۔ جیسے ہی سبھی تم خوش تو ہو گیں۔“ اٹل کمار نے اسے غار ہونے والی نظروں سے دیکھا۔

”اچھا اٹل جی۔ اب ہم کو اجازت دیجیے۔ کام کی

کا سٹے رہے گا۔ شیڈول تو ہم نے پندرہ دن ہی کا بنایا ہے لیکن مختلف مسائل کی وجہ سے اکثر آؤٹ ڈور شوٹنگ میں طے شدہ شیڈول سے ہٹ کر بھی وقت لگ جاتا ہے۔“ اٹل کمار نے بتایا۔

”بس تو پھر جس دن آپ کا ڈرائیور فارغ ہو، ہمیں اطلاع کر دیجیے گا۔ وہ ہمیں ضرورت کے مطابق خریداری کروالائے گا۔ ظاہر ہے پہاڑوں پر یہاں بھیگی میں پہننے جانے والے کپڑے اور جوتے تو مناسب نہیں رہیں گے تا اس لیے نیا سامان لینا پڑے گا۔“ زمر دہاکی نے فوراً ہی مطالبہ کر ڈالا۔

”جی ٹھیک ہے۔“ اٹل کمار نے جواب تو اثبات میں دیا تھا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے جیسے اس نے کوئی کڑوی گولی چبائی ہو۔ زمر دہاکی اس کے تاثرات کو نظر انداز کر گئی اور مودبانہ لہجے میں بولی۔

”ماشاء اللہ دل کے بڑے کھلے ہیں آپ۔ چاند بانو کی قسمت اچھی ہے کہ پہلی ہی فلم آپ جیسے دل والے شخص کے ساتھ مل گئی ہے لیکن آپ بھی کم خوش قسمت نہیں..... دیکھیے گا جب ہماری چاند بانو فلمی پردے پر جلوہ کر ہوگی تو

آپ کی تجویزیاں بھر جائیں گی۔“ اٹل کمار کے ہاں بھر لیتے پر زمر دہاکی نے اس کی تعریف کی لیکن ساتھ میں خود کو بھی نہیں گرنے دیا اور اٹل کمار کو بتا دیا کہ تمہارے ہاتھ جو ہر نایاب آگیا ہے اس کی کچھ نہ کچھ قیمت تو ادا کرنا ہی پڑے گی چنانچہ اگر وہ شائیکہ کروائے گا تو ان پر کوئی احسان نہیں کرے گا۔ بظاہر مسکرا کر سب سنا اٹل کمار اپنے دل میں سوچ رہا تھا۔

”تجویزیاں میری نہیں بھائی بیٹی کی بھرس گئی کیونکہ پیسا تو سارا اسی نے لگایا ہے۔ میرے حصے میں تو بس چند فیصد کا منافع ہی آئے گا۔ رہی دل کے بڑے ہونے کی بات تو تمہاری خریداری کا بل کونسا میری جیب سے جائے گا۔ وہ بھی بیٹی ہی بھرے گا۔ آخر اس نے کہا تھا کہ تمہارا بہت خیال رکھا جائے تو اس خیال داری کا بل تو اسے ہی ادا کرنا ہوگا۔“

”ہم شوٹنگ کے لیے کون سے بل اسٹیشن جائیں گے اٹل جی؟“ اب تک خاموش سامع کا کردار ادا کرنے والی چاند بانو نے اچانک ہی سوال کیا۔ اس نے اپنے سامنے رکھی ٹھٹھی بوتل کو ہاتھ تک نہیں لگا یا تھا اور اسے اس بات سے بھی کوئی غرض نہیں تھی کہ آپس میں گفتگو کرنے والے ان دو افراد کے دلوں میں کیا ہے۔ وہ تو بس بل اسٹیشن کے لفظ

☆☆☆

”ہیلو۔“ براؤن پینٹ کے ساتھ چیک دار بش مرث زیب تن کیے فاروق ملازم کرشن سے بات کر رہا تھا کہ سیزھیان اترتی بھلانے بلند آواز میں اسے مخاطب کیا۔ ”صبح بخیر۔“ فاروق نے اس کی طرف رخ کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔ آج ناشتے کی میز پر بھلانے کے ساتھ نہیں تھی بلکہ اس نے کل دوپہر اور رات میں بھی ان کے ساتھ کھانا نہیں کھایا تھا اور ملازم نے اس کے بارے میں صرف اتنی خبر دی تھی کہ وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہے۔ دنوں تاہم ملازم کو کھانے کی ٹرنے لے کر اس کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے البتہ سب ہی نے دیکھا تھا اور آج بھی جب وہ ناشتے میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہوئی تھی تو یہی سوچا تھا کہ وہ ناشتا اپنے کمرے میں ہی کرے گی۔ وہ یہاں ان کے لیے نہیں آئی تھی اور نہ ہی وہ اس کے مہمان تھے۔ اس لیے اس کے ایسے کسی رویے پر شکوہ دشکایت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”کہاں کی تیاری ہے؟“ اس نے فاروق کے پیروں میں گھریلو استعمال کے سلیپرز کے بجائے براؤن جوتے دیکھ کر سوال کیا۔

”بس ڈراپوسٹ آفس تک جانا ہے۔ کرشن سے اسی کا پتا سمجھ رہا تھا۔“ اس نے بھلانے کا جواب دیا۔ ”کچھ پوسٹ کروانا تھا تو کرشن کو دے دیتے، یہ جا کر پوسٹ کروا دے گا۔“ اس نے مشورہ دیا۔ ”نہیں۔ میں خود پوسٹ آفس جانا چاہ رہا تھا۔ اس بہانے تھوڑا سا شملہ بھی دیکھ لوں گا۔“

”اگر یہ بات ہے تو میرے ساتھ چلیے گا۔ میں بھی باہر گھومنے ہی جا رہی تھی۔ میں آپ کو تھوڑا نہیں بہت سارا شملہ دکھا دوں گی۔ بس آپ کو تھوڑی دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ میں بریک فاسٹ لے لوں پھر نکلتے ہیں۔ آپ کو جلدی تو نہیں ہے نا؟“ بھلا کی پیش کش اچھی تھی اس لیے اس نے انکار نہیں کیا اور یولا۔

”آپ آرام سے ناشتا کریں۔ مجھ جیسے بے کار آدمی کو بھلا کیا جلدی ہوگی۔ دن رات آرام کرنے کے علاوہ کام ہی کیا ہے۔“

”بہت بیزار لگ رہے ہیں۔“ بھلا نے ڈائنگ چیئر سنبھال لی اور اسے اپنے سامنے جھپٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے مسکرا کر یولی۔ اس وقت وہ بہت تروتازہ لگ رہی تھی۔ سیاہ پتلون پر پہنی سرخ جرسی اس کی گندی رنگت پر فوج رہی تھی۔

بات تو ہو گئی، اب بے بی ذرا آرام کر لے۔ دیکھ رہے ہیں تاکتی الجھی ہوئی بیٹھی ہے۔“ زمر دبا کی فوراً چونکی ہوئی اور لیڈن پر بظاہر مسکراہٹ سجا کر انیل کمار سے اجازت چاہی۔ ”ہاں ہاں بالکل۔ آپ لوگ جائیں۔ میں بھی اپنے کام سے نکلتا ہوں۔“ اندر ہی اندر دانت کچکچاتے انیل کمار نے کبھی اخلاق سے جواب دیا۔ فلمی ہیروئن بننے کے لیے آنے والی لڑکیوں کو شیشے میں اتارنے اور اپنے دام میں پھنسانے کا ہنردہ خوب جانتا تھا۔ اوپر والے نے شخصیت ہی اچھی دی تھی اور اسے ٹپ ٹاپ سے رہنا بھی آتا تھا اس لیے کبھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑا تھا۔ اگر کوئی لڑکی اس کی شخصیت اور چمکنی چیزیں باتوں کے جال میں نہیں پھنستی تھی تو دھونس اور دھمکی سے بھی کام چل جاتا تھا کیونکہ وہ ایک کامیاب فلم میکر تھا اور فلمی دنیا میں راج کرنے کی خواہش مند کوئی لڑکی اس کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں گنوانا چاہتی تھی۔ چاند بانو کے سلسلے میں اسے قطعاً اس لیے احتیاط سے کام لینا پڑ رہا تھا کہ بھائی سیدھے کی طرف سے اس کا خیال رکھنے کی خصوصی ہدایت دی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ بھائی سے بگڑے چنانچہ رال بچکنے کے باوجود خود کو باندھ کر رکھنے پر مجبور تھا۔

”بہت بد معاش آدمی ہے یہ انیل کمار۔ اس سے بہت بچ کر رہنا ہوگا تمہیں۔“ وہ دونوں ڈریسنگ روم میں واپس آئیں تو وہاں کی تہائی سے فائدہ اٹھا کر زمر دبا کی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ چاند بانو جواب میں کچھ نہیں بولی اور خاموشی سے اپنے زیورات اتارنے لگی۔

”چالاک آدمی ہمیں قلم میں کردار کی پیشکش کر کے اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا ہے۔ ہم نے ایک زمانہ دیکھا ہے۔ آدمی کی آنکھیں دیکھ کر اس کے اندر تک کا حال جان لیتے ہیں۔ ہمیں بے وقوف بنانے چلا تھا جیسے ہم تو اس کی چالبازی کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ ہم کام کرنے کی ہاں بھر لیتے تو یہ ہمیں یہاں کام میں الجھاتا اور تمہیں اپنے ساتھ لے کر شملہ چل پڑتا لیکن ہم نے بھی کوئی جکی گولیاں نہیں کھیل رکھیں جو ایسے جھکٹنڈوں سے زیر ہو جائیں۔“ زمر دبا کی بولتی جا رہی تھی اور وہ دھیمے سروں میں گنگناتے ہوئے مغل شہزادی کے گیٹ اپ سے نجات حاصل کر رہی تھی۔ اسے شہزادی بننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ وہ تو اپنے من مندر میں سے دہلیز کی داسی بن کر رہنے میں بھی خوش تھی اور اس داسی کے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ وہ ان فضاؤں میں پہنچ جائے جہاں اس کے دل کا شہزادہ موجود ہے۔

اس سے دریافت کیا۔ جس واقعی تازہ اور فرحت بخش تھا۔
 ”اگر اس بات کا ڈر ہوتا تو میں آپ کو آفر ہی نہیں کرتی۔“ اس نے نظر اٹھا کر پل بھر کے لیے فاروق کی طرف دیکھا اور جواب دے کر اپنے ناشتے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اب وہ خود بھی پینلوں کا رس پی رہی تھی۔ آج بھی اس نے بہت مختصر ناشتا کیا تھا۔ شاید وہ کئی ہی کم خوراک اسی لیے دہلی تھی اور نازک سی تھی اور ذرا سی خود پر توجہ دے کر اصل عمر سے کہیں کم نظر آنے لگتی تھی۔
 ”تو پھر چلیں۔“ چند منٹوں میں ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے فاروق سے پوچھا۔

”بالکل۔“ وہ جو پہلے ہی اپنا جوس کا گلاس خالی کر چکا تھا، فوراً کھڑا ہو گیا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے باہر آئے تو کرن گاڑی میں بڑا سا ہاٹ پاٹ اور پانی کا کولر رکھتا ہوا نظر آیا۔ پچھلے پر ڈرائیور سمیت گاڑی موجود تھی لیکن بھلانے اپنی ہی گاڑی کا انتخاب کیا تھا۔ ڈرائیورنگ سیٹ سنبھال کر اس نے فاروق کے لیے اپنے ساتھ دالی سیٹ کا دروازہ کھولا اور اس کے بیٹھنے کے بعد گاڑی آگے بڑھائی۔ پہلے وہ پوسٹ آفس پہنچے۔

”آپ اپنا لیٹر پوسٹ کر آئیں۔ میں یہیں آپ کا وٹ کرتی ہوں۔“ پوسٹ آفس کی پرانی سی عمارت کے سامنے گاڑی روک کر بھلانے اس سے کہا تو وہ اپنے ہاتھ میں موجود چڑے کا چھوٹا سا بیگ لیے گاڑی سے اتر گیا۔ پوسٹ آفس کی سیڑھیاں چڑھ کر بیگ میں موجود دو لفافوں کو پوسٹ کر دانے میں اسے چند منٹ لگے تھے۔ اس نے اڈے کے سب ساتھیوں کے لیے ایک مشترکہ خط لکھا تھا۔ جس میں اپنا تفصیلی احوال ذریعہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہر ایک کی فرداً فرداً خیریت دریافت کی گئی تھی۔ شملہ سے واپسی کے بعد رہن حسب وعدہ اس سے فون پر رابطے میں تھا لیکن دو تین منٹ کی اس کال سے اس کے ساتھیوں کی وہ کشتی نہیں ہو سکتی تھی جو اس کے ہاتھ سے لکھے اس تفصیلی خط سے ہوتی اس لیے اس نے خط کا تردد کیا تھا۔ دوسرا خط چاند بانو کے نام تھا۔ وہ یہاں آتے ہوئے اس سے وعدہ کر کے آیا تھا کہ خط کے ذریعے اپنے احوال سے آگاہ رکھے گا چنانچہ اس وعدے کو ایفا کرنے کے لیے اس خط کی بہت ضرورت تھی۔ کیونکہ اسے زیادہ لکھنے پڑھنے کی اجازت نہیں دیتی تھی کہ اس سے ذہن پر زور پڑنے کا احتمال تھا اس لیے اس نے وقفے وقفے سے یہ دونوں خطوط مکمل کیے تھے۔ خطوط پوسٹ کرنے کے بعد وہ باہر آیا۔ بھلا اس کی

ہونٹوں پر سرخ ہی رنگ کی لپ اسٹک تھی اور سیاہ بانوں کو پیچھے کی طرف سمیٹ کر ان کی پونی ٹیل بنائی گئی تھی۔ اس صبح میں آج پھر وہ کوئی کالج گرنل محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی صبح صبح سے بالکل بھی محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ بیوہ ہے۔ ہندو خاندانوں سے تعلق رکھنے والی بیوہ عورتوں کے بارے میں فاروق کا تجربہ تھا کہ وہ سفید لباس میں نہایت سادگی سے رہتی ہیں اور اپنی مرضی یا معاشرتی دباؤ کے باعث زندگی کی ساری خوشیوں کو خود پر حرام کر لیتی ہیں لیکن بھلا کو دیکھ کر ذرا بھی یہ گمان نہیں ہوتا تھا کہ وہ کوئی بیوہ ہے اور عین جوانی میں اپنے محبوب شوہر کو کھونے کا صدمہ برداشت کرنا پڑا ہے۔ ایک ایسا شخص جس کے لیے اس نے اپنے باپ، گھر بار اور دولت و جائیداد سب کو ٹھکرا دیا تھا، اس سے چھین گیا تھا لیکن وہ ممکن نظر آتا تو دور کی بات بہت مطمئن اور تروتازہ نظر آتی تھی۔ اب معلوم نہیں کہ اس نے اس صبح صبح کے پیچھے اپنا نام چھپایا تھا یا وہ ترکو رسوم کی قائل تھی اس لیے ہمدست کی روایات کے مطابق بیوہ عورت کا چھوٹا پہننا منظور نہیں کیا تھا۔

”آپ کے ساتھی کہاں ہیں؟“ کانٹے کی مدد سے ٹوسٹ اور آٹلیٹ کے ٹکڑے منہ کی طرف لے جاتے ہوئے بھلانے اس سے دریافت کیا تو وہ اپنے خیالات سے چونکا۔ بھلا کے ناشتے کے علاوہ ملازم اس کے اپنے سامنے پھلوں کے تازہ رس کا گلاس رکھ گیا تھا۔ یہ ملازم کو کیتھرائٹ کی ہدایت تھی کہ فاروق کو زیادہ چائے کافی نہ دی جائے اور خاطر کرنا مقصود ہو تو جوس پیش کیا جائے چنانچہ اس وقت اس کے آگے جوس کا گلاس رکھا تھا۔

”وہ دونوں ٹیلی ویژن پر کوئی فلم دیکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور شاید اسی کے انتظام میں مصروف ہیں۔“ اس نے سنبھل کر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
 ”ٹھیک ہے انہیں ان کے پروگرام کے مطابق فلم دیکھنے دیں اور آپ میرے ساتھ میرے پروگرام میں شامل ہو جائیں۔“ وہ بہت نفاست کے ساتھ کانٹے اور چھری کی مدد سے ٹوسٹ اور آٹلیٹ کھا رہی تھی۔ اس کی ایک ایک جینش سے ظاہر تھا کہ اس کی پرورش مخصوص ماحول میں ہوئی ہے۔ وہی مخصوص ماحول جو بہت زیادہ پیسے والے لوگوں کے گھروں میں ہوتا ہے اور بچوں کو ان کی ماؤں سے زیادہ تربیت یافتہ و تجربہ کار گورنس اور ٹرینرز زندگی گزارنے کے ادب و آداب سکھاتی ہیں۔

”میرے شامل ہونے سے آپ کا اپنا پروگرام تو ڈیڑھ گھنٹہ میں ہوگا؟“ فاروق نے جوس کا ایک گھونٹ بھر اور

ختر تھی۔ اس کے بیٹے ہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی پھر پوچھنے لگی۔

”کہاں چلنا پسند کریں گے آپ؟ میرا مطلب ہے شملہ میں کوئی جگہ پہلے دیکھنا چاہیں گے؟“

”جہاں آپ مناسب سمجھیں۔ میں پہلی بار شملہ آیا ہوں اور یہاں کے قابل دید مقامات کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتا لیکن آپ تو یقیناً شملہ کو اچھی طرح جانتی ہوں گی۔“

”کیوں نہیں۔ شملہ پورے ہندوستان میں میری سب سے پسندیدہ جگہ ہے۔ جب بھی موقع ملے، میں یہاں ضرور آتی ہوں۔ یہ میری مٹی کی جنم بھومی بھی ہے۔ جس جھنگلے میں ہم رہ رہے ہیں وہ میرے نانا نے مٹی کو جھینر میں دیا تھا اور مٹی نے میرے پیدا ہوتے ہی میرے نام کر دیا تھا۔

یہاں آکر مجھے اس لیے بھی بہت اچھا لگتا ہے کہ شملہ کی خوب صورتی دیکھنے کے ساتھ ساتھ میں مٹی کو بھی محسوس کرتی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہاں گھومتے پھرتے ہوئے مٹی بھی میرے

ساتھ ساتھ ہر جگہ موجود ہیں۔“ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی اداسی کے رنگ جھلکنے لگے تھے۔ فاروق کو اس کی بات سن کر

سمجھ آیا کہ اول ملاقات میں جو اس نے خود کو بیٹگلے کی مالکن قرار دیا تھا تو وہ دعویٰ ملکیت محض بھلائیے کی بیٹی ہونے کے

زعم میں نہیں تھا وہ حقیقتاً اس بیٹگلے کی مالکن تھی۔ ”یہ کرسٹ چرچ ہے۔“ ایک قدیم عمارت کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے فاروق کو بتایا۔ عمارت خاصی پرانی لگتی تھی

لیکن یہ پرانا پن بس طرز تعمیر کی حد تک ہی تھا ورنہ عمارت کی حالت بہت عمدہ تھی۔

”یہ چرچ 1850ء میں بنایا گیا تھا۔ شملہ میں دیکھنے کے لائق جگہوں میں سے ایک ہے لیکن میں ابھی آپ کو یہ

نہیں دکھا رہی۔ ابھی ہم جاکو مندر (Jaku) جائیں گے۔ جاکو شملہ میں سب سے بلند مقام ہے اور ہم وہیں سے

شملہ دیکھنے کی شروعات کریں گے۔“ اس نے فاروق کو اپنے پروگرام سے آگاہ کیا۔

”جیسا آپ پسند کریں۔ میں تو بس آپ کے ساتھ چل پڑا ہوں۔“ فاروق نے اسے جواب دیا۔

”بڑے ادیبہ بنت ہیں۔“ بھلا اس کے جواب پر ہنس کر بولی۔

”انتاز زیادہ ہوں تو نہیں لیکن کبھی کبھی فرمانبرداری اور تابعداری میں حراج بھی نہیں ہوتا۔“ فاروق نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ بھلا کی بھی زیادہ توجہ ذرا نیونگ کی طرف تھی پھر

اس نے ایک مقام پر گاڑی روک لی اور اسے اطلاع دی۔

”یہاں سے ہم پیدل اوپر جائیں گے۔“ اطلاع دینے کے بعد وہ گاڑی سے سامان نکالنے لگی۔ ہاٹ پاٹ اور کولر کے علاوہ اس نے دو چھڑیاں بھی نکالی تھیں۔ فاروق

جو اس کی پیروی کرتا ہوا گاڑی سے باہر نکل آیا تھا، کولر اور ہاٹ پاٹ اٹھانے لگا۔

”نو۔۔ نو۔۔ آپ صرف کولر اٹھالیں۔ ہاٹ پاٹ میں خود اٹھاؤں گی۔“ بھلا نے اسے ٹوکا۔

”میری موجودگی میں ایک خاتون سامان اٹھا کر چلیں، مجھے یہ اچھا نہیں لگے گا۔“ اس نے مشرقی روایت نبھانی چاہی۔

”یہاں ایسے تکلفات کی گنجائش نہیں ہے۔ ہم دونوں کو ایک ہاتھ میں اسٹک بھی پکڑنی ہوگی اس لیے ایک فرد کے لیے ایک بوجھ مناسب ہے۔“ بھلا نے اس سے کہا اور ایک

چھڑی اس کی طرف بڑھا دی۔ فاروق نے اس کی بڑھائی ہوئی چھڑی تھام لی۔

”ناؤ لیش گو۔“ اپنی چھڑی اور ہاٹ پاٹ کو تھامنے کے بعد بھلا نے اس سے کہا۔

”یہ چھڑی کیوں ساتھ لی ہے؟“ فاروق نے اس کے ساتھ قدم ملاتے ہوئے پوچھا۔

”یہ اسٹک جا کھول پر جانے والوں کے لیے بڑی کارآمد ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ جا کھو آٹھ ہزار فٹ کی

بلندی پر ہے۔ ہم جو راستہ پیدل طے کریں گے اس پر چڑھتے ہوئے اگر کہیں مشکل پیش آئی تو اسٹکس سے سپورٹ

من جائے گی۔ اس کے علاوہ بھی اسٹک بڑی اہموریت ہے۔“ آخری جملہ ادا کرتے ہوئے بھلا کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

”کیا مطلب؟“ فاروق چونکا۔

”ہمیں جا کھو پر موجود اچکوں سے نمٹنے کے لیے ان اسٹکس کا استعمال کرنا پڑے گا ورنہ ہمارے پاس کچھ نہیں بچے گا۔“ وہ بڑے محفوظ سے انداز میں اسے بتا رہی تھی اور فاروق

حیران تھا کہ وہ اچکوں کا ذکر بڑے اطمینان سے کر رہی ہے ورنہ خواتین تو ایسی کسی بھی چیز سے بہت گھبراتی ہیں۔

”واقعی وہاں اچکے ہوتے ہیں؟“ اس نے مشکوک سے لہجے میں دریافت کیا۔

”کاؤنٹ لیس۔ آپ خود دیکھ لیجیے گا۔“ وہ جیسے فاروق کی حیرانی پر لطف اندوز ہو رہی تھی۔

”تو کیا یہاں کی انتظامیہ انہیں کچھ نہیں کہتی؟ میرا

مطلب ہے یہ تو ایک سیاحتی مقام ہے اور یہاں ایسی صورت حال کا ہونا خود حکومت کے لیے نقصان دہ ہے۔ اچکوں کے ڈر سے ساحل یہاں آنا چھوڑ بھی سکتے ہیں۔“

”جیس، ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ ساحلوں کو خود بھی وہ اچکے اچھے لگتے ہیں۔“ بھلا نے مسکرا کر جواب دیا تو وہ خاموش ہو رہا۔ اصل صورت حال سمجھ میں نہ آنے کے باوجود وہ اتنا تو سمجھ ہی چکا تھا کہ اس بات میں کوئی رمز ہے اور حقیقت خود کھل کر سامنے آ جائے گی۔ اب وہ اس مسئلے پر سوچنے کے بجائے راستے پر توجہ دے رہا تھا۔ دیو دار اور چیز کے درختوں کے درمیان سے گزرتا یہ راستہ آنکھوں کو بھلا لگ رہا تھا۔ اصل میں تو شیلہ میں جس طرف بھی نکل جاؤ خوب صورتی ہی خوب صورتی تھی، یہ اور بات کہ وہ یہاں آمد کے بعد آج پہلی بار ہی باہر نکلا تھا۔ انہیں کیونکہ چڑھائی چڑھنی پڑ رہی تھی اس لیے تھوڑی دیر میں ہی ہلکا ہلکا پسینا آنے لگا تھا۔ فاروق اچھے اسٹیمنا کا مالک تھا لیکن بیماری نے اسے متاثر کیا تھا۔ بہر حال صورت حال اتنی خراب بھی نہیں تھی کہ اس کے لیے اس راستے پر چلنا ناممکن ہوتا۔ وہ بھلا سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

”ذرا رک کر پانی پی لیتے ہیں۔ مجھے پیاس محسوس ہو رہی ہے۔“ ایک جگہ بھلا نے اس سے کہا تو اس نے اپنے قدم روک لیے۔ وہ دونوں ایک درخت کے تنے کے ساتھ آ بیٹھے۔ بیٹھنے کے بعد دونوں نے اپنا اپنا رومال نکال کر پسینا خشک کیا پھر بھلا نے اپنے بڑے سے پرس سے ایک گلاس نکالا۔ پلاسٹک کا بنایا گلاس شوخ سرخ رنگ کا تھا۔

”آپ کو پانی دوں؟“ کولر سے گلاس بھرتے ہوئے اس نے فاروق سے پوچھا۔

”پہلے آپ پی لیجیے۔ آپ کو پیاس لگی تھی۔“ فاروق نے مسکرا کر جواب دیا تو بھلا نے مزید تکلف میں پڑے بغیر گلاس لیوں سے لگا لیا۔ خود پانی پینے کے بعد اس نے فاروق کی طرف بڑھا دیا۔ فاروق گلاس منہ کی طرف لے جا رہا تھا کہ بھلا نے قریب رکھی چھڑی پھرتی سے اٹھا کر ہوا میں چلائی۔ فاروق نے اپنی پشت پر قیس قیس کی آواز سن کر پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک بندر تھا جو چھڑی کی ضرب کھا کر ان سے دور جا رہا تھا۔

”اگر میں ہوشیار نہیں ہوتی تو یہ آپ کے ہاتھ سے گلاس اچک کر لے جاتا۔“ بھلا نے شوخی سے کہا تو فاروق چونکا۔ یعنی بھلا اب تک اسے جن اچکوں سے ڈرانے کی کوشش کرتی رہی تھی وہ یہ بندر تھے۔

”تو یہ ہیں آپ کے سوکا لڈا کچے؟“ اس نے ہنس کر پوچھا۔

”جی ہاں اور انہیں معمولی مت سمجھیے گا۔ یہ بہت تیز ہوتے ہیں۔ پل میں انسان کے ہاتھ کی چیز اچک کر غائب ہو جاتے ہیں۔ بس چیز انہیں پسند آنے کی بات ہوتی ہے۔ بٹوا، چشمہ، ٹوپی کچھ بھی اچانک آپ کے قبضے سے نکل سکتا ہے اگر آپ ہوشیار نہ ہوں تو۔“

”بڑے تیز ہیں یہ بندر۔“ فاروق نے مسکرا کر کہتے ہوئے دوبارہ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ گلاس چھیننے میں ناکام ہو کر جانے والا بندر کچھ آگے جانے کے بعد رک گیا تھا اور ان ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”یہ ہنومان جی کی فورس ہیں۔ انہیں ہلکا لیجیے گا بھی نہیں۔“ بھلا نے اسے اطلاع دی تو وہ ہنس دیا۔ ہندو مذہب میں ہنومان اور ان بندروں کا کتنا گہرا تعلق تھا، اس بات کا تو اسے بھی علم تھا۔

”چلو تمہاری کچھ خاطر کرتے ہیں۔“ اب بھلا بندر سے مخاطب تھی۔ ہاٹ پاٹ کھول کر اس نے اس میں سے ایک کچوری نکالی اور بندر کی طرف اچھال دی۔ وہ فوراً اسے اٹھانے کے لیے لپکا۔ اچانک ہی دو تین بندر مزید وہاں آگئے۔ بھلا نے ان کی طرف بھی کھانے کی اشیاء اچھالیں پھر اس سے بولی۔

”چلیں اب چل پڑیں ورنہ راستے میں ہی گھر جا میں گے۔“ فاروق نے فوراً اس کی بات پر عمل کیا۔ ان کا سفر پھر شروع ہو گیا۔ راستے میں انہوں نے کئی بندروں کو دیکھا لیکن وہ دور دور ہی رہے اور ان کے نزدیک نہیں آئے۔ راستے میں بھلا اسے پہاڑی اور مندر کے بارے میں معلومات فراہم کرتی رہی۔

”کہتے ہیں جب ہنومان جی راون سے لڑائی میں زخمی ہو گئے تھے تو انہوں نے جا کھولیں پر ہی بسیرا کیا تھا اور یہیں وہ حیرت انگیز بوٹی بنی ہوئی..... بھی پائی جاتی ہے جو ہر طرح کے زخم کے علاج کے لیے کارآمد ہے۔ ہنومان نے اسی بوٹی سے اپنے زخموں کا علاج کیا تھا اور راون سے اگلے ٹکڑا تک یہیں پڑاؤ کیے رہے تھے۔“

بھلا اسے جو کچھ بتا رہی تھی وہ بغیر تبصرے کے سن رہا تھا۔ ظاہر ہے اسے ان ہندو دیومالائی داستانوں پر یقین نہیں تھا لیکن بھلا کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کر کے وہ اس کا دل بھی نہیں دکھانا چاہتا تھا۔ وہ پڑھی لکھی اور ماڈرن عورت ہونے کے باوجود اگر ان داستانوں پر یقین رکھتی تھی تو ایسا صرف عقیدے کی وجہ سے تھا اور وہ کسی کے عقیدے کو

پکارنے پر ہڑ بڑا کے چونکا تو اس خواب کا اختتام ہوا۔
 ”کیا آنکھیں کھول کر سو رہے تھے؟“ بملا نے ہنس
 کر پوچھا لیکن اس کی ہنسی میں کچھ پھیکا پن تھا جسے فاروق
 نے فوراً محسوس کر لیا اور فکر مندی سے پوچھنے لگا۔

”کیا بات ہے آپ کچھ اداں لگ رہی ہیں۔“
 ”نہیں بس ایسے ہی!“ اس نے فاروق سے نظریں
 چرائیں۔

”کچھ تو ہے اگر مناسب سمجھیں تو بتادیں۔“ اس نے
 ہلکا سا اصرار کیا۔

”کچھ خاص نہیں۔ اندر مندر میں می کی ایک پرانی
 جاننے والی مسز سٹیکمرٹل گئی تھیں۔ انہیں کسی سے میرے
 ہنز بینڈ کی ڈیوٹی کا پتہ لگ گیا تھا۔ اب ملیں تو مجھ سے افسوس
 کرنے لگیں لیکن افسوس کم کیا اور تنقید زیادہ کہ میں ایک دوسرا
 کے بجائے شوخ اور ماڈرن لڑکی کے روپ میں کیوں نظر آ
 رہی ہوں۔ پتا نہیں لوگ دوسروں کو جینے کیوں نہیں دیتے
 خاص طور پر عورت کو۔ اگر میرا پتی مر گیا ہے تو اب مجھے بھی
 جیتے جی مر جانا چاہیے اور جیون کی ہر خوشی سے منہ پھیر لینا
 چاہیے۔ یہ کہاں کا اصول ہے۔“ وہ غم و غصے کا شکار تھی۔

”جانے دیجیے۔ یہ تو یہاں کا رواج ہے۔ آپ کے
 ہاں ذرا زیادہ اور ہمارے ہاں ذرا کم بیوہ عورت کے ساتھ
 ایسا ہی سلوک کیا جاتا ہے لیکن آپ تو ایک پڑھی لکھی اور
 بہادر خاتون ہیں۔ آپ کو لوگوں کی ایسی باتوں کا اثر نہیں لینا
 چاہیے۔“ فاروق نے مختصر الفاظ میں اس کی دلجوئی کی۔

اس کے لیے اتنی ہی بات کافی ہوئی اور سر جھٹک کر
 بولی۔ ”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ چلیں آئیں میں آپ کو یہاں
 کچھ اور خاص چیزیں دکھاتی ہوں پھر ہم سچ کریں گے۔“

اپنی خراب ہوتی طبیعت کے باوجود فاروق اس کی
 دلجوئی کے لیے کھڑا ہو گیا۔ ویسے بھی یہاں تک آنے کے بعد
 اس جگہ کو اچھی طرح نہ دیکھنا بے وقوفی ہوتی۔ بملا اس کے
 آگے آگے چل رہی تھی ایک اونچے چوڑے پر بنے ہنومان
 جی کے مجسمے کو دیکھ کر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر تعظیم دی اور
 آگے بڑھ گئی۔ لمبی دم دان لے ہنومان جی اپنی سینا کے اچھلتے
 کودتے شریز سپاہیوں میں گھرے ساکت کھڑے رہے۔
 بملا اسے اپنے ساتھ مندر سے کافی آگے لے آئی۔ اس جگہ
 پر درخت اتنے زیادہ نہیں تھے اور بلندی میں خاصا اضافہ
 ہو گیا تھا۔

”یہ ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے لگائیں اور پتے کی
 طرف دیکھیں۔“ ایک مقام پر رک کر بملا نے اپنے زمبیل

خواتواہ چھیڑنے کا قائل نہیں تھا سو چپ چاپ چلتا رہا۔ چلتے
 چلتے اس کے سر میں درد کی ہلکی ہلکی ٹپسیں اٹھنے لگیں لیکن اس
 نے پروا نہیں کی اور نہ ہی چہرے سے تکلیف کا اظہار ہونے
 دیا۔ بالآخر وہ جاکھو مندر تک پہنچی ہی گئی۔ بلندی پر بنے
 اس مندر کے پس منظر میں دیو دار اور چڑ کے درختوں کی
 موجودگی نے منظر کو مزید خوب صورت بنا دیا تھا۔ مندر کے
 اطراف میں ہنومان کے عقیدت مندوں کے علاوہ چند
 انگریز جوڑے بھی دکھائی دے رہے تھے جو یقیناً صرف
 تفریح کے خیال سے وہاں آئے ہوئے تھے۔ ویسے اس
 نے سن رکھا تھا کہ انگریزوں کو تاریخی عمارتیں اور نوادرات
 وغیرہ دیکھنے کا بے حد شوق ہوتا ہے۔ بملا انگریزوں کے
 لباس میں تھی لیکن وہ ان کی طرح یہاں صرف سیر و تفریح کے
 لیے نہیں آئی تھی۔ اسے ہنومان جی کی یوگا بھی کرنی تھی
 چنانچہ وہ مندر کی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ فاروق اپنی
 جگہ پر ٹھہرا رہا اور احاطے میں ہی ایک درخت کے تنے سے
 ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ سر کی تکلیف میں آہستہ آہستہ اضافہ
 ہونے لگا تھا۔ وہ کچھ دیر آنکھیں بند کر کے بیٹھتا تو سکون
 محسوس ہو سکتا تھا لیکن سارا سامان اس کی تحویل میں تھا اور
 ہنومان جی کے بندروں کی فورس کا کوئی بجز و سنا نہیں تھا کہ
 اس کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر کب کیا اچک کر لے جائیں
 اس لیے وہ چونکا بیٹھا اور گرد کا جائزہ لیتا رہا۔

مندرجہ کی عمارت خوب صورت تھی اور اس پر لگے رنگین
 جھنڈے دور ہی سے اسے نمایاں کر رہے تھے۔ دیواروں
 پر مختلف نقش و نگار موجود تھے۔ ان میں سے زیادہ تر نقش
 ہنومان اور رام جی کے تھے۔ بملا نے اسے راستے میں جو
 معلومات فراہم کی تھیں، ان کے مطابق یہاں ماربل کی ایک
 ریل پر ہنومان جی کا قدموں کا نشان بھی موجود تھا۔ ایسے
 ہنومان کے قدموں کا نشان دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی
 اس لیے اپنی جگہ بیٹھا اور گرد کا جائزہ لیتا رہا۔ وہاں موجود
 افراد میں چند ایسے جوان جوڑے بھی شامل تھے جنہیں
 دیکھتے ہی احساس ہو جاتا تھا کہ وہ نوبیا ہتا ہیں اور شملہ ہنی
 مون منانے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ ان کی آنکھوں کی
 چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ ہی چراتھی۔ من پسند ساٹھی
 کے ٹل جانے کی خوشی چہروں سے چھلکی پڑتی تھی۔ ایسے منظر کو
 دیکھ کر اسے جو لیٹ کا خیال نہ آتا یہ کیسے ممکن تھا۔ وہ غیر
 ارادی طور پر ہی خود کو اور اسے ان جوڑوں کے درمیان انہی
 کی طرح کھوستا پھرتا محسوس کرنے لگا۔ جاگتی آنکھوں کا یہ
 خواب کئی دیر جاری رہا اسے اندازہ نہیں ہو سکا۔ بملا کے

وار میزبان کا کردار ادا کر رہی تھی۔ فاروق نے اس کی پیشکش پر ایک نوالہ منہ میں رکھا۔ دُش یقیناً اچھی رہی ہوگی لیکن وہ اس کا ذائقہ محسوس کرنے سے زیادہ اس کوشش میں جٹا تھا کہ منہ میں رکھے نوالے کو حلق سے نیچے اتار سکے۔ ہلکی ہلکی ٹیسوں سے شروع ہونے والا سرور و یکدم ہی بہت زیادہ شدت اختیار کر گیا تھا۔

”بیچ کے بعد ہم جنگل میں چلیں گے۔ وہاں جا کر بہت اچھا لگتا ہے لیکن میں اکیلی ہوں تو اس طرف جانے کی ہمت نہیں کرتی اور کوشش کرتی ہوں کہ یہاں سے ہی کسی ٹیلی کو ووست بنا کر اپنے ساتھ چلنے پر راضی کر لوں۔ پہلے ہی اور میں جنگل میں ضرور جاتے تھے۔ ان کے بعد میں اکیلی شملہ آتی ہوں تو ہائی چانس ہی جنگل کی طرف جاتی ہوں۔“

رغبت سے بیچ کرتے ہوئے ہلا اسے بتا رہی تھی۔ خوب چلنے کی وجہ سے اس کی بھوک چمک اٹھی تھی اور اس نے محسوس نہیں کیا تھا کہ فاروق کچھ سست پڑ رہا ہے۔ اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے فاروق نے بھی اپنی طبیعت کا ذکر نہیں کیا اور یونہی دیکھا دے کے لیے وقفے وقفے سے چھوٹے چھوٹے نوالے منہ میں ڈالتا رہا۔

”لگتا ہے آپ کو کھانا پسند نہیں آیا۔“ ہلا نے اس کی کھانے میں سست روی کو محسوس کر کے تبصرہ کیا۔

”ایسی بات نہیں۔ میں نے ناشتا خاصا بھاری کیا تھا اس لیے اس وقت زیادہ بھوک محسوس نہیں ہو رہی۔“ فاروق نے اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”اتنا چلنے کے بعد تو پتھر بھی ہضم ہو جاتے ہیں۔“ وہ ہنسی۔ ”دیکھیں، میں کیسے نیدیدوں کی طرح کھا رہی ہوں۔“

”آپ نے جو چڑیاؤ جیسا ناشتا کیا تھا اس کے بعد بھوک تو لگتی ہی تھی۔“ فاروق نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن درو کی ایک تیز لہر نے اس کی مسکراہٹ کو چھٹ لیا۔ اس پل ہلا کی توجہ اس کی طرف ہی تھی، وہ چونک گئی۔

”کیا بات ہے سُر فاروق آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”جی بس ذرا سر میں درد ہو رہا ہے۔“ اس نے آہستہ سے بتایا۔

”مجھے تو لگتا ہے کہ آپ کے بہت زیادہ درد ہو رہا ہے۔“ وہ بغور اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

”کوئی بات نہیں، آپ جنگل میں گھوم لیں تو پھر ہم واپس چلیں گے۔ میں واپس جا کر دو الے لوں گا تو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔“ اس نے خود پر ضبط کرتے ہوئے جواب دیا۔

جیسے پرس سے دوور بین برآمد کی اور اس سے کہا۔ اس کے حکم کے مطابق اس نے دوور بین آنکھوں سے لگا کر نیچے کی طرف دیکھا۔ منظر سٹ کر اس کی آنکھوں کے قریب چلا آیا تھا اور وہ دوور تک پھیلے منظر کو خوشگوار احساسات کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ بیزہ اور اس بیزے کے درمیان فاصلے فاصلے سے موجود رنگین چھتوں والے گہر آنکھوں کو بہت بھلے لگ رہے تھے۔ بالکل ایسا لگتا تھا کہ بیزے کے بیچ مختلف رنگوں کے پھول کھلے ہوں۔ وہ دوور بین کو مختلف زاویوں پر گھما کر نیچے تہے کے مناظر دیکھتا رہا۔

”آپ تو ایک ہی منظر کے ہو گئے اصل منظر تو ادھر ہے۔“ ہلا نے مسکراتے ہوئے اسے ٹوکا۔

”کہاں؟“ اس نے ذرا جھینچتے ہوئے آنکھوں پر سے دوور بین ہٹائی۔

”اس طرف۔“ ہلا نے ہاتھ سے اشارہ کیا تو اس نے اس کی بتائی ہوئی سمت رخ کر کے دوور بین آنکھوں سے لگائی۔ یکدم ہی اس کی آنکھوں میں ایک بے پناہ خوب صورت منظر اتر آیا۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے کسی بحر زوہ آوی کی طرح پوچھا۔

”یہ ہالے ہے۔“ ہلا نے اتنے فخر سے بتایا جیسے

اسی نے ہمالیہ کو دریافت کیا ہو۔ فاروق زبان سے مزید کچھ کہے بغیر برف پوش ہمالیہ کی چوٹی کا نظارہ کرتا رہا۔ سفید برف پر گویا سورج کی کرنوں کا رقص ہو رہا تھا۔ ہمالیہ کی سفید برف سے ٹکرا کر منعکس ہونے والی سورج کی کرنیں ارد گرد رنگ سے بکھیر رہی تھیں۔

”میں جب بھی یہاں آؤں ہالے کو دیکھے بغیر واپس نہیں لوٹی۔“ اس کی کیفیت کو محسوس کرتی ہلا نے اسے بتایا تو وہ ذرا سا چونکا اور دوور بین اس کی طرف بڑھا دی۔ اسے احساس ہوا تھا کہ وہ خود دوور بین پر قبضہ کیے کھڑا ہے اور بے چاری ہلا کو کچھ دیکھنے کا موقع نہیں مل رہا۔

”یہاں آنے کے بعد اتنا خوب صورت منظر نظر انداز کر جانے والا کوئی بے وقوف ہی ہو سکتا ہے۔“ اس کا یہ تبصرہ حقیقت پر مبنی تھا۔ جا کھول پر کھڑے ہو کر برف پوش ہمالیہ کو دیکھنے کا تجربہ واقعی بہت خوش کن تھا۔ جب ہلا بھی اپنے شوق کی تکمیل کر چکی تو انہوں نے مندر کی طرف واپسی کا سفر شروع کیا۔ مندر کے احاطے میں ایک جگہ جن کر ہلا نے بیچ کا فیصلہ کیا۔

”تو کھا کر دیکھیے۔ شملہ مرچ اور پیاز سے بنائی ہوئی یہ شملہ کی ایک روایتی ڈش ہے۔“ اب وہ ایک گھڑ اور ڈسے

”بالکل بھی نہیں، ہم ابھی ابھی واپس چل رہے ہیں۔ اسے جو مان اور عزت دی تھی، اس کے بعد اسے ایسا ہی محسوس کرنا چاہیے تھا۔“

مجھے آپ کی طبیعت بہت زیادہ خراب لگ رہی ہے۔“ بہلا نے فوراً اپنا فیصلہ ستایا۔

”لیکن آپ کا جنگل میں گھومنا تو رہ جائے گا۔“ فاروق اب بھی حذبذب تھا۔

”جنگل میں گھومنے کے لیے دوبارہ بھی آیا جاسکتا ہے۔“ وہ بہت پھرتی سے سب کچھ سمیٹ کر کھڑی ہو چکی تھی۔ اس باز فاروق نے بھی اصرار نہیں کیا۔ اسے واقعی اچھی خاصی تکلیف ہو رہی تھی وہ ابھی اس کا سفر انہوں نے نسبتاً تیزی سے طے کیا۔ درمیان میں رکے بھی نہیں۔

”کب سے ہو رہا ہے آپ کے سر میں ورد؟ آپ کو مجھے بتا دینا چاہیے تھا۔“ وہ دونوں جب گاڑی میں سوار ہوئے تو بہلا نے انکیشن میں چابی گھماتے ہوئے جنگلی سے کہا۔ وہ جواب میں کچھ نہیں بولا۔ ہنگلے تک کا سفر بہت تیزی سے طے ہو گیا۔ یہاں کیتھرائن اور گولوختر تھے۔

”کہاں چلے گئے تھے آپ، آپ نے تو صرف پوسٹ آفس تک جانے کا بتایا تھا مجھے۔“ اس کی شکل دیکھتے ہی کیتھرائن نے شکوہ کیا۔

”انہیں میڈیسن دو سسر۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ مزید سوال جواب کا موقع دینے کے بجائے بہلا نے تیز لہجے میں اطلاع دی تو کیتھرائن چومنی ہو گئی اور فوراً ہی پیشہ ورانہ مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فاروق کو دیکھنے لگی۔ معائنہ کرنے کے بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ صرف گولی اثر نہیں کرے گی بلکہ انکیشن بھی دینا پڑے گا۔ تمام ضروری دواؤں کا ذخیرہ وہ لوگ ساتھ لائے تھے پھر کیتھرائن نے ڈاکٹر سے خصوصی بریفنگ بھی لی تھی اس لیے اسے اچھی طرح علم تھا کہ کس صورت میں کیا کرنا ہے۔ اس کی کوششوں کے اثر سے فاروق آدھے گھنٹے بعد اپنے کمرے میں پرسکون نیند سو رہا تھا۔

”میں پورے جسم کا کنٹرول سنبھالے ہوتا ہے۔ بلندی پر چڑھنے سے زیادہ انرجی خرچ ہوتی ہے اور آکسیجن کی ضرورت بڑھ جاتی ہے لیکن بلندی پر جاتے ہوئے فضا میں آکسیجن کم ہوتی جاتی ہے۔ مسٹر فاروق کو آکسیجن کی کمی نے متاثر کیا ہے۔“ کیتھرائن جیسے سارا معاملہ سمجھ گئی۔

”اگر تم ٹیل کر ڈاکٹر کو کوئی پرابلم ہے تو مجھے بتانا۔ ہم کسی اچھے ڈاکٹر سے رائے لے لیں گے۔ یہاں میری پہچان کے ایک دو اچھے ڈاکٹر ہوتے ہیں۔“ بہلا بنا غلطی کے ہی خود کو تصور دار سمجھ رہی تھی اس لیے فکر مند تھی۔

”ڈونٹ وری میڈم۔ مسٹر فاروق بہت اسٹرونک وول پاور رکھتے والے آدمی ہیں۔ وہ جلدی کور کر لیں گے۔“ کیتھرائن نے اسے تسلی دی۔

☆ ☆ ☆

چاند بانو نے پتا نہیں کوئی بارساوہ سے صفحے پر تحریر وہ چند سطری خطوط پڑھا جو آج ہی اسے ملا تھا اور جس میں فاروق نے اپنی خیریت اور شملہ کی خوب صورتی کے مختصر سے تبصرے کے علاوہ اس سے اس کا احوال دریافت کرنے کے سوا کچھ نہیں لکھا تھا لیکن وہ یوں شاداں و فرحاں تھی جیسے کوئی محبت نامہ پڑھ رہی ہو۔ اس کے لیے اتنا خیال ہی بہت تھا کہ فاروق دور جا کر بھی اسے نہیں بھولا اور اس نے اپنا وعدہ نبھاتے ہوئے اس کے نام علیحدہ سے خط لکھ کر بھیجا ہے۔ اس ایک خیال سے وہ اتنی خوش تھی کہ کبھی خط کی تحریر

”صبح میرے ساتھ نکلے تو اچھے بھلے تھے۔ پھر اچانک ہی پتا نہیں کیسے طبیعت خراب ہو گئی۔“ کیتھرائن کیونگ روم میں واپس آ کر بیٹھی تو بہلا نے ہاتھ ملتے ہوئے بتانا شروع کیا۔

”اچانک طبیعت خراب نہیں ہوئی ہوگی۔ مسٹر فاروق کو عادت ہے کہ کم تکلیف ہوتو اسے برداشت کرتے رہتے ہیں۔ اسی جگہ میں تکلیف بڑھ جاتی ہے۔“ کیتھرائن نے ادا ان سے سچے سچے بتایا۔ فاروق کی تکلیف کو وہ بالکل ایسے ہی دیکھ کر راضی تھی جیسے وہ اس کا سگا بھائی ہو۔ فاروق نے

سپینس ڈائجسٹ 89 اپریل 2016ء

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN

PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

”میری طبیعت اچھی ہے۔ شملہ کا موسم بہت خوشگوار ہے۔ تم اپنا احوال سناؤ۔ یہ بھلا کیسا محبت نامہ ہے۔“ ایک نظر میں پورا خط پڑھ لینے والی کاہل نے خط اسے واپس کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔

”محبت نامہ تو اسے تم نے قرار دیا تھا ورنہ یہ تو ایک سادہ سا خط ہے۔“ چاند بانو اس کے تبصرے پر مسکرا کر بولی۔

”وہ تو ہمیں تمہارے چودھویں کے چاند کی طرح چمکتے چہرے کو دیکھ کر گمان ہوا تھا۔“ کاہل نے منہ بنایا۔ وہ چاند بانو کے بستر پر اس کے عین مقابل بیٹھی اس سے مکالمہ کر رہی تھی۔

”ہمیں تو وہ ہوا بھی پیاری ہے جو ان کو چھو کر آجائے، یہ تو پھر ان کے ہاتھ سے لکھا خط ہے۔“ چاند بانو نے عالم جذب میں اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے بے خودی کی کیفیت میں خط کو سینے سے لگا لیا۔

”اللہ اللہ..... ایسا عشق۔ عشق کے سمندر میں اتنی گہرائی تک مت اتر دو چاند بانو..... یہ سمندر تمہیں ڈبو دے گا۔“ ان ہار کاہل ذرا ٹھہرائی تھی۔

”واللہ۔ اگر ایسا ہو گیا تو ہم اسے اپنی خوش نصیبی سمجھیں گے۔“ چاند بانو نے بے ساختگی سے جواب دیا۔

”تمہاری باتوں سے مجھے تو خوف آ رہا ہے۔“

”تو چھوڑو نا جانے دو ان باتوں کو اور یہ بتاؤ کہ ہمارے سفر کی تیاری کہاں تک پہنچیں پتہ مٹی تمہیں تا خریداری کے لیے ساتھ میں۔“ اس نے خود ہی موضوع بدل دیا۔

انہل کمار نے حسب فرمائش زمر دبائی اور اس کے لیے گاڑی بھجوا دی تھی کہ وہ جا کر اپنی مرضی کی خریداری کر آئیں۔ آج چاند بانو کا کوئی سین شوٹ نہیں ہونا تھا اس لیے اس کی چھٹی تھی اور اسی لیے انہل کمار نے بھی آج گاڑی بھجوائی تھی لیکن زمر دبائی نے اسے خریداری کے لیے اپنے ساتھ بازار لے جانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اگرچہ وہ برقعوں میں خود کو چھپا کر بازار جایا کرتی تھیں لیکن زمر دبائی کے خیال کے مطابق مستقبل کی ٹاپ ہیروئن کا بازاروں میں پھرنا اس کی شان کے خلاف تھا چنانچہ وہ کاہل کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ کاہل کو اس کی پسند ناپسند کا اچھی طرح علم تھا اس لیے اسے کوئی خاص فکر بھی نہیں تھی۔

”بڑی جلدی خیال آ گیا آپ کو خریداری کے بارے میں پوچھنے کا؟ کتنی دیر ہوئی بنے میاں سے پیغام بھجوایا تھا کہ ہال میں آجاؤ۔ سب وہیں جمع تھے اور تمہارے ساتھ مل کر سارا سامان دیکھنا چاہتے تھے۔“

بڑھتی رہتی کبھی اسے آنکھوں سے لگاتی دیکھی لبوں سے چوستی اور کبھی سینے سے لگاتی۔ یہ خط محض ایک کاغذ کا کٹڑا تھوڑی تھا جس پر تیلی روشنائی سے چند سطریں درج تھیں۔ یہ تو پیا سے کے لیے صحرا میں پانی کی بوتلوں کی طرح تھا۔ وہ اس کاغذ سے لپٹی فاروق کی خوشبو کو سونگھ سکتی تھی۔ اسے کاغذ پر موجود فاروق کی انگلیوں کا ناویدہ لمس بھی محسوس ہو رہا تھا۔ ایسے میں وہ خوشی سے سرشار نہ ہوتی تو اور کیا کرتی۔

”کیا بات ہے بتو آج کمرے سے باہر ہی نہیں نکلیں۔ کہیں ابھی سے بڑی ہیر دیکھوں کے خڑے تو نہیں آگئے مزاج میں کہ اپنے ساتھ والیوں سے ملنا ہی گوارا نہیں۔“ وہ اپنی خوشی میں مست بستر پر نیم دراز تھی اور خط کے کاغذ کو اپنے دائیں رخسار سے لگا رکھا تھا کہ کاہل دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوئی اور اس سے شکوہ کیا۔

”اللہ نہ کرے جو ہم میں ایسے خڑے آئیں۔ ویسے بھی کونسا ہم اپنی خوشی سے فکمی ہیر دیکھنے پر راضی ہوئے ہیں جو اس بات پر غرور کریں گے۔ ہمارے لیے تو بس یہ سب ایک آزمائش ہی ہے۔ اگر آپ سب لوگوں کا اتنا اصرار نہ ہوتا تو ہم کبھی اس کام کی ہا ہی نہ بھرتے۔“ کاہل کی آواز سن کر وہ بستر پر اٹھ بیٹھی اور پوری سچائی سے اس کی بات کا جواب دیا۔

”ہم کیا اور ہمارا اصرار کیا۔ یوں کہو نا کہ ”ان“ کے کہنے پر راضی ہوئی تھیں۔“ کاہل نے اسے چھیڑا۔

”ان کا کہنا ہم نال بھی کیسے سکتے تھے۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز میں مسکرائی اور اپنی نرم و نازک انگلیوں کو سطروں پر پھیرنے لگی۔

”لگتا ہے انہوں نے محبت نامہ بھیجا ہے۔“ کاہل نے فوراً ہی اس کے ہاتھ میں موجود خط کا نوٹس لیا پھر اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

”کیا لکھا ہے؟“

”خود پڑھ کے دیکھ لو۔“ چاند بانو نے خط اس کی طرف بڑھا دیا جسے کاہل نے فوراً تمام لیا اور جلدی جلدی تحریر پر نظریں دوڑانے لگی۔ زمر دبائی کے کونٹھے کی لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھا یا جاتا تھا اور شعراء کا کلام خاص طور پر پڑھنے کے لیے دیا جاتا تھا کیونکہ زمر دبائی کا کہنا تھا کہ جو شاعر کو پڑھنا اور سمجھنا نہیں جانتا وہ اسے روح کی پوری گہرائی سے گا بھی نہیں سکتا۔ سو یہاں لڑکیوں کی تعلیم کا خصوصی انتظام تھا اور انہیں اساتذہ کا کلام پڑھایا جاتا تھا۔

کاہل نے خفا سے لہجے میں اسے یاد دلایا۔ ابراہیم موجود تھے۔ اچھے خاصے افراد کی موجودگی کے باوجود وہاں ایسی خاموشی تھی کہ پن بھی گرتی تو اس کی آواز سنائی دیتی۔ اس خاموشی میں صرف رہن کی آنکھیں بول رہی تھیں اور یہ آنکھیں تہر کی جو زبان بول رہی تھیں اس کو سمجھنے والوں کے دل اپنی اپنی جگہ کانپ رہے تھے۔ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے جب انہوں نے انہیں اسی مقام پر رہن کے ہاتھوں موجودا کا انجام دیکھا تھا۔ ایک عرصے اڈے پر حکمرانی کرنے والے موجودا کو اس نے منٹوں میں چت کر دیا تھا اور بڑے بڑے دعوے کرنے والا موجودا اس لائق بھی نہیں رہا تھا کہ زندگی میں بھی چاقو تھام سکے۔

”تیرے کو اڈے کے اصولوں کا پتا نہیں لگا تھا کیا؟“ سامنے کھڑے شخص کو کچھ دیر گھورتے رہنے کے بعد اس نے بھاری آواز میں اس سے استفسار کیا۔ ”اپن نے کوئی نیا کام نہیں کیا ہے۔ اپن نے وہی کیا ہے جو اتنے سالوں سے کرتا آ رہا ہے۔“ اس شخص نے شانے جھٹکتے ہوئے ذرا خراب مزاج کے ساتھ اس کی بات کا جواب دیا۔ وہ تقریباً چالیس سال کی عمر کا آدمی تھا۔ قد کاٹھ اچھا تھا اور ہاتھ پیروں کا بھی مضبوط نظر آتا تھا۔ اس کا نام رفیق عرف فیہ کا تھا اور وہ موجودا کے منہ چڑھے ساتھیوں میں سے ایک تھا۔

”اب وہ تیری ماں کا یا اس اڈے کی گدی پر نہیں بیٹھا ہے جس کے ہوتے تو اپنی من مانی کرتا تھا۔ اب یہ مجھ کا نہیں، رہن واداکا اڈا ہے اور یہاں صرف رہن واداکا اصول چلنے کا ہے۔ تم ساروں کو پہلے دن ہی بولا تھا کہ جس کو ادھر رہنا ہے اپنے اصولوں کے حساب سے رہنا ہوگا ورنہ ادھر سے چلتے بنو۔ ہندوستان کوئی چھوٹا ملک نہیں ہے۔ کدھر نہ کدھر تم کو جگہ مل ہی جائے گی پر تو سمجھ رہا تھا کہ رہن واداکا ناک کے نیچے رہ کر اپنی من مانی کرتا رہے گا اور کسی کو خبر نہیں ہوگی۔ پر یہ تیری بھول تھی۔ یہ جو تیرے کو اپنے قبو بڑے پر دو آنکھیں اور دو کان دکھتے ہیں، یہ دیکھنے کو صرف دو دو ہیں ورنہ اپن کی سیکڑوں آنکھیں اور سیکڑوں کان ہیں اور تیرے جیسے..... اپنے سے چھپ نہیں سکتے۔“ اس نے منہ بھر کے فیکے کو ایک بڑی سی گالی سے نوازا۔

”گالیاں مت دو واداکا۔“ گالی سن کر فیکے کا منہ سرخ ہو گیا اور اس نے احتجاج کیا۔

”گالی نہ دوں تو تیرے جیسے..... کو پھولوں کا ہار پہناؤں۔“ رہن نے اسے ایک اور زوردار گالی دی۔ گالی سن کر فیکے کی آنکھوں میں طیش کی لہر دوڑ گئی اور اس نے لبوں کو یوں کھولا کہ جیسے جواب میں خود بھی کوئی سخت لفظ کہنا چاہتا

کاہل نے خفا سے لہجے میں اسے یاد دلایا۔ ”ہاں بس ہم ذرا مصروف تھے۔“ اس نے محظوظ لہجے سے سہلایا۔

”چھٹی کے دن مصروف رہنے کا عذر..... اس کا مطلب سمجھتی ہو چاند بانو..... تمہارے ساتھ دایلوں کو یہ گمان گزرے گا کہ تم مشغور ہو گئی ہو اور ہیروئن بننے کے بعد ان کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتیں۔“ کاہل کا لہجہ ٹھیکھا ہو گیا۔

”لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ ٹیٹائی۔ ”یہ صرف میں سمجھتی ہوں۔ باقی سب کو تمہارے دل کی خبر نہیں ہے اور نہ ہی ہونی چاہیے۔ محبت ایک ایسا مقدس راز ہے جو دل میں ہی دفن رہے تو اچھا ہوتا ہے۔ لوگوں کی زبان پر آنے کے بعد یہ جذبہ تماشا بن کر رہ جاتا ہے۔“ کاہل نے اسے صیحت کی۔

”آئندہ ہم احتیاط کریں گے۔“ اس نے فوراً ہی اپنی غلطی تسلیم کر لی اور خط کا کاغذ تہ کر کے لفافے میں رکھنے لگی۔

”فاروق صاحب کو اس خط کا جواب دو گی تو اس میں اپنے شملہ بیٹے کی خبر دو گی کیا؟“ کاہل نے اس سے پوچھا۔ اس بار اس کا لہجہ پہلے ہی کی طرح نرم تھا۔ وہ چاند بانو سے بہت محبت کرتی تھی اور اس کی سچی خیر خواہ تھی۔

”ارادہ تو نہیں ہے۔ کیا خیال ہے انہیں اطلاع دینی چاہیے کیا؟“ اس نے کاہل سے رائے مانگی۔ ”مت دو اطلاع۔ اچانک پہنچ کر ان کے تاثرات دیکھنا۔“ کاہل نے اسے مشورہ دیا۔

”ہم بھی ایسا ہی کچھ سوچ رہے ہیں۔“ اس کے ہنسنے کے سے ہونٹوں پر مسکراہٹ چھٹی۔ وہ جیسے تصور کی آنکھ سے فاروق کا حیران چہرہ دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھی۔ اس پل اس کے چہرے پر اتنے رنگ تھے کہ کاہل نے نظر لگ جانے کے ڈر سے اپنی نظریں اس پر سے ہٹائیں اور کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

”آؤ چلو۔ چل کر سب کے درمیان بیٹھتے ہیں۔“ چاند بانو نے خط اپنے پیچے کے نیچے احتیاط سے رکھا اور اس کے ساتھ چل پڑی۔ اس کی چال کے متوالے پن میں آج ہونے والی آدمی ملاقات کی سرشاری بھی شامل تھی۔



رہن کی قبر بار نظریں اپنے سامنے کھڑے شخص پر مچی تھی۔ اس وقت موجودا والے اڈے پر تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ پر رامو بیٹھا ہوا تھا اور سامنے اڈے کے باقی

ہو لیکن پھر عین وقت پر ہونٹوں کو سمجھ لیا۔
 "اپن نے بولا تھا کہ اوہر اپنی مرضی نہیں چلے گی اور
 کوئی ماں کا جناہی مرضی سے کہیں سے ایک دھیلا نہیں لے
 گا۔ اپنے پاس سارا کام حساب کتاب سے ہوتا ہے اور
 حساب کتاب سے سب کو حصہ ملتا ہے پر تو نے اپنی بات
 ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑادی اور حاجی سرمد کی
 وکان سے ایک دو نہیں پورے ورجن بھر جوڑے کٹوا
 ڈالے۔ تیرے کو ایسا کرنے کی اجازت کس نے دی تھی؟"
 رین اس پر بری طرح بگڑ رہا تھا۔

اس کا کچا پچھا کھولا تو وہ اس سر بھٹکت کر رہ گیا، منہ سے کچھ
 بولا نہیں۔
 "اسے ہاندھ کر چوک پر ڈال دو اور گن کر سب کے
 سامنے پورے سو جوتے لگاؤ تا کہ سب کو پتا چل جائے کہ
 رین واداکے اڈے پر کوئی اپنی من مانی نہیں کر سکتا۔" رین
 نے اس کا باغیانہ انداز دیکھا اور جھٹ سزا تجویز کر دی۔ اس
 سزا کو سن کر فیکے کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اسے سرعام جوتے
 لگائے جانے کا مطلب تھا کہ وہ پھر اس علاقے میں سر اٹھا کر
 نہیں چل سکتا۔

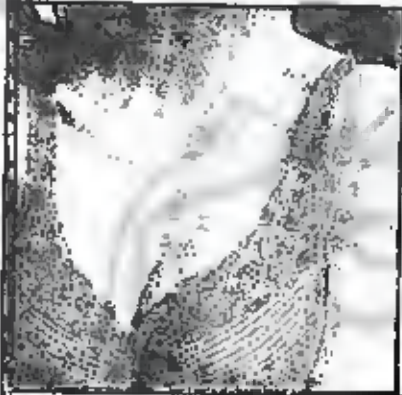
"تم لوگوں نے سنا نہیں کہ اپن نے کیا کہا ہے۔"
 فیکے کو سنائی جانے والی سزا پر دم بخورہ جانے والوں کو اس
 نے قہر بار لہجے میں یکارا تو اپنی اپنی جگہ ساکت بیٹھے لوگوں
 کے جسموں میں جنبش پیدا ہوئی۔ پہلے بیش قدمی کرنے
 والے وہ لوگ تھے جنہوں نے دل سے رین کی اڈے پر
 حکمرانی کو تسلیم کر لیا تھا۔

"ہاتھ نہیں لگانا اپنے کو۔" فیکے نے لوگوں کو اپنی طرف
 بڑھتے دیکھا تو بھڑک اٹھا اور چاقو نکال لیا۔ دیکھتے ہی
 دیکھتے وہاں چاقو ہی چاقو نکل آئے۔ اتنے چاقوؤں کی

"اپنے کو ضرورت تھی اس لیے اپن نے ایسا کیا۔"
 فیکے نے بے پروائی سے اس کی بات کا جواب دیا۔ اس کی
 آنکھوں میں ایک واضح بغاوت تھی اور لگتا تھا وہ رین کے
 رعب میں آنے کے موڈ میں نہیں ہے۔

"کیوں تیرے کو بہن بننی کا وھج بنانے کا تھا جو
 ضرورت تھی؟ ہوتی تو اپن خود سارا انتظام کرتا پر تو حرام کا جنا
 تو اس رن..... کے ناز اٹھانے کو مال سمیٹ کرنے گیا تھا ما
 جس کے کوٹھے پر دن رات پڑا رہتا ہے اور جس کی ہوس کا
 پیٹ کسی طرح بھرتا ہی نہیں۔" رین نے کاٹ وار لہجے میں

نسوانی حسن میں اضافہ (بلوسم یونانی کریم) کل نہیں آج خوبصورت اور جازب نظر آئیں



بلوسم پریسٹ ڈولپنگ اینڈ ٹاسٹنگ کریم (ہربل)

چھوٹی بڑیٹ میں اضافہ کر کے بڑیٹ کی نشوونما کو مکمل کرتی ہے
 بڑیٹ کی نرمی کو دور کر کے سختی لاتی ہے۔ بڑیٹ کو سڈول اور خوبصورت بناتی ہے۔
 گوشت 30 سال سے آرزو

چہرے کے فاضل
 بالوں کو ہمیشہ کیلئے
 ختم کرتی ہے۔

یونانی کریم گلیسی

اپنی PIC روانہ کریں
 whatsapp: 0311-5800067
 Email: bdhdeva@yahoo.com
 skype: devapak
 0322-2916250 کراچی بہاولپور
 0300-2500026 جڈی ڈیلری

سختی دہانہ سالہ جھڑاؤ
 جگہ ہر جھڑاؤ اور کھانسی
 کوئی دھانسیا اور کھانسی
 کوئی دھانسیا اور کھانسی
 کوئی دھانسیا اور کھانسی
 کوئی دھانسیا اور کھانسی
 کوئی دھانسیا اور کھانسی
 کوئی دھانسیا اور کھانسی

تالہ دھانسیا اور کھانسی
 کوئی دھانسیا اور کھانسی
 کوئی دھانسیا اور کھانسی
 کوئی دھانسیا اور کھانسی
 کوئی دھانسیا اور کھانسی
 کوئی دھانسیا اور کھانسی
 کوئی دھانسیا اور کھانسی

کوئی دھانسیا اور کھانسی
 کوئی دھانسیا اور کھانسی
 کوئی دھانسیا اور کھانسی
 کوئی دھانسیا اور کھانسی
 کوئی دھانسیا اور کھانسی
 کوئی دھانسیا اور کھانسی
 کوئی دھانسیا اور کھانسی

بادشاہ دی ہنسی یو ہر بازار اور واپشہدی 051-5502903-5533528 ایچ ایم ایس SMS کر کے لٹر بچھری مگوا آئیں

042-7666264

021-32720328 ریاض محمد 69 نیو ماگنر مارکیت شاہنام لاہور۔ فون

Cell: 0333-5203553, Website: www.devaherbal.com

www.PakSociety.com

”نہیں بھائی۔ اپن کو دوسرے کام سے جانا ہے۔ آپ کے پاس بس اس لیے ٹھہرے تھے کہ چا کر لیں کہ آپ نے ٹرکے والوں کو بھیجی آنے کا پیغام بھیج دیا یا نہیں۔ اپن چاہتا ہے کہ وہ لوگ آئیں تو اپن ان سے ملنے کو موجود ہو۔“ ربن نے اندر جانے سے انکار کرتے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

”پیغام بھیج دیا ہے اور وہاں سے جواب بھی آ گیا ہے۔ آنے والے سوموار کو وہ لوگ بھیج رہے ہیں۔ میں خود یہ اطلاع دینے آپ کے پاس آنے ہی والا تھا۔“ غلام محمد نے اسے بتایا۔

”تم آؤ کہ اپن آئے ایک ہی بات ہے۔ کام کی بات ہوگئی، یہ کافی ہے۔ یاد رکھنا کہ وہ لوگ اپنے مہمان ہوں گے اور ان کی ساری خاطر مدارت اپنے ذمے ہوگی۔“ ”جیسی آپ کی مرضی۔“ غلام محمد نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔

”چلو تو پھر ابھی اپن چلتے ہیں۔“ ربن وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اب اس کا رخ اندر گلی میں جولیٹ کے گھر کی طرف تھا۔ دروازے پر تالا موجود نہیں تھا جس کا مطلب تھا کہ جولیٹ گھر میں ہی ہے۔ اس کے اشارے پر جانی نے دروازے پر زور سے دستک دی اور ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اب ربن اکیلا دروازے کے مقابل کھڑا تھا۔ دستک کا فوری رد عمل ظاہر ہوا اور اندر سے تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ پھر فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور جولیٹ کا چہرہ نظر آیا لیکن ربن کی نظروں نے جس پہلی چیز کو فوکس کیا، وہ جولیٹ کا چہرہ نہیں کچھ اور تھا۔ جولیٹ نے بھی اس کی نظر کے زاویے کو فوراً ہی محسوس کر لیا اور تیزی سے شانوں پر پڑے اس کا رخ کو کھینچ کر آگے پھیلایا۔ اس کے اس عمل سے قبل ہی ربن اپنی نظروں کا رخ بدل چکا تھا لیکن دونوں فریقین جانتے تھے کہ پل بھر میں کیا ہو گیا ہے۔ ربن نے تو پھر تیزی سے اپنی نیت پر قابو پا لیا لیکن جولیٹ کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا چہ جب وہ بولی تو بھی اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

”جی فرمائیے۔“ یہ دو لفظ ادا کرنے کے لیے بھی اسے سخت جدوجہد کرنی پڑی تھی۔

موجودگی میں اکیلا فیکا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔ ذرا دیر میں وہ رسیوں سے بندھا پڑا تھا۔ پانچ چھ بندوں نے مل کر اسے اٹھایا اور ربن کے حکم کی تعمیل کے لیے چل پڑے۔ اس سارے ہنگامے کے بعد ربن زیادہ دیر سب کے درمیان نہیں ٹھہرا اور رامو کے ساتھ اٹھ کر ایک اندرونی کمرے میں پہنچ گیا۔

”اپنے کو لگتا ہے یہ بات ادھر ہی ختم نہیں ہوگی۔ فیکا پھر دوبارہ کمیٹہ پن کرے گا۔ سالے کی آنکھوں پر سورا کی چربی چڑھی صاف نظر آرہی تھی۔“ تنہائی ملتے ہی رامو نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

”اپنی جوتی کو بھی پروا نہیں ہے۔ اپن نے بھی سب دیکھا اور سمجھا ہے۔ وہ حرام کا جناب ادھر کھنے والا نہیں ہے۔ تو دیکھ لیتا وہ دوبارہ ادھر شکل نہیں دکھائے گا اور یہ بہت اچھا ہوگا۔ اپن کو اس کے تیور نظر آرہے تھے۔ باقیوں کو سبق سکھانے کے واسطے اس کا یہ انجام ضروری تھا۔“ ربن نے اسے جواب دیا پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

”اپن اب ادھر سے چلے گا۔ ادھر بھی دیکھنا ہے۔ تو ادھر ہی رک اور آنکھیں اور کان کھلی رکھ۔“ رامو کو نصیحت کر کے وہ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اب اس کا رخ اپنے پرانے اڈے کی طرف تھا۔ شملہ سے واپسی کے بعد اس نے دونوں اڈوں میں کئی انتظامی تبدیلیاں کی تھیں جن میں سب سے بڑی تبدیلی افراد کا تبادلہ تھا۔ مجود ادا والے اڈے سے کچھ لوگ اپنے اڈے پر منتقل کیے گئے تھے اور کچھ افراد کو پرانے اڈے سے مجود ادا والے اڈے پر لایا گیا تھا۔ اس طرح نئے شامل ہونے والوں کی تربیت اور نگرانی دونوں کا انتظام ہو گیا تھا۔ ان چکروں میں الجھا وہ جولی سے ملاقات کا وقت بھی نہیں نکال سکا تھا۔ ایک تو وہ خود بھی ملازمت کرتی تھی اس لیے ایسا بھی ہوا کہ اس کے پاس ملاقات کی فرصت ہوتی تو وہ گھر پر موجود نہ ہوتی لیکن آج اسے امید تھی کہ ملاقات ہو جائے گی کیونکہ شام ہو چکی تھی اور شام تک جولی واپس گھر آ جاتی تھی۔ اسے شریا بانو کے رشتے کے سلسلے میں غلام محمد سے بھی ملاقات کرنی تھی۔ اپنے علاقے میں پہنچ کر اس نے کمو کو اڈے سے پر جانے کا حکم دیا اور خود جانی کے ساتھ غلامو کے گھر کی طرف بڑھا۔ کمو اور جانی کو وہ مجود ادا والے اڈے سے اپنے ساتھ لے کر چلا تھا۔

”ارے بھائی آپ آئیے اندر تشریف لائیے۔“ غلام محمد کا دروازہ کھٹکھٹانے پر وہ خود باہر نکلا اور ربن کو دروازے پر کھڑا دیکھ کر گرم جوشی سے دعوت دی۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور

عصبت کی فریب کاریوں کا مزید

Downloaded From
Paksociety.com

سپینس ڈائجسٹ

Section

شناخت

تویر ریاض

کبھی کبھی اندھا اعتماد گہری نظر رکھنے والوں کو بھی اندھا کر دیتا ہے۔ وہ بھی ایک ذرا سی غلطی کر بیٹھی تھی مگر جب اعتماد اور یقین کی دیوار گری تو وہ خود بھی جانے کتنی پستی میں جا رہی... اور بس اس ایک پل میں اس نے یقین اور گمان کے درمیان بہت لمبا سفر طے کیا اور بالآخر صحیح مقام پر جا پہنچی لیکن... اس ایک پل کی شناخت اس کے لیے بہت بڑی آزمائش بن گئی۔

بھولے بسے چہروں میں رشتوں کی تلاش کا تیسرا مرحلہ

Downloaded From
Paksociety.com

کہ میں کچھ نہ سن سکی اور نہ ہی مجھے کچھ نظر آیا۔ میرے سر کا دایاں حصہ لکڑی کے فرش سے ٹکرایا اور میں وہیں ڈھیر ہو گئی۔ کافی دیر تک حرکت کرنے کے قابل نہ رہی اور فرش پر لیٹے ہوئے یوں لگا جیسے گولی مجھے لگی ہے اور شاید میں

”کیا تم ترتیب سے واقعات کی تفصیل بتا سکتی ہو؟“ انہوں نے مجھ سے پوچھا لیکن میں کوئی معقول جواب نہ دے سکی کیونکہ مجھے تفصیل یاد نہیں تھی۔ پستول کا قاتر میرے قریب سے ہوا تھا اور دھماکے کی آواز اتنی زیادہ تھی

مرچکی ہوں کیونکہ میں کچھ محسوس کر رہی تھی اور نہ ہی سن پارہی تھی۔

کافی دیر تک میں نے کوئی حرکت نہیں کی۔ شاید مرچکی تھی یا زندہ تھی۔ جب تک حرکت کرنے کی کوشش نہ کرتی یہ کیسے معلوم ہوتا کہ میں زندہ ہوں یا مرچکی ہوں لیکن وہ اس وقت تک زندہ تھا جب میں اس سے چلے جانے کی التجا کر رہی تھی پھر ایک فائر ہوا اور گولی اس کے سینے میں جا لگی۔ اس وقت تک ٹریوس زندہ تھا لیکن وہ میری بات نہیں سن رہا تھا اور مجھ پر قہقہے لگا رہا تھا۔ میرا گلا خشک ہو گیا اور الفاظ میرے دماغ میں جم کر رہ گئے۔ "چلے جاؤ۔ چلے جاؤ۔" میں اس کی خوشامد کر رہی تھی۔

لیکن اس پر میری التجاؤں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ مسلسل قہقہے لگا رہا تھا اور اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ کیونکہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ چند لمحوں بعد وہ زندہ نہیں رہے گا۔ کوئی بھی جاندار اپنی موت کے بارے میں نہیں جانتا۔ ٹریوس اکیلا نہیں آیا تھا بلکہ اس کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا۔ نہ جانے مجھے کیوں خیال آیا کہ اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے اور اس پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہیے کہ میں اسے شناخت کر چکی ہوں۔ اس لیے میں نے اسے نہیں دیکھا لیکن اپنے کزن ٹریوس کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی جس نے مجھے پکڑ رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک گن تھی۔

وہ منظر بھی کبھی ایک ڈراؤنے خواب کی طرح مجھے ستاتا ہے۔ میں بے سدھ فرش پر لیٹی ہوئی ہوں۔ میرے بازو اور ٹانگیں بن یا مفلوج ہو چکی ہیں۔ یہاں تک کہ میرے بچوں میں سے کوئی ایک میرا کندھا ہلا کر جگا دیتا ہے۔

"مئی، اٹھ جاؤ۔" میری بیٹی اس حالت میں لیٹا ہوا دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہے اور خوفزدہ ہو کر رونے لگتی ہے، تب میں ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں اور بچوں کے ساتھ مل کر قہقہے لگاتی ہوں تاکہ انہیں یقین آجائے کہ ان کی ماں خیریت سے ہے۔

"کیا تمہیں وہ گن یاد ہے؟" مجھ سے پوچھا گیا۔

میرا جواب نفی میں تھا۔ گن نہیں البتہ فائر کی آواز یاد ہے۔ میں صاف طور پر گن نہیں دیکھ سکی کیونکہ میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اسپارٹا جرنل میں اس گن کی شناخت آٹھارہ تین آٹھ کولٹ ریوالور کے طور پر ہوئی تھی اور یہ پھیپھائیس ڈروپلین ایونیو میں رہنے والے گورڈن

میکڈ انلڈ کی ملکیت تھا جسے 1958ء میں اس کا ہوم اور پرمٹ جاری ہوا تھا۔ اس کے تحت مالک پر لازم ہے کہ وہ ہتھیار کو گھر میں رکھے اور اسے جیب یا کار میں رکھ کر گھر سے باہر لے جانا ممنوع ہے۔ سز میکڈ انلڈ کے پاس دو شکاری ہینڈ گنز بھی تھیں جو اس کے گھر یلو دفتر کی الماری میں منتقل تھیں جسے میرا کزن اور اس کا دوست نہیں کھول سکے۔

جب ریوالور سے فائر ہوا تو میں کچھ نہ سمجھ سکی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کیا ہوا۔ گولی لگی یا کزن نے مجھے فرش پر گرا دیا۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کسی اور کو گولی لگی۔ وہ جان بوجھ کر چلائی گئی یا کوئی حادثہ تھا۔ اس واقعے کو پچیس سال گزر چکے ہیں۔ اس کے بعد کسی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا لیکن سچ یہ ہے کہ اب بھی اس واقعے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی اور حیرت کی بات یہ ہے کہ میکڈ انلڈ ہاؤس آج بھی پھیپھائیس ڈروپلین ایونیو پر موجود ہے جیسے یہ کوئی عام مکان تھا جس میں کسی کا قتل نہ ہوا ہو۔ یہ کوئی خوشگوار بات نہیں ہے اور ہر بار جب بھی میں اسپارٹا آتی تو یہ مجھے پوری طرح اپنے بچوں میں جکڑ لیتی ہے۔

اگر میں کار میں اپنے بچوں یا کسی اور کے ساتھ وہاں سے گزروں تو کسی پر اپنی پریشانی ظاہر نہیں کرتی اور عموماً اس مکان پر دوسری نظر ڈالنے بغیر وہاں سے گزر جاتی ہوں۔ میری چودہ سالہ بیٹی پوچھتی ہے کہ میں یہاں کیوں آتی ہوں جبکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

"اس مکان میں میری ایک پرانی ٹیچر رہا کرتی تھی۔" میں خود کلامی کے انداز میں کہتی ہوں جیسے برابر میں بیٹھی ہوئی بیٹی اور پچھلی نشست پر براجمان بیٹے کو ستانے کے بجائے خود سے مخاطب ہوں۔

میری بیٹی ایلن پوچھتی ہے کہ سز میکڈ انلڈ کیسی ٹیچر تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں خاموش ہو جاتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ سز میکڈ انلڈ بہت عرصہ پہلے اسپارٹا سے جا چکی تھی لیکن یہ نہیں جانتی کہ وہ دونوں میاں بیوی اب بھی زندہ ہیں یا نہیں۔ شاید وہ حیات ہوں کیونکہ 1961ء میں وہ درمیانی عمر کے تھے۔

"وہ بہت اچھی ٹیچر تھیں۔" میں سوچ کر جواب دیتی ہوں۔ "ہم سب ان سے بہت محبت کرتے تھے۔"

"وہ کیا پڑھاتی تھیں مام؟"

"وہ ہمیں سوشل اسٹڈیز پڑھاتی تھیں اور لوئیس

جماعت میں وہ میری کلاس ٹیچر بھی تھیں۔"

"میری زندگی میں ان کی خاص اہمیت تھی۔" میں

تھیں۔ ان کے شوہر مسٹر میکڈانلڈ ریٹائرڈ فوجی افسر تھے جنہوں نے جنگ عظیم دوم میں خدمات انجام دی تھیں۔ مجھے وہ صبح اچھی طرح یاد ہے جب مسٹر میکڈانلڈ نے کلاس روم سے نکلنے کے لیے میرا بازو پکڑ کر کہا تھا۔ ”ماریا! میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ اگلے روز ان کے شوہر کا آپریشن ہے۔

”یہ کوئی بڑا آپریشن نہیں ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”گورڈن بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ دراصل ہم لوگ اس کے لیے تیار نہیں تھے۔ یہ سب کچھ اچانک ہی ہو گیا۔ کل صبح سات بجے اس کا آپریشن ہے۔ کیا تم میری کچھ مدد کر سکتی ہو؟“

”بالکل۔“ میں نے کہا۔ میرے لیے اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی تھی کہ انہوں نے اس اہم ذمے داری کے لیے میرا انتخاب کیا۔

جانتی تھی کہ میری ماں اس کی مخالفت نہیں کرے گی کہ میں اس ہنگامی صورت حال میں اپنی ٹیچر کی مدد کروں۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ اسکول کی کوئی ٹیچر میری ذات میں دلچسپی لے اور میں دوسری لڑکیوں سے آگے نکل جاؤں۔ دراصل اس طرح وہ اپنی محرومی کا ازالہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ ایک دہکی علاقے میں پیدا ہوئی اور حالات کے سبب اسے نويس جماعت میں اسکول چھوڑنا پڑ گیا۔

مسٹر میکڈانلڈ ہمارے مکان سے چند بلاک کے فاصلے پر رہتی تھیں۔ اس دن اسکول ختم ہونے کے بعد وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئیں۔ اس علاقے میں سبھی مشہور لوگ رہا کرتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں اپنے والدین یا کسی قریبی رشتے دار کے بجائے ایک غیر عورت کے ساتھ گھر گئی تھی۔ وہ کافی پریشان لگ رہی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے شوہر کو ایک پرائیویٹ کار کے ذریعے سیرا کوس کے اسپتال بھیج دیا گیا ہے جبکہ وہ اگلے روز صبح روانہ ہوں گی اور توجیح ہے کہ آپریشن شروع ہونے سے پہلے اسپتال پہنچ جائیں گی۔ آپریشن معمولی نوعیت کا ہے۔ اس لیے پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ انہوں نے بار بار ایک ہی بات کہی۔ ”ماریا! یہ بہت اہم ہے کہ کسی اور کو مکان میں داخل نہ ہونے دو۔ سوائے تمہاری ماں کے، اگر وہ ساتھ آنا چاہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور نہیں۔ وعدہ کرو کہ کسی اور کو اندر نہیں آنے دو گی۔“

نے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ پر مضبوطی سے جمائے ہوئے کہا۔ میری نظریں پرانے مکانات کی قطار پر جمی ہوئی تھیں۔ سرخ اینٹوں اور سبز دروازوں والے مکان آج بھی اسی حالت میں تھے۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا۔ میں جب بھی اسپارٹا آتی اور اس مکان کے پاس سے گزرتی تو میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہونے لگتی اور دماغ کی اسکرین پر برسوں پرانی فلم چلنے لگتی۔

☆☆☆

”صرف تم اور کوئی نہیں ماریا۔ میں نہیں سمجھتی کہ تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت ہے۔ کسی اور کو اس مکان میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا تم وعدہ کرتی ہو؟“

”ہاں۔“ میں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

میرے لیے یہ فخر کی بات تھی کہ اپنی ٹیچر کی مدد کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ ان کے شوہر مسٹر میکڈانلڈ کو بغرض علاج سیرا کوس کے اسپتال میں داخل ہونا تھا اور مسٹر میکڈانلڈ نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ ان کی غیر موجودگی میں مکان کی دیکھ بھال کرتی رہوں۔ میری ذمے داریوں میں روزانہ اسکول سے واپس آنے کے بعد میکڈانلڈ ہاؤس جانا، اخبار اور ڈاک اٹھانا، مسٹر میکڈانلڈ کی ٹیلی کے لیے خوراک کا انتظام کرنا اور پودوں کو پانی دینا تھا۔ مسٹر میکڈانلڈ کا کہنا تھا کہ وہ مجھے ان خدمات کا معاوضہ ادا کریں گی۔ معاوضے کی رقم سن کر میں حیران رہ گئی۔ یہ بے بی سنگ کے معاوضے سے دو گنا تھی۔ تاہم یہ ایک ہنگامی صورت حال تھی۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ مسٹر میکڈانلڈ کو اچانک ہی آپریشن کی ضرورت پیش آجائے گی اور انہیں اپنے شہر سے پچاس میل دور سیرا کوس کے ایک ہوٹل میں قیام کرنا پڑے گا جو اسپتال سے نزدیک ہی تھا۔ اس دوران کوئی متبادل ٹیچر ان کی جگہ کلاس لیتی جبکہ گھر کی دیکھ بھال کے لیے وہ مجھ سے مدد کی توقع کر رہی تھیں۔

وہ اپریل 1961ء کا مہینا تھا۔ اس وقت میں چودہ سال کی اور نويس جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ مسٹر میکڈانلڈ مجھے بہت چاہتی تھیں۔ چالیس کی ہونے کے باوجود وہ بہت پرکشش تھیں۔ ان کے لمبوسات، بالوں کا انداز، ذہانت اور شاندار شخصیت انہیں دوسری ٹیچرز سے ممتاز کرتی تھی۔ ان کا جسم بے حد متناسب تھا۔ اس وجہ سے ہر لباس ان پر چلتا تھا اور انہیں دیکھ کر ہالی ووڈ ایکٹریس جین کرین کی یاد آ جاتی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے ہمراہ اسپارٹا کے سب سے بہترین علاقے میں واقع ایک بڑے اور پرکشش مکان میں رہتی

میں نے وعدہ کر لیا۔ وہ بے بھی میرا کوئی عزیز دوست نہیں تھا جسے اپنی ٹیچر کی غیر موجودگی میں ان کے گھر بلاتی۔ صبح اسکول میں مجھ سے بات کرنے کے بعد مسز میکڈانلڈ نے میری ماں کو فون کیا۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس سلسلے میں میری ماں سے اجازت طلب کریں گی لیکن وہ ہر کام مناسب اور باوقار طریقے سے کرتی تھیں۔

وہ مجھے بتا رہی تھیں کہ اوپر کی منزل کے کمرے بند رہیں گے۔ "اوپر جانے کی ضرورت نہیں، میرے شوہر کا دفتر ہال کے آخری سرے پر ہے۔ وہ بھی منتقل رہے گا۔ جو بھی ڈاک آئے، وہ تم کھانے کی میز پر رکھ دینا۔" وہ مجھے لے کر نچلی منزل کے مختلف حصوں میں گئیں۔

میں نے اتنا خوب صورتی سے سجا ہوا گھر نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے جو کام بتائے وہ میری توقع سے بہت زیادہ تھے۔ مجھے ان کی لمبی کی دیکھ بھال کرنے کے ساتھ ساتھ پودوں کا بھی خیال رکھنا تھا۔ میز صیوں پر سے اخبار اور ڈاک اٹھا کر کھانے کی میز پر رکھنا تھی۔ کمروں کی لائٹس اور ٹی وی آن کرنا تھا تاکہ لوگ بھی سمجھیں کہ گھر میں کوئی ہے۔

وہ تمہیں کم از کم ایک گھنٹا یہاں رہنا ہوگا تاکہ ساشا کو اکیلے بین کا احساس نہ ہو۔ تم یہاں صوفے پر بیٹھ کر ہوم ورک کر سکتی ہو اور چاہو تو ٹی وی سے دل بہلاؤ۔ ریفریجریٹر بھرا ہوا ہے۔ تمہارا جو دل چاہے وہ کھاؤ لیکن صرف تم۔۔۔۔۔ کوئی اور نہیں۔"

وہ میرا نام لیے بغیر تیزی سے بول رہی تھیں۔ جیسے انہیں بہت جلدی ہو۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں کھائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو گھمرا رہی تھیں اور بھول گئی تھیں کہ میں کون ہوں۔ اس خوب صورت کمرے کے ایک سرے پر فرش سے چھت تک شیٹے کی کھڑکیاں نصب تھیں جن سے سورج کی روشنی اندر آرہی تھی۔ اس جگہ مختلف اقسام کے پودے رکھے ہوئے تھے اور عام پودوں کی نسبت ان کی نگہداشت زیادہ پیچیدہ تھی۔ مسز میکڈانلڈ نے اپنے دفتر میں جو پودے رکھے ہوئے تھے، وہ کافی عرصے تک پانی کے بغیر بھی رہ سکتے تھے۔ خوش قسمتی سے میں اپنے ساتھ نوٹ بک لے آئی تھی لہذا اچھے بچوں کی طرح ان کی ہدایات نوٹ کرتی رہی۔

اس دوران میں ایک خوب صورت سیای لمبی کچھ فاصلے سے ہمس و ہستی رہی۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک ہمارے پیچھے آئی لیکن اس نے ایک مرتبہ بھی ہم سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی آنکھیں نیکی اور کان عاجزیوں کی نسبت کافی بڑے تھے۔ میں نے سمجھ

قریب سے اسٹاڈنٹس جانور نہیں دیکھا تھا۔ مسز میکڈانلڈ نے کہا۔ "امید ہے کہ تم ساشا کو دوست بنا لو گی۔" لیکن یہ ظاہر ایسا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بھی بدستور فاصلے پر رہی۔ مسز میکڈانلڈ نے اسے بلانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔

ان کی ہدایت کے مطابق مجھے ہر روز لمبی کی خوراک کا ایک تازہ ڈبا کھولنا تھا اور ساتھ ہی اسے خشک میوے اور تازہ پانی بھی دینا تھا۔ ساشا شاید اکیلے رہنے کی وجہ سے پریشان ہو گئی تھی اور اس وجہ سے شاید پوری طرح کھانا نہیں کھا رہی تھی۔ ایسی صورت میں مجھے پیالہ دھو کر اسے تولیا سے صاف کرنا ہوتا اور اس کے لیے میں ایک نیا ڈبا کھولتی۔ اسی طرح ہر روز مجھے اس کا پانی بھی تبدیل کرنا پڑتا۔

"خیال رکھنا یہ باہر نہ جانے پائے۔" مسز میکڈانلڈ نے کہا۔ "ہو سکتا ہے جب تم دروازہ کھولو تو یہ باہر جانے کی کوشش کرے۔"

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ مسز میکڈانلڈ نے لپٹ کر فون اٹھا لیا۔ وہ کسی سے کہہ رہی تھیں۔ "ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں اور کل صبح اسپتال کے لیے روانہ ہو جاؤں گی۔ میں نے اپنی ایک بہت ہی قابل اعتماد شاگرد سے کہہ دیا ہے کہ وہ میری غیر موجودگی میں گھر کا خیال رکھے۔ ہاں، مجھے اس پر پورا بھروسہ ہے۔"

گھر سے باہر نکلنے وقت انہوں نے مجھے چابی سے دروازہ کھولنے کی مشق کرائی۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں آمدورفت کے لیے سامنے والے دروازے کے بجائے کچن کا دروازہ استعمال کروں۔ انہوں نے مجھے ایک ٹائپ شدہ کاغذ بھی دیا جس پر ہدایات درج تھیں اور اس کے ساتھ ہی تیس ڈالر کے کچھ نوٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کسی بھی وقت پیسوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"

وہ کل ساٹھ ڈالرز تھے اور اگر میں کئی ہفتوں تک ان کی مدد کرتی تب بھی یہ رقم بہت زیادہ تھی گوکہ میں انہیں بتا چکی تھی کہ اپنے گھر تک پیدل چلی جاؤں گی جو تھوڑے فاصلے پر ہے لیکن انہوں نے اسرار کیا کہ وہ مجھے اپنی گاڑی میں چھوڑ دیں گی۔ اس کے بعد میرے پاس کچھ کنبے کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ وہ جو فیملہ کر لیں، تبدیل نہیں ہو سکتا تھا۔

"اندھیرا پھیل رہا ہے اور سردی بھی ہے۔ اس لیے میں تمہیں پیدل نہیں جانے دوں گی۔"

اس رات ماں نے مجھ سے کئی سوالات کیے۔ وہ لگ بگ کس طرح کے گھر میں رہتے ہیں اور میری ذمے

داریاں کیا ہوں گی۔ وہ بہت خوش اور پرجوش نظر آ رہی تھی لیکن ساتھ ہی تھوڑی سی فکر مند بھی کہ اگر سز میکڈانلڈ کی غیر موجودگی میں کوئی واقعہ پیش آ گیا تو اس کا الزام مجھ پر آئے گا۔

سز میکڈانلڈ نے ماں کو بتا دیا تھا کہ وہ مجھے اس خدمت کا معاوضہ دے گی لیکن ماں کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ پہلے ہی ایک بڑی رقم دے چکی ہے جو کام کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ ماں کو ان ساٹھ ڈالرز کے بارے میں بتاؤں یا نہیں لیکن ابھی نہیں۔ اگر اسے پتا چل جاتا تو وہ اس کا بڑا حصہ لے لیتی، یہ میرے پیسے تھے۔

اگلے روز سہ پہر میں جب میں بیکی بار میکڈانلڈ باؤس گئی تو کانی گھبرائی ہوئی تھی۔ جانے کیوں مجھے موبوم سی توقع تھی کہ وہاں کوئی ہوگا لیکن گھر خالی پڑا ہوا تھا۔ سوائے اس بلی کے جو مجھے دیکھتے ہی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ کچھ چیزیں اس طرح نظر نہیں آئیں جیسا کہ امید کر رہی تھی۔ سز میکڈانلڈ نے اسپرے گن اور پانی کا برتن ڈائننگ روم کے فرش پر رکھنے کے بجائے چکن میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ تنگ میں ناشتے کے برتن بغیر وحلے رکھے ہوئے تھے جیسے وہ بہت عجلت میں روانہ ہوئی ہو۔ چکن کا ڈنٹر پر گزشتہ روز کے اخبار کے صفحات پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی الماری کا ایک دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کے اندر ایک بلیب چل رہا تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ گزشتہ شب وہ کتنی پریشان تھی اور فون سن کر خوفزدہ ہوئی تھی جیسے اسے کسی بدترین بات کا ڈر ہو کہ اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے۔

میں نے دیکھا کہ اوپری منزل کے کمرے منتقل نہیں تھے جیسا کہ سز میکڈانلڈ کا پروگرام تھا اور ان کے دروازے بھی بند نہیں تھے۔ میں نے انہیں بند کرنے کے بارے میں سوچا۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ میں نے وہ دروازے کھولے ہوں گے لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ مجھ پر بھروسہ کرتی تھی۔ میں نے دروازے کے پاس سے ڈاک اور اخبارات اٹھائے اور انہیں کھانے کی میز پر رکھ دیا۔ ان میں زیادہ تر سز میکڈانلڈ کے نام کاروباری خطوط تھے جبکہ صرف ایک خط سز میکڈانلڈ کے نام تھا۔ اس دوران میں ساشا کو بھی آوازیں دیتی رہی لیکن اس نے مکمل طور پر مجھے نظر انداز کر دیا۔

میں نے گزشتہ روز کا بچا ہوا کھانا پلاسٹک کے پیالا سے صاف کیا اور اس کے لیے چھلکی کا نیا ڈبہ گھولا اور ساتھ ہی خشک میوے اور تازہ پانی بھی رکھ دیا لیکن ساشا نظر نہیں

آ رہی تھی۔ میں نے چکن میں جا کر سبک میں رکھے ہوئے برتن دھوئے اور انہیں کپڑے سے خشک کر کے کینٹ میں رکھ دیا۔ میری خواہش تھی کہ جب وہ واپس آئیں تو انہیں ہر چیز صاف ستھری ملے۔ اسی نفاست پسندی سے میں نے پودوں کی دیکھ بھال کی تاکہ سز میکڈانلڈ کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ وہ بہت ہی خوب صورت پودے تھے جو میکسیکو اور جنوبی امریکا سے منگوائے گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ ایک دن میرے پاس بھی ایسے ہی پودے اور ایسا مکان ہوگا۔

میرا ارادہ لائبریری میں رکھی ہوئی چند کتابوں کو بھی دیکھنے کا تھا جو لیونگ روم سے متصل تھی اور اس میں چاروں طرف چھت سے فرش تک کتابوں سے بھرے ہوئے شیلف رکھے ہوئے تھے لیکن میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکی اور نہ ہی میں نے ٹیلی ویژن کو آن کیا جو ہمارے گھر کے بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوب صورت اور بڑا تھا۔ ڈرتی تھی کہ کہیں کوئی خرابی ہوگئی تو اس کا الزام میرے سر آئے گا۔

ٹی وی روم کے برابر میں سز میکڈانلڈ کا ہوم آفس تھا جسے میرنی ٹیچر نے منتقل کیا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے یوں لگا جیسے سز میکڈانلڈ مجھے دیکھ رہی ہیں۔ اچانک ہی میرے عقب میں یا سیدھیوں کے اوپر ایک آواز سنائی دی جیسے کوئی زور زور سے سانس لے رہا ہو۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے بے اختیار پکارا۔ "ہیلو، ہیلو۔" لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ رہے بھی یہ مکان بہت بڑا تھا اور میں نہیں جانتی تھی کہ اس میں کتنے کمرے ہیں۔

میں نے سوچا کہ نوراً ہی یہاں سے نکل جانا چاہیے گوکہ مجھے آئے ہوئے پہ مشکل میں منٹ ہوئے تھے اور ابھی تک میں نے وہ سارے کام انجام نہیں دیے تھے جو سز میکڈانلڈ نے مجھے بتائے تھے۔ ان میں سب سے اہم ساشا کو کھانا کھلانا تھا لیکن وہ آوازیں کر میں اتنی گھبرا گئی کہ میرے لیے ایک سیکنڈ بھی رکتا محال ہو گیا۔ میں نے جلدی سے لائٹس آف کیں اور گھر کی طرف چل دی گوکہ کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا تھا لیکن میں بری طرح کانپ رہی تھی۔ مام نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے کچھ نہیں ہوا لیکن اسے مجھ سے زیادہ سز میکڈانلڈ کے مکان کی فکر تھی۔ اس نے پوچھا۔ "اس کے گھر میں تو سب ٹھیک ہے نا؟"

میں نے وعدہ کر لیا۔ دو گھنٹے بھی میرا کوئی عزیز دوست نہیں تھا جسے اپنی بیچری غیر موجودگی میں ان کے گھر بلانی۔ صبح اسکول میں مجھ سے بات کرنے کے بعد سز میکڈ انڈ نے میری ماں کو فون کیا۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس سلسلے میں میری ماں سے اجازت طلب کریں گی لیکن وہ ہر کام مناسب اور باوقار طریقے سے کرتی تھیں۔

وہ مجھے بتا رہی تھیں کہ اوپر کی منزل کے کمرے بند رہیں گے۔ ”اوپر جانے کی ضرورت نہیں، میرے شوہر کا دفتر ہال کے آخری سرے پر ہے۔ وہ بھی منتقل رہے گا۔ جو بھی ڈاک آئے وہ وہاں کھانے کی میز پر رکھ دینا۔“

وہ مجھے لے کر بجلی منزل کے مختلف حصوں میں گئیں۔ میں نے اتنا خوب صورتی سے سجا ہوا گھر نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے جو کام بتائے وہ میری توقع سے بہت زیادہ تھے۔ مجھے ان کی بلی کی دیکھ بھال کرنے کے ساتھ ساتھ

پودوں کا بھی خیال رکھنا تھا۔ بیڑھیوں پر سے اخبار اور ڈاک اٹھا کر کھانے کی میز پر رکھنا تھی۔ کمروں کی لائٹس اور ٹی وی آن کرنا تھا تاکہ لوگ یہی سمجھیں کہ گھر میں کوئی ہے۔

”تمہیں کم از کم ایک گھنٹا یہاں رہنا ہو گا تاکہ ساشا کو اکیلے پن کا احساس نہ ہو۔ تم یہاں صوفے پر بیٹھ کر ہوم ورک کر سکتی ہو اور چاہو تو ٹی وی سے دل پہلاؤ۔ ریفریجریٹر بھرا ہوا ہے۔ تمہارا جو دل چاہے وہ کھاؤ لیکن صرف تم..... کوئی اور نہیں۔“

وہ میرا نام لیے بغیر تیزی سے بول رہی تھیں۔ جیسے انہیں بہت جلدی ہو۔ وہ گھبراہٹ کے عالم میں کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی کو گھمرا رہی تھیں اور پھول گئی تھیں کہ میں کون ہوں۔ اس خوب صورت کمرے کے ایک سرے پر فرش سے چھت تک شیشے کی کنڈیاں نصب تھیں جن سے سورج کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ اس جگہ مختلف اقسام کے پودے رکھے

ہوئے تھے اور عام پودوں کی نسبت ان کی نگہداشت زیادہ پیچیدہ تھی۔ سز میکڈ انڈ نے اپنے دفتر میں جو پودے رکھے ہوئے تھے وہ کافی عرصے تک پانی کے بغیر بھی رہ سکتے تھے۔ خوش قسمتی سے میں اپنے ساتھ نوٹ بک لے آئی تھی

لہذا اچھے بچوں کی طرح ان کی ہدایات نوٹ کرتی رہی۔ اس دوران میں ایک خوب صورت سیاہی بلی کچھ فاصلے سے ہمیں دیکھتی رہی۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک ہمارے پیچھے آئی لیکن اس نے ایک مرتبہ بھی ہم سے آگے نکلنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی آنکھیں نیلی اور کان عام بلیوں کی نسبت کافی بڑے تھے۔ میں نے بھی

قریب سے اتنا دلکش جا بوج نہیں دیکھا تھا۔ سز میکڈ انڈ نے کہا۔ ”اسید ہے کہ تم ساشا کو دوست بنا لو گی۔“ لیکن یہ ظاہر ایسا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بھی بدستور فاصلے پر رہی۔ سز میکڈ انڈ نے اسے بلانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔

ان کی ہدایت کے مطابق مجھے ہر روز بلی کی خوراک کا ایک تازہ ڈبا کھولنا تھا اور ساتھ ہی اسے خشک میوے اور تازہ پانی بھی دینا تھا۔ ساشا شاید اکیلے رہنے کی وجہ سے پریشان ہو گئی تھی اور اس وجہ سے شاید پوری طرح کھانا نہیں کھا رہی تھی۔ ایسی صورت میں مجھے یہاں دھوکرا سے تولیا سے صاف کرنا ہوتا اور اس کے لیے میں ایک نیا ڈبا کھولتی۔

اسی طرح ہر روز مجھے اس کا پانی بھی تبدیل کرنا پڑتا۔ ”خیال رکھنا یہ باہر نہ جانے پائے۔“ سز میکڈ انڈ نے کہا۔ ”ہوسکتا ہے جب تم دروازہ کھولو تو یہ باہر جانے کی کوشش کرے۔“

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ سز میکڈ انڈ نے لپک کر فون اٹھالیا۔ وہ کسی سے کہہ رہی تھیں۔ ”ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں اور کلن صبح اسپتال کے لیے روانہ ہو جاؤں گی۔ میں نے اپنی ایک بہت ہی قابل اعتماد دشا گرد سے کہہ دیا ہے کہ وہ میری غیر موجودگی میں گھر کا خیال رکھے۔ ہاں، مجھے اس پر پورا بھروسہ ہے۔“

گھر سے باہر نکلتے وقت انہوں نے مجھے جانی سے دروازہ کھولنے کی مشق کروائی۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں آمدورفت کے لیے سامنے والے دروازے کے بجائے کچن کا دروازہ استعمال کروں۔ انہوں نے مجھے ایک ٹائپ شدہ کاغذ بھی دیا جس پر ہدایات درج تھیں اور اس کے ساتھ ہی بیس ڈالر کے کچھ نوٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں کسی بھی وقت پیسوں کی ضرورت پر سکتی ہے۔“

وہ کل ساٹھ ڈالر زتھے اور اگر میں کئی ہفتوں تک ان کی مدد کرتی تب بھی یہ رقم بہت زیادہ تھی گوکہ میں انہیں بتا چکی تھی کہ اپنے گھر تک پیدل چلی جاؤں گی جو تھوڑے فاصلے پر ہے لیکن انہوں نے اصرار کیا کہ وہ مجھے اپنی گاڑی میں چھوڑ دیں گی۔ اس کے بعد میرے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ وہ جو فیصلہ کر لیں تبدیل نہیں ہو سکتا تھا۔

”اندھیرا پچھل رہا ہے اور سردی بھی ہے۔ اس لیے میں تمہیں پیدل نہیں جانے دوں گی۔“

اس رات ماں نے مجھ سے کئی سوالات کیے۔ وہ لوگ کس طرح کے گھر میں رہتے ہیں اور میری ذمے

واریاں کیا ہوں گی۔ وہ بہت خوش اور مزہ خوش نظر آ رہی تھی لیکن ساتھ ہی تھوڑی سی فکر مند بھی کہ اگر مسز میکڈائلڈ کی غیر موجودگی میں کوئی واقعہ پیش آ گیا تو اس کا الزام مجھ پر آئے گا۔

مسز میکڈائلڈ نے ماں کو بتا دیا تھا کہ وہ مجھے اس خدمت کا معاوضہ دے گی لیکن ماں کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ پہلے ہی ایک بڑی رقم دے چکی ہے جو کام کے لحاظ سے بہت زیادہ تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ ماں کو ان ساٹھ ڈالرز کے بارے میں بتاؤں یا نہیں لیکن ابھی نہیں۔ اگر اسے پتا چل جاتا تو وہ اس کا بڑا حصہ لے لیتی، یہ میرے لیے تھے۔

اگلے روز سہ پہر میں جب میں پہلی بار میکڈائلڈ باؤس گئی تو کافی گھبرائی ہوئی تھی۔ جانے کیوں مجھے موم سی توقع تھی کہ وہاں کوئی ہوگا لیکن گھر خالی پڑا ہوا تھا۔ سوائے اس بلی کے جو مجھے دیکھتے ہی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ کچھ چیزیں اس طرح نظر نہیں آئیں جیسا کہ امید کر رہی تھی۔ مسز میکڈائلڈ نے اسپرے گن اور پانی کا برتن ڈاسٹنگ روم کے فرش پر رکھنے کے بجائے کچن میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ ٹنک میں ٹائٹے کے برتن بغیر دھلے رکھے ہوئے تھے جیسے وہ بہت غفلت میں روانہ ہوئی ہو۔ کچن کاؤنٹر پر گزشتہ روز کے اخبار کے صفحات پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی الماری کا ایک دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کے اندر ایک بلب جل رہا تھا۔ مجھے یاد آ گیا کہ گزشتہ شب وہ کتنی پریشان تھی اور فون سن کر خوفزدہ ہو گئی تھی جیسے اسے کسی بدترین بات کا ڈر ہو کہ اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے۔

میں نے دیکھا کہ اوپری منزل کے کمرے مقفل نہیں تھے جیسا کہ مسز میکڈائلڈ کا پروگرام تھا اور ان کے دروازے بھی بند نہیں تھے۔ میں نے انہیں بند کرنے کے بارے میں سوچا۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ میں نے وہ دروازے کھولے ہوں گے لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ مجھ پر بھروسہ کرتی تھی۔ میں نے دروازے کے پاس سے ڈاک اور اخبارات اٹھائے اور انہیں کھانے کی میز پر رکھ دیا۔ ان میں زیادہ تر مسز میکڈائلڈ کے نام کاروباری خطوط تھے جبکہ صرف ایک خط مسز میکڈائلڈ کے نام تھا۔ اس دوران میں ساشا کو بھی آوازیں دیتی رہی لیکن اس نے مکمل طور پر مجھے نظر انداز کر دیا۔

میں نے گزشتہ روز کا بیجا ہوا کھانا پلاسٹک کے پیالا سے صاف کیا اور اس کے لیے پھل کا نیا ڈاکھولا اور ساتھ ہی خشک بیوے اور تازہ پانی بھی رکھ دیا لیکن ساشا نظر نہیں

آ رہی تھی۔ میں نے کچن میں جا کر ٹنک اٹل رکھے ہوئے برتن دھوئے اور انہیں کپڑے سے خشک کر کے کینٹ میں رکھ دیا۔ میری خواہش تھی کہ جب وہ واپس آئیں تو انہیں ہر چیز صاف ستھری ملے۔ اسی نفاست پسندی سے میں نے پودوں کی دیکھ بھال کی تاکہ مسز میکڈائلڈ کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ وہ بہت ہی خوب صورت پودے تھے جو میکسیکو اور جنوبی امریکا سے منگوائے گئے تھے۔ میں نے سوچا کہ ایک دن میرے پاس بھی ایسے ہی پودے اور ایسا مکان ہوگا۔

میرا ارادہ لائبریری میں رکھی ہوئی چند کتابوں کو بھی دیکھنے کا تھا جو لیونگ روم سے متصل تھی اور اس میں چاروں طرف چھت سے فرش تک کتابوں سے بھرے ہوئے شیف رکھے ہوئے تھے لیکن میں وہاں زیادہ دیر نہیں رکی اور نہ ہی میں نے نئی ڈیزائن کو آن کیا جیہ ہمارے گھر کے بلیک اینڈ وائٹ فی بی کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوب صورت اور بڑا تھا۔ ڈرتی تھی کہ کہیں کوئی خرابی ہو گئی تو اس کا الزام میرے سر آئے گا۔

فی بی روم کے برابر میں مسز میکڈائلڈ کا موم آفس تھا جسے میری بیچر نے مقفل کیا ہوا تھا۔ میں نے اسے کھولنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے یوں لگا جیسے مسز میکڈائلڈ مجھے دیکھ رہی ہیں۔ اچانک ہی میرے عقب میں یا سیرچیوں کے اوپر ایک آواز سنائی دی جیسے کوئی زور زور سے سانس لے رہا ہو۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے بے اختیار پکارا۔ "ہیلو، ہیلو" لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ویسے بھی یہ مکان بہت بڑا تھا اور میں نہیں جانتی تھی کہ اس میں کھل کتنے کمرے ہیں۔

میں نے سوچا کہ فوراً ہی یہاں سے نکل جانا چاہیے گوکہ مجھے آئے ہوئے پہ مشکل بیس منٹ ہوئے تھے اور ابھی تک میں نے وہ سارے کام انجام نہیں دیے تھے جو مسز میکڈائلڈ نے مجھے بتائے تھے۔ ان میں سب سے اہم ساشا کو کھانا کھلانا تھا لیکن وہ آوازیں کر میں اتنی گھبرا گئی کہ میرے لیے ایک سیکنڈ بھی رکنا محال ہو گیا۔ میں نے جلدی سے لائٹس آف کیں اور گھر کی طرف چل دی گوکہ کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا تھا لیکن میں بری طرح کانپ رہی تھی۔ ماں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ میں نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے کچھ نہیں ہوا لیکن اسے مجھ سے زیادہ مسز میکڈائلڈ کے مکان کی فکر تھی۔ اس نے پوچھا۔ "اس کے گھر میں تو سب ٹھیک ہے نا؟"

یہ عجیب و غریب سوال سن کر میں حیران رہ گئی۔ "ہاں"

رہتے ہیں کہ تم واپس کب آؤ گی؟
 "بہت جلد۔ اگلے ہفتے تک واپس آ جاؤں گی۔"
 میں نے ان سے مسٹر میکڈانلڈ کے بارے میں پوچھا تو
 انہوں نے بتایا کہ وہ تیزی سے صحت یاب ہو رہے ہیں۔
 اس کے بعد فون بند ہو گیا۔ میں نے گھر کی بتیاں بجھائیں
 اور اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گئی۔

سب ٹھیک ہے، گھر لو کیا ہونا تھا؟
 "اس نے آج مجھے سیرا کوس سے فون کیا تھا۔"
 "تمہیں فون کیا تھا..... کیوں؟ وہ کیا کہہ رہی تھی؟"
 "وہ تمہارے اور اپنے گھر کے بارے میں پوچھ رہی
 تھی لیکن اس نے اپنے شوہر کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔
 شاید وہ ذاتی باتیں کسی سے نہیں کرنا چاہتی۔"

تیسرے روز میں نے چھینج کر تیس منٹ پر اپنا کام
 ختم کر لیا۔ بلی کے برتن دھوئے اور اس میں تازہ کھانا رکھ
 رہی تھی کہ میں نے ساشا کو بچن کے دروازے پر دیکھا۔ وہ
 اضطرابی طور پر اپنی دم فرش پر رگڑ رہی تھی۔ میں اسی وقت
 دروازے کی گھنٹی بجی جس کی آواز اس خاموش مکان میں
 ایک جیٹا کے کے ساتھ گونجی۔ کیا کوئی دروازے پر تھا؟ میں
 سوچنے لگی کہ میرے والدین کے سوا کسی کو معلوم نہیں کہ میں
 اس وقت یہاں ہوتی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میکڈانلڈ کا کوئی
 جاننے والا ہو۔ کوئی سامان لانے والا شخص تو ہو نہیں سکتا
 کیونکہ وہ نوگ عموماً صبح کے وقت آتے ہیں۔

دوسرے روز ماں نے رضا کارانہ طور پر میرے
 ساتھ چلنے کی پیشکش کی لیکن میں نے فوراً ہی منع کر دیا کیونکہ
 مسز میکڈانلڈ نے سختی سے تاکید کی تھی کہ میں کسی کو اپنے ساتھ
 لے کر نہ آؤں البتہ ماں کے لیے منع نہیں کیا تھا لیکن میں
 احتیاط سے کام لے رہی تھی۔
 "میں نہیں سمجھتی کہ مسز میکڈانلڈ کو اس پر کوئی اعتراض
 ہوگا۔" ماں نے کہا۔
 "لیکن میں وعدہ کر چکی ہوں اور اپنا وعدہ نہیں
 توڑ سکتی۔"

میں نے سوچا کہ خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ وہ یہ سوچ
 کر واپس چلا جائے گا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے لیکن مشکل یہ
 آن پڑی کہ میں نے مسز میکڈانلڈ کی ہدایت کے مطابق تمام
 کمروں کی بتیاں روشن کر رکھی تھیں جس سے کوئی بھی شخص یہ
 اندازہ لگا سکتا تھا کہ گھر خالی نہیں ہے۔ یہ بھی غنیمت ہوا کہ
 لیونگ روم کی جو کھڑکیاں سڑک کی جانب کھلتی تھیں، وہاں
 پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس طرح کسی کے لیے باہر
 سے جھانکنا ممکن نہ تھا۔

اس روز میں نے وہ سارے کام نمٹا دیے جو مسز
 میکڈانلڈ نے مجھے بتائے تھے۔ مجھے اپنی ٹیچر کی ہدایت کے
 مطابق ایک گھنٹا وہاں رہنا تھا۔ میں نے وقت تزاری کے
 لیے ساشا کو اپنے پاس بلانا چاہا لیکن وہ مجھ سے دور رہی۔
 اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے تمام کمروں کی لائٹس آن
 کر دیں۔ اس کے بعد اپنا ہوم ورک کرنے بیٹھ گئی لیکن مجھے
 بے آرامی محسوس ہو رہی تھی۔ سوا سات ہو چکے تھے اور میں
 واپس جانے کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی
 بجی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ریسیور اٹھایا۔ دوسری جانب
 سے مسز میکڈانلڈ بول رہی تھیں۔

دروازے کی گھنٹی دوبارہ بجی اور بار بار بجتی رہی جو
 کہ ایک غیر فطری بات تھی۔ یقیناً یہ کوئی میکڈانلڈ کا دوست
 نہیں ہو سکتا پھر میرے کانوں میں ایک جانی پھپھانی آواز
 آئی۔ "ماریا!" مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ آواز کس
 کی ہو سکتی ہے۔ وہ میرا کزن ٹریوس ریڈل تھا لیکن اسے یہ
 کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں ہوں؟ یہ بات تو صرف میرے
 والدین ہی جانتے تھے۔ ضرور میری ماں نے اپنے کسی
 رشتے دار کے سامنے سچی بگھاری ہوگی کہ میں اپنی ٹیچر کی
 غیر موجودگی میں اس کے مکان کی دیکھ بھال کر رہی ہوں
 اور اس نے میری سوتیلی خالہ لویس ریڈل کو بتا دیا ہوگا جو
 اسپارٹا سے ٹومیل کے فاصلے پر پیجیم کاؤنٹی میں رہتی تھی لیکن
 دونوں بہنوں کے درمیان ملنا جلنا نہیں تھا اور وہ میرے
 کزن ٹریوس کی ماں تھی۔

"ہیلو، ماریا! کیسی ہو..... گھر کا کیا حال ہے؟"
 "بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے وہ سارے کام کر دیے
 جو تم نے مجھے بتائے تھے۔"
 "اور ساشا کیسی ہے؟"
 "کھانا کھا رہی ہے لیکن مجھ سے اب بھی تھوڑی سی
 خوفزدہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ جلد ہی ہماری دوستی
 ہو جائے گی۔"

یہ میرے لیے حیرت کی بات تھی۔ میں نے ٹریوس کو

انہوں نے مجھ سے ایک بار پھر مکان کے بارے میں
 پوچھا۔ وہ اپنی ڈاک کے بارے میں جاننے کے لیے بے
 چین تھیں اور ساتھ ہی انہیں یہ فکر بھی لاحق تھی کہ ان کی
 غیر موجودگی میں کوئی فون تو نہیں آیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ
 میں اس وقت یہاں نہیں ہوں اور سب لوگ پوچھتے

نشے کی حالت میں ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دروازے پر آکر اس سے جانے کے لیے کہوں۔ اس طرح وہ مشتعل ہو سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر خاموش رہوں گی تو وہ یہی سمجھے گا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے اور اگر میں نے انہیں اشتعال نہ دایا تو وہ چند منٹوں میں چلے جائیں گے۔

ایسا ہی ہوا۔ پانچ یا چھ منٹ بعد دروازے پر ضربیں پڑنا بند ہو گئیں۔ اب وہ دروازے کی کھنٹی بھی نہیں بجارہے تھے۔ میرے کزن کی التجا کی اور چیخا چلاتا بھی بند ہو گیا تھا۔ غالباً انہوں نے اپنی کوشش ترک کر دی تھی اور وہ وہاں سے چلے گئے تھے۔ میں نے بڑی احتیاط سے بیرونی دروازے کا جائزہ لیا۔ یہ ظاہر وہاں سیرچیوں پر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے لیونگ روم کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ مجھے سامنے والے لان میں بھی کوئی نظر نہ آیا۔

میں نے سکون کا سانس لیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسا سوچا ہی نہ تھا کہ وہ مجھے ہراساں یا نقصان پہنچانا چاہتا ہے اور نہ ہی وہ یہاں سے کچھ چرانا چاہتا ہوگا کیونکہ اسکی صورت میں اس کے پکڑنے جانے کا خطرہ ہو سکتا تھا۔ وہ مجھے پسند کرتا تھا اور کبھی نہیں چاہے گا کہ میں کسی مشکل میں گرفتار ہو جاؤں جب تک کہ وہ مجھ سے ناراض نہ ہو۔ میں اب بھی اپنے کزن ٹریوس سے محبت کرتی تھی۔ اسی لیے چاہ رہی تھی کہ کم از کم آج کی رات وہ میکڈالڈ ہاؤس میں نہ آئے۔

یہ جاننے کے بعد کہ ٹریوس اور اس کا ساتھی جا چکے ہیں، میں بھی گھر جانے کے لیے بے قرار ہو گئی۔ اب مجھے بتیان سمجھانا تھیں۔ میں نے جلدی جلدی پودوں کو پانی دیا۔ اس کے بعد کچن میں واپس آئی۔ میں گھر جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ کچن کے دروازے پر آوازیں اور دبے دبے قہقہے سنائی دیے۔

”ماریا! ہم نے تمہیں دیکھ لیا۔“ یہ کہہ کر اس نے دروازے کی تاب گھمائی لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ اسی دوران ٹریوس کا چہرہ کھڑکی میں نمودار ہوا۔ وہ غصے سے کہہ رہا تھا۔ ”مجھے اندر آنے دو۔“ اس کے ساتھ ہی اس کی زبان سے مغلطات کا طوفان اٹل پڑا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے روکتی، اس نے کھڑکی کے شیشے پر زوردار گھونسا مارا جس سے شیشے کے ٹکڑے کچن کے فرش پر بکھر گئے۔ اب اس نے اندر ہاتھ ڈال کر دروازے کی تاب گھمائی اور دروازہ کھول دیا۔ اس کوشش میں نوٹے ہوئے شیشے کی وجہ سے اس کا ہاتھ زخمی ہو گیا کیونکہ خون کے دھبے دروازے اور فرش پر نظر آ رہے تھے لیکن اس نے اس پر

مزید ایک سال سے نہیں دیکھا تھا۔ پھر وہ ایک ایسی جگہ کیوں آ گیا جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا؟ وہ مسلسل کھنٹی بجارہا تھا اور بار بار کھڑکی کے شیشوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس بار اس نے بلند آواز سے کہا۔ ”ہم جانتے ہیں کہ تم اندر ہو۔ دروازہ کھول دو لڑکی۔ باہر بہت سردی ہے۔“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو وہ زور زور سے دروازہ پینے لگا۔ ”دروازہ کھولو ماریا، ورنہ ہم اسے توڑ دیں گے۔“

میں دیکھ سکتی تھی کہ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی ہے۔ وہ دونوں دروازے کی سیرچیوں پر کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے چہرے چھپانے کے لیے ہڈ پکین رکھے تھے۔ وہ میرا آوارہ گرد کزن تھا گوکہ میں نے یہ بات کبھی اس کے منہ پر نہیں کہی ورنہ وہ ناراض ہو جاتا۔ یہ ان کے خاندان کی خاصیت تھی۔ اگر انہیں شک ہو جائے کہ کوئی ان پر تنقید کر رہا ہے تو وہ جارحیت پر اتر آتے تھے۔

ٹریوس اب سترہ سال کا ہو چکا تھا۔ اس میں ایک آرٹسٹ یا کارٹونسٹ جیسی خصوصیات تھیں۔ وہ اپنی کامک ایک کی نقالی کرتے ہوئے ادھوری، دلچسپ اور رنگین تصویریں بنایا کرتا تھا۔ وہ باب ڈیلن کی طرح نامور موسیقار بننا چاہ رہا تھا۔ اس نے بارہ سال کی عمر میں ایک پرانا گٹار بھی خرید لیا تھا اور اسے بجا کر وہ اپنے آپ کو موسیقار سمجھنے لگا تھا۔ بد قسمتی سے وہ گٹار ٹوٹ گیا یا چوری ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ٹریوس بھی مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ اسے اسکول سے نکال دیا گیا۔ اسے اپنی سے بڑی عمر کے ساتھی ویلز کے ساتھ لوٹ مار، نقب زنی اور چوری کے الزامات میں گرفتار کیا گیا تاہم انہیں نابالغ ہونے کی بنا پر اچھے چال چلن کی ضمانت پر رہائی مل گئی گوکہ میری ماں کے خیال میں وہ سخت مزا کے مستحق تھے۔

میری آنٹی لوئیس کی دو تین مرتبہ شادی اور طلاق ہو چکی تھی۔ ان کے پانچ بچے تھے جنہوں نے ان کی زندگی برباد کر رکھی تھی۔ ٹریوس ان میں سب سے چھوٹا اور ہونہار تھا۔ جی ہاں وہ میرا خاص کزن تھا۔ جانتی تھی کہ وہ میرے بارے میں اس انداز سے سوچتا ہے جس طرح میں اس کے لیے سوچتی ہوں۔

”ماریا، اچھی لڑکی۔ ہمیں اندر آنے دو۔“ وہ کسی کوسے کی سلاخ سے دروازے پر ضرب لگا رہا تھا اور مسلسل دروازہ کھولنے کی التجا کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ

کوئی توجہ نہیں دی۔
 ٹریوس کا دوست اس کے پیچھے چکن میں نہیں آیا۔
 شاید اسے توقع نہیں تھی کہ ٹریوس اتنی بڑا احتیاطی کا مظاہرہ
 کرے گا۔ ”یہ تم کیا کر رہے ہو؟“ وہ باہر کھڑا سے برا بھلا
 کہہ رہا تھا۔ وہ غالباً ویلز تھا۔ اس کا جسم مضبوط، چوڑے
 جڑے اور عمر بیس سال کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے اپنا
 آؤھا چہرہ اور سر ہڈ میں چھپا رکھا تھا اور وہ دونوں آپس میں
 بحث کر رہے تھے پھر وہ وہاں سے جانے لگا۔ ٹریوس نے
 غصے سے کہا۔ ”جہنم میں جاؤ۔“

جب وہ دونوں چکن کے دروازے کے باہر بحث
 مباحثہ کر رہے تھے تو مجھے چاہیے تھا کہ سامنے کے
 دروازے سے باہر نکل کر کسی کو مدد کے لیے پکارتی۔ راہ چلتی
 کسی گاڑی کو روکتی یا کسی پڑوسی کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹاتی
 لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ بے حس و حرکت کھڑی اپنی
 پٹلیں چھپکاتی رہی جیسے میری ٹانگوں میں جان نہ رہی ہو۔
 میں سوچ رہی تھی کہ یہ سب کچھ ایک شرارت سے زیادہ نہ ہو
 اور میرے کزن کا ارادہ حقیقت میں نقتب زنی کرنے کا نہ
 ہو۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرے گا جو میرے لیے برائی کا
 سبب بنے۔ وہ میرا دوست جو تھا۔

ٹریوس دروازے سے اندر آیا اور مجھے جھنجھوڑتے
 ہوئے بولا۔ ”تم نے ہمیں اندر کیوں نہیں آنے دیا؟ یہ سب
 تمہاری فطرتی ہے۔“

میں نے اسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن میرے بازو
 پر اس کی گرفت بڑی مضبوط اور تکلیف دہ تھی۔ وہ اتنا قریب تھا
 کہ میں اس کی سانسون کی ناگوار بو محسوس کر سکتی تھی۔ اس کی
 آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے کبھی اسے اتنے پرجوش
 انداز میں نہیں دیکھا تھا اور مجھے اس کے ارادے خطرناک لگ
 رہے تھے۔ اس کے باوجود میں یہ یقین کرنا چاہ رہی تھی کہ میرا
 کزن مجھے نقصان نہیں پہنچائے گا۔

میں نے اس سے چلے جانے کی التجا کی اور سمجھانا چاہا
 کہ میری کلاس ٹیچر اس مکان میں رہتی ہے اور میں اس کی
 غیر موجودگی میں یہاں کی دیکھ بھال کر رہی ہوں کیونکہ اس کا
 شوہرا ہسپتال میں ہے۔

پریشان مت ہو ماریا۔ کوئی بھی اس مکان کو یا
 جہیں نقصان نہیں پہنچائے گا تاوقتیکہ تم پولیس کو بلانے یا
 اس مشق کے لیے باہر جانے کی کوشش نہ کرو۔ ایسی صورت
 میں میں بھڑکانا پڑے گا۔“

کیا وہ مذاق کر رہا تھا؟ بچپن میں کھیل کے دوران وہ

کبھی کبھی ایسی باتیں کیا کرتا تھا جن میں دھمکی کی جھلک ہوتی
 تھی اگر میں فوراً ہی اس کی بات مان جاتی تو وہ نہ مجھے دھکا
 دیتا اور نہ ہی مارتا اور اگر میں رونے لگتی تو فوراً ہی نرم پڑ جاتا
 اور کہا کہ وہ تو مذاق کر رہا تھا لیکن اب گوکہ میری آنکھوں
 میں آنسو آگئے تھے اور وہ دیکھ رہا تھا کہ میں خوفزدہ
 و پریشان ہوں لیکن اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ وہ ناراض
 ہونے کے باوجود تہمتیں لگا رہا تھا۔ اسے یہ توقع نہیں تھی کہ اس
 کا دوست اسے یوں چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس نے بار بار
 کھڑکی سے جھانک کر دیکھا کہ شاید وہ اسے دیکھ کر کہہ سکے۔
 ”بے وقوف بزدل۔“

جب میں نے اس کی گرفت سے اپنا بازو چھڑانے کی
 کوشش کی اور کہا کہ وہ یہاں سے چلا جائے تو اس نے مجھے
 دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تنگ مت کرو ماریا۔ میں اپنا کام ختم
 کر کے ہی جاؤں گا۔“

”ممکن ہے کہ بڑوسیوں نے تمہیں نقتب زنی کرتے ہوئے
 دیکھ لیا ہو۔ ان میں سے کوئی بھی پولیس کو نون کر سکتا ہے۔“
 ”مجھے اس کی پروا نہیں۔ یہ مکان کافی فاصلے پر ہے
 ہوئے ہیں۔ اس لیے کسی نے کچھ نہیں سنا ہوگا اور نہ ہی کوئی
 اس پر توجہ دے گا۔“

ٹریوس چکن کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ شاید ہی اس
 سے پہلے اس نے اتنا بڑا چکن دیکھا ہو۔ اس نے الماریوں
 کے دروازے اور کینٹھ کی درازیں کھولیں اور ایک ایک
 کر کے چیزیں نکال کر دیکھنے لگا۔ اس نے مستی میں آکر اپنی
 جیکٹ اتار کر فرش پر پھینک دی۔ اس کے نیچے اس نے ایک
 سیاہی شرٹ پہن لی تھی۔ اس کے بال جو کبھی بہت خوب
 صورت ہوا کرتے تھے اب گرد اور مٹی کی وجہ سے سخت اور
 بے رونق ہو گئے تھے۔ اس کا چہرہ بھی پہلے کی طرح شاداب
 نہیں رہا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نشیات کا عادی
 ہو چکا تھا۔

”دوبارہ اسٹھے ہونے کی خوشی میں ایک ایک ڈرنک
 ہو جائے۔“ وہ جھومتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم مجھے یاد نہیں کر
 رہی تھیں؟ کیا میں تمہارا پسندیدہ کزن نہیں ہوں؟“

میں نے شراب لینے سے انکار کیا تو اس نے زبردستی
 میرے منہ سے گلاس نکایا۔ میں نے دانت بھینچ لیے تو اس
 نے میرے جڑے کھول کر تھوڑا سا شراب میرے منہ میں
 ڈال دیا۔ میرے حلق میں جلن ہونے لگی اور میں نے زور
 زور سے کھانسا شروع کر دیا۔ وہ مجھ پر ہنسنے لگا پھر کھینچتا ہوا
 ہال میں لے گیا جہاں سے گزر کر وہ ٹی وی روم میں داخل

اس نے گلوں میں لگے ہوئے پودوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ سز میکلڈ ایلڈ نے یہ پودے بڑی محنت سے جمع کیے تھے۔ مجھے ڈر لگا کہ کہیں یہ انہیں نقصان نہ پہنچائے چنانچہ میں نے ایک بار پھر اس سے کہا۔ ”ٹریوس! پلیز رک جاؤ۔ یہاں سے چلے جاؤ۔“

”کہاں چلا جاؤں..... کیا اس کے علاوہ بھی کوئی جگہ ہے؟“ مجھے اب چکر آ رہے تھے۔ گوکہ میں نے ایک دو ہی گھونٹ لیے تھے۔ پھر مجھے زور کی قے آئی۔ ٹریوس میری حالت دیکھ کر تھم لگا لگا۔ میں کلی کرنے کے لیے کچن یا باتھ روم جانا چاہ رہی تھی لیکن ٹریوس نے مجھے روک دیا۔ اسے مجھ پر بھروسہ نہیں تھا۔ اس نے ایک کینسٹ سے چاندی کے برتن نکالے اور بولا۔ ”کچھ لوگوں کے پاس بہت مال ہے اور کچھ بالکل تلاش ہیں۔“

ان میں سے کچھ برتن اس کی بی پروائی کی وجہ سے فرش پر گر پڑے تو اس نے انہیں ٹھوکر باری۔ مجھ سے یہ منظر نہیں دیکھا گیا اور میں نے اس سے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ ”پلیز! گھر چلے جاؤ۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔“

”واقعی تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی سویت ہارٹ اور اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا چہرہ بد صورت ہو جائے گا۔ بالکل اس پیدا کئی نشان کی طرح سرخ اور بد نما۔“ اس کے یہ الفاظ تیر کی طرح میرے دل پر لگے۔ مجھے یقین نہیں آیا کہ وہ میرے بارے میں ایسی بات بھی کہہ سکتا ہے جبکہ وہ جانتا تھا کہ میں اس پیدا کئی نشان کے بارے میں کیسا محسوس کرتی ہوں۔ میں نے ہکلاتے ہوئے کہا کہ جب سز میکلڈ ایلڈ واپس آئیں گی اور انہیں پتا چلے گا کہ ان کی کچھ چیزیں غائب ہیں تو بتا دوں گی کہ کون لے گیا ہے۔ اس پر ٹریوس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”مجھے شبہ ہے کہ تم ایسا کر سکو گی اور اگر تم نے انہیں کچھ بتایا تو بہت بچھڑتا پڑے گا۔“

میں نے دوسرے آدمی کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اس نے بھی ٹریوس کی طرح ہو ڈی پہن رکھی تھی لیکن اپنا ہڈ نیچے نہیں کیا تھا البتہ یہ بتا سکتی تھی کہ وہ ٹریوس سے عمر میں بڑا تھا۔ میں اسے نہیں جانتی تھی اور نہ ہی اس کی آواز پہچان سکی۔ اتنا وقت ہی نہیں ملا جب وہ کچن کی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر گھر میں داخل ہوئے تھے۔

میں اپنے کزن کی مٹیں کرتی رہی کہ وہ سز میکلڈ ایلڈ کے گھر سے چلا جائے لیکن وہ نہیں مانا۔ وہ مجھے گھسیٹتا ہوا اس..... کمرے کے دروازے تک لے گیا جسے سز میکلڈ ایلڈ اپنے دفتر کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ وہ مقفل نہیں تھا۔

ہو گیا۔ وہاں رکھے ہوئے ٹی وی کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس نے خواب میں بھی اتنا بڑا اور قیمتی ٹی وی نہیں دیکھا ہوگا۔ اس نے ٹی وی آن کیا اور۔۔۔ بے ہودہ طریقے سے چینل بدلتے لگا۔

ٹریوس کی فطرت میں بے چینی تھی۔ وہ چند سیکنڈ سے زیادہ ایک چینل نہیں دیکھ سکتا تھا۔ البتہ اس نے ٹیلی ویژن کی آواز اونچی کر رکھی تھی۔ اس لیے میں نے سوچا کہ شاید پڑوسی یہ آواز سن کر پوچھ گچھ کرنے آجائیں لیکن بہ ظاہر اس کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ ٹریوس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا کہ اسے یہ ٹی وی لے جانے کے لیے دوبارہ آنا پڑے گا کیونکہ اس کے لیے اسے ایک ٹرک کی ضرورت ہوگی۔ اس نے ٹی وی سے ابھرنے والی موسیقی کی دھنوں پر تھرکنا شروع کر دیا اور مجھے بھی پکڑ کر رقص کے انداز میں حرکت کرنے لگا۔ وہ میرے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”میں سمجھتا ہوں کہ تم میرے لیے بالکل مناسب ہو۔“ اس نے کلانی کے پاس سے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ اس نے مجھے مجبور کرنے کے لیے اپنا بازو میری گردن کے گرد ڈالا اور گلاس پھر میرے منہ سے لگایا۔ میں نے مزاحمت کی لیکن وہ میرے مقابلے میں بہت طاقتور تھا۔ پھر میں نے یہ سوچ کر مزاحمت ترک کر دی کہ شاید وہ رک جائے۔ شاید وہ یہاں سے چلا جائے کیونکہ وہ مجھے تنگ کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔

اس نے مجھے جس طرح پکڑ رکھا تھا، وہ میرے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ اس سے پہلے اس نے شاید ہی مجھے غور سے دیکھا ہو لیکن اس وقت وہ میرے بہت قریب تھا۔ میں اس کی ناگوار سانسوں اور جسم سے پھوٹنے والی بو کو محسوس کر سکتی تھی۔

”تم اتنی خوفزدہ کیوں ہو؟ لگتا ہے جیسے تم مجھے نہیں جانتیں؟“ میں نے تہقہ لگا کر اپنے آپ کو پُر سکون کرنے کی کوشش کی اور اس کی گرفت سے بھی اپنے آپ کو نکال لیا لیکن اس سے دور جانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ جانتی تھی کہ اسے وہ اپنی بے عزتی محسوس کرے گا۔ اس لمحے مجھے اچانک ہی ٹریوس سے نفرت محسوس ہونے لگی۔ میرے دل میں یہ خواہش ابھری کہ کاش وہ کہیں دور چلا جائے۔ اپنے بڑے بھائی کی طرح جس نے فوج میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور وہ بہت نام کی جنگ میں چلا گیا تھا۔

میں نے کہا کہ میں اب بھی اس سے جانے کے لیے کہہ رہی تھی لیکن وہ مجھے گھسیٹتا ہوا ڈانٹنگ روم میں لے گیا۔ وہاں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کپریسڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریخ
- ☆ ایڈ فری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریخ
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

کرتوت

”دلہا۔“ جانتی ہو ہمارے ستارے مل گئے۔
ورنہ میرے تو شادی سے پہلے بیس لڑکیوں سے چکر
تھے۔“

”لوہن شرماتے ہوئے۔“ جی..... ہمارے
ستارے ہی نہیں کرتوت بھی ملتے ہیں۔“

☆☆☆

Active, passive

”الف۔“ سونے کی چین کب دو گئے؟“

شوہر۔ ”چین سے سونے کب دو گئے؟“

☆☆☆

”چلو۔ ایک کوشش اور کرتے ہیں۔“ اس نے نال کا
رخ میری طرف کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ پلیز نہیں۔“ میں گڑگڑانے لگی لیکن اس پر

کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ پستول کی نال میرے چہرے سے

رگڑنے لگا۔ پھر اس نے میرا منہ کھول کر نال اس میں گھسیڑ

دی۔ اس کے باوجود مجھے امید تھی کہ وہ مجھے قتل نہیں کرے گا

کیونکہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ پھر اس نے ایک ایسی

حرکت کی جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے

گریبان میں ہاتھ ڈال کر میرا سوپٹر بھاڑ دیا اور پستول

میرے سینے سے لگا دی۔ میں بری طرح کانپ رہی تھی پھر

میں نے زار و قطار رونا شروع کر دیا لیکن ان کا گن والا ہاتھ

مستقل حرکت کرتا رہا۔ اس نے پستول کی نال کو اور نیچے کیا

پھر پیٹ سے ہوتا ہوا ٹانگوں تک آ گیا۔ ڈر کے مارے میرا

پیشاب خطا ہو گیا اور پستول کی نال بھیگ گئی۔ ٹریوس کا چہرہ

غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے مجھے زور سے دھکا دیا اور گن

کری پر پھینک دی جیسے وہ گندی ہو گئی ہو۔

”رونا بند کر دو۔ ابھی تک تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

اپنے گھٹنوں پر چل کر دیکھو۔ اس طرح تم اپنے آپ کو بچا

سکتی ہو۔“

میں نے چلنا شروع کیا اور کری کے قریب پہنچ گئی۔

پھر میں نے بے اختیار وہ گن اٹھالی۔ یہ بھی ایک معجزہ ہی تھا

کہ وہ گن میرے ہاتھوں میں آ گئی۔ وہ میری توجہ سے

زیادہ بھاری تھی۔ ٹریوس نے میرے ہاتھ میں گن دیکھی تو

سز میکلڈ اٹلڈ شاید جلدی میں اسے لاک کرنا بھول گئی تھیں۔

ٹریوس بے دھوک کرے میں داخل ہوا۔ اس نے کتابوں

سے بھرے شیلف دیکھ کر کہا۔ ”اوہ میرے خدا اتنی ساری

کتابیں، کیا کوئی شخص انہیں پڑھ سکتا ہے۔“ پھر اس نے میز

کی درازیں دیکھنا شروع کر دیں۔ سب سے پہلی دراز میں

سے اسے ایک گن ملی جسے اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور

پر جوش لہجے میں بولا۔ ”مجھے اس کی ضرورت تھی۔“

میں بہت خوفزدہ ہو گئی۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس

گھر میں کوئی گن بھی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ سز

میکلڈ اٹلڈ اس کمرے کا دروازہ منتقل کرنا کیوں بھول گئیں۔

میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی تاکہ سڑک پر پہنچ کر کسی کو

مدد کے لیے پکاروں لیکن اگر میں نے ایسا کیا تو ٹریوس مجھے

بہت سخت سزا دے گا۔ ممکن ہے کہ وہ مجھ پر گولی چلا دے۔

شاید وہ مجھے جان سے نہ مارے لیکن میری ٹانگ کا نشانہ

لے کر زمین پر ضرور گرا سکتا ہے اور پھر فاتحانہ انداز میں

تہمتے لگاتے ہوئے کہے گا۔ ”میں نے تمہیں منع کیا تھا لیکن تم

نے حکم عدولی کی۔“

ٹریوس نے گن کا جیمبر کھول کر اس کا معائنہ کیا۔ اس کے

چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر اس نے میری طرف

دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم نے اجتماعی خودکشی کے بارے میں سنا

ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ محبت کا امتحان ہوگا۔“

میں نے گن میں سر ہلا دیا تو وہ کسی قسمی ادا کار کی طرح

آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور مجھے خوفزدہ کرنے کے لیے

پستول کی نال اپنے سر سے لگالی پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس

نے ریوالور نیچے کیا اور احتیاط سے گولیاں نکال کر اپنی جیب

میں رکھنے کے بعد بولا۔ ”اب یہ پوری طرح بھری ہوئی

نہیں ہے۔ اس لیے تمہارے بچنے کا چانس ہے۔“

”نہیں۔“ میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ ”پلیز اسے

دور رکھو۔“

”اس میں صرف ایک گولی ہے۔“ اس نے دوبارہ آئینے

میں دیکھتے ہوئے کہا اور پستول کی نال دوبارہ اپنے ماتھے سے

لگالی۔ لگا تھا کہ وہ ٹریگر دبانے والا ہے پھر وہ ڈرامائی انداز میں

گھوما اور گھٹنوں کے بل جھک کر نال کا رخ میری طرف کر کے

ٹریگر دبا دیا۔ ایک ہلکی سی کلک ہوئی۔ میں نے آنکھیں

بند کر لیں، موت میرے قریب سے آ کر گزر گئی تھی۔

میں بہت خوفزدہ تھی۔ سردی کے باوجود پورا جسم سینے

سے شرمایا ہو گیا تھا۔ میرا دل زور زور سے دھوک رہا تھا

لیکن ٹریوس کو مجھ پر رحم نہیں آیا۔ وہ بدستور تہمتے لگا رہا تھا۔

سوالات کیے۔ وہ مجھے مزید پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے کیونکہ ٹریوس نے میرے ساتھ جو شرمناک سلوک کیا تھا، اس کے اثرات اتنے گہرے تھے کہ میں کافی عرصے تک نارمل نہیں ہو سکی تھی۔ میں نے جو کہانی سنائی، وہ بھی اچھی ہوئی اور غیر واضح تھی لیکن میرے سینے، پیٹ اور ٹانگوں پر نظر آنے والے زخموں کے نشانات نے ساری حقیقت بیان کر دی اور اخبارات نے یہ شرمناک تفصیلات بڑے مزے لے کر شائع کیں۔

”تمہارے کزن کے ساتھ آنے والا کون تھا؟“ مجھ سے پوچھا گیا لیکن میں صرف اتنا ہی کہہ سکی کہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ پائی تھی اور نہ ہی اس کی آواز پہچان سکی۔

”کیا اس نے تمہیں کوئی دھمکی دی تھی کہ اگر تم نے کسی کو اس کے بارے میں بتایا تو وہ واپس آکر تمہیں بھی قتل کروے گا۔“ میں کچھ نہ کہہ سکی۔

”اس کا نام کیا ہے؟ کیا تم اس کا حلیہ بیان کر سکتی ہو یا اسے شناخت کر سکتی ہو؟“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا کیونکہ یہ ایک افسوس ناک بات ہوتی اگر میں لٹلٹی سے کسی بے گناہ شخص کو اپنے کزن کی موت کا ذمے دار قرار دیتی۔

پولیس نے اس پڑوسی سے پوچھ چمچہ کی جس نے انہیں فون کیا تھا۔ اس کے علاوہ ان پڑوسیوں سے بھی سوالات کیے گئے جن کا کہنا تھا کہ انہوں نے کسی کار کا دروازہ بند ہونے، مردوں کی آوازیں، ایک لڑکی کے چیخنے اور سات بج کر دس منٹ پر فائر کی آواز سنی تھی لیکن کوئی بھی اس گاڑی یا ٹریوس کے ساتھی کے بارے میں کچھ نہ بتا سکا۔

کئی مرتبہ پولیس بائیس سالہ ویلز کو پوچھ چمچہ کے لیے ہیڈ کوارٹر لے کر آئی۔ انہیں یقین تھا کہ ویلز ہی وہ شخص ہے جس نے حادثاتی طور پر اپنے دوست ٹریوس ریڈلی کو ڈبکتی کے دوران گولی مار دی تھی لیکن اسے گرفتار کرنے کے لیے ان کے پاس ناکافی ثبوت تھے لہذا ہر مرتبہ اسے چھوڑنا پڑا۔ اگر ویلز۔۔۔ میرے کزن کا ساتھی ہوتا تو وہ یہ بھی جانتا ہوگا کہ اس نے ٹریوس کو گولی نہیں ماری اور ممکن طور پر اسے معلوم تھا کہ ٹریوس کو ہلاک کرنے والا کون تھا لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکا کہ اس نے اپنے دوست کو گولی نہیں ماری کیونکہ اس طرح وہ یہ تسلیم کر لیتا کہ وہ بھی ٹریوس کے ساتھ اس ڈاکازنی میں شریک تھا لیکن وقوعہ سے پہلے ہی وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔ اس کے بجائے اس نے موقف اختیار کیا کہ وہ ڈروٹین پر ہونے والی ڈکیتی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا اور اسے یہ

چلایا۔ ”ہے..... ہسپتال چھینک دو۔“ لیکن اس وقت تک میں ٹریگر دبا چکی تھی۔ اس بار بھی جیسے خالی تھا۔ ٹریوس نے غصے میں آکر مجھ سے ہسپتال چھیننا چاہا لیکن اتنی دیر میں میں دوبارہ ٹریگر دبا چکی تھی۔ اس بار کلک کے بجائے ایک دھماکا ہوا۔ ٹریوس کے جسم نے ایک جھٹکا لیا۔ گولی اس کے سینے میں لگی تھی اور وہ آنا فانا فرش پر جا گرا۔

میں ایک خوفزدہ جانور کی طرح مکشوں اور ہاتھوں کے بل رینگتی ہوئی اس سے دور ہونے لگی۔ میں اس کی پہنچ سے دور ہونا چاہ رہی تھی کیونکہ اگر اس کے ہاتھ آجاتی تو وہ مجھے اس نافرمانی کی بہت سخت سزا دیتا۔

گن میرے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری تھی اور ٹریوس کے بالکل قریب پڑی ہوئی تھی۔ جو آتش دان کے سامنے لیٹا ہوا کراہ رہا تھا گوکہ میں اس کے سینے سے بہتا ہوا خون دیکھ سکتی تھی لیکن یہ مجھے حقیقی نہیں لگ رہا تھا۔ میں یقین نہیں کر سکتی تھی کہ ٹریوس کو واقعی گولی لگی ہے۔ وہ میرے ساتھ چھیڑ خانی کر رہا تھا اور کسی بھی لمحے اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر مجھے سزا دے سکتا تھا۔ حالانکہ گن سے فائر ہوا تھا۔ میں یہی سمجھ رہی تھی کہ ہسپتال ٹریوس کے ہاتھ میں تھا اور اسی کشش میں فائر ہو گیا۔

میں کافی دیر تک فرش پر بے حس و حرکت پڑی رہی۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ ٹریوس کے دوست کو وہاں سے گئے ہوئے کتنی دیر ہو چکی تھی پھر دروازے پر گھنٹی کی آواز سنائی دی جو مجھے کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، میں۔۔۔ پریشان اسے سن پائی۔ پھر کوئی پڑوسی عجبی دروازے پر آیا۔ اس نے کھڑکی کا ٹوٹا ہوا شیشہ دیکھا جبکہ کچن کی لائٹ بھی جل رہی تھی وہ آوازیں دیتا ہوا ہال تک آیا پھر اس کمرے میں داخل ہوا جہاں میں اور ٹریوس فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ وہ یہی سمجھا کہ ٹریوس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی گولی لگی ہے۔

مقامی اخبارات میں اس حوالے سے مختلف قیاس آرائیاں شائع ہوئیں۔ پہلے کہا گیا کہ گولی خود بخود چل گئی جو اس کے سینے میں مین دل کے مقام پر لگی اور سترہ سالہ ٹریوس موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ اس کے پس منظر کے بارے میں بتایا گیا کہ پہلے وہ چھوٹے موٹے جرائم میں ملوث رہا اور بعد میں غشیات فروشوں کے ہتھے چڑھ گیا اور کچھ عجب نہیں کہ انہی میں سے کسی ایک نے اسے قتل کیا ہو۔ اسپارٹا جرنل نے یہ انکشاف کیا کہ ٹریوس کے ساتھی نے ہی اس پر فائر کیا تھا لیکن وہ ابھی تک پولیس کے ہاتھ نہیں آیا۔

پولیس والوں نے مجھ سے بڑے ہمدردانہ لہجے میں

دماغ ٹھکانے پر ہوتا تو وہ کبھی ماریا کو نقصان پہنچانے کے بارے میں نہیں سوچتا۔ مجھے امید ہے کہ تم یہ بات سمجھتی ہو اور ماریا بھی شاید یہ جانتی ہو۔

☆☆☆

میرے بچے ٹریوس ریڈل کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ انہیں تو اپنی ماں کے بارے میں بھی زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ ان چھبیس سالوں میں میں جب بھی اسپارٹا آئی تو اسٹیو ویلز سے چند مرتبہ ہی میرا سامنا ہوا بلکہ میں اس کی جھلک ہی دیکھ پائی۔ ایک دفعہ شاپنگ مال اور دوسری مرتبہ سیون ایون اسٹور میں۔ ہم جوانی میں بھی ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اسے میرا نام بھی معلوم نہیں تھا کہ اس واقعے کے بعد وہ اس بارے میں جان گیا ہوگا۔ جب بلوغت کو پہنچنے کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تو وہ اپنی جگہ پر رگ گیا اور مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے وہ مجھے یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

اس بار جب میں اسپارٹا آئی تو حادثاتی طور پر اسٹیو ویلز سے میرا آہنا سامنا ہو گیا۔ میں اپنی بیٹی کے ہمراہ سینک کے عقب میں واقع پارکنگ لائٹ سے گزر رہی تھی کہ میں نے ایک درمیانی عمر کے شخص کو اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔ اس نے گندی سی جیکٹ اور چٹلون پہن رکھی تھی۔ اس کا چہرہ ایسا تھا جیسے بڑی بے دردی سے کسی دائرہ برش سے صاف کیا گیا ہو۔ اب وہ ایک بھاری چھامت، ہلکے بالوں، کرخت چہرے اور اس آنکھوں والا شخص بن چکا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی عمارت میں داخل ہوتے وقت راستہ نہیں دیتے اور نہ ہی آپ کو اپنے سے پہلے قطار میں کھڑا ہونے دیتے ہیں۔

اس نے مجھے دیکھا اور ایک اجنبی ہوئی نظر میری بیٹی پر ڈالی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کچھ کہنے والا ہے لیکن جھجک رہا ہے اور میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ بد صورت شخص مجھے پہچانے۔ میں اس شہر سے اپنا تعلق ختم کر چکی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ مجھے کن لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے یا کون میرے لیے اجنبی ہے۔ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑے اس کے پاس سے گزرنے ہی والی تھی جب اس نے میرے سامنے آتے ہوئے کہا۔

”ہیلو ماریا! میرا خیال ہے کہ وہ تم ہی نہیں۔“
یہ سننے کے بعد میرا بدن بڑی طرح لرزنے لگا اور ناگوں میں جیسے جان ہی نہ رہی۔ میں نے اپنی بیٹی کا سہارا لیا اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس شام ٹریوس ریڈل کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ البتہ اس واقعے سے ایک روز پہلے اس کی اپنے دوست سے ملاقات ہوئی تھی۔

اس زمانے میں چھوٹے شہروں کے پولیس سراخ رساں جائے وقوعہ سے ملنے والے شواہد کو احتیاط سے محفوظ کرنا نہیں جانتے تھے۔ جس پستول سے ٹریوس کو قتل کیا گیا، اس پر پائے جانے والے فنگر پرنٹس دھندلے ہو گئے تھے اور کسی نے میرے فنگر پرنٹس لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ میں سرے سے مشکوک افراد کی فہرست میں نہیں تھی۔ پستول مسٹر گورڈن میکڈانلڈ کو واپس کر دیا گیا کیونکہ وہ ان کی قانونی ملکیت تھا۔

اگلے ہفتے مسٹر میکڈانلڈ اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر واپس آ گئے لیکن وہ زیادہ عرصے اس گھر میں نہیں رہے۔ اس واقعے کے بعد مکان کی شہرت خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے مارکیٹ پرائس سے بہت کم قیمت پر اسے فروخت کرنا پڑا۔ اسے ایک ایسے جوڑے نے خرید لیا جو اسپارٹا میں قیام کا خواہش مند تھا اور اسے اس حادثے کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا۔ مکان فروخت ہونے کے بعد میکڈانلڈ فیملی اسپارٹا سے چلی گئی اور پولیس کی ابتدائی پوچھ گچھ کے بعد کسی نے بھی مجھ سے یہ جاننے کی زحمت نہیں کی کہ اس شام میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ البتہ یہ انواہ ضرور پھیل گئی کہ ماریا کو اس کے اپنے کزن نے ایذا پہنچائی اور جس معنی خیز انداز میں یہ بات لگائی جاتی تھی، اس سے لوگ اپنی مرضی کے معنی نکال لیتے حالانکہ یہ صرف میں ہی جانتی تھی کہ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔

مسٹر میکڈانلڈ نے مجھے کسی بات کے لیے موروا الزام نہیں ٹھہرایا۔ وہ جانتی تھی کہ میں نے اپنے کزن ٹریوس کو گھر میں نہیں بلایا تھا اور یہ کہ میں نے اس سے چلے جانے کی درخواست کی تھی۔ اس نے میری ماں سے کہا۔ ”بے چاری ماریا..... یہ میری غلطی تھی کہ اتنی چھوٹی لڑکی کو یہ ذمہ داری سونپ دی۔“

لیکن ماں نے خوشامدانہ لہجے میں جواب دیا۔ ”ماریا تو بہت خوش تھی۔ یہ محض ایک حادثہ تھا۔“
بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ آنٹی لوئیس نے بھی میری زبان کے سامنے اپنی پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ٹریوس نے میرے ساتھ جو کچھ کیا، اس پر وہ خود کو مجرم محسوس کرتی ہیں اور شرمندہ ہیں۔

حقیقت ہے کہ وہ ماریا کو بہت چاہتا تھا اگر اس کا

ماضی سے حال کی جانب سے والے در اور داستان الم کے رنگ
Downloaded From
Paksociety.com

راز ماضی

ملک صفدر حیات

اپنی مرضی سے شریک زندگی کا انتخاب کرنے کا اختیار اللہ نے تو انسان کو دے دیا ہے مگر انسان... جو اللہ کو تو مانتا ہے لیکن... اللہ کی نہیں مانتا کہ زمرے میں بعض معاملات میں اپنی ہی چلاتا ہے اور ناقابل تلافی نقصان اٹھاتا ہے... یہی حال ان لوگوں کا بھی تھا، قدرت کے اشاروں کو سمجھنے کے باوجود نظر انداز کرتے ہوئے بالآخر اپنے جگر گوشے کو ہی نظروں سے دور کر ڈالا... وہ جب ماضی کا ایک ایسا ہی راز بن کر سامنے آیا تو بہت سے پہلوئوں کو اجاگر کرتے ہوئے ایک نئی داستان رقم کر گیا۔ خطا کسی کی اور سزا کسی کو... غلط فیصلوں کے نتائج ایسے ہی نکلتے ہیں اور ایسی غلطیوں کو درست کرنے کے لیے ملک صفدر حیات جیسے لوگوں کو بہت محنت کرنا پڑتی ہے، تب کہیں جا کر درست حقائق سامنے آتے ہیں۔

بہتی تھی۔ کوٹ فرمان، فریڈ آباد کے مقابلے میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔
”کیا کچھ پتا چلا کہ وہ کس کی لاش ہے اور اسے کس نے قتل کیا ہے؟“

”نہیں ملک صاحب!“ اے ایس آئی نئی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”وہ بندہ پورے گاؤں والوں کے لیے اجنبی ہے۔ کوئی اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ اس بندے کی لاش اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پڑی ملی ہے اور اللہ رکھا اس وقت باہر برآمدے میں بیٹھا ہوا ہے۔“
”اوہ.....!“ میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔
جب میں اپنے کمرے کی طرف آ رہا تھا تو میں نے برآمدے میں دو تین افراد کو بیٹھے دیکھا تھا۔ اے ایس آئی نے پوچھا۔

”اگر آپ کہیں تو میں اللہ رکھا کو اندر بھیجتا ہوں۔“
”ہاں، ہاں..... ضرور.....“ میں نے جلدی سے کہا۔

اجنبی نوجوان کی لاش نے موضع ”کوٹ فرمان“ میں کھلبلی مچا دی تھی۔ وہ ماہ فروری کے اہترائی ایام تھے تاہم موسم سرما کسی بھی طور رخصت ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ان دنوں میری تعیناتی ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے ایک قصبے فریڈ آباد میں تھی۔

ایک روز میں حسب معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو ٹھنڈے ٹھار موسم میں ایک گرم خبر میری منتظر تھی۔ میں اپنے کمرے میں آ کر بیٹھا ہی تھا کہ اے ایس آئی گل شیر میرے پاس آ گیا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ”ملک صاحب! ادھر ایک بندے کی لاش ملی ہے جناب۔“

میں نے اے ایس آئی کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”ادھر کدھر گل شیر؟“

”وہ جی کوٹ فرمان میں۔“ گل شیر نے جواب دیا۔
موضع کوٹ فرمان اور قصبہ فریڈ آباد کے بیچ ایک نہر



READING
Section

”بس جی، مجھے تو یہی لگا کہ وہ بد نصیب دوسرے جہان پہنچ چکا ہے۔ بعد میں دوسرے دیکھنے والوں نے بھی میری بات کی تصدیق کر دی۔“

اللہ رکھا جو کچھ بتا رہا تھا، اس سے تو یہی نتیجہ نکلتا تھا کہ وہ شخص واقعی زندگی کی بازی ہار چکا تھا اور اس کے لباس اور چہرے پر نظر آنے والا خون اس امر کی جانب اشارہ کرتا تھا کہ اسے ہاتھ قتل کیا گیا تھا۔ میں نے بہ دستور اللہ رکھا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”جب تمہیں یقین ہو گیا کہ وہ بندہ مر چکا ہے تو پھر تم نے کیا کیا؟“

”کرنا کیا تھا جی.....“ وہ ایک ہنسی ہوئی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے شور مچا کر لوگوں کو وہاں جمع کر لیا۔ آج مجھے مسجد کی طرف جانے میں تھوڑی دیر ہو گئی تھی۔ اس وقت تک لوگ مسجد سے واپس آ رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرے ہمسایوں کے علاوہ بھی وہاں کافی لوگ جمع ہو گئے۔ سب کی ایک ہی رائے تھی جناب کہ وہ بندہ مر چکا ہے۔“

”ہوں.....“ میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ”وہ بد قسمت آخر ہے کون..... مجھے بتایا گیا ہے کہ اسے کوئی بھی نہیں جانتا؟“

”جی ہاں، آپ کو بالکل ٹھیک بتایا گیا ہے۔“ وہ اثبات میں گرون ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس بندے کا تعلق ہمارے گاؤں سے نہیں تھا، وہ صاحب۔ وہ ہمارے لیے اچھی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور اسے کس نے قتل کیا ہے اور..... قاتل جو کوئی بھی ہے، وہ اس بندے کی لاش کو میرے دروازے کے سامنے کیوں پھینک گیا ہے.....“ لہجائی توقف کر کے اس نے اپنی پھولی ہوئی اور گھبرائی ہوئی آواز کو ہموار کیا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”ہم نے اس عجیب و غریب واقعے کی اطلاع سب سے پہلے چودھری صاحب کی حویلی میں پہنچائی تھی۔ وہاں سے ہمیں حکم دیا گیا کہ تھانے جا کر رپورٹ درج کرائیں۔ میں نے اپنے پڑوسیوں فقیر حسین اور یحیٰ علی کو ساتھ لیا اور آپ کے پاس آ گیا ہوں.....“

کوٹ فرمان پر چودھری فیضان علی کی حکمرانی تھی۔ چودھری فیضان سے میری دو تین بار ملاقات ہو چکی تھی۔ وہ عام روایتی چودھریوں سے خاصا مختلف شخص تھا۔ اس کے اندر غرور اور تکبر نام کی چیز میں نے نہیں دیکھی تھی۔ اس کی

تھوڑی ہی دیر کے بعد اللہ رکھا میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اللہ رکھا کی عمر ساٹھ کے قریب رہی ہوگی۔ اس نے عام دیہاتی لباس پہن رکھا تھا اور سر پر ساوہ سی پگڑی جسے عام طور پر ”صافہ“ کہا جاتا ہے۔ شکل صورت اور وضع قطع سے وہ مزور پیش نظر آتا تھا۔ اسے ایس آئی نے اس کے ساتھ آنے والوں کو باہر ہی روک لیا تھا۔ بعد ازاں مجھے پتا چلا کہ وہ دیگر دونوں افراد اس کے پڑوسی تھے۔ اللہ رکھا خاصا گھبرایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

”ہاں اللہ رکھا، یہ لاش کا کیا معاملہ ہے؟“

”معاملہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، دار صاحب۔“ وہ پریشانی سے بولا۔ ”صبح سو کر اٹھا ہوں تو دروازے کے سامنے ایک لاش پڑی تھی۔“

”ہوں.....“ میں نے اللہ رکھا کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے پُر سوچ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”صبح کتنے بجے..... تم نے اپنے دروازے کے سامنے کتنے بجے اس لاش کو پڑے دیکھا تھا؟“

”جی ابھی سورج نہیں اگا تھا مگر ہلکا ہلکا اجالا ہو رہا تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں فجر کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد جانے کے لیے گھر سے نکلا ہی تھا کہ دروازے کے سامنے کسی کو سوتا ہوا دیکھا۔ پہلے تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ اتنی سروی میں میرے دروازے کے سامنے کون سو رہا ہے لیکن جب میں نے اس کے قریب جا کر دیکھا تو مجھے ایک جھٹکا سا لگا.....“

”کیسا جھٹکا اللہ رکھا؟“ میں نے قطع کلانی کرتے ہوئے سوال کیا۔

”بندہ مرا پڑا تھا جناب۔“ وہ ایک جھرجھری لہجے ہوئے بولا۔

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ مر چکا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا تم نے اسے ہلا جلا کر دیکھا تھا؟“

”نہیں تھا، دار صاحب!“ وہ جلدی سے نفی میں گرون ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تو اس بندے کی لاش کو ہاتھ تک نہیں لگایا جی۔ جب میں اس کے نزدیک گیا تو مجھے اس کے چہرے اور سر پر خون نظر آیا تھا۔ اس کے کپڑوں پر بھی خون لگا ہوا تھا اور وہ بالکل ساکت پڑا تھا..... سانس بھی نہیں لے رہا تھا جی.....“ اس نے وحشت زدہ انداز میں آنکھیں پھیلائیں اور لہجائی توقف کے بعد ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

کیا تھا۔ وہ ایک چادر کے نیچے ڈھکی ہوئی تھی۔ اللہ رکھانے بتایا کہ تھانے کی طرف جااتے ہوئے اس نے مردہ شخص کے اوپر یہ چادر ڈال دی تھی۔ میں نے وہاں جمع لوگوں کو ایک طرف ہٹایا اور اللہ رکھا سے کہا۔

”چاچا یہ چادر تو ہٹاؤ.....!“

اللہ رکھانے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ میں اکڑوں بیٹھ کر اس لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ پہلی ہی نظر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ شخص اس دار فانی سے کوچ کر چکا تھا۔ متحول کی عمر کم و بیش پچیس سال رہی ہوگی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور درمیانہ قد شخص تھا۔ اس نے مناسب سائز کی ڈاڑھی بھی رکھ چھوڑی تھی۔ موسم کی مناسبت سے اس نے گرم شلوار تھیں زیب تن کر رکھا تھا جس کے اوپر گرم ادنی سویر بھی نظر آ رہا تھا۔ پاؤں میں موزوں کے ساتھ تسموں والے بند جوتے تھے۔ اس جائزے کے دوران میں اس شخص کے سر اور چہرے نے میری توجہ خصوصی طور پر اپنی جانب مبذول کر لی تھی کیونکہ وہاں مجھے تشدد کے خویش آثار دکھائی دیے تھے۔ میں بغور اس کے سر کا جائزہ لینے لگا۔

جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا سر بری طرح زخمی تھا۔ کئی جگہ سے کھوپڑی چھٹی ہوئی تھی جہاں سے خارج ہونے والے خون نے اس کے چہرے کو بھی بھگو ڈالا تھا اور لباس کے سامنے والے حصے پر بھی جا بجا خون کے دھبے نظر آ رہے تھے تاہم یہ تمام تر خون جم چکا تھا۔ سر کے زخموں اور خون کی حالت کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ اس شخص کو زندگی کی بازی ہارے ہوئے آٹھ سے دس گھنٹے گزر چکے تھے یعنی اسے گزشتہ شب، رات کے ابتدائی حصے میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

یہ سو فیصد گل کی ایک ہولناک واردات تھی۔ کسی نے بڑی بے دردی سے اس اجنبی جوان کی کھوپڑی کو شدید زخمی کر کے اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا تھا مگر کیوں.....؟

یہ ایک خطرناک سوال تھا جس کا جواب مجھے تلاش کرنا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی ایک سوالات ابھی تک تھے جو اب تھے بھلا یہ کہ وہ شخص تھا کون؟ کہاں سے آیا تھا؟ اسے کس نے اور کیوں گل کر ڈالا اور گل کرنے کے بعد اس کی لاش کو اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے ہی کیوں چھینک دیا؟

میں نے زمین پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے متحول کے لباس کی تلاشی بھی لے ڈالی۔ اس جامہ تلاشی کے نتیجے میں اس بد نصیب شخص کی جیبوں سے چند ایسی اشیا برآمد ہوئیں

سوچ متوازن اور مزاج میں معقولیت پائی جاتی تھی۔ یہ گاؤں اس کے دادا فرمان علی کے نام پر تھا۔

میں نے اللہ رکھا سے پوچھا۔ ”تو اس کا مطلب ہے، چودھری فیضان کو اس نامعلوم بندے کی لاش کے بارے میں بتا دیا گیا ہے؟“

”چودھری صاحب خود تو حویلی میں موجود نہیں ہیں جناب۔“ اللہ رکھانے جواب دیا۔ ”وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ بہر حال، ہم نے حویلی میں یہ خبر پہنچا دی ہے۔“

میں نے اللہ رکھا سے مزید دو چار سوال کر کے اسے قانع کر دیا اور اس کے ساتھ آنے والے افراد کو اندر بلا لیا۔ میں نے فقیر حسین اور یعقوب علی سے بھی دس منٹ تک پوچھ چمک کی مگر کوئی نئی بات سامنے نہیں آسکی۔ وہ بھی اس اجنبی شخص کی لاش کے بارے میں اتنا ہی جانتے تھے جتنا ان سے پہلے اللہ رکھا مجھے بتا چکا تھا۔ میں نے انہیں باہر برآمدے میں انتظار کرنے کو کہا۔

”آپ تھوڑی دیر باہر بیٹھو۔ میں ابھی آپ لوگوں کے ساتھ کوٹ فرمان چلتا ہوں۔ دیکھتا ہوں، اس اجنبی بندے کی لاش کا کیا معما ہے.....“

وہ تینوں میرے کمرے سے نکل گئے۔ میں نے اسے ایس آئی گل شیر کو اپنے پاس بلا کر تھانے کے حوالے سے ضروری ہدایات دیں پھر کاشییل سلیم کو ساتھ لے کر کوٹ فرمان کی جانب روانہ ہو گیا۔

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے، قصبہ فرید آباد اور موضع کوٹ فرمان کے بیچ ایک نہر رواں دواں تھی اور اریب قریب اس نہر پر کوئی پل وغیرہ نہیں تھا لہذا فرید آباد سے کوٹ فرمان جانے کے لیے نہر کو یا تو تیر کر یا پھر چھوٹی سستی کے ذریعے پار کیا جاسکتا تھا۔ مذکورہ نہر اچھی خاصی چوڑی تھی جو کسی دریا سے کم دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہم نے سستی کے ذریعے نہر کو پار کیا اور کوٹ فرمان پہنچ گئے۔ جب ہم نے کوٹ فرمان میں قدم رکھا تو صبح کے دس بج رہے تھے۔

☆☆☆

اللہ رکھا کا گھر گاؤں کے وسط میں تھا۔ نہر کے کنارے سے گاؤں تک بھگ آدھے میل کا فاصلہ تھا جو ظاہر ہے، ہم نے پیدل ہی طے کیا تھا۔ موسم خاصاً خشک بلکہ خوشگوار ہو رہا تھا۔ فضا میں شہتک رہتی ہی تھی تاہم یہ سردی قابل برداشت تھی۔ آدھے میل کا یہ فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پہنچ گئے۔

اللہ رکھانے تھانے میں جس اجنبی شخص کی لاش کا ذکر

جنہوں نے مجھے متذکرہ بالا سوالات میں سے چند ایک کے جواب دے دیے۔

مقتول کی قمیص کے سامنے والی جیب میں سے ایک سو چالیس روپے نقدی کے علاوہ دو گھٹ برآمد ہوئے۔ ان گھٹ میں سے ایک "راجا ٹریولز" کی بس کا تھا جو لاہور سے لاکل پور تک کے سفر کے لیے جاری کیا گیا تھا جبکہ دوسرا گھٹ ایک ویگن کا تھا جو "ملک ٹرانسپورٹ" سروس کے زیر اہتمام چلتی تھی۔ میں اس ٹرانسپورٹر ملک خدا بخش کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس بندے کی ویگن سروس لاکل پور کے لاری اڈے سے مختلف دیہاتوں اور قصبہ جات کی طرف جاری تھی۔ یہ ویگنیں صرف ان قصبہ جات اور دیہاتوں تک جاتی تھیں جو کسی نہ کسی بچی یا بچی سڑک کے کنارے پر واقع تھے۔ دونوں نکٹس پر آٹھ فروری کی تاریخ ڈالی گئی تھی۔

آج نو فروری تھی۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ گزشتہ روز وہ نامعلوم شخص لاہور سے "راجا ٹریولز" کی بس میں بیٹھ کر لاکل پور پہنچا تھا اور پھر لاکل پور کے لاری اڈے سے اس نے ملک ٹرانسپورٹ سروس کی ویگن پکڑ کر فریڈ آباد تک سفر کیا تھا اور ظاہر ہے، فریڈ آباد سے کوٹ فرمان تک پہنچنے کے لیے اس نے نکٹی کے ذریعے بڑی نہر عبور کی تھی اور پھر وہ ایک عبرت ناک موت سے دوچار ہو کر عدم آباد روانہ ہو گیا تھا۔

دونوں نکٹ کی روشنی میں وہ نامعلوم شخص آٹھ فروری کو لاہور سے چل کر لاکل پور اور فریڈ آباد سے ہوتے ہوئے کوٹ فرمان پہنچا تھا مگر کیوں.....؟ جب کوٹ فرمان کے لوگوں کے لیے وہ اچنی تھا تو پھر وہ کس مقصد سے یہاں آیا تھا؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے مجھے موج کے گھوڑوں کو سرپٹ دوڑانا پڑا۔ میں نے مقتول کی سائڈ پاکٹ سے برآمد ہونے والے سامان کا جائزہ لیا۔ اس سامان میں ایک روپال، ایک چابیوں والا گچھا اور ایک المونیم (ایلیومینیم) کی نکٹھی تھی۔ اس زمانے میں پلاسٹک کی مصنوعات کا استعمال ابھی شروع نہیں ہوا تھا اور نہ ہی ایسی چیزیں تیار کرنے کی فیکٹریاں وجود میں آئی تھیں۔ نکٹھی عموماً یا تو لکڑی کی ہوتی تھی اور یا پھر ایلیومینیم کی چابیوں کے سچے میں تین چابیاں بیرونی ہوتی تھیں۔

مقتول کی قمیص کی سائڈ پاکٹ سے برآمد ہونے والے سامان سے مجھے کسی قسم کی تقابلی مشابہت نہیں مل سکی تاہم ان تمام چیزوں کو میں نے اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میرا روئے سخن اللہ رکھا کی جانب تھا۔

"اللہ رکھا! اچھی طرح ذہن پر زور دے کر بتاؤ....." میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا واقعی تم اس بندے کو نہیں جانتے؟"

"سرکارا میں آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گا۔" وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ "میں کیا، پنڈ کا کوئی ایک بندہ بھی نہیں جانتا کہ یہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے....."

"یہ کہاں سے آیا تھا، اس بات کا تو میں پتا چلا چکا ہوں اللہ رکھا۔" میں نے گھبرائے انداز میں کہا۔ "اب یہ جانتا باقی ہے کہ اسے کس نے قتل کیا ہے اور قتل کرنے کے بعد قاتل نے لاش تمہارے دروازے کے سامنے کیوں چھپائی ہے؟"

"جی....." اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہ کہاں سے آیا ہے؟"

میں نے ابھی تک بس اور ویگن کے نکٹ کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا۔ میں نے اس تفصیل سے اللہ رکھا کو آگاہ کر دیا اور کہا۔ "اگر کوٹ فرمان میں رہنے والے لوگوں میں سے کوئی مقتول کو نہیں جانتا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مقتول لاہور سے یہاں کیا لینے آیا تھا.....؟"

"جناب! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" اللہ رکھا بے بسی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ ہی اس بھارت (پاکستان) کو حل کریں جی۔"

جس مقام پر اس اجنبی شخص کی لاش پڑی تھی وہاں پر مجھے ایسے کوئی آثار دیکھائی نہیں دیے تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ اسے اسی جگہ پر قتل کیا گیا تھا۔ ایک بات طے تھی کہ قاتل نے کسی اور مقام پر اس کی زندگی کا چراغ گل کیا تھا اور بعد ازاں کسی وقت اس کی لاش کو لا کر وہاں چھپک ویا گیا تھا۔

میں نے لگ بھگ آدھے گھنٹے میں موقع کی کارروائی مکمل کی اور پھر نامعلوم مقتول کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے کانسٹیبل سلیم کے "ہاتھ" سرکاری اسپتال بھجوا دیا۔ میں نے جائے وقوعہ پر موجود کمیشن دو درجن افراد سے پوچھ چچھ کر کے اس امر کی تسلی کر لی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی اس اجنبی مقتول شخص کو نہیں جانتا تھا البتہ نور حسین نامی ایک بندے نے ایک ایسی بات کی کہ مجھے چونکنا پڑا۔

"جناب! اس بندے کی لاش کو دیکھ کر پہلی نظر میں تو مجھے ایسا لگا تھا کہ وہ موٹی ہے.....!"

میں نور حسین کو ایک طرف لے گیا اور سرسراتی ہوئی آواز میں استفسار کیا۔ "کون موٹی؟"

میرے اس کڑے سوال سے وہ ایک دم گھبرا گیا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر پریشانی نمودار ہوئی۔ مجھے

کوئی بات ہوتی تو اللہ رکھا اور اس کی بیوی کرم بی بی ضرور اس اجنبی مقتول کو اپنے بیٹے موسیٰ کی حیثیت سے پہچان لیتے۔ میں نے ایک دو سوالات کے بعد نور حسین کو فارغ کرتے ہوئے پوچھا۔

”نور حسین! تم کرتے کیا ہو؟“

”ذات کا کہہ رہا ہوں جی۔“ وہ بڑی عاجزی سے بولا۔ ”مٹی کے برتن بناتا ہوں۔ اسی سے اللہ تعالیٰ میری روزی روٹی کا بندوبست کر دیتا ہے۔“

”اگر تم کہہ رہے ہو تو برتنوں کی تیاری کے لیے تمہیں مٹی کی ضرورت پیش آتی ہوگی۔“ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ ”یہ مٹی تم کہاں سے حاصل کرتے ہو؟“

”نہر سے جناب..... اور کہاں سے حاصل کروں گا۔“ وہ ساوگی سے بولا۔ ”میں روزانہ صبح اپنے گدھے کے ساتھ نہر کی طرف ایک چکر لگاتا ہوں۔ جتنی ضرورت ہوتی ہے، نہر سے اتنی مٹی نکال لاتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلاتی پھر پوچھا۔ ”تمہارا گھر کس طرف ہے؟“

”اللہ رکھا سے دو گلی پیچھے جناب۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تم ابھی تو اپنے گھر جاؤ اور تسلی سے اپنا کام کرو۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”میں تھوڑی دیر میں فارغ ہو کر تمہارے پاس آتا ہوں پھر اس واقعے کے حوالے سے کچھ باتیں کریں گے۔“

”ٹھیک ہے جی، جو آپ کا حکم۔“ وہ فرماں برداری سے بولا۔

میں نور حسین کو چھوڑ کر اللہ رکھا کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اس وقت تک جائے وقوعہ سے لوگوں کی بھیڑ چھٹ چکی تھی۔ گلی میں بس اللہ رکھا اور اس کے دو تین پڑوسی موجود تھے۔ میں نے اللہ رکھا سے کہا۔

”تمہارے گھر میں بیٹھنے کی کوئی جگہ ہے؟ میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی..... بسم اللہ۔“ اللہ رکھا جلدی سے بولا۔ ”میں آپ کے لیے پیٹھک کھلواتا ہوں جناب۔“

چند منٹ کے بعد میں اللہ رکھا کی پیٹھک میں ان دونوں میاں بیوی کے سامنے بیٹھا تھا۔ کرم بی بی کی عمر پچاس بے تھوڑی تھی۔ وہ عام سی شکل صورت کی مالک ایک گھریلو عورت تھی۔ اللہ رکھا ساتھ کا ہندسہ عبور کر چکا تھا۔ اس کی تھوڑی سی زرعی اراضی تھی جس کی کھیتی باڑی سے اس کا رزق روزگار چلتا تھا۔ میں نے ان بڑھاپہ کی ذمہ داری پریشانی کو

یوں محسوس ہوا جیسے وہ خود کو کسی مصیبت میں مبتلا سمجھ رہا ہو۔ اس کی کیفیت کے پیش نظر میں نے جلدی سے کہا۔

”فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں نور حسین۔ تم موسیٰ کے بارے میں جو کچھ جانتے ہو، سچ مجھے بتا دو۔ یہ باتیں ہم دونوں کے سچ رہیں گی۔ میں اسی لیے تمہیں ایک طرف لے آیا ہوں.....“

”جی..... مجھے مغالطہ ہوا تھا.....“ اس نے الجھن زدہ انداز میں بتایا۔

”مغالطہ..... کیسا مغالطہ نور حسین؟“ میں نے اظہارِ رائے لہجے میں پوچھا۔

”وہ جی..... جب میں نے اس بندے کی لاش کو دیکھا تو ایک لمحے کے لیے مجھے یہی لگا تھا کہ وہ موسیٰ ہے۔“ نور حسین وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن یہ موسیٰ نہیں جناب۔ اس میں تھوڑی بہت موسیٰ کی شباہت ضرور ہے۔“

”مگر یہ موسیٰ کون ہے؟“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

”موسیٰ..... اللہ رکھا کا بیٹا تھا جی۔“

”بیٹا تھا..... کیا مطلب؟“

”موسیٰ کوئی چار سال پہلے اچانک غائب ہو گیا تھا، تمہارے وار صاحب۔“ نور حسین نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ”پھر آج تک اس کی کوئی خبر نہیں ہے جناب۔ موسیٰ اللہ رکھا کی اکلوتی اولاد تھا۔ دونوں بڑھاپہ کی کافی دنوں تک بیٹے کی جدائی میں آنسو بہاتے رہے پھر رفتہ رفتہ انہیں فرار آ گیا۔“

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ”کیا تمہیں پکا یقین ہے کہ جس شخص کی لاش ابھی میں نے اسپتال بھجوائی ہے، وہ موسیٰ نہیں تھا؟“

”لوہے کی طرح پکا یقین جناب.....“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ”اس بندے میں بس موسیٰ کی ایک ہلکی سی جھلک نظر آئی تھی مجھے ورنہ حقیقت یہی ہے کہ یہ موسیٰ ہرگز نہیں ہے۔ آپ خود سوچیں نا جناب.....“ لہجائی توقف کر کے اس نے اپنی سانس ہموار کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اگر یہ بندہ موسیٰ ہی ہوتا تو بھلا اللہ رکھا اسے پہچاننے میں غلطی کیسے کر سکتا تھا۔ اللہ رکھا کی گھروالی کرم بی بی نے بھی اس اجنبی شخص کی لاش دیکھی ہے۔ ایک ماں اپنے بیٹے کو پہچاننے میں تو کوئی کوتاہی نہیں کر سکتی نا.....!“

نور حسین کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔ اگر ایسی

ملنے جلتے ہیں ہاں..... اس کا قد کاٹھ اور بدن وغیرہ موسیٰ ہی کا لگتا ہے جی۔

الفاظ اور بیان کا ہیر پھیر تھا لیکن کرم بی بی اور اللہ رکھا کا بیان نور حسین کے بیان کی تصدیق کرتا تھا۔ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

”یعنی تم لوگ یہ کہہ رہے ہو کہ اگر یہ اجنبی بندہ دور سے آ رہا ہو یا یہ گنجل جا رہا ہو تو پیچھے سے دیکھ کر ذہن میں یہ خیال آ سکتا ہے کہ..... یہ موسیٰ ہے؟“

”جی..... جی ہاں۔“ اللہ رکھا نے اثبات میں گردن ہلائی۔

کرم بی بی نے کہا۔ ”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ اجنبی مقتول اور گمشدہ موسیٰ کے حوالے سے ان دونوں میاں بیوی کے تصدیقی کلمات نے میرے ذہن میں چند خدشات کو جنم دیا۔ میں نے پوچھا۔

”چار سال پہلے جب آپ لوگوں کا بیٹا اچانک گم ہو گیا تھا تو کیا آپ نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ وغیرہ درج کرائی تھی؟“

”رپورٹ.....؟“ اللہ رکھا نے سوالیہ نظر سے مجھ کو دیکھا۔

”ہاں ہاں۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”موسیٰ کی گمشدگی کے حوالے سے تمہارے میں کوئی اطلاع دی تھی؟“

”نہیں جی۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”ہم نے اپنے طور پر ہی اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ آ لے دوالے کے گاؤں دیہات میں جدھر جدھر بھی ہمارے رشتے دار بستے ہیں وہم نے ہر ایک کے گھر جا کر موسیٰ کو تلاش کیا تھا۔ رشتے داروں نے بھی اس سلسلے میں ہماری بہت مدد کی تھی مگر کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔“

”تمہارے دار جی! وہی بات کہ جو ہونا ہوتا ہے وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔“ کرم بی بی دیکھی لہجے میں بولی۔ ”موسیٰ کو نہیں ملتا تھا وہ نہیں ملا.....“ وہ رو ہاکی ہو گئی۔ ”میں تو ہر وقت یہی دعا کرتی ہوں کہ وہ جہاں بھی ہو بس زندہ سلامت ہو۔ انسان زندہ ہوتا بھی نہ بھی زندگی میں ملاقات ہو ہی جاتی ہے۔“

ایک گمشدہ نوجوان بیٹے کی ماں کے دکھ کو میں اچھی طرح سمجھ سکتا تھا لیکن ان لمحات میں میرے ذہن میں جن خدشات نے جنم لیا تھا ان کی تحقیق اور تصدیق بہت ضروری تھی۔ میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

”مجھے آپ لوگوں کے درد کا پوری طرح احساس ہے۔ چار سال پہلے جب آپ کا بیٹا موسیٰ گم ہوا میں اس

دیکھتے ہوئے چند تل اور کشمی کی باتیں کیں پھر اصل موضوع کی طرف آیا۔

”اللہ رکھا! آپ لوگوں کے بچے وغیرہ کہاں ہیں؟“ میں نے انجان بننے ہوئے پوچھا۔ ”گھر کے اندر کوئی رونق اور چہل پہل نظر نہیں آ رہی.....؟“

”وہ جی، بات دراصل یہ ہے کہ.....“ اللہ رکھا بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”ہمارا صرف ایک ہی بیٹا تھا..... موسیٰ..... پتا نہیں وہ کہاں چلا گیا ہے۔“

”کہاں چلا گیا ہے..... کیا مطلب؟“ میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔

نور حسین کی زبانی مجھے موسیٰ کی گمشدگی کی خبر تو مل چکی تھی تاہم میں یہ حقیقت اللہ رکھا اور اس کی بیوی کی زبان سے سنتا چاہتا تھا۔ کرم بی بی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

”حقیقت تو سو ہنار ب ہی جانتا ہے جی۔“ وہ ایک شہنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ”کوئی چار سال پہلے وہ اچانک غائب ہو گیا تھا۔ جہاں تک ڈھونڈ سکتے تھے وہم نے اسے تلاش کیا لیکن وہ ہمیں ملا اور نہ ہی اس کی کوئی خبر ٹھیک بار کر ہم پیٹھ گئے لیکن..... اس کی واپسی کی اب بھی آس لگی ہوئی ہے۔“ اتنا بتا کر کرم بی بی خاموش ہو گئی۔

”تمہارے دار جی! یوں محسوس ہوتا ہے.....“ اللہ رکھا اپنی بیوی کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یوں لگتا ہے کہ موسیٰ کسی وقت اچانک ہمارے سامنے آ کر کھڑا ہو جائے گا اور ہمیں حیران کر دے گا۔“

”ایسی ہی حیرت آج صبح اس اجنبی شخص کی لاش کو بھی دیکھ کر ہوئی تھی یا نہیں؟“ میں نے اللہ رکھا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ بوکھلا گیا اور جلدی سے بولا۔ ”میں سمجھا نہیں

جناب.....!“

”اللہ رکھا!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں نے ابھی جو گھنٹا آدھا گھنٹا گفتیش کی ہے اس سے مجھے پتا چلا ہے کہ تمہارا گمشدہ بیٹا شکل میں اس اجنبی مقتول سے کافی حد تک ملتا جلتا ہے.....؟“

”شکل میں ملتا جلتا تو نہیں کہہ سکتے جناب۔“ اللہ رکھا نے جواب دیا۔ ”البتہ اس کی جسامت موسیٰ جیسی ہی ہے۔“

”میں نے بھی اس بندے کو دیکھا ہے جی۔“ کرم بی بی نے جتنے کہا۔

اللہ رکھا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میرے موسیٰ کی اور ان بندے کی شکل ایک جیسی نہیں۔ بس جی، میں نقش و کج

”جی.....جی ہاں۔“

”اور آپ لوگ اس بات سے بھی انکار نہیں کر سکیں گے کہ کوئی کسی کو خواہ مخواہ قتل نہیں کر دیتا۔“ میں نے یہ دستور سوالیہ نظر سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لہذا اس اجنبی شخص کو جس کسی نے بھی قتل کیا ہے وہ یقیناً اس کا دشمن ہوگا۔ اس کے دل میں اس اجنبی شخص کے لیے شدید ترین نفرت پل رہی ہوگی اسی لیے اس نے موقع ملتے ہی اس شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔“

”جی تمہارے دار صاحب۔“ اللہ رکھا سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ ”لیکن اس میں ہمارا کیا قصور ہے تمہارے دار صاحب۔“ ”کرم بی بی شکایتی لہجے میں بولی۔ ”ان دونوں کی جو بھی آپس میں دشمنی تھی وہ ایک دوسرے سے نکالتے رہتے۔ اس بندے کی لاش کو ہمارے دروازے کے سامنے پھینکنے کی کیا تکبنتی ہے؟“

”تکبنتی ہے کرم بی بی!“ میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”وہ دونوں انہیں زدہ انداز میں مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس بد بخت اجنبی شخص کو آپ کے گمشدہ بیٹے موسیٰ کے مقابلے میں کسی نے قتل کیا ہے جیسی اس کی لاش کو آپ کے دروازے کے سامنے پھینکا گیا ہے۔“

”ادہ.....“ اللہ رکھانے ایک پر تشویش سانس خارج کی اور فکر مند لہجے میں بولا۔ ”لیکن موسیٰ کا ایسا دشمن کون ہو سکتا ہے جو اپنے دل میں اس کے لیے اتنی نفرت رکھتا ہو کہ بے دردی سے اسے قتل کر ڈالے.....“

”یہ تو آپ لوگ مجھے بتاؤ گے؟“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”موسیٰ کرتا کیا تھا؟ میرا مطلب ہے، اس کی دن بھر کی کیا مصروفیات ہوا کرتی تھیں؟“

”دیکھیں جی.....“ اللہ رکھا گہری سنجیدگی سے بولا۔

”موسیٰ چار سال پہلے اچانک غائب ہو گیا تھا۔ ہم جہاں جہاں اسے تلاش کر سکتے تھے، ڈھونڈ کر دیکھ لیا مگر وہ ہمیں کہیں بھی نہیں ملا۔ وہ اس وقت کہاں ہے اور کیا کرتا ہوگا۔ اس کی ہمیں کوئی خبر نہیں جناب۔ ہاں.....“ ”تھوڑا توقف کر کے اس نے اپنی سانس درست کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”جب تک وہ یہاں ہمارے پاس تھا تو میرے ساتھ ہی کھیتوں میں کام کرتا تھا۔ تھوڑی سی زمین ہے۔ اللہ

تمہارے کا انچارج نہیں تھا لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ موسیٰ کو تلاش کرنے کی حتی الامکان کوشش کروں گا مگر فی الحال ایک دوسرا معاملہ درپیش ہے۔“

”دوسرا معاملہ۔“ کرم بی بی نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔ ”کون سا معاملہ جی.....؟“

”اس اجنبی بندے کا معاملہ“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جو کل لاہور سے یہاں پہنچا تھا اور پھر شتی القلب قاتل نے پچھلی رات اسے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا اور لاش آپ کے دروازے پر پھینک کر کہیں گم ہو گیا ہے۔“

”لعل..... لیکن.....“ اللہ رکھا کلفت زدہ انداز میں بولا۔ ”موسیٰ کا اس بندے سے کیا تعلق؟“

”یہ ظاہر تو کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔“ میں نے صاف کوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اگر ڈھونڈنے کی کوشش کریں تو بہت گہرا تعلق نکالا جاسکتا ہے۔“

”کیا مطلب ہے جی آپ کا؟“ کرم بی بی کی گھبرائی ہوئی آواز برآمد ہوئی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھیں، اس گاؤں میں سونے قریب گھر آباد ہیں لیکن اجنبی شخص کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش کو آپ کے دروازے کے سامنے پھینک دیا گیا۔ میرے خیال میں اپنی اس حرکت سے قاتل آپ لوگوں کو کوئی سنگین پیغام دینا چاہتا ہے۔“

ان دونوں کی آنکھوں میں خوف اُٹ آیا۔ اللہ رکھانے پوچھا۔ ”کیسا پیغام تمہارے دار صاحب۔ میں تو آپ کی بات کو بالکل نہیں سمجھ سکتا؟“

میں نے ان کی الجھن دور کرنے کی غرض سے واضح الفاظ میں کہا۔ ”دیکھیں، میں اس علاقے کا تمہارے دار ہوں۔ میرے سوچنے کا انداز عام لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔ میں گفتیش کے دوران میں ہر شخص کو شک کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ اگر میں ایسا نہیں کروں تو پھر مجرموں تک پہنچ نہیں سکتا۔ یہ میرے پیشے کا تقاضا اور فرض کا حصہ ہے۔ میں اس اجنبی شخص کے قتل کو بھی مختلف زاویوں سے دیکھ رہا ہوں۔ یہ تو آپ دونوں مانتے ہیں نا کہ یہ اجنبی شخص قتل کا ٹھکانہ اور نقش و نگار میں کافی حد تک آپ کے گمشدہ بیٹے موسیٰ سے ملتا جلتا ہے.....؟“

میں نے لمحاتی توقف کر کے سوالیہ نظر سے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے یہ ایک زبان ہو کر لوٹے۔

نہ ہوسکا۔ اس صورت حال سے میرا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔

☆☆☆

موضوع ”کوٹ فرمان“ بڑی نہر کے کنارے سے لگ بھگ آدھے میل کے فاصلے پر واقع تھا اور یہ آدھا میل لہلہاتے، سرسبز و شاداب کھیتوں پر مشتمل تھا۔ نہر سے گاؤں کے اندر تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ایک کچا راستہ کھیتوں کے پھول سج بنا ہوا تھا۔ میں اسی راستے پر سیک خرائی سے آگے بڑھ رہا تھا کہ عقب سے کسی نے مجھے پکارا۔

”تھانے دار صاحب!.....!“

میں نے یکا یک پلٹ کر دیکھا تو نور حسین کہہ رہی صورت دکھائی دی۔ میں رک گیا اور سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ تیز قدموں سے چلتے ہوئے میرے قریب آ گیا۔

”ہاں بھی نور حسین!“ میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”خیریت تو ہے نا۔ یہ تمہارا سانس کیوں پھولا ہوا ہے.....؟“

”وہ جی..... آپ نے کہا تھا نا کہ ادھر سے فارغ ہونے کے بعد آپ میرے پاس آئیں گے۔“ وہ سادگی سے بولا۔ ”لیکن آپ تو دایس جا رہے ہیں۔“

نور حسین کہہ رہے تھے تو وہ جانیے میری مختصر سی بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ اجنبی شخص کی لاش کو دیکھ کر اس کے ذہن میں پہلا خیال موسیٰ کا آیا تھا لیکن بعد میں اسے اپنے اس خیال کی تردید کرنا پڑی کیونکہ وہ موسیٰ نہیں تھا۔ اس وقت میں نے نور حسین سے کہا تھا کہ اللہ رکھا کی طرف سے فارغ ہونے کے بعد میں اس کے پاس آؤں گا اور تفصیلی بات چیت کروں گا۔ نور حسین بھی میری اسی بات کا حوالہ دے رہا تھا۔

”ہاں نور حسین!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں تمہارے گھر نہیں آیا تو کیا ہوا۔ آؤ، ہم چلتے پھرتے بات کر لیتے ہیں۔“

وہ فرماں برداری سے میرے ساتھ چلتے لگا۔ ”نور حسین! یہ بات تو طے ہو گئی کہ وہ اجنبی مقتول اللہ رکھا کا بیٹا موسیٰ نہیں ہے۔“ میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”لیکن یہ پتا نہیں چل رہا کہ وہ آخر ہے کون..... میرا مطلب ہے، وہ تھا کون؟“

”کچھ سمجھ میں نہیں آرہا جناب۔“ وہ بے بسی سے بولا۔ ”اس بد نصیب کی شکل کافی حد تک موسیٰ سے ملتی جلتی ہے اسی لیے مجھے دھوکا ہوا تھا۔“

کے کرم سے اچھی گزر بسر ہو جاتی ہے۔ جب موسیٰ کام میں میرا ہاتھ بنا تا تھا تو مجھے بڑی سہولت تھی مگر اب اکیلا ہی کام میں جتا رہتا ہوں۔ یوڑھی ہڈیاں جانے کب جواب دے جائیں.....“

”جب موسیٰ ادھر کوٹ فرمان میں ہی تھا تو ظاہر ہے، لوگوں سے اس کا میل جول بھی ہوتا ہوگا۔“ اللہ رکھا کے خاموش ہونے پر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ”ایسا تو ممکن نہیں کہ انسان کے جہاں دس دوست ہوں وہاں اس کا کوئی ایک آدمہ دشمن نہ ہو لیکن تم بتا رہے ہو کہ..... اس کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی؟“

”تھانے دار صاحب! اللہ رکھا نے آپ کو بالکل سچ بتایا ہے۔“ کرم بی بی دکھی لہجے میں بولی۔ ”موسیٰ اپنے کام سے کام رکھنے والا بچہ تھا جی۔ لڑائی جھگڑا تو بہت دور کی بات ہے، اس کی تو کبھی کسی سے تو تو، میں میں بھی نہیں ہوئی تھی۔“

ہر ماں کا عموماً اپنی اولاد کے بارے میں یہی خیال ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی سب سے مہذب اور سچھی ہوئی شائستہ اولاد ہے۔ میں نے اس بڑھی بڑھے کو ایک اور زاویے سے کریدنے کی کوشش کی۔

”کیا آپ لوگوں نے موسیٰ کی شادی بھی کر دی تھی؟“

”جی نہیں۔“ اللہ رکھا نے نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے پوچھا۔ ”کوئی منگنی وغیرہ.....؟“

”نہ شادی اور نہ منگنی جی۔“ اللہ رکھا نے جواب دیا۔

میں مزید پندرہ بیس منٹ تک جھما پھرا کر ان سے مختلف سوالات کرتا رہا لیکن اس کی کوئی بھی مفید بات سامنے نہ آسکی جس سے اس اجنبی کے حوالے سے کوئی پیش رفت ہو سکتی جسے بڑی بے دردی کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ اگرچہ موسیٰ کے والدین کا یہ دعویٰ تھا کہ اس کے کسی دشمن کا وجود نہیں تھا لیکن میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ ان الفاظ کے ساتھ میں ان کے گھر سے اٹھ آیا۔

”ٹھیک ہے اللہ رکھا! میں اس بد قسمت شخص کے قاتل کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس دوران میں اگر آپ لوگوں کو کوئی خاص بات پتا چلے تو فوراً مجھے اس کی اطلاع دینا۔“

انہوں نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور میں گھر سے باہر نکل آیا۔ واپسی کا رخ کرنے سے پہلے میں نے اللہ رکھا کے بڑے بیٹے فقیر حسین اور یعقوب علی سے فرداً فرداً دوبارہ پوچھ چکھی مگر مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

جانی دشمن کون ہو سکتا ہے....." لہجائی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر حذب اعدا میں بولا۔

"جہاں تک میں موسیٰ کو جانتا ہوں، وہ تو بہت امن پسند اور صلح صفائی سے رہنے والا انسان تھا۔ اس کا بھی کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ میں اسی گاؤں میں پیدا ہوا ہوں، تھانے دار صاحب اور موسیٰ میری آنکھوں کے سامنے مل بڑھ کر جوان ہوا ہے۔ میں نے بھی اسے کسی کے ساتھ لہجے ہوئے نہیں دیکھا۔"

"موسیٰ کے ماں باپ کا بھی یہی دعویٰ ہے نور حسین۔" میں نے کبھی انداز میں کہا۔ "لیکن میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ میں یہ راز جان کر رہوں گا کہ موسیٰ کے خون کا بیجا سا کون ہو سکتا ہے اور اس مقصد میں کامیابی کے لیے مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے....."

"جی..... آپ حکم کریں۔" وہ فرماں برداری سے بولا۔ "میں کیا تعاون کر سکتا ہوں؟"

"یہ تو تم بتا چکے ہو کہ موسیٰ سے کسی کی یا کسی سے موسیٰ کی کوئی دشمنی نہیں تھی۔" میں نے پوچھ کر کچھ کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں یہ جانتا چاہتا ہوں کہ چار سال پہلے جب موسیٰ اچانک غائب ہوا تھا تو اس وقت ایسا کون سا واقعہ پیش آیا تھا جسے اس کی گمشدگی کے ساتھ جوڑا جا سکے.....؟"

"کوئی نہیں....." وہ لہجی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "ایسا کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ بس وہ ایک دن اچانک غائب ہو گیا تھا..... چنپ چاپ..... پھر اس کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔ چار سال کے بعد آج کھلی مرتبہ اتنے زور شور سے اس کا ذکر ہو رہا ہے۔"

موسیٰ کے کسی دشمن کا سراغ نہ ملنے کی صورت میں، میں نے نور حسین سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔

"کیا آج صبح تم مٹی نکالنے نہر کی طرف گئے تھے؟"

"جی..... گیا تھا۔" اس نے اثبات میں جواب دیا۔

"میرے اعدا نے کے مطابق قاتل نے اس دشمنی بندے کی لاش کو رات کے آخر پہر یا پھر علی الصبح لاکر اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے بچھا ہوگا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "کیا تم نے کسی شخص کو ادھر آتے ہوئے یا جاتے ہوئے دیکھا تھا؟ میرا مطلب ہے، جب آج صبح تم نہر سے مٹی نکالنے گئے تھے تو تم نے گاؤں کے اندر یا گاؤں سے باہر کی فضا میں کوئی غیر معمولی بات نوٹ کی تھی؟"

وہ میرے سوال کے مقصد تک پہنچ گیا اور ٹھہرے

"اس اجنبی کو کسی نے بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارا ہے۔" میں نے یہ دستور اس کی جانب دیکھے بغیر گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا۔ "جس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ قاتل کو اس اجنبی سے شدید نوعیت کی نفرت تھی اور اس کی لاش اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے بچھنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ رکھا کو کوئی سنگین پیغام دینا چاہتا ہے۔ میرا ذہن یہ کہتا ہے کہ قاتل جو کوئی بھی ہے، وہ دراصل موسیٰ کا دشمن ہے اور موسیٰ کے مخالف ہی میں اس نے اس بندے کو موت کے گھاٹ اتارا ہے....."

"جی....." وہ چلتے چلتے رک گیا۔ "آپ تو بڑی گہری بات کر رہے ہیں۔"

"بات کی گہرائی کو بعد میں بھی ناپا جاسکتا ہے۔" میں نے نور حسین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "فی الحال یہ بتاؤ کہ اس سلسلے میں تمہارا کیا خیال ہے.....؟"

"آپ کی بات میں بہت وزن ہے تھانے دار صاحب۔" وہ پُرسوج نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آرہی کہ موسیٰ جو کچھ چار سال سے قایم ہے، اچانک کہاں سے نمودار ہو گیا اور اس کا ایسا کون سا دشمن ہے جو بے دردی سے اسے قتل کر سکتا ہے۔"

"موسیٰ کہیں سے نمودار نہیں ہوا نور حسین!" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "تم نے شاید میری بات پر غور نہیں کیا۔ جان کی بازی ہارنے والا موسیٰ نہیں بلکہ اس سے ملتی جلتی شکل کا کوئی بندہ ہے اور اسے موسیٰ کے شبہ میں قتل کیا گیا ہے۔"

نور حسین نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد بڑی مشکل مندی کی بات کی۔ "اس کا مطلب تو یہ ہوا جناب کہ قاتل کو کہیں سے یہ اطلاع ملی ہوگی کہ پچھلی رات موسیٰ اپنے ماں باپ سے ملنے کوٹ فرماں آ رہا ہے لیکن کسی بھی وجہ سے موسیٰ نہیں آیا اور یہ بد بخت قاتل کے ہتھے چڑھ گیا اور اس نے موسیٰ کے مخالفے میں اس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔"

"میں تم سے سو فی صد اتفاق کرتا ہوں نور حسین کیونکہ میں بھی اسی اعدا میں سوچ رہا ہوں۔" میں نے نہر کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پچھلی رات اگر موسیٰ کو کوٹ فرماں آتا تھا تو وہ کیوں نہیں آیا اور اس کی جگہ اس سے ملتی جلتی شکل کا یہ اجنبی کیوں اور کہاں سے فلک پڑا.....؟"

"جی ہاں یہ سوالات تو ہیں۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "اور یہ بھی کہ موسیٰ کا ایسا خطرناک اور

”سرکارا اگر آپ کا حکم ہو تو میں کشتی چلاؤں؟“ وہ لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔
 میں نے مختصر جواب دیا۔ ”نہیں اور پوچھ پوچھا“
 اس نے کشتی کو رواں کر دیا اور بولا۔ ”اگر آپ کو برا نہ لگے تو کچھ پوچھوں جناب.....!“
 میں نے فراخ دلی سے کہا۔ ”ہاں ہاں..... پوچھو خادم حسین۔“

اس نے پوچھا۔ ”سرکارا صبح آپ چند لوگوں کے ساتھ ادھر کوٹ فرمان گئے تھے اور ابھی آپ اکیلے ہیں۔“
 ”ہاں۔ وہ لوگ اسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔“
 میں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

”دو گھنٹے پہلے آپ کے محلے کا ایک سنتری کسی اجنبی کی لاش لے کر فریدآباد کی طرف گیا ہے۔“ وہ کریدنے والے انداز میں بولا۔ ”کیا کوٹ فرمان میں قتل کی کوئی واردات ہوئی ہے.....؟“

میں نے چونک کر خادم حسین کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں مجھے دنیا جہاں کے تجربے کے ساتھ ہی بہت گہرائی بھی نظر آئی۔ پتا نہیں کیوں، مجھے یوں محسوس ہوا کہ خادم حسین اس واقعے کے بارے میں زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت ضرور جانتا ہے تاہم انجان بن کر مجھ سے استفسار کر رہا ہے۔ میں نے التماسی کوٹھنے کا فیصلہ کر لیا۔

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے خادم حسین۔“ میں نے بہ دستور اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”کوٹ فرمان میں پچھلی رات ایک اجنبی شخص کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ میرے محلے کا آدمی اسی بد نصیب بندے کی لاش کو لے کر فریدآباد کی طرف گیا ہے.....“ لہجائی توقف کر کے میں نے اسے ٹھوٹی ہوئی نظر سے دیکھا اور سنسناتے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔

”ادھر گاؤں میں چند لوگوں کی زبانی مجھے پتا چلا ہے کہ وہ اجنبی شخص کل شام میں تمہاری کشتی پر سوار ہو کر کوٹ فرمان پہنچا تھا؟“

میرا یہ سوال ”اعدمیرے میں چلایا ہوا تیر“ ہرگز نہیں تھا۔ فریدآباد سے کوٹ فرمان تک پہنچنے کا واحد ذریعہ خادم حسین کی کشتی ہی تھی۔ کل شام میں وہ پہر میں یا دن میں کسی وقت وہ نامعلوم شخص اسی کشتی میں بیٹھ کر کوٹ فرمان پہنچا ہوگا۔

”آپ کو بالکل ٹھیک بتایا گیا ہے تمہانے وار

ہوئے لہجے میں بولا۔ ”جناب امیں جب اپنے گدھے کے ساتھ کشتی نکالنے بڑی نہر کی طرف جاتا ہوں تو اس وقت ہلکا ہلکا اجالا پھیل رہا ہوتا ہے۔ آج صبح نہر کی جانب جاتے ہوئے یاد اپسی میں مجھے ایسا کچھ بھی دکھائی نہیں دیا جسے غیر معمولی کہا جاسکے۔ میں نے نہر سے مٹی نکال کر اپنے گدھے پر لاد دی اور واپس گھر آ گیا۔“

نور حسین کی وضاحت سے یہ لگتا تھا کہ اس اجنبی نامعلوم شخص کی لاش کو رات کے اندھیرے میں کسی وقت لا کر اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پھینک دیا گیا تھا اور شواہد سے میں یہ اندازہ پہلے ہی لگا چکا تھا کہ قتل کی یہ واردات کسی اور مقام پر ہوئی تھی۔ بعد ازاں جب اس بد قسمت کی لاش ٹھنڈی ہوئی اور بدن سے خارج ہونے والا لہو جم چکا تو اسے اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پھینک دیا گیا..... مگر کیوں؟ اللہ رکھا کا دروازہ ہی کیوں؟

اس ”کیوں“ کا کوئی واضح جواب ابھی تک سامنے نہیں آسکا تھا۔ اگر میں اصل جائے وقوعہ تک یعنی جہان اس اجنبی کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا، وہاں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو بہت سے رازوں سے پردہ اٹھ سکتا تھا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے نہر کے کنارے پہنچ گئے۔ یہاں سے مجھے کشتی کے ذریعے نہر عبور کرنا تھی۔ کشتی اس وقت نہر کے دوسرے کنارے سے اسی طرف آرہی تھی۔ میں نے نور حسین سے کہا۔

”اب تم اپنے گھر جاؤ اور میں تمہانے جا رہا ہوں میں کل پھر ادھر کا چکر لگاؤں گا۔ تم اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا..... میری بات سمجھ رہے ہوتا؟“

”جی ہاں..... بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں جناب۔“ وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔“

میں نے نور حسین کو واپس بھیج دیا اور نہر کے کنارے کھڑے ہو کر کشتی کا انتظار کرنے لگا۔ مذکورہ نہر کا پاٹ خاصا چوڑا تھا اسی لیے اسے بڑی نہر کہا جاتا تھا۔ جو نہیں جانتے تھے وہ اسے دریا ہی سمجھتے تھے۔

کشتی والے خادم حسین نے دو افراد کو نہر کے کنارے اتارا تو میں کشتی پر سوار ہو گیا۔ خادم حسین کی عمر پچاس سے متجاوز تھی۔ وہ ایک دبلا پتلا اور میانہ قد شخص تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور چہرے سے جھانکشی جھانکشی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، اس کی ساری زندگی محنت کرتے گزری ہو۔

”نہیں جناب.....“ وہ نفی میں گردن جھکتے ہوئے بولا۔ ”اس بندے کو تو میں نے کل پہلی بار دیکھا تھا اور دوبارہ دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ.....“ اس نے افسوسناک انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو میں نے جلدی سے کہا۔ ”تو تم اس کے ساتھی کی بات کر رہے ہو؟“

”جی۔ اس کا اصل نام تو اسحاق ہے۔“ خادم حسین نے بتایا۔ ”مگر وہ ”بھولا“ کے نام سے مشہور ہے۔“ ”تو تم اس اسحاق عرف بھولا کو کسی حد تک جانتے ہو؟“ میں نے پرسوج انداز میں کہا۔ ”ٹھیک ہے..... پھر بھولا ہی کے بارے میں بتاؤ؟“

”یہ بھولا چاچا اسماعیل کا بیٹا ہے جی۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”فرید آباد کے لاری اڈا پر چاچا اسماعیل کی چائے اور سگریٹ وغیرہ کی دکان ہے۔ بھولا بھی کئی بار مجھے ادھر دکان پر نظر آیا ہے۔“

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر خادم حسین سے پوچھا۔ ”کیا کل وہ دونوں ایک ساتھ ہی تمہاری کشتی پر سوار ہو کر کوٹ فرمان پہنچے تھے یا الگ الگ تمہارے پاس آئے تھے؟“

”میں آپ کی بات سمجھ گیا جی۔“ وہ مدبرانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”وہ دونوں ایک ساتھ ہی باتیں کرتے ہوئے میری کشتی تک پہنچے تھے اور نہر عبور کرتے ہوئے بھی ان میں بات چیت ہوتی رہی تھی۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ وہ دونوں ایک ساتھ ہی تھے.....“

میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”اچھا تو اب یہ بھی بتا دو کہ وہ دونوں ہی نہر کے اس پار اتر گئے تھے یا بھولا واپس آ گیا تھا؟“

”دونوں ہی ادھر رہ گئے تھے۔“ خادم حسین نے جواب دیا۔ ”میں خالی کشتی لے کر واپس آیا تھا۔“ ”اور آج صبح ہی سے تم اپنی کشتی پر نہر کے پھیرے لگا رہے ہو؟“

”جی ہاں..... صبح نو بجے سے میں اپنے کام میں لگا ہوا ہوں۔“

”کیا کوٹ فرمان سے فرید آباد کی طرف آتے ہوئے کسی پھیرے میں آج تم نے بھولا کو بھی بٹھایا ہے اپنی کشتی میں؟“ میں نے سناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”نہیں جناب..... میرا خیال ہے وہ بھولا ابھی تک ادھر کوٹ فرمان ہی میں ہے۔“ وہ بڑے وثوق سے بولا۔

”ساحب!“ وہ افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ جن دو بندوں کو میں آخری پھیرے میں کوٹ فرمان پہنچا رہا ہوں، آج ان میں سے ایک کی لاش واپس جائے گی.....“

”دو بندوں کو.....؟“ مجھے کرنٹ سا لگا۔ ”جی ہاں۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ جو آپ کا سنتری جس بندے کی لاش لے کر فرید آباد گیا ہے، وہ میں نے اسے اور ایک دوسرے بندے کو کل شام میں کوٹ فرمان پہنچایا تھا۔ وہ میرا آخری پھیرا تھا۔“ میں نے تھوڑی دیر پہلے خادم حسین کے بارے میں جو اندازہ قائم کیا تھا، وہ اب درست ثابت ہو رہا تھا۔ یقیناً وہ اجنبی مقتول کے حوالے سے معلومات رکھتا تھا۔ میں اپنے مخصوص انداز میں اس سے سوال کرنے لگا۔

”خادم حسین! تم نے لگ بھگ کتنے بجے ان دونوں افراد کو کل کوٹ فرمان پہنچایا تھا؟“

”جی، اللہ آپ کا بھلا کرے۔“ وہ بتانے لگا۔ ”وہ ساڑھے پانچ اور چھ بجے کے درمیان کا کوئی وقت تھا۔ میں صبح نو بجے کشتی نکلا ہوں اور سورج ڈوبنے سے پہلے آخری چکر لگا کر واپس چلا جاتا ہوں کیونکہ میرا گھر ادھر فرید آباد ہی میں ہے۔“

”خادم حسین!“ میں نے گہری سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔ ”جن دو بندوں کو تم نے کل شام کوٹ فرمان پہنچایا تھا، ان کے بارے میں کیا جانتے ہو؟“

”جی..... میں سمجھا نہیں؟“ وہ ابھمن زدہ نظر سے مجھے تنکے لگا۔

میں نے فوراً وضاحت کر دی۔ ”کیا تم ان دونوں کو پہچانتے ہو؟“

اجنبی مقتول کی شناخت ہی سب سے بڑا مسئلہ بنی ہوئی تھی لہذا میری تان بھی اسی پر آ کر ٹوٹی تھی۔ اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

”جناب! میں ان دونوں میں سے ایک کو کسی حد تک جانتا ہوں۔“

”کس کو؟“ میں نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں سوال کیا۔

”بھولا کو.....“ اس نے بتایا۔

”بھولا.....!“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم اس بندے کی بات کر رہے ہو جس کی لاش کچھ دیر پہلے میں نے کانسٹیبل سلیم کے ہاتھ سرکاری اسپتال بھجوائی ہے؟“

”جی اچھا۔“ اس نے گرون کو اثنائی جنبش دی۔ ”جو آپ کا حکم۔“

”میں تمہارے آخری پھیرے کے دقت سے پہلے ہی واپس آ جاؤں گا۔“ میں نے تسلی بھرے انداز میں کہا۔ ”سورج غروب ہونے سے پہلے تم اپنے گھر پہنچ جاؤ گے۔“ اس نے کچھ نہیں کہا۔ میں نہر کے کنارے سے ”کوٹ فرمان“ کی جانب بڑھنے لگا۔ اس بار میرے قدموں میں ایک خاص قسم کی تیز رفتاری پائی جاتی تھی جو سنسنی خیز اور پرجسس بھی تھی۔

☆☆☆

اب سہ پہر ہو چکی تھی۔ فضا کی خشکی بھی چپ چاپ کہیں غائب ہو گئی تھی۔ اگرچہ سورج آسمان پر موجود تھا لیکن اس کی دھوپ میں حدت یا تپش نہیں پائی جاتی تھی۔ میں تھوڑی ہی دیر میں کوٹ فرمان کے اندر موجود تھا۔

آج صبح اس اجنبی شخص کی پراسرار موت نے پورے گاؤں میں خاصی سنسنی پھیلا دی تھی۔ لوگ کام میں کم اور... چہ میگوئیوں میں زیادہ مصروف تھے۔ کھیتوں کے اندر بھی وہ چہل پہل نظر نہیں آ رہی تھی جو نارمل حالات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ میں اللہ رکھا کے گھر پہنچا اور یہ اعلان کر دیا کہ ہر گھر کا ایک ایک آدمی وہاں جمع ہو جائے۔ تھوڑی ہی دیر میں میرے ارد گرد ایک مجمع سا لگ گیا۔ میں نے اس جم غفیر پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور بہ آواز بلند سوال کیا۔

”تم میں سے کون کون“ فرید آباد“ آتا جاتا رہتا ہے؟“ یہ سوال اگرچہ بادی النظر میں غیر اہم اور فضول لگتا تھا لیکن اس کے پیش نظر میرے کچھ مقاصد تھے جو اگلے سوالات میں کھل کر سامنے آنے والے تھے۔ کوٹ فرمان میں رہنے والوں میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو فرید آباد نہ آتا جاتا ہو کیونکہ ان لوگوں کی ہر ضرورت فرید آباد سے تعلق رکھتی تھی۔

سب نے اثبات میں جواب دیا یعنی ان سب کا فرید آباد جانا لگتا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اسی انداز میں پوچھا۔ ”فرید آباد کے لاری اڈے پر چاچا اسٹیل نای ایک بندے کی سٹریٹ اور جائے کی چھوٹی سی دکان ہے۔ آپ میں سے جو لوگ چاچا اسٹیل کو جانتے ہیں، وہ ایک طرف ہو جائیں۔“

لگ بھگ بیس افراد مجھے میں سے الگ ہو گئے۔ سب کے چہروں پر اپنی اپنی سوچ کی نمائندگی کرنے والے سوالات چمک رہے تھے۔ میرے انداز نے انہیں عجیب

”اگر وہ واپس آتا تو میری کشتی میں ضرور بیٹھتا۔“ ”ہوں۔۔۔۔۔“ میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ”تھانے دار صاحب!“ خادم حسین کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

”آں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔“ میں نے خیالات سے باہر آتے ہوئے کہا۔

”جناب! ہم کنارے پر پہنچ گئے ہیں۔“ خادم حسین نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ ”میرے لیے کیا حکم ہے سرکار؟“

جب انسان کی گہری سوچ میں ڈوبا ہوتا ہے تو اس پر نئے نئے دروا ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے اضطراری لہجے میں کہا۔ ”تم مجھے واپس کوٹ فرمان لے چلو۔“

چند لمحات تک وہ سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا پھر فرمان برداری سے بولا۔ ”جیسی آپ کی مرضی تھانے دار صاحب۔۔۔۔۔“

بات ختم کرتے ہی اس نے کشتی کا رخ پھیرا اور واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔

جب سے خادم حسین نے مجھے یہ بتایا تھا کہ بھولا ادھر کوٹ فرمان ہی میں رک گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا، میرے ذہن میں خیالات کی اٹھک بیٹھک لگی ہوئی تھی۔ گزشتہ شام میں اجنبی مقتول، بھولا کی معیت میں کوٹ فرمان پہنچتا ہے پھر اسی رات کے ابتدائی حصے میں اجنبی شخص کو بڑی بے دردی سے قتل کر کے اس کی لاش کو اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پھینک دیا جاتا ہے اور مصدقہ اطلاع کے مطابق اسحاق عرف بھولا ابھی تک کوٹ فرمان کے اندر موجود ہے تو پھر۔۔۔۔۔ یہ بھولا یقیناً، اس اجنبی کی موت کے راز سے واقف ہوگا اور بھولا ہی مجھے بتا سکتا تھا کہ وہ اجنبی مقتول آخر تھا کون۔۔۔۔۔؟

اسی سوال کی روشنی میں، میں نے فوری طور پر واپس کوٹ فرمان جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ”کوٹ فرمان“ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ لگ بھگ سو گھروں پر مشتمل ایک مختصر سا دیہات۔ بھولا کو اس گاؤں میں تلاش کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ایک بار بھولا میرے ہتھے چڑھ جاتا تو پھر میں اس کی زبان کو ہر راز اگلنے پر مجبور کر سکتا تھا۔

انہی سوچوں میں تم سنسنی نہر کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔ میں نے کشتی میں سے باہر نکلنے کے بعد خادم حسین سے کہا۔

”جب تک میں واپس نہ آ جاؤں، تم اپنی کشتی کے ساتھ اسی کنارے پر موجود ہو گے۔“

الجھن میں ڈال دیا تھا۔ ایک تو آج صبح ہی سے نامعلوم شخص کی لاش نے گاؤں کی سیدھی ساوی زندگی میں خاصی افراتفری مچا رکھی تھی اور پھر اوپر سے میں جس انداز میں تفتیش کر رہا تھا، وہ ان کی الجھن میں اضافے کا باعث تھا۔ جو بیس افراد الگ ہوئے تھے، ان میں سے ایک اوجیز عمر شخص نے مجھ سے سوال کیا۔

”تمہارے وار صاحب! ادھر فرید آباد میں سب خیریت تو ہے نا.....“

”خیریت ہوتی تو پھر اس پوچھ گچھ کی ضرورت کیا تھی؟“

”نہ..... میرا مطلب ہے.....“ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اسٹیل تو ٹھیک ہے نا؟“

میں نے گھور کر اس اوجیز عمر شخص کو دیکھا اور پوچھا۔ ”چاہا تم کون ہو اور..... تمہیں اسٹیل کے بارے میں اتنی تشریح کیوں ہو رہی ہے؟“

”میں اسٹیل کا بڑا بھائی ہوں جی..... ابراہیم!“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”ایک بھائی کو دوسرے بھائی کی فکر نہیں ہوگی تو اور کسے ہوگی جناب.....!“

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”پھر تو تم اپنے بھتیجے بھولا کو بھی جانتے ہو گے؟“

”آپ بھی کمال کرتے ہیں سرکار۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ”اسٹیل میرا اکلوتا بھائی ہے اور بھولا اس کی اکلوتی اولاد ہے۔ میں بھلا اپنے اکلوتے چھوٹے بھائی کی اکلوتی اولاد کو کیسے نہیں جانتا ہوں گا۔“

ابراہیم کی شکل میں مجھے ایک کام کا بندہ مل گیا تھا۔ اس دوران میں اللہ رکھانے ایک درخت کے نیچے میرے لیے چار پائی بچھا دی تھی۔ میں ابراہیم کو لے کر اس چار پائی کی جانب بڑھ گیا۔ وہاں جمع ہو جانے والے لوگوں کو میں نے واپس اپنے گھروں کو جانے کے لیے کہہ دیا تھا۔

میں چار پائی پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ ابراہیم نے ایک بار پھر پوچھا۔ ”تمہارے وار صاحب! یہ تو بتادیں کہ اسٹیل آمنہ اور بھولا تو ٹھیک ٹھاک ہیں نا.....!“

آمنہ غالباً اسٹیل کی بیوی اور بھولا کی ماں کا نام تھا۔ بعد ازاں ابراہیم سے استفسار پر میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔

”ابراہیم!“ میں نے بھولا کے تاپا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”وہاں تو سب خیریت ہے لیکن ادھر کوٹ فرماں میں تم بھی دیکھ رہے ہو آج صبح سے کیسی افراتفری مچ رہی ہے۔ اجنبی شخص کی لاش نے گاؤں کے ہر

شخص کا سکون برباد کر کے رکھ دیا ہے۔“

”یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے بھی صبح اس بندے کی لاش کو دیکھا تھا۔ کسی نے بڑی بے دروی سے اس بد نصیب کو موت کے گھاٹ اتارا ہے لیکن.....“ وہ بولتے بولتے تھما، ایک گہری سانس لی پھر الجھن زدہ انداز میں اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اس اجنبی شخص کے قتل سے میرے چھوٹے بھائی کا کیا تعلق ہے؟ آپ اسٹیل کے بارے میں کیوں پوچھ گچھ کرتے پھر رہے ہیں؟“

”بہت گہرا تعلق ہے چاچا.....“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھے پتا چلا ہے، اس واردات میں تمہارے بھتیجے بھولا کا ہاتھ ہے۔“

”یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب.....؟“ اس کی حیرت ساتویں آسمان کو چھونے لگی۔

”میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں.....“ میرے لہجے میں سختی اتر آئی۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا.....!“

”تمہارے یقین کرنے یا نہ کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے بہ دستور سخت لہجے میں کہا۔ ”بھولا کل شام میں اس اجنبی شخص کے ساتھ فرید آباد سے کوٹ فرماں پہنچا تھا۔ خادم حسین سستی والا اس امر کا گواہ ہے۔ اس نے کل شام آخری پھیرنے میں ان دونوں کو فرید آباد سے کوٹ فرماں پہنچایا تھا۔ میرا مطلب ہے، اپنی سستی میں بٹھا کر بڑی نہر عبور کرائی تھی۔ خادم حسین اس وقت نہر کے کنارے کھڑا میری واپسی کا انتظار کر رہا ہے.....“

”بھولا اگر یہاں آیا تھا تو مجھے خبر کیوں نہیں ہے۔“ ابراہیم کی آنکھیں ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ”وہ مجھ سے ملے بغیر واپس کیسے چلا گیا.....“

”بھولا واپس نہیں گیا ابراہیم.....“

میرے اٹل لہجے نے ابراہیم کو الجھن میں ڈال دیا۔

”وہ واپس نہیں گیا تو..... پھر کہاں ہے؟“

”تم جانتے ہو، کوٹ فرماں سے فرید آباد جانے کا واحد ذریعہ یہ بڑی نہر ہی ہے۔“ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”اور اس نہر کے اس پار یا اس پار آنے جانے کے لیے لوگ خادم حسین کی سستی استعمال کرتے ہیں۔ کرتے ہیں یا نہیں.....؟“

”جی ہاں..... بالکل کرتے ہیں۔“ اس نے اثبات

میں گردن ہلائی۔

”اللہ تمہارا بھلا کرے۔“ میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”خادم حسین کا دعویٰ ہے کہ کل شام میں آخری پھیر لگاتے ہوئے اس نے بھولا اور اس اجنبی شخص کو کوٹ پہنچایا تھا اور آج کا پورا دن بھولا واپسی کے لیے اس کی کشتی میں نہیں بیٹھا۔ اس کا کیا مطلب ہوا.....“ ”لحماتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”اس بات کا صرف ایک ہی مطلب ہے کہ بھولا ابھی تک کوٹ فرمان کے اندر موجود ہے۔“

”لیکن وہ ہے کہاں.....؟“

”اس سوال کا جواب تو تم دو گے ابراہیم۔“

”میں.....!“ وہ جبر جبراتی ہوئی آواز میں بولا۔

”ہاں ابراہیم..... تم۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”بھولا تمہارا بھتیجا ہے اور بھتیجا بھی اکلوتا..... کوٹ فرمان میں تم اس کے واحد رشتے دار ہو۔ وہ جب بھی یہاں آتا ہوگا تو یقیناً تمہارے پاس ہی آتا ہوگا۔“ ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تمہانے دار صاحب۔“ وہ بے بسی سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ظاہر ہے وہ مجھ سے ملنے ہی یہاں آیا کرتا ہے لیکن آپ میری بات کا یقین کریں وہ کل کوٹ فرمان نہیں آیا۔“ ”تو تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میں غلط بیانی کر رہا ہوں۔“ ”نہیں جی..... میں نے ایسا کب کہا ہے۔“

”اگر میں جھوٹ نہیں بول رہا تو پھر تمہیں یقین کر لینا چاہیے کہ کل شام میں بھولا اس اجنبی مقتول کے ساتھ کوٹ فرمان آیا تھا اور..... اسی تک ادھر ہی نہیں چھپا بیٹھا ہے۔“ ”جناب! آپ کی باتیں بالکل میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔“ وہ تقریباً رو ہانسا ہو گیا۔ ”پہلی بات تو یہ کہ اگر وہ کوٹ فرمان آیا تھا تو مجھ سے کیوں نہیں ملا۔ دوسرے وہ اگر ابھی تک گاؤں میں موجود ہے تو پھر کہاں چھپا بیٹھا ہے.....“ وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اس بات پر میں یقین کرنے کو تیار نہیں کہ بھولا کسی قتل کی واردات میں ملوث ہو سکتا ہے۔“

”وینکو ابراہیم.....!“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میں نے بھولا کو قتل کی واردات کرتے دیکھا ہے یا یہ کہ میرے پاس اس خونیں واقعے کا کوئی چشم دید گواہ ہے۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ کل

شام بھولا اس بد نصیب مقتول کے ساتھ کوٹ فرمان کے اندر داخل ہوا تھا۔ خادم حسین کے مطابق وہ دونوں دوستوں کی طرح کھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مقتول بھولا کے لیے قطعاً اجنبی نہیں تھا۔ بالقرض بھولا نے اگر اس شخص کو موت کے گھاٹ نہیں بھی اتارا تو وہ اتنا ضرور جاننا ہوگا کہ پچھلی رات اس بد نصیب کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا اور اس کی لاش کو اللہ رکھا کے گھر کے سامنے پھینکنے کا کیا راز تھا۔“

”آپ کی بات کو میں کسی حد تک سمجھنے لگا ہوں۔“ وہ گھبرانداز میں بولا۔ ”لیکن ابھی یہ ہے کہ کوٹ فرمان آنے کے بعد بھولا مجھ سے کیوں نہیں ملا اور آپ کے مطابق اگر وہ کہیں چھپا بیٹھا ہے تو کہاں.....؟“

”ابراہیم!“ میں نے چپتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ”تمہانے وار تم ہو یا میں؟“

وہ بوکھلا گیا اور جلدی سے بولا۔ ”جی..... تمہانے وار تو آپ ہی ہیں۔“

”بس تو پھر تمہانے داری بھی مجھے ہی کرنے دو۔“ میں نے یہ دستور آواز میں کہا۔ ”یہ سوال پوچھنا میرا حق ہے کہ تمہارا بھتیجا اس وقت کوٹ فرمان میں کہاں چھپا بیٹھا ہے۔ تم صرف جواب دو.....“

”جناب! اگر مجھے بھولا کے بارے میں کچھ پتا ہوتا تو آپ کو ضرور بتا دیتا۔“ وہ عاجزی سے بولا۔ ”آپ میری بات کا یقین کریں سرکار۔“

”یہ قتل کا معاملہ ہے ابراہیم.....“ میں نے اسے مٹولنے والے انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اور شاید تمہیں معلوم نہیں کہ پولیس کی تفتیش کی گاڑی شک کے بیٹروں سے چلتی ہے۔“

”شک.....!“ وہ تھوک نگتے ہوئے بولا۔ ”تت..... تو کیا آپ مجھ پر کسی قسم کا شک کر رہے ہیں تمہانے دار صاحب!“

”تفتیشی معاملات میں ایک ویانت وار پولیس والے کو بعض اوقات اپنے باپ پر بھی شک کرنا پڑ جاتا ہے ابراہیم۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس سلسلے میں ہم اپنی ذات کو بھی معاف نہیں کرتے.....“ میں نے ذرا دیر کو رک کر ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے مزید کہا۔

”مجھے جس بھولا کی تلاش ہے وہ رشتے میں تمہارا اکلوتا سگا بھتیجا لگتا ہے۔ اس گاؤں میں اس کا اور کوئی ایسا رشتے

اس لیے مجھے کسی سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔“
تھوڑی ہی دیر کے بعد میں ابراہیم کی معیت میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ اس گھر میں ابراہیم اپنی بیوی اور چار بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ ایک بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی اور دوسری کی بھی اگلے سال شادی ہونے والی تھی۔ وہ منگنی شدہ تھی۔ جبکہ دونوں بیٹے کامران اور عمران کھیتی باڑی میں ابراہیم کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ کامران اور عمران دونوں جوان تھے۔ میں نے پندرہ بیس منٹ کے اندر بڑی باریک بینی سے ابراہیم کے گھر کا کوتا کوتا چھان مارا لیکن کہیں پر بھی مجھے بھولا نظر نہ آیا اور نہ ہی اس گھر میں اس کی آمد کے کوئی آثار دکھائی دیے۔“ میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا جناب کہ بھولا نہ تو ہمارے گھر میں آیا ہے اور نہ ہی ہم نے اسے نہیں چھپا کر رکھا ہوا ہے۔“ ابراہیم نے کہا۔

اس وقت میں گھر کی تلاشی سے فارغ ہونے کے بعد ابراہیم کی بیٹھک میں بیٹھا ہوا تھا۔ ابراہیم کے علاوہ اس کی بیوی شگفتہ اور دونوں بیٹے بھی وہاں موجود تھے جن میں کامران، عمران سے دو تین سال بڑا تھا۔ وہ دونوں جوانی کی دہلیز پر کھڑے تھے۔

ابراہیم! میں نے اس کی بات کے جواب میں کہا۔“ پولیس کی تفتیش کا اپنا ایک طریقہ کار ہوتا ہے اور ہم اس پر عمل ضرور کرتے ہیں۔ اب یہ تو پتا چل گیا کہ بھولا پچھلی رات اس گھر میں نہیں آیا اور نہ ہی آپ لوگوں نے اسے کہیں چھپا رکھا ہے لیکن اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔“
”کون سا مسئلہ تھا تار صاحب؟“ شگفتہ نے مجھ سے پوچھا۔

جس وقت میں خانہ تلاشی کے کام میں مصروف تھا سی دوران میں وقفے وقفے سے اس گھر کے مکینوں سے بات چیت کا سلسلہ بھی جاری رہا تھا اور میں نے انہیں تازہ ترین حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ انہیں یہ پتا چل چکا تھا کہ میں نہر عبور کرنے کے بعد دوبارہ کوٹ فرمان کیوں آیا ہوں اور میری اس وقت ترجیحات کیا ہیں۔

”مسئلہ بھولا کی تلاش کا ہے۔“ میں نے شگفتہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔“ بھولا کل شام یہاں آیا ہے اور ابھی تک واپس نہیں گیا تو پھر وہ کہاں ہے؟“
”یہ بھی تو ہو سکتا ہے جناب..... کہ بھولا ادھر آیا ہی نہ ہو۔“ شگفتہ نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

”کشتی والے خادم حسین نے بڑے وثوق سے اس امر کی تصدیق کی ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے

دار یا دوست موجود نہیں جس کے پاس وہ تمہیں نظر انداز کر کے ظہر جاتا۔ اس امر میں بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ کل شام کو بھولا اپنی مقتول کے ہمراہ کوٹ فرمان آیا تھا۔ میں بھولا کی تلاش کے سلسلے میں تم پر شک نہیں کروں تو پھر کس پر کروں!.....“

”جناب! میں اپنی باتوں سے تو آپ کو یقین دلانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اب ایک ہی طریقہ باقی رہ جاتا ہے کہ آپ اپنے شک کو دور کرنے کے لیے میرے گھر کی تلاشی لے لیں۔“

”تلاشی تو میں تمہارے گھر کی لوں گا ہی ابراہیم۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خاصے مضبوط لہجے میں کہا۔“ لیکن یہ سوچ لینا کہ بعد میں اگر مجھے پتا چلا کہ تم نے کسی مرحلے پر دروغ گوئی سے کام لیا ہے تو میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ ساری زندگی یاد رکھو گے۔“

”منظور ہے، تھانے دار صاحب۔“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔“ آپ صرف میرے گھر کی تلاشی ہی نہ لیں بلکہ میری بیوی اور بچوں سے بھی بھولا کے بارے میں پوچھیں۔ اگر کسی بھی مقام پر میری کوئی بات غلط نکلے تو جو چور کی سزا وہی میری سزا.....“

میرا سا لہا سال سے برائے پیشا فرد سے داسطر رہا ہے۔۔۔۔۔
چہرے کو سیانے دل کی کتاب کہتے ہیں۔ کچھ لوگ چہرے کو دماغ کا انڈیکس بھی کہتے ہیں۔ چہرے پر سب سے اہم چیز آنکھیں ہوتی ہیں۔ جب کوئی بھی انسان کچھ بول رہا ہوتا ہے تو آنکھیں اس کی سوچ کی ترجمانی کر رہی ہوتی ہیں۔ انسان کو شش کر کے چہرے کے تاثرات سے تو دل کی کیفیت کو چھپانے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن آنکھیں چغلی کھانے سے باز نہیں آتیں۔

ابراہیم کے چہرے کے تاثرات اور آنکھوں کی مخصوص زبان سے میں یہ اندازہ تو لگا چکا تھا کہ وہ بھولا کی کوٹ فرمان میں آمد کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا لیکن عملی تفتیش اور کارروائی بھی ضروری تھی لہذا میں نے ظہر سے ہوئے لہجے میں اس سے کہا۔

”چور کی سزا تو بہت معمولی ہوتی ہے ابراہیم..... اگر مجھے پتا چلا کہ تم نے غلط بیانی کر کے قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی ہے تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں تمہیں کتنی سخت سزا دلا سکتا ہوں۔“

”تھانے دار صاحب!“ وہ بولا۔“ میرا خدا جانتا ہے کہ میں سچا ہوں

”کشتی والے کو مغالطہ بھی تو ہو سکتا ہے تھانے دار صاحب۔“ گلگتہ اپنے موقف پر ڈٹی رہی۔ ”خادم حسین نے نکل شام اجنبی شخص کے ساتھ جس نوجوان کو کوٹ فرمان پہنچایا تھا، وہ بھولا کے علاوہ کوئی اور بھی تو ہو سکتا ہے..... بھولا سے ملتا جلتا کوئی بندہ..... ایسا ناممکن تو نہیں۔“

”ناممکن تو اس دنیا میں کچھ بھی نہیں گلگتہ۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”لیکن اس کیس میں پہلے ہی ”ملتی جلتی شکل“ والا ایک اتفاق موجود ہے۔ جس اجنبی بندے کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد اس کی لاش کو اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے پھینکا گیا ہے، مجھے بتایا گیا ہے کہ اس کی شکل کافی حد تک اللہ رکھا کے بیٹے موئی سے ملتی جلتی ہے۔“

”میں نے موئی کو تو ہزار بار دیکھا ہے لیکن اس اجنبی بندے کی لاش کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا.....“

”ہم نے دیکھا ہے۔“ کامران اور عمران بہ یک زبان ہو کر بولے۔ ”یہ بات صحیح ہے کہ یہ بندہ بڑی حد تک موئی جیسا تھا مثلاً قد کاٹھ، چہرے کے نقش اور ڈاڑھی کا انداز وغیرہ.....“

”میرا خیال ہے۔“ ابراہیم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر آپ فریڈ آباد میں اسٹیشن کے گھر جا کر تفتیش کریں تو وہ دھکا دودھا اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔“

”آپ نے کوٹ فرمان میں تو بھولا کو اچھی طرح تلاش کر لیا ہے۔“ گلگتہ اپنے شوہر کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”وہ آپ کو کہیں نہیں ملا۔ اگر وہ ادھر فریڈ آباد میں موجود ہے تو پھر اس کا بھی مطلب ہوگا کہ وہ کوٹ فرمان آیا ہی نہیں اور اگر خادم حسین کسی چالاکی سے کام نہیں لے رہا تو پھر یہی کہا جاسکتا ہے کہ اسے بھولا کے حوالے سے کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔“

”اس بات میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ میں فریڈ آباد پہنچ کر سب سے پہلے بھولا اور اسٹیشن ہی کو چیک کر دوں گا۔“ میں نے ٹھوس لہجہ میں کہا۔ ”اور جہاں تک بھولا کی تلاش میں میری ناکامی کا سوال ہے تو یہ بات درست نہیں۔ میں نے صرف ابھی تک تمہارے گھر کی تلاشی لی ہے۔ باقی لوگوں سے صرف پوچھ بچھ کی ہے۔“

انسان اپنی طرف سے پوری کوشش پوری تدابیر اختیار کرتا ہے اور جب کامیابی اس کے قریب جا پہنچتی ہے تو وہ دو چیزیں اس کے اور کامیابی کے بیچ حائل ہو جاتی ہیں۔ ایک موت اور دوسری تقدیر۔ اس حقیقت کو جانے کہ آپ کو اشرف المخلوقات پیدا کیا گیا ہے۔

مرسلہ۔ مرحا گل، درابن کلاں

مصیبت

ایک سردار جی صبح سویرے کوٹ ماہن کر آفس جا رہے تھے۔ اچانک انہیں سڑک کے عین درمیان کیلے کا چھلکا پڑا نظر آیا۔ سردار جی وہیں ایک دم رک گئے اور خود سے کہنے لگے۔

”اویار! اے کی مصیبت اے..... مجھے آج پھر پھسلنا پڑے گا۔“

مرسلہ۔ مرحا گل، درابن کلاں

اس لیے اس کے کہیں اور چھپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ گلگتہ کی بات میں اچھا خاصا وزن تھا۔ اس سے پہلے میں اللہ رکھا کے گھر کے سامنے ابراہیم سے بھی تفصیلی گفتگو کر چکا تھا لہذا اب میں نے اس کے بیٹوں کی جانب رخ کر لیا۔

”تم دونوں بھی لگ بھگ بھولا ہی کے ہم عمر ہو۔“ میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”جب بھولا کوٹ فرمان آتا ہوگا تو اس کا زیادہ تر وقت تم لوگوں کے ساتھ ہی گزرتا ہوگا؟“

”جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ کامران نے اثبات میں گردن ہلائی۔

عمران بولا۔ ”بھولا جب یہاں آتا ہے تو وہ ہمارے ساتھ کھیتوں میں کام بھی کرتا ہے اور ہم لوگ خوب کھیلتے بھی ہیں۔“

”تم لوگ عموماً کون سا کھیل کھیلتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی کھیل مخصوص نہیں ہے جناب۔“ کامران نے جواب دیا۔ ”فٹ بال، کبڈی اور نہر میں نہانا..... سب شامل ہے۔“

”اچھا..... تو تم لوگ نہر میں نہایا بھی کرتے ہو؟“

”جی ہاں..... بالکل۔“ عمران نے جواب دیا۔

”بھولا بہت اچھا تیراک ہے۔ اسی نے ہمیں نہر میں تیرنا سکھایا ہے۔ ویسے ہم زیادہ تر فٹ بال ہی کھیلتے ہیں۔“

بھولنے کی شادی اپنی بھانجی سے کیوں نہیں کر سکتی حالانکہ میں نے شیم اور سیم کے رشتے کربتے وقت ابراہیم پر ایسی کوئی شرط عائد نہیں کی تھی۔ اب یہ بات الگ کہ ابراہیم کا صرف ایک ہی بھائی ہے اور اس کا بھی صرف ایک ہی بیٹا بھولا.....“
 ”اسٹعلیل اپنی بیوی سے بہت ڈرتا ہے جناب۔“
 ابراہیم وکھی لہجے میں بولا۔ ”ویسے میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ رشتے نصیبوں کا کھیل ہیں۔ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں، زمینوں پر نہیں.....“

”ابراہیم! یہ تو تم نے سولہ آنے درست بات کی ہے۔“ میں نے سر اٹھنے والے انداز میں کہا پھر روئے سخن اس کے بیٹوں کی طرف پھیر لیا۔

”جب بھولا ادھر کوٹ فرمان میں آتا تھا تو اس کا یہاں کے لوگوں سے بھی میل جول ہوتا ہوگا؟“
 ”جی ہاں..... ہم سب مل جل کر ہی کہتے ہیں۔“
 کامران نے جواب دیا۔

”یہاں کسی لڑکے کے ساتھ اس کی گہری دوستی بھی ہوگئی ہوگی؟“
 ”نہیں جناب! دوستی تو صرف ہم ہی سے تھی۔“
 عمران نے بتایا۔

”میرا مطلب ہے.....“ یہی سوال میں نے ایک دوسرے زاویے سے کیا۔ ”وہ زیادہ تر کن لڑکوں کے ساتھ گھلنا ملنا پسند کرتا ہے؟“

”زیادہ تر.....“ کامران نے سوچنے والے انداز میں کہا۔ ”میرے خیال میں اس کی جھیل اور منگھور کے ساتھ زیادہ ہوتی تھی۔“

”جی بالکل۔“ عمران نے اپنے بڑے بھائی کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ ”جھیل اور منگھور کے ساتھ وہ گپ شپ کر لیتا ہے کیونکہ ان دونوں کے مزاج بھولا سے بہت ملتے ہیں۔“

”مزاج ملتے ہیں.....“ میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”کیا آپ میں سے کوئی جھیل اور منگھور کو بلا کر یہاں لاسکتا ہے؟“

”جی ضرور۔“ عمران اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”میں ابھی انہیں بلا کر لاتا ہوں۔“

میں نے اثبات میں گروں ہلانے پر اکتفا کیا۔ عمران اگلے ہی لمحے وہاں سے رخصت ہو گیا۔ میں کامران، ابراہیم اور شگفتہ کے ساتھ ہلکی پھلکی گنگھو کرنے لگا۔ اس دوران میں اللہ رکھا کا بیٹا موسیٰ بھی زیر بحث آیا۔ ان تینوں

میں نے شگفتہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
 ”تمہاری بڑی بیٹی کی شادی کہاں ہوگی ہے؟“
 ”شیم کی شادی میری بڑی بہن کے بیٹے سے ہوئی ہے۔“
 ”اس نے جواب دیا۔“ اب تو اس بات کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ اس کے تو ماشاء اللہ چار بچے بھی ہیں۔“

”ماشاء اللہ.....!“ میں نے خلوص دل سے کہا پھر پوچھا۔ ”اور چھوٹی بیٹی کی منگھنی کہاں کی ہے؟“
 ”شیم کا رشتہ میرے بھائی کے بیٹے سے ملے ہوا ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اگلے سال انشاء اللہ اس کی بھی شادی کروں گے۔“

شگفتہ کی بات مجھے ہنسم نہ ہو سکی۔ اس کی دو بیٹیاں تھیں اور دونوں کے رشتے ان کے تھیال یعنی شگفتہ کے خاندان میں ملے کیے گئے تھے جبکہ ابراہیم کا صرف ایک ہی بھائی تھا..... اسٹعلیل اور اسٹعلیل کا بھی ایک ہی بیٹا تھا..... اسحاق عرف بھولا..... اس قسم کی صورت حال میں تو ابراہیم کی محبت کو جوش مارنا چاہیے تھا۔ وہ کم از کم ایک بیٹی کی شادی تو اپنے اکلوتے بھائی کے اکلوتے بیٹے سے کر سکتا تھا۔ اگر ایسا نہیں ہوا تھا تو اس کا راز کیا تھا۔ یہ راز جاننے کے لیے میں نے اسی سے پوچھ لیا۔

”ابراہیم! تمہاری دو بیٹیاں ہیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اور صرف ایک بہتجا۔ تمہیں اپنی بیٹیوں کے رشتے ملے کرتے ہوئے بھولا کا خیال کیوں نہیں آیا؟“
 ”مجھے تو بھولا کا بڑا خیال تھا۔“ وہ ایک افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”لیکن آمنہ کی وجہ سے ساری گڑبڑ ہوگئی۔“

”آمنہ.....“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
 ”یہ آمنہ کون ہے؟“

”آمنہ اسٹعلیل کی گھر والی ہے جی۔“ شگفتہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”ابراہیم کی تو یہی خواہش تھی کہ شیم کی شادی بھولا سے ہو کیونکہ شیم اور بھولا کی عزتیں ایک ہی جیسی ہیں لیکن اسٹعلیل اپنی بیوی سے بہت ڈرتا ہے۔ آمنہ نے اس رشتے کی مخالفت کر دی تھی۔“

”مخالفت کی کوئی وجہ؟“
 ”جی ہاں۔“ ابراہیم نے اثبات میں گروں ہلائی۔

”وہ بھولا کو اپنے خاندان میں بیاہنا چاہتی ہے۔“
 اس نے بڑے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ جب شگفتہ اپنی بیٹی کا رشتہ اپنے بھانجے کو دے سکتی ہے تو میں

تھا؟“ میں نے سوالیہ نظر سے کامران کی طرف دیکھا۔
 ”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا
 شخص بھی خادم حسین کی کشتی میں بیٹھ کر فریڈ آباد سے یہاں
 تک آ گیا ہو.....“

کامران نے اپنی دانست میں بہت عقل مندی کی
 بات کی تھی لیکن میں چونکہ بہت سی حیثیتوں سے آگاہی
 حاصل کر چکا تھا اس لیے اس کی عقل مندانہ بات مجھے ہنسم نہ
 ہوئی اور میں نے کہا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا برخوردار..... اور اس کی چند
 وجوہات ہیں۔“

وہ کچھ نہیں بولا اور سوالیہ نظر سے مجھے نکلنے لگا۔
 ابراہیم اور عقیقت کی نگاہیں مجھ ہی پر جمی ہوئی تھیں۔ میں
 نے کھٹکھٹا کر گلا صاف کیا اور کہا۔

”نمبر ایک..... میری اب تک کی تحقیق اور تفتیش کے
 مطابق، اجنبی مقتول کو اس گاڑی میں کوئی جانتا یا پہچانتا نہیں لہذا
 اس کے ادھر رخ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا.....“

”جناب! ممکن ہے، اسے اپنے تعاقب کا احساس
 ہو گیا ہو۔“ وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ”اور اس نے
 اپنی جان بچانے کے لیے کشتی میں بیٹھ کر نہر کے اس پار
 آنے کا فیصلہ کر لیا ہو لیکن بد قسمتی سے قاتل بھی اس کے پیچھے
 یہاں پہنچ گیا ہو۔“

اس کی قطع کلامی کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے
 نرمی سے کہا۔ ”پہلے میری بات مکمل ہو جانے دو پھر تم بولنا۔
 ہو سکتا ہے پھر تمہیں کچھ بولنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہو۔“
 وہ ندامت آمیز انداز میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

”جب کوٹ فرمان میں مقتول کا کوئی جاننے والا
 موجود نہیں تو پھر کشتی کے ذریعے نہر پار کر کے یہاں تک
 آنے کی کوئی منطوق نظر نہیں آتی۔“ میں نے اپنے بیان کو
 آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”وہ اگر اس گاڑی میں آیا تھا تو
 اس کے پیش نظر کوئی خاص مقصد تھا۔ وہ بشیر کسی کام کے
 یہاں نہیں آ سکتا تھا.....“ لچاتی توقف کر کے میں نے ایک
 گہری سانس لی پھر سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”اس بات میں شک کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی
 کہ کل شام خادم حسین نے اپنی کشتی کے آخری پھیرے میں
 صرف دو افراد کو نہر عبور کر کے کوٹ فرمان پہنچایا تھا یعنی
 اجنبی مقتول اور تمہارا چچا زاد اسحاق عرف بھولا۔ ان دونوں
 کے علاوہ کوئی تیسرا شخص برسرِ سر نہیں ہوا تھا لہذا قاتل
 کے تعاقب والی بات کو درست تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔“

کی رائے میں موٹی ایک صلح جو اور امن پسند شخص تھا۔ موٹی
 کے بارے میں یہی رائے باقی گاڑوں والوں کی بھی تھی لیکن
 ان سب میں سے کوئی یہ نہیں بتا سکا تھا کہ موٹی اچانک کہاں
 غائب ہو گیا تھا اور اجنبی شخص کی لاش کو اللہ رکھا کے گھر کے
 سامنے کیوں پھینکا گیا تھا۔

”میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آرہی ہے تمہانے وار
 صاحب! ابراہیم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

میں نے فوراً پوچھ لیا۔ ”کون سی بات ابراہیم؟“
 ”یہ ٹھیک ہے کہ موٹی بہت ہی شریف اور بیبا بندہ

تھا۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔
 ”اس گاڑی میں اس کی کسی سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے،
 یہاں سے جانے کے بعد اس نے کسی کو اپنا دشمن بنا لیا ہو اور اس
 دشمن نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا ہو۔“

”ابراہیم.....!“ میں نے گھور کر اس اذیتزور، سادہ
 دل دیہاتی کی طرف دیکھا۔ ”موٹی کو کسی نے موت کے
 گھاٹ نہیں اتارا۔ ہم اس وقت ایک اجنبی شخص کے قتل کی
 بات کر رہے ہیں۔“

”وہ تھی..... میرا بھی وہی مطلب تھا، بس الفاظ آگے
 پیچھے ہو گئے۔“ وہ جلدی سے محذرت خواہانہ انداز میں
 بولا۔ ”میں یہ کہنا چاہ رہا تھا جناب کہ اس اجنبی بندے کی
 شکل صورت بڑی حد تک اللہ رکھا کے بیٹے موٹی جیسی ہے۔
 ہو سکتا ہے، کسی دشمن نے موٹی سمجھ کر اس کا تعاقب کیا ہو اور
 پھر موقع ملنے ہی اسے موت کے گھاٹ اتار کر اس کی لاش کو
 اللہ رکھا کے گھر کے سامنے پھینک دیا ہوتا کہ باپ کو بیٹے کی
 لاش کا جھنڈ دے سکے۔“

”ایک اور بات بھی تو ہو سکتی ہے جناب.....!“
 کامران نے کہا۔

”کون سی بات؟“ میں نے پوچھا۔

”جس کسی نے بھی اس اجنبی شخص کو قتل کیا ہے وہ اسی کا
 دشمن ہو۔“ کامران وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”قاتل
 کہیں پیچھے سے اس کا تعاقب کرتے ہوئے کوٹ فرمان پہنچا
 ہو اور پھر موقع ملنے ہی اسے ٹھکانے لگا دیا ہو.....“

”اور پھر اس کے بعد.....؟“ میں نے کامران کی
 طرف دیکھا۔

وہ بوکھلا گیا۔ ”جی، میں سمجھا نہیں؟“

”میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ اس کے بعد قاتل کہاں گیا؟“
 ”وہ جیڑھ سے آیا تھا، واپس ادھر ہی چلا گیا ہوگا۔“
 ”لیکن مقتول کے ساتھ تو تمہارا چچا زاد بھولا یہاں آیا

”تو کیا آپ بھولا پر کسی قسم کا شک کر رہے ہیں؟“

پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”پھر بھولا کو بتانا پڑے گا کہ وہ ایک اجنبی کے ساتھ کیسے گھل ملی گیا تھا۔ وہ ایک دوست کی حیثیت سے مقتول کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر کیوں اور کس مقصد سے کوٹ فرمان آیا تھا اور یہاں سے اچانک کہاں غائب ہو گیا۔“

”تمہارے دار صاحب! سچ پوچھیں تو مجھے یقین ہی نہیں آ رہا کہ بھولا پچھلی رات یہاں آیا تھا۔“ کامران نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”میں نے پوچھا۔“ تمہیں کس بنا پر یقین نہیں آ رہا؟“

”وہ جی، ظاہر کی بات ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ایسا کیسے ممکن ہے کہ بھولا کوٹ فرمان میں آئے اور ہم سے ملے بغیر ہی واپس چلا جائے۔۔۔۔“

”میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔“ وہ واپس نہیں گیا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ابھی تک نہر عبور کر کے فرید آباد نہیں گیا۔“

گھنٹہ نے کہا۔ ”تمہارے دار صاحب! آپ فرید آباد پہنچ کر یقین کریں گے تو انشاء اللہ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔“

”اللہ تمہاری زبان مبارک کرے گھنٹہ۔“ میں نے غلو میں دل سے کہا۔ ”میں تو خود بھی اس مسئلے کو جلد از جلد حل کرنا چاہتا ہوں لیکن پتا تو چلے کہ تم نے یہ بات اتنے وثوق سے کیوں کہی ہے۔“

”وہ جی، مجھے یقین ہے، بھولا آپ کو یا تو اسماعیل کے ہوٹل پر ملے گا یا پھر گھر پر مل جائے گا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اس سے مل کر آپ کی تسلی ہو جائے گی کہ وہ نہ تو پچھلی رات کوٹ فرمان آیا تھا اور نہ ہی وہ قتل کی کسی واردات میں ملوث ہے۔“

یہ ایک چابکی بلکہ تانی کا اپنے سچے پر یقین اور اعتماد تھا کہ وہ بھولے کو بے تصور اور بے گناہ سمجھ رہی تھی۔ میں جب تک بھولا سے ایک تفصیلی تفتیشی ملاقات نہ کر لیتا، اس وقت تک گھنٹہ کے اعتماد اور یقین کو چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری جانب خادم حسین کا وثوقی بیان تھا۔ اس نے بھولا کی معیت میں اجنبی مقتول کو اپنی کشتی کے ذریعے نہر کے پار کوٹ فرمان میں پہنچایا تھا اور اس کے بیان کے مطابق آج دن بھر اس نے جتنے بھی پھیرے لگائے تھے، ان میں بھولا اسے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ بھولا ابھی تک گاؤں کے اندر یا گاؤں کے باہر کہیں موجود تھا کیونکہ میری معلومات کے مطابق اس بڑی نہر پر میلوں دور تک کوئی پل نہیں بنا ہوا تھا لہذا کوٹ فرمان سے فرید آباد

گھنٹہ نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔

”شک کرنا تو پولیس والوں کی گھنٹی میں شامل ہوتا ہے بی بی۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”ہاں، یہ بات ٹھیک ہے کہ مجھے بھولا پر شک ہے لیکن اس شک کی نوعیت کا یقین میں اس وقت کر سکوں گا جب بھولا میرے ہاتھ چڑھے گا۔۔۔۔۔“ میں نے ایک بار پھر توقف کر کے باری باری ان سب کے چہروں کا جائزہ لیا اور سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

”یا تو بھولا ہی نے اس اجنبی شخص کو موت کے گھاٹ اتارا ہے اور یا پھر وہ اس کے قاتل کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔“

”بھولا ایسا نہیں کر سکتا۔۔۔۔۔“ گھنٹہ اضطرابی انداز میں بولی۔

ابراہیم نے کہا۔ ”اس کی ذات کے حوالے سے اس قسم کی مجرمانہ شکایت کسی سننے کو تو نہیں ملی۔“

”اماں اور ابا بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں تمہارے دار صاحب۔“ کامران جذبات سے لبریز لہجے میں بولا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ بھولا گھیل میں بے ایمانی کرنے کا ماہر ہے لیکن کبھی اس نے کوئی سنگین جرم نہیں کیا۔ اس کی سرگرمیاں مار پٹائی تک ہی محدود ہیں۔“

”جھوٹ بولنا یا بے ایمانی کرنا میرے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا جرم ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”باقی تمام برائیاں اسی کے پیٹ سے جنم لیتی ہیں۔ جو شخص جھوٹ بول سکتا ہے اور بڑی صفائی کے ساتھ بے ایمانی کر سکتا ہے وہ اس سے کہیں آگے بڑھ کر کوئی بھی سنگین جرم کر سکتا ہے۔ میرے کہنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ بھولا نے ہی اس اجنبی شخص کو قتل کیا ہے لیکن میرا تجربہ کہتا ہے کہ بھولا اس قتل کے بارے میں زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت ضرور جانتا ہے۔ میں بھولا سے اس لیے بھی پہلی فرصت میں ملنا چاہتا ہوں کہ یہ بات وہی بتا سکتا ہے کہ اجنبی مقتول کے ساتھ اس کی ملاقات کب، کیوں اور کیسے ہوئی تھی۔ اگر وہ پہلے سے مقتول کو جانتا ہے تو پھر مجھے اس کیس کو حل کرنے میں کافی آسانیاں حاصل ہو جائیں گی۔ جب مقتول کا پس منظر میرے سامنے کھلے گا تو قتل کا محرک اور قاتل تک رسائی کے راستے کی تمام رکاوٹیں خود بہ خود دور ہو جائیں گی اور اگر بھولا اجنبی شخص کو پہلے سے نہیں جانتا تو۔۔۔۔۔“ میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے باری باری ان لوگوں کے چہروں کا جائزہ لیا

جانے کے لیے کشتی ہی کے ذریعے سفر کرنا پڑتا تھا۔ ایک اور سوہوم سا امکان بھی تھا کہ بھولا نہر کے کنارے کے ساتھ ساتھ میلوں دور تک چلا گیا ہو اور پھر کسی پل کے ذریعے نہر عبور کر کے، دوبارہ میلوں کا قافلہ طے کرنے کے بعد واپس فرید آباد پہنچ گیا ہو۔ اس امکان کو زیر غور لانے کے لیے بھی بھولا کا تفصیلی انٹرویو بہت ضروری تھا۔

میرے محتاط اندازے کے مطابق اجنبی مقتول کی موت گزشتہ شب رات کے ابتدائی حصے میں واقع ہوئی تھی۔ اس کی کھوپڑی کی حالت، چہرے اور گردن کے زخموں اور وہاں سے خارج ہونے والے خون کی کیفیت بتاتی تھی کہ اس بد نصیب کو رات سات اور نو کے درمیان کسی وقت موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس کی گردن اور لباس کے مختلف حصوں پر جتنے والے خون سے یہی اندازہ ہوتا تھا اور یہ بات بھی سمجھ میں آسکتی تھی کہ اسے قتل کے فوراً بعد اللہ رکھا کے دروازے کے سامنے نہیں پھینکا گیا تھا۔ جس جگہ پر میں نے اس اجنبی شخص کی لاش کا معائنہ کیا تھا وہاں پر قتل و غارت گری کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا آثار بھی دریافت نہیں ہو سکا تھا۔

یہ دونوں بندے عمر کے لحاظ سے انیس بیس کے فرق سے کامران کے برابر ہی تھے۔ کامران نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ بلا دالے کر جانے والے نے انہیں راستے میں اس ملاقات کے پس منظر سے تفصیلاً آگاہ کر دیا تھا۔

جب کسی بھی شخص کی زندگی سے کھیننے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ اپنی جان بچانے کے لیے حتی المقدور کوشش ضرور کرتا ہے۔ یہ کوشش مزاحمت کی شکل میں بھی ہو سکتی تھی اور راہ فرار کی صورت میں بھی۔ میں نے جائے وقوعہ کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا تھا۔ وہاں راہ فرار اختیار کرنے کے آثار بھی ٹاپید تھے۔ زمین پر قدموں کے ایسے نشانات کہیں بھی دکھائی نہیں دیے تھے جن کی مدد سے کہا جاسکتا ہو کہ وہاں دو یا دو سے زیادہ افراد کے پیچھے کھینچا جانی اور پکڑا جکر یا قتل کیا گیا ہو۔

وہ دونوں سلام کر کے بیٹھ گئے۔ میں نے باری باری ان کے چہروں کا تنقیدی جائزہ لیا۔ وہاں کسی قسم کا خوف و ہراس یا پریشانی نہیں پائی جاتی تھی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی قسم کے جرم یا مجرمانہ کارروائی میں ملوث نہیں تھے۔

”میں نے تم دونوں کو ایک خاص مقصد کے لیے بلایا ہے۔“ میں نے کہا۔ وہ گہری سنجیدگی سے میری جانب متوجہ ہو گئے۔

”مجھے پتا چلا ہے کہ کامران اور عمران کا چچا زاد بھائی اسحاق عرف بھولا تم دونوں کے ساتھ کافی گھلا ملا ہوا ہے۔“ میں نے بدستوران کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

”ہاں جی..... یہ بات تو بالکل سچ ہے۔“ منظور نے کہا۔ ”بھولا کھیل کے معاملے میں گڑبڑ کر جاتا ہے لیکن دل کا بہت اچھا ہے۔“

”اس کے ساتھ ہمارا وقت ہنسی مذاق کرتے گزر جاتا ہے۔“ جمیل، منظور کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”وہ جی عمران نے راستے میں ہمیں بتایا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ کل شام بھولا ادھر آیا تھا اور ابھی تک ادھر کوٹ فرمان ہی میں کہیں چھپا بیٹھا ہے۔“ وہ اپنے ”لیکن“ کی

”کافی دنوں سے اس نے ادھر کا چکر نہیں لگایا۔ مجھے اس کی یاد بہت ستاتی ہے لیکن.....“

”لیکن کیا جمیل؟“

”وہ جی عمران نے راستے میں ہمیں بتایا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ کل شام بھولا ادھر آیا تھا اور ابھی تک ادھر کوٹ فرمان ہی میں کہیں چھپا بیٹھا ہے۔“ وہ اپنے ”لیکن“ کی

وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

تھا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”پھر..... پھر کیا ہوا؟“ میں نے سوال کیا۔

نہر اور کوٹ فرمان نامی اس گاؤں کے بیچ کھیتوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جمیل نے معتدل انداز میں بتانا شروع کیا۔ ”میں کھیتوں کے درمیان سے گزر رہا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ تھوڑے فاصلے پر بھولا جا رہا ہے.....“ وہ اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے اسے آواز دی تو اس نے میری آواز پر کان نہیں دھرے اور آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں نے یہ آواز بلند سے پکارا لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا جب مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا.....“ وہ چند لمحات کے لیے خمہا، ایک آسودہ سانس خارج کی اور بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”شاید وہ کوئی اور تھا۔ اگر وہ بھولا ہوتا تو میری آواز پر پلٹ کر ضرور دیکھتا۔ رات کی تاریکی میں کسی اور کو میں نے بھولا سمجھ لیا تھا۔ بہر حال، وہ شخص کھیتوں میں غائب ہو گیا اور میں واپس گھر آ گیا۔“

جمیل کے اس سنسنی خیز بیان نے میرا کام آسان بنا دیا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ جمیل کو مخالف نہیں ہوا ہوگا۔ وہ بھولا ہی تھا لیکن چونکہ وہ کسی خفیہ مشن پر تھا اس لیے اس نے جمیل کی آواز پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ کوٹ فرمان میں اپنی موجودگی کو ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

”کیا تم مجھے وہ جگہ دکھا سکتے ہو جہاں پچھلی رات تم نے کسی ایسے شخص کو کھیتوں میں غائب ہونے دیکھا تھا جسے تم بھولا سمجھ بیٹھے تھے؟“ میں نے جمیل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جی ضرور۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”آپ آئیں میرے ساتھ۔“

اگلے چند لمحات میں، میں جمیل کی معیت میں مذکورہ مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں گزشتہ شام اس نے بھولا کی جھلک دیکھی تھی۔ کوٹ فرمان نامی یہ گاؤں نہر کے کنارے سے کم و بیش نصف میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ گاؤں اور نہر کے بیچ میں سرسبز لہلہاتے کھیتوں کا سلسلہ تھا۔ ایک جگہ پر رک کر جمیل نے کہا۔

”تھانے دار صاحب! میں نے وہاں سے بھولا کو جاتے دیکھا تھا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی اور ہلکا ہلکا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر میری نگاہ نہیں گئی تاہم اس کے قد کا ٹھڈ اور ڈیل ڈیل سے مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ بھولا ہے جیسی میں نے اسے آواز بھی دی تھی لیکن وہ

”ہاں..... یہ ایک حقیقت ہے۔“ میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ”میرے پاس اس بات کے ٹھوس ثبوت موجود ہیں کہ بھولا کل شام کو اس شخص کے ساتھ خادم حسین کی کشتی میں بیٹھ کر کوٹ فرمان آیا تھا جسے رات کے کسی حصے میں بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا ہے۔“

”جی..... اس شخص کی لاش ہم نے بھی دیکھی ہے۔“ منظور نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ”مگر بھولا ہمیں کہیں نظر نہیں آیا۔ نہ رات میں اور نہ ہی صبح سے لے کر اب تک.....“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ”اگر وہ کوٹ فرمان آتا تو ہم سے ملے بغیر کیسے جاسکتا تھا۔“

”منظور بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے تھانے دار صاحب!“ کامران نے اپنے مشترکہ دوست کی تائید میں کہا۔ ”وہ اور کسی سے ملے یا نہ ملے لیکن ہم تو اس کے سنگے رشتے دار ہیں۔ وہ ہمیں کیسے بھول سکتا ہے۔“

”تم کیا کہتے ہو جمیل؟“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جی، یہ لوگ غلط تو نہیں کہہ رہے۔“ جمیل الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ”بھولا جب بھی ہمارے گاؤں آتا ہے، چند دن رہے بغیر واپس نہیں گیا اور یہ تو بالکل ہی ممکن نہیں کہ وہ ہم سے ملے بغیر ہی واپس چلا جائے مگر.....“

”مگر“ پر توجہ کر وہ بولتے بولتے رک گیا تو میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”مگر کیا جمیل؟“

”وہ جی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس بات کی کوئی اہمیت بھی ہے یا نہیں۔“

ابھی تک اس کے لہجے سے الجھن ٹپک رہی تھی۔ میں نے بہ دستور درشت انداز میں استفسار کیا۔ ”کسی بات کی اہمیت ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ میں خود کر لوں گا۔ تم بتاؤ، مسئلہ کیا ہے؟“

”مسئلہ تو میری سمجھ میں نہیں آیا جناب.....!“

”منہ سے کچھ بولو گے تو پتا چلے گا نا؟“

”کل رات مجھے بھولا کا مخالف ہوا تھا.....!“ وہ متذبذب انداز میں بولا۔

میں چونک اٹھا اور جلدی سے پوچھا۔ ”بھولا کا مخالف..... کیا مطلب؟“

”میں کھیتوں کی طرف سے گاؤں کی جانب آ رہا

پہنچایا تھا۔ یہ لگ بھگ مغرب کا وقت تھا اور اس کے تھوڑی ہی دیر بعد جمیل نے (اس کے گمان کے مطابق) بھولا کو گاؤں سے نکل کر نہر کی سمت جاتے دیکھا تھا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ بھولا محض اس اجنبی نوجوان مقتول کو کوٹ فرمان پہنچانے ہی آیا تھا لیکن یہاں پر ایک سوال ذہن کو الجھاتا تھا کہ بھولا کہاں غائب ہو گیا؟ میری ابتدائی تفتیش کے مطابق وہ کوٹ فرمان کے کسی گھر میں موجود نہیں تھا اور اس امر کا بھی کوئی ثبوت سامنے نہیں آیا تھا کہ وہ کوٹ فرمان سے کہیں چلا گیا ہو حتیٰ کہ کوٹ فرمان میں کسی نے اسے دیکھا بھی نہیں تھا، سوائے جمیل کے اور..... وہ بھی ایک مقالے کی حالت میں۔ اگر یہ بھولا میرے ہتھے پڑھ جاتا تو اس معاملے کو یہ آسانی سلجھایا جاسکتا تھا۔ شام ہونے کو آ رہی تھی لہذا میں نے واپسی کا قصد کیا۔

فوری طور پر میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ کل کسی کھوجی کے ساتھ دوبارہ ادھر کا رخ کروں گا۔ اگر بھولا اور اجنبی مقتول کا کھرا ہاتھ لگ جاتا تو پھر یہ پتا چلایا جاسکتا تھا کہ بھولا کہاں غائب ہوا ہے اور نامعلوم نوجوان کو کیا حادثہ پیش آیا ہوگا۔ میں نے واپسی کے سفر سے پہلے ابراہیم اور اس کے

رکا نہیں۔
”تم اس وقت کھتوں سے گاؤں کی طرف جا رہے تھے؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
”جی..... جی ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔

”اور بھولا نہر کی طرف جا رہا تھا.....!“
”پتا نہیں جناب، وہ بھولا تھا بھی یا نہیں۔“ وہ الجھن زدہ انداز میں بولا۔ ”اگر وہ بھولا ہوتا تو میری آواز پر رکنا ضرور.....“
”وہ جو کوئی بھی تھا، ہم اس پر بحث نہیں کر رہے۔“ میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم صرف یہ بتاؤ کہ جس شخص پر تمہیں بھولے کا گمان ہوا، وہ گاؤں کی طرف سے نہر کی جانب جا رہا تھا؟“
”جی..... بالکل ایسا ہی ہے۔“ اس نے اثبات میں جواب دیا۔

ملاح خادم مجھے بتا چکا تھا کہ اس نے گزشتہ روز آخری پھیرے میں بھولا اور اس اجنبی نوجوان کو فرید آباد سے کوٹ فرمان پہنچایا تھا جس کی تشدد شدہ لاش آج صبح اللہ رکھا کی ویلیز پر پٹری ملی تھی۔ خادم کے مطابق اس نے ان دونوں افراد کو ساڑھے پانچ اور چھ بجے کے درمیان کوٹ فرمان

یہ کہاں بچیں کہ دل ہے

نت نئے کرداروں کو الفاظ کے قالب میں ڈھالتی پُراثر تحریروں کی خالق اور..... ماہنامہ پاکیزہ کی دیرینہ ساتھی.....

مایہ ناز مصنفہ
ذفعت سراج
کے قلم کا ایک اور شاہکار

جلد ہی پاکیزہ کے صفحات کی زینت بننے جا رہے

”وہ کب جھنگ گیا ہے؟“ میں نے چوکتے ہوئے پوچھا۔ ”اور وہاں وہ کیا کرنے گیا ہے؟“ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ کہے گا بھولا کل شام کو جھنگ گیا تھا لیکن اس کے جواب نے میری توقع کی ایسی کم تھی پھیروی۔

”وہ آج صبح جھنگ گیا ہے سرکار۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ وہاں اپنے کسی دوست سے ملنے گیا ہے۔“

”آج صبح.....“ میں نے استغیث کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تمہارا مطلب یہ ہے کہ وہ پچھلی رات اپنے گھر پر ہی تھا؟“

”جی بالکل..... وہ گھر پر ہی تھا۔“ اس نے الجھن زدہ لہجے میں جواب دیا پھر سوال کیا۔ ”تھانے دار صاحب! آپ بھولا کے بارے میں اتنی چھان بین کیوں کر رہے ہیں؟ سب خیریت تو ہے نا؟“

”پولیس اور خیریت ایک ساتھ کیسے چل سکتی ہیں؟“ میں نے گھبرانداز میں کہا۔ ”کچھ بتا تو چلے جناب، آخر معاملہ کیا ہے؟“ اس کی پریشانی دو چند ہو گئی۔

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں اسے صورت حال کی سنگینی سے آگاہ کیا۔ اس کے چہرے پر تنگ کے سائے لہرانے لگے۔ بے حد گھبراہٹ ہوئی آواز میں بولا۔ ”تھانے دار صاحب! یہ بات تو میرے علم میں آچکی ہے کہ ساتھ والے پنڈ میں کل کی کوئی واردات ہو چکی ہے لیکن میں یہ ماننے کو تیار نہیں کہ ایسے کسی منجائے میں بھولا کا ہاتھ ہو۔“

”ادھر کوٹ فرمان میں جس نوجوان کی لاش ملی ہے، وہاں کے لوگوں کے لیے وہ اجنبی ہے۔“ میں نے واقعے کی روح بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”اور وہ اجنبی نوجوان تمہارے بیٹے بھولا کی سنگت میں کل شام فرید آباد سے کوٹ فرمان پہنچا تھا۔ اس بات کا چشم دید گواہ خادم حسین ملاح ہے جس کی کشتی میں بیٹھ کر وہ نہر کے اس پار گئے تھے اور حالات یہ بتاتے ہیں کہ بھولا ابھی تک واپس نہیں آیا جبکہ تم کہہ رہے ہو کہ گزشتہ رات وہ گھر پر موجود تھا اور آج صبح جھنگ کی طرف روانہ ہوا ہے۔“

”میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا جناب۔“ وہ لجاجت آمیز لہجے میں بولا۔ ”آپ کہیں گے تو میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔“

”قسم چھوٹی ہو یا بڑی اس کے کھانے یا پینے سے

دونوں بیٹوں کو خصوصی ہدایات دین پھر خادم حسین کی کشتی میں بیٹھ کر فرید آباد کی جانب روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

میری معلومات کے مطابق بھولا کے والد چاچا اسٹعلیل کی دکان فرید آباد کے لاری اڈے پر تھی۔ تھانے کا رخ کرنے سے پہلے میں نے اسٹعلیل سے غنا ضروری سمجھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ بھولا بھی چائے سگریٹ کی اس دکان پر اپنے باپ کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔

اسٹعلیل کی شکل بڑی حد تک اپنے بڑے بھائی ابراہیم سے ملتی جلتی تھی۔ وہ مجھے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اٹیشن ہو گیا پھر قد و پیمانہ لہجے میں بولا۔

”ست بسم اللہ سرکار۔ حکم کریں، میں آپ کی کیا خدمت کروں؟“

”اسٹعلیل!“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”میں یہاں خدمت کرانے نہیں آیا ہوں۔ مجھے تم سے چند ضروری باتیں کرنا ہیں۔ امید ہے تم مجھ سے بھرپور تعاون کرو گے۔“

”جی ضرور.....“ وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا۔ ”آپ پوچھیں، کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟“

میں نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے سرسری انداز میں استفسار کیا۔ ”تمہارا بیٹا بھولا کہیں نظر نہیں آ رہا.....“

”وہ جی اچھا نہیں لگ رہا۔ آپ پہلی مرتبہ میری دکان پر آئے ہیں۔“ وہ میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”چائے بالکل تیار ہے اور موسم بھی خاصا ٹھنڈا ہو رہا ہے.....“

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔“ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا اور کہا۔ ”ایک کپ چائے چلے گی۔“

اس نے جلدی سے مجھے چائے اور کیک میں پیش کر دیے۔ میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”اسٹعلیل! تمہارا بیٹا کدھر ہے؟“

”وہ تو جی یہاں نہیں ہے۔“ وہ سادگی سے بولا۔ ”میری معلومات اور تحقیق کے مطابق اسے فرید آباد میں ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔ حالات و واقعات کی روشنی میں وہ ابھی تک کوٹ فرمان ہی میں تھا۔ میں نے چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔

”یہاں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے؟“

”وہ جی جھنگ گیا ہوا ہے۔“ اس نے بتایا۔

LEADING
Section

معاہلے کو سلجھانے کے بجائے مزید الجھا دیا تھا۔ اگر اسلجیل کسی نوعیت کی دروغ گوئی سے کام نہیں لے رہا تھا تو پھر بھولا نے گزشتہ رات اپنے گھر پر گزاری تھی جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ رات ہی میں کسی وقت نہر پار کر کے کوٹ فرمان سے فرید آباد آ گیا تھا۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ کشتی کے بغیر اس نے نہر کو کیسے عبور کیا تھا؟ وہ نام کی نہر تھی مگر اس کا پاٹ کسی دریا سے کم نہیں تھا۔ اس سوال کا بہتر جواب خود بھولا ہی دے سکتا تھا اور..... مجھے اس جواب کو حاصل کرنے کے لیے بھولا کی آمد کا انتظار کرنا تھا۔

دن بھر کی بھاگ دوڑ نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا۔ میں نے تھکانے پہنچ کر متعلقہ عملے کو ضروری ہدایات دیں پھر اپنے سرکاری کوارٹر میں چلا آیا جو تھکانے کے پچھوڑے میں واقع تھا۔ آئندہ روز مجھے کسی کھوجی کے ساتھ دوبارہ کوٹ فرمان کا رخ کرنا تھا تا کہ نہر کے کنارے سے بھولا اور اس اجنبی نوجوان کا کھرا اٹھایا جاسکے۔

☆☆☆

انگلی صبح بڑی ہنگامہ خیز ثابت ہوئی۔ میں فجر کی نماز کے لیے بیدار ہوا تو گرج چمک کے ساتھ بونڈا باندی کا سلسلہ جاری تھا۔ رات کے آخری پہر میں بارش کا سلسلہ شروع ہوا تھا جو تاحال جاری تھا۔ اپنے کوارٹر کے تریترجن کو دیکھ کر میرے ذہن میں جو پہلا خیال ابھرا، وہ یہ تھا کہ اب کسی کھوجی یا کھرے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ بارش نے زمین پر سے ہر قدم کے نشان کو مٹا دیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے مایوسی کا احساس ہوا لیکن اگلے ہی لمحے میں نے اپنے ذہن سے ہر قسم کے دل شکنہ خیالات کو جھٹک دیا، اس یقین کے ساتھ کہ اللہ کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اگر یہ مصلحت سردست انسان کی سمجھ میں نہ آئے تو اسے اپنی سمجھ کا علاج کرانا چاہیے۔ میں مایوسی اور ناامیدی کو کفر کے خانے میں رکھتا ہوں۔

وقتے وقتے سے برسات کا سلسلہ جاری تھا کہ دوپہر ہو گئی۔ اس روز مطلع ابر آلود تھا۔ تاہم سورج آسمان پر دکھائی دے یا نہ دکھائی دے، دوپہر تو ہو ہی جایا کرتی ہے۔ دس فروری کی اس صبح بتہ دوپہر کے بعد سرکاری اسپتال سے پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ آ گئی۔ میں نے فوری مذکورہ رپورٹ کھول کر پڑھی۔ انگریزی کی تحریر میں کچھ اس نوعیت کا مضمون تھا۔

اس رپورٹ کی روشنی میں نامعلوم نوجوان کی موت آٹھ فروری کی شام سات اور آٹھ بجے کے درمیان واقع

بات نہیں بنے گی اسلجیل نے میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ نقل کا معاملہ ہے اور مقتول گزشتہ شام تمہارے بیٹے کے ہمراہ فرید آباد سے کوٹ فرمان پہنچا تھا۔ خادم حسین کے مطابق وہ دونوں دوستانہ ماحول میں آہن آہن کر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ اگر بھولا میرے ہاتھ لگ جائے تو اس کیس کو حل کرنا آسان ہو جائے گا۔“

”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا جناب.....“ وہ مرئی سی آواز میں بولا۔

”اچھا یہ بتاؤ..... کیا کل شام کے وقت بھولا یہاں دکان پر تمہارے ساتھ موجود تھا؟“ میں نے ایک دوسرے زاویے سے سوال کیا۔

”نہیں جی۔“ اس نے حذبذب انداز میں سر کوٹنی میں جنبش دی پھر اگلے ہی لمحے اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”جناب! بات دراصل یہ ہے کہ بھولا ہر وقت میرے ساتھ دکان پر موجود نہیں ہوتا۔ وہ من موچی ہے سرکار..... اس کا جب دل چاہتا ہے، تھوڑی دیر کے لیے میرا ہاتھ بٹانے ادھر آ جاتا ہے ورنہ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔“

”ہوں۔“ میں نے پرسوج انداز میں کہا۔ ”تو گزشتہ شام بھولا تمہارے ساتھ دکان پر موجود نہیں تھا اور تمہارا دعویٰ ہے کہ پچھلی رات کو وہ گھر پر ہی تھا۔ وہ آج صبح جھنگ گیا ہے اور کل واپس آئے گا؟“

”جی تھانے دار صاحب۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہی حقیقت ہے۔ میں نے آپ سے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کی۔“

”اور اگر بعد میں کسی مرحلے پر مجھے پتا چلا کہ تم نے دانستہ کوئی بات چھپانے کی کوشش کی ہے تو پھر مجھ سے کسی رعایت کی توقع نہیں رکھنا اسلجیل!“ میں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔

”جی بالکل!“ وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”میرا دل مطمئن ہے کہ میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔“

میں نے اسلجیل کو چند ہدایات دیں اور وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے اس بات کی تاکید کر دی۔

”بھولا جیسے ہی جھنگ سے واپس آئے، تم پہلی فرصت میں اسے لے کر میرے پاس تھانے آؤ گے۔“

اس نے میرے حکم کی تعمیل کا وعدہ کیا۔ جب میں تھانے پہنچا، ناچل برتاریکی چھا چکی تھی اور ہر طرف خاموشی کا راج تھا۔ اسلجیل سے ہونے والی ملاقات نے اس

خیریت سے مطلع کرتے ہوئے جلد ملاقات کی امید دلائی تھی۔ اب یہی ہو سکتا تھا کہ یا تو اللہ رکھا اور اس کی بیوی نے موسیٰ کے حوالے سے کوئی بات مجھ سے چھپائی تھی اور یا پھر اس رقعے کا گم شدہ موسیٰ سے کوئی تعلق نہیں تھا..... تو کیا کوٹ فرمان کی کسی اور ماں کا بیٹا بھی اس سے بچھڑا ہوا تھا؟

مختلف نوعیت کے سوالات میرے ذہن میں چکر رہے تھے۔ میں نے سوچا، جیسے ہی بارش کے سلسل میں قحط واقع ہوگا، میں کوٹ فرمان کی جانب روانہ ہو جاؤں گا اس رقعے کی روشنی میں نئے زاویے سے تفتیش کو آگے بڑھانے کی کوشش کروں گا۔

بارش نے مجھے تھانے سے نکلنے کا موقع تو نہیں دیا البتہ سہ پہر کے وقت مجھے ایک کال شیٹل نے اطلاع دی کہ اسٹیشن چائے والا مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ اس کے ساتھ بھولا بھی تھا۔ اسٹیشنل نے کہا۔

”تھانے دار صاحب! میں آپ کے حکم کے مطابق بھولا کو لے کر آپ کے پاس حاضر ہو گیا ہوں۔“

”ٹھیک ہے چاچا! تم ذرا باہر برآمدے میں جا کر بیٹھو۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”میں بھولا کے ساتھ علیحدگی میں چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

چند لمحات کے تذبذب کے بعد اسٹیشنل اٹھا اور میرے کمرے سے باہر نکل گیا۔ میں نے بھولا کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے سپاٹ آواز میں پوچھا۔ ”تم صرف نام ہی کے بھولا ہو یا عمل میں بھی بھولے بھالے ہو؟“

”جی..... میں سمجھا نہیں تھانے دار صاحب۔“ وہ فکر مندی سے بولا۔

”جب ٹرائل روم میں تمہاری چھتروں ہوگی تو سب کچھ سمجھ جاؤ گے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سخت لہجے میں کہا۔

وہ ہم کراہد اطلب نظر سے مجھے نکلنے لگا۔ میں نے پوچھا۔ ”آٹھ فروری کی شام تم کہاں تھے؟“

”میں اوجھری تھا جی۔“ وہ تھوک نکلتے ہوئے بولا۔

”فرید آباد میں۔“

”لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ آٹھ فروری کی شام تم کسی نوجوان کے ساتھ خادم حسین کی کشتی میں بیٹھ کر کوٹ فرمان گئے تھے۔“ میں نے یہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”وہ نوجوان کون تھا؟ اور تم کوٹ فرمان سے واپس کب اور کیسے آئے تھے؟“

ہوئی تھی۔ موت کا سبب اس بد قسمت کے سر پر لکھنے والی وہ شدید چوٹیں تھیں جنہوں نے اس کی کھوپڑی کو چٹا کر رکھ دیا تھا۔ مقتول کے بدن کے مختلف حصوں پر بھی چوٹوں کے متعدد نشانات پائے گئے تھے۔ لاش کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ بیک وقت دو تین افراد نے لاشوں کی مدد سے اس پر تازہ توڑ حملے کیے تھے۔ حملے کی نوعیت بتاتی تھی کہ قاتل، مقتول کے لیے اپنے دلوں میں شدید ترین نفرت رکھتے تھے۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے ساتھ ہی ایک پرچہ بھی منسلک تھا۔ وہ ایک تحریری رقعہ تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ پرچہ مقتول کے موزوں میں سے برآمد ہوا تھا۔ جب جائے وقوعہ پر میں نے مقتول کی لاش کا معائنہ کرتے ہوئے اس کی جامہ خلاشی لی تھی تو اس کی جرابوں کی طرف میرا دھیان نہیں گیا تھا۔ وہ جرابوں کے ساتھ تسموں والے بند جوتے چھپنے ہوئے تھا۔ مذکورہ رقعے کی تحریر نہایت ہی مختصر مگر سنسنی خیز تھی..... اس کا مضمون کچھ اس طرح تھا۔

”ماں! میں خیریت سے ہوں۔ بہت جلد آپ لوگوں سے ملنے آؤں گا۔“

اس مختصری تحریر کو پڑھ کر بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ ایک بیٹے نے اپنی ماں کو اپنی خیریت سے آگاہ کرتے ہوئے عنقریب ملاقات کی نوید سنائی تھی مگر کون بیٹا اور کون ماں؟ یہ دو نہایت ہی اہم سوال تھے۔ یہ رقعہ اجنبی مقتول کے موزوں میں سے برآمد ہوا تھا لہذا بیٹا وہ تو ہو نہیں سکتا تھا۔ کوٹ فرمان میں بسنے والوں میں سے کوئی بھی شخص مقتول کو پہچانتا نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقتول کی ماں کوٹ فرمان میں نہیں رہتی تھی۔ ہاں البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ مقتول کسی بیٹے کا رقعہ اس کی ماں کو پہنچانے کوٹ فرمان آیا تھا مگر کون ماں؟..... کس کی ماں.....؟

اچانک میرے ذہن میں روشنی کا ایک جھماکا ہوا اور آپوں آپ میرا دھیان اللہ رکھا کی بیوی کرم بی بی کی طرف چلا گیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اللہ رکھا اور کرم بی بی کا جوان بیٹا موسیٰ چار سال پہلے اچانک غائب ہو گیا تھا۔ تو کہیں ایسا تو نہیں کہ اجنبی مقتول کو موسیٰ ہی نے کوٹ فرمان بھیجا ہو؟ لیکن شاید ایسا ممکن نہیں تھا۔ میں نے گزشتہ روز موسیٰ کی گمشدگی کے حوالے سے اللہ رکھا اور کرم بی بی سے کرید کرید کر متعدد سوالات کیے تھے لیکن انہوں نے موسیٰ کے بارے میں اپنی مکمل لاشی کا اظہار کیا تھا جبکہ مذکورہ رقعے کی تحریر بتاتی تھی کہ یہ بیٹا اپنی ماں سے رابطے میں تھا جیسی تو اس نے اپنی

بتانے لگا۔ "وہ صدیق پہلوان کا بیٹا ہے۔ مجھے کشتی اور کبڈی کے مقابلے دیکھنے کا بہت شوق ہے تمہانے دار صاحب اور میں گویا پہلوان کو بہت پسند کرتا ہوں اسی لیے میں نے آنکھیں بند کر کے اس کا کام کرنے کی ہائی بھری۔ اس کام کے لیے گوگانے مجھے پورے سو روپے دیے تھے۔"

"اور اس نے تمہیں کام کیا بتایا تھا؟" بھولا سانس بھوار کرنے کے لیے متوقف ہوا تو میں نے سوال کر دیا۔

"چند روز پہلے وہ مجھ سے علیحدگی میں ملا اور مجھ سے پوچھا کہ کیا میں کوٹ فرمان والے موسیٰ کو جانتا ہوں۔" بھولا تفصیلات سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے جواب دیا کہ میں موسیٰ کو نہیں جانتا۔ پھر اس نے مجھے موسیٰ کے قد کاٹھ اور حلیے کے بارے میں بتایا اور کہا کہ میں لاری اڈے پر آنے والے مسافروں پر گہری نگاہ رکھوں۔ ایک دو دن میں موسیٰ یہاں پہنچے گا۔ وہ فرید پور سے کوٹ فرمان جائے گا۔ تم نے کسی طرح اس سے دوستی کرنا ہے۔ موسیٰ کی منزل کوٹ فرمان میں اللہ رکھا کا گھر ہے لیکن تم نے کسی طرح بہلا پھسلا کر اسے چودھری فیضان علی کے ڈیرے پر پہنچانا ہے۔ اس کے بعد تمہارا کام ختم اور ہاں..... بات کے اختتام پر گوگانے مجھے سمیپہ کی تھی کہ کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں نے تمہیں کوئی کام سونپا ہے۔ میں نے اس سے رازداری کا وعدہ کیا اور گوگانے سو روپے نکال کر مجھے دے دیے۔ یہ ہے ساری کہانی جناب۔"

"یہ ساری کہانی نہیں ہے۔ ابھی بہت کچھ باقی ہے۔" میں نے گہری نظر سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ "کیا تم نے آٹھ فروری کی شام موسیٰ کو چودھری فیضان علی کے ڈیرے پر پہنچا دیا تھا؟"

"جی بالکل، میں نے اپنا کام مکمل کر دیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "گوگا سے ملاقات کے بعد میں نے لاری اڈے کی ایک ایک بس اور دیکن سے اترنے والے مسافروں پر گہری نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ پھر آٹھ فروری کی شام مجھے موسیٰ ایک ویگن سے اترتا دکھائی دیا تو میں اس کے ساتھ ہولیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کوٹ فرمان کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ بھی ادھر ہی جا رہا تھا۔ موسیٰ سے دوستی کرنے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی لہذا ہم خادم حسین کی کشتی میں بات چیت کرتے ہوئے نہر کے دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ موسیٰ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس علاقے میں اجنبی ہے اور اسے کسی اللہ رکھا کے گھر جانا ہے۔ اس بات نے میرا

"میں کسی اجنبی نوجوان کو نہیں جانتا۔" وہ باغیانہ انداز میں بولا۔ "میں کوٹ فرمان نہیں گیا۔ میں تو اس رات اپنے گھر میں تھا اور اگلی صبح یعنی نو فروری کو میں جھنگ چلا گیا تھا اور وہاں سے ابھی واپس آیا ہوں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ شرافت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔" میں نے خونخوار نظر سے اسے گھورا۔ "لہذا مجھے کوئی ٹیڑھا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

"آپ میری بات کا یقین کریں جناب۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔" وہ مجھے چکر دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "تمہارے سچ اور جھوٹ کا ٹیسٹ ڈرائنگ روم میں ہوگا بھولا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "تم اس طرح نہیں مانو گے۔"

میں نے ایک اہلکار کو بلا کر بھولا کو اس کے حوالے کیا اور کہا۔ "یہ صرف نام کا بھولا ہے۔ ڈرائنگ روم میں لے جا کر اسے ابتدائی ٹیسٹ سے گزارنا کہ پتا چلایا جاسکے کہ اس بھولے کے اندر کون کون سے گن چھپے ہوئے ہیں۔" تھوڑی ہی دیر کے بعد مجھے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی۔ بھولا زیادہ دیر تک مزاحمت نہیں کر سکا تھا۔ وہ ابتدائی لات جوتا کھانے کے بعد ہی شرافت کی زبان بولنے کے لیے آمادہ ہو گیا تھا۔ پولیس اہلکار اسے واپس میرے پاس چھوڑ کر کمرے سے باہر نکلا تو میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں بھولا! کچھ یاد آیا، وہ اجنبی نوجوان کون تھا جس کے ساتھ تم آٹھ فروری کی شام خادم حسین کی کشتی میں بیٹھ کر کوٹ فرمان گئے تھے؟"

"میں اس نوجوان کو نہیں جانتا جناب۔" وہ کمزوری آواز میں بولا۔

"اگر تم اسے نہیں جانتے تو پھر اس کے ساتھ کوٹ فرمان کیوں گئے تھے؟" میں نے کڑی نظر سے اسے گھورا۔ "خادم حسین نے مجھے بتایا ہے کہ تم اس نوجوان کے ساتھ اس طرح کھل مل کر بات چیت کر رہے تھے جیسے اس کے ساتھ تمہاری برسوں کی یاری ہو؟"

"وہ سب کچھ میں نے گوگا پہلوان کے کہنے پر کیا تھا۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔ "میں لالچ میں آ گیا تھا جناب۔"

"گوگا پہلوان کون ہے؟" میں سیدھا ہو کر پینہ گیا۔ "میں نے تمہیں کون سا لالچ دیا تھا؟"

وقت تیر کر نہر پار کرنا بڑے دل گروے کا کام تھا۔
”بھولا! جب تک میں اس کیس کو حل نہیں کر لیتا تم سرکاری مہمان رہو گے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب جناب؟“ وہ ہکا بکا ہو کر میرا منہ ٹکنے لگا۔
”مطلب یہ کہ تمہیں تھانے کی حوالات میں قیام کرنا ہوگا۔“ میں نے بے رحم لہجے میں کہا۔
”لیکن میرا تصور کیا ہے جناب؟“ وہ احتجاجی انداز میں مستفسر ہوا۔

”تمہارے تصور کا فیصلہ ایک آدھ دن میں ہو جائے گا۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال اتنا سمجھ لو کہ گوگانے تمہیں عقیدت کی مار ماری ہے.....“
وہ حیرت اور فکر مندی کے طے جلے تاثرات کے ساتھ مجھے دیکھنے لگا پھر بولا۔ ”مجھ پر رحم کریں جناب۔“
”رحم ہی کر رہا ہوں جو حوالات میں بند کر رہا ہوں۔“ میں نے حتی لہجے میں کہا۔ ”ورنہ اب تک میں تمہیں پھانسی چڑھا چکا ہوتا۔“

وہ خوف زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس کیس کے دوسرے میرے ہاتھ میں آگئے تھے یعنی گوگا پہلوان آف گکر والی اور چودھری فیضان علی کا ڈیرا۔ بھولا کے مطابق اس نے مہتول کو موٹی کے مخالفے میں چودھری کے ڈیرے تک پہنچایا تھا۔ اگر میں محتاط روی سے پیش قدمی کرتا تو قاتل تک رسائی حاصل کرنے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہ ہوتا۔

میں نے اسی وقت ایک اے ایس آئی اور ووکا ٹشیلو کی ایک ٹیم بنا کر موضع گکر والی روانہ کر دی۔ گکر والی، کوٹ فرمان کے جنوب میں سنات میل کے فاصلے پر واقع ایک درمیانے سائز کا گاؤں تھا۔ میں نے اے ایس آئی کو سختی سے یہ ہدایت کر دی تھی کہ ہر حال اور ہر قیمت پر گوگا پہلوان کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ تھانے لانا ہے۔ میں نے خود ایک کانسٹیبل کو ساتھ لیا اور بارش کی پروا کیے بغیر چودھری فیضان علی کے ڈیرے کی سمت چل پڑا۔

☆☆☆

چودھری فیضان علی کا ڈیرا نہر اور گاؤں کے درمیان کھیتوں کے اندر بنا ہوا تھا۔ یہ تینٹی چھتوں والے تین کمروں پر مشتمل تھا جہاں پر مال مویشیوں کے علاوہ جانوروں کا چارا وزرعی آلات بھی موجود تھے۔ ڈیرے کا ایک کمر چودھری کے ملازموں نے اپنی رہائش کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ اس ڈیرے پر طفیل اور مراد حسین نامی دو ملازم رہا کرتے

کام آسان کر دیا اور میں نے اس سے کہا کہ میں نے اللہ رکھا کا گھرو دیکھا ہوا ہے لہذا میں بڑی آسانی سے موٹی کو بے وقوف بنا کر چودھری کے ڈیرے پر لے گیا تھا۔“

”تم جس نوجوان کو چودھری فیضان علی کے ڈیرے پر چھوڑ کر آئے تھے وہ موٹی نہیں تھا۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”موٹی تو اللہ رکھا کا بیٹا تھا جو چار سال پہلے اچانک کہیں گم ہو گیا تھا۔ اگر تم موٹی کے چہرے سے آشنا ہوتے تو گوگا پہلوان کی سازش کا شکار نہ ہوتے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں تھانے دار صاحب۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ بات تو میرے علم میں تھی کہ چار سال پہلے کوٹ فرمان سے کوئی لڑکا غائب ہو گیا تھا لیکن میں موٹی کو شکل سے پہچانتا نہیں تھا اس لیے اس کے مخالفے میں کسی اور بندے کو میں نے چودھری کے ڈیرے پر پہنچا دیا تھا.....“ لہجائی توقف کر کے اس نے ایک جھرجھری لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”ابا نے مجھے بتایا ہے کہ اس اجنبی نوجوان کو کسی نے بڑی بے وردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔“

”تمہارے ابا نے بالکل ٹھیک بتایا ہے۔“ میں نے زہر پلے لہجے میں کہا۔ ”اور اس بد نصیب شخص کو قتل تک پہنچانے والے تم تھے.....!“

”جناب! میں نہیں جانتا تھا کہ گوگا کے ذہن میں کیا منصوبہ ہے۔“ وہ منت پر نزل لہجے میں بولا۔ ”میں سو روپے کے لالچ میں آ گیا تھا۔ قتل کی اس واروا سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔“

”تمہارا قتل کے اس معاملے سے کتنا تعلق واسطہ ہے، یہ میں بہت جلد پتا چلا لوں گا۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال یہ بتاؤ کہ تم آٹھ فروری کو واپس فرید آباد کیسے آئے تھے..... خادم حسین کی کشتی تو تمہیں میسر نہیں تھی؟“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”خادم حسین نے اپنے آخری پھیرے میں ہمیں کوٹ فرمان پہنچایا تھا اور مجھے رات کو ہر صورت واپس آنا تھا لہذا میں نے تیر کر نہر پار کر لی تھی۔“

”اوہ.....!“ میں ایک گہری سانس خارج کر کے رہ گیا۔

ابراہیم کے بیٹے کا مران و عمران اور ان کے دوستوں کیلئے وہ منظور کی زبانی مجھے پتا چلا تھا کہ اسحاق عرف بھولا بہت اچھا تیراک بھی تھا۔ بہر حال، سردی کے موسم میں رات کے

بلالیا۔ چودھری فیضان علی کے دونوں ملازموں نے اجنبی نوجوان کو موت کے گھاٹ اتارنے کا اقرار تو کر لیا تھا لیکن جب میں نے ان سے پوچھا کہ تمہاری اس بے چارے کے ساتھ کیا دشمنی تھی تو مراد حسین نے کہا۔

”ہم تو اس کو جانتے تک نہیں تھے۔ دوستی اور دشمنی کا کیا سوال۔“

”ہم نے یہ کام دولت کے لالچ میں گوگا پہلوان کے کہنے پر کیا ہے۔“ طفیل نے بتایا۔ ”اس نے ہمیں ایک ہزار روپے دیے تھے۔“

اس زمانے کے ایک ہزار روپے آج کل کے پانچ لاکھ سمجھ لیں۔ بھولا، مراد اور طفیل کے بیانات سے یہی ثابت ہو رہا تھا کہ اس اجنبی نوجوان کا اصل دشمن گوگا پہلوان ہی تھا اور اس نے یہ کام کرائے کے قاتلوں سے کرایا تھا۔ گوگا میرے ہتھے چڑھ جاتا تو پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جاتا تھا۔

”تم لوگوں نے گوگا سے پوچھا نہیں کہ وہ بندہ ہے کون اور اسے کیوں موت کی نیند سنانا ہے؟“ میں نے ناپسندیدہ نظر سے باری باری ان کے چہروں کو گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”پوچھا تھا۔“ طفیل نے جواب دیا۔ ”اس نے کہا تھا، تم لوگ آم کھاؤ، پیڑ نہیں گنو۔ اگر پیڑ گننے میں لگ گئے تو پھر تمہارے پیٹ میں پیڑ ہوگی۔“

مراد بولا۔ ”میں نے گوگا سے اس بندے کی نشانی پوچھی تو اس نے مذکورہ بندے کا قد کاٹھ بتانے کے بعد کہا کہ وہ چاچا سلطعل چائے والے کے لڑکے بھولا کے ساتھ ڈیرے پر آئے گا۔ بھولا اسے ڈیرے پر چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس کے بعد تم لوگوں نے اپنا کام کرنا ہے۔ میں نے گوگا سے بندے کا نام بھی پوچھا تھا مگر اس نے بتایا نہیں۔ بس اتنا کہا کہ..... ایک ہزار روپے پر نظر رکھو اور جو کہا جا رہا ہے بس وہی کرو۔“

میں نے دونوں قاتلوں کو حوالات میں بند کر دیا اور اپنے کمرے میں بیٹھ کر اس اے ایس آئی کا انتظار کرنے لگا جو گوگا پہلوان کو لینے نگر والی گیا ہوا تھا۔ یہ گوگا بہت زیادہ پر اسرار ثابت ہو رہا تھا۔ ایک بار وہ میرے قابو میں آ جاتا تو پھر میں اس کی ساری پر اسراریت ناک کے راستے نکال کر رکھ دیتا۔

اگرچہ قاتل میری گرفت میں آچکے تھے لیکن ابھی تک مشغولگی شناخت نہیں ہو سکی تھی اور پھر دوپہر تک یہ

تھے لیکن جب میں وہاں پہنچا تو صرف مراد حسین وہاں موجود تھا۔ سورج غروب ہونے والا تھا۔ میں نے خادم حسین کو ہدایت کر دی تھی کہ جب تک میں واپس نہ آؤں، وہ نہر کے کنارے پر روک کر میرا انتظار کرے گا۔

مراد حسین مجھے ڈیرے پر دیکھ کر بوکھلا گیا۔ میں نے ہاتھ پاؤں سے مراد حسین کی ”خاطر تو واضح“ کی اور آٹھ فروری کی رات ڈیرے پر پیش آنے والے خونچکاں واقعے کے بارے میں استفسار کیا تو وہ ہٹ و پھری پر اتر آیا۔ میں نے اسے ہتھکڑی پہنا کر کانسٹیبل کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”تم سے باقی باتیں تمہانے میں ہوں گی۔“

پھر میں ڈیرے کی تلاشی میں مصروف ہو گیا۔ یہ خانہ تلاشی جلد ہی رنگ لے آئی اور چارے والے کمرے میں مجھے دو لاشیاں مل گئیں۔ ان لاشیوں کے سروں پر جما ہوا خون بھی نظر آ رہا تھا۔ جب میں نے خون آلود لاشیوں کا بغور جائزہ لیا تو وہاں چند بال بھی چپکے دکھائی دیے۔ یقیناً یہ خون اور بال اسی بد نصیب نوجوان کے تھے جس کی کھوپڑی پر یہ لاشیاں برسا کر اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا گیا تھا۔

اسی دوران میں مراد حسین کا ساتھی طفیل احمد بھی ڈیرے پر پہنچ گیا۔ میں نے فوراً سے چیشر اسے بھی آہنی زیور پہنا دیا پھر میں ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر تھانے آ گیا۔

آرٹل یعنی وہ خون آلود لاشیاں میرے ہاتھ لگ گئی تھیں لہذا طفیل اور مراد کی زبان کھلوانے میں مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ تھانے پہنچتے ہی میں نے چودھری فیضان علی کے ان دونوں ملازموں کو ایک تخت گیر حوالدار کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے صبح تک رزلٹ چاہیے.....!“

”آپ فکر ہی نہ کریں ملک صاحب۔“ حوالدار نے پراعتماد لہجے میں کہا۔ ”میں پوری رات ان کی، ایسی مکینگی کروں گا کہ صبح تک یہ کسی ٹیپ ریکارڈ کی طرح فر فر بولنے لگیں گے۔“

حوالدار نے جو کہا تھا وہ کر بھی دکھایا۔ اگلی صبح جب میں حسب معمول تیار ہو کر اپنے کمرے میں پہنچا تو حوالدار نے میرے پاس آ کر یہ نوید سنائی۔

”ملک صاحب! دونوں ملازموں نے اس اجنبی نوجوان کے قتل کا اقرار کر لیا ہے۔ وہ اپنا اقبالی بیان لکھوانا

چاہتے ہیں۔“

میں نے طفیل احمد اور مراد حسین کو اپنے پاس

معاملہ بھی صاف ہو گیا۔ اسے ایسی آئی نگر والی سے گوگا پہلوان کو گرفتار کر کے لایا تو اس کی گمشدہ کڑیاں آپس میں جڑ گئیں۔

گوگا پر مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ وہ بھولا، طفیل اور مراد کو تھانے کی حوالات میں دیکھ چکا تھا لہذا اس نے زبان کھولنے ہی میں اپنی عاقبت جانی۔ اس کا حلقیہ بیان سنسنی خیز اور عبرت انگیز تھا۔ میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

چار سال پہلے جب موئی کوٹ فرمان سے غائب ہوا تو اس کے ٹھیک دس دن کے بعد صدیق پہلوان کی بیٹی اور گوگا پہلوان کی اکلوتی بہن بھی نگر والی سے غائب ہو گئی تھی۔ دونوں گاؤں میں اتنا ناصلا تھا کہ کوئی ان دونوں کی گمشدگی کو ایک دوسرے کے ساتھ نہیں جوڑ سکا۔ صدیق پہلوان مخائین کے طعنے برداشت نہ کر سکا اور ایک روز اس نے غیرت میں آ کر خودکشی کر لی۔ کچھ عرصے کے بعد گوگا کی ماں بھی اپنی بیٹی رخصانہ کی جدائی میں آنسو بہا بہا کر اس دنیا سے رخصت ہوئی۔ اب گوگا اکیلا رہ گیا تھا۔ ان کی اتنی زمین تھی کہ کسی کی نجاتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پہلوانی کے ساتھ ساتھ اس نے رخصانہ کی تلاش کا کام بھی جاری رکھا اور بالآخر چار سال بعد وہ اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ تب اسے پتا چلا کہ وہ موئی کے ساتھ گھر سے بھاگی تھی۔ آج کل وہ لاہور کے علاقے اچھرہ میں رہائش پذیر تھے۔ انہوں نے شادی کر لی تھی اور اس دوران میں ان کے دو بچے بھی ہو گئے تھے۔ موئی فریجیئر مارکیٹ میں کام کرتا تھا۔ اس صورت حال میں گوگانے موئی سے بھیانک انتقام لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایک منصوبہ بنایا۔ اس کام کے لیے اس نے تین افراد بھولا، طفیل اور مراد کا انتخاب کیا تھا تا کہ اس کی طرف کسی کا دھیان نہ جائے۔ وہ پیسا خرچ کر کے مطمئن ہو گیا تھا۔

اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے موئی کو ایک خط ارسال کیا جو اس کی ماں کرم بی بی کی طرف سے تھا جس میں کرم بی بی نے اپنے ایک خواب کا حوالہ دے کر کہا تھا کہ اسے موئی کی رخصانہ سے شادی اور دو بچوں کی پیدائش کا علم ہو گیا ہے اور کرم بی بی (گوگا) نے خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ موئی کے سارے دشمن اس دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں لہذا ایک ماں کی التجا ہے کہ وہ ایک دن کے لیے کوٹ فرمان آ کر اسے اپنی شکل دکھا جائے۔

گوگا کو یقین تھا کہ یہ خط ملتے ہی موئی لاہور سے اپنی

ماں کو ملنے کے لیے روانہ ہو جائے گا لیکن اس وقت ساری گڑبڑ ہو گئی جب موئی نے اپنی جگہ اپنے ایک دوست حیدر کو گاؤں جانے کے لیے تیار کیا۔ حیدر اس کے ساتھ ہی فریجیئر کا کام کرتا تھا اور قد و قامت و جسامت میں اسی کے جیسا تھا۔ دراصل موئی حیدر کے ذریعے پہلے کوٹ فرمان کے حالات و واقعات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اس کے بعد بیوی بچوں کے ساتھ اپنے والدین سے ملنے گاؤں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس نے حیدر کو ماں کے نام یہ مختصر سا پیغام دے کر کوٹ فرمان روانہ کر دیا۔ ”ماں! میں خیریت سے ہوں۔ بہت جلد آپ لوگوں سے ملنے آؤں گا۔“

موئی کی احتیاط پسندی اپنی جگہ درست تھی تاہم حیدر کی شامت اعمال یا بدبختی کہہ لیں کہ وہ قربانی کا بکر اثابت ہوا۔ عین ممکن تھا کہ اگر حیدر کی جگہ موئی خود آتا تو یہ حالات پیش نہ آتے لیکن تقدیر کے سامنے اگر مگر نہیں چلتے۔ نصیب میں جو رقم ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔

میں نے گوگا سے پوچھا۔ ”تم انتقام میں اتنے اعدھے ہو گئے تھے کہ تم نے اپنی اکلوتی بہن اور اس کے دو ننھے منے بچوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں سوچا؟“

”کیا رخصانہ نے گھر سے بھاگتے وقت ہمارے بارے میں، گھر کی عزت کے بارے میں کچھ سوچا تھا جو مجھے اس کا احساس ہوتا۔ اس کی بے غیرتی نے میرے ماں باپ کی جان لے لی۔ میں موئی کو موت کے گھاٹ اترا کر رخصانہ کو بے آسرا بے سہارا چھوڑ دیتا لیکن اس بار بھی اس کینخت کی قسمت نے ساتھ دیا ہے مگر.....“

وہ یولتے یولتے اچانک خاموش ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ ”مگر کیا؟“

”ایک بار میں قانون کی گرفت سے نکل جاؤں تو اس دفعہ میں کسی بھولا، مراد اور طفیل کا سہارا نہیں لوں گا بلکہ خود اپنے ہاتھوں سے موئی اور اس کے بیوی بچوں کو فنا کے گھاٹ اتاروں گا.....“

گوگا پہلوان کے یہ دھمکی آمیز الفاظ میں نے اس کے بیان میں ریکارڈ کے طور پر شامل کر لیے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

گڑے مردوں کو اکثر نے میں ویرنی کتنی لگتی ہے۔ ماضی کا ایک سر بیت راز چار سال کے بعد اچانک کھل کر سامنے آ گیا تھا تو مستقبل میں بھی بہت کچھ پیش آ سکتا تھا..... بہت کچھ!

(تحریر: حُسام بٹ)



Downloaded From
Paksociety.com

سلیم انور

مستطاب

وہ ایک ایسا جراح تھا جسے اپنے پیشے سے عشق تھا اور عشق کی خاطر تو انسان کچھ بھی کر سکتا ہے۔ بشرطیہ کہ وہ سب کچھ اس کی نظر میں درست ہو۔ لہذا اس نے بھی بلا خوف و خطر وہی کیا جو اس کے پیشے کا تقاضا تھا لیکن کچھ فرائض انسانیت کے ناتے بھی اسے ادا کرنے تھے، سو کیے۔ مگر اس کے نتائج وہ نہ نکلے جو بہت سے لوگ چاہتے تھے۔

بال برابر فرق سے صحیح اور غلط کی پہچان کرنے
والے مسیحا کا اجرا

کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی جب اس نے وہ آواز دوبارہ سنی۔ اس مرتبہ اسے کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی۔ کسی نے داخلی دروازے پر مین مرتبہ زوردار دستک دی تھی۔ اس کے برابر میں سوئی ہوئی اس کی بیوی مائرا کی آنکھ

بوڑھے ڈاکٹر ویلش کو جب پہلی بار وہ آواز سنائی دی تو وہ بھی سمجھا کہ یہ بادلوں کی گڑگڑاہٹ ہے۔ وہ سوتے ہیں نہیں سے ہڑبڑا کر اٹھ چکا تھا اور دوبارہ اس آواز کو سننے کی کوشش میں بیڑ پر تین کر بیٹھ گیا تھا اور پھر اچانک اس

بالوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا اور دروازہ بند کرنا چاہا۔

”اب تم ہی سرجن ہو، ڈاکٹر!“

تب ڈاکٹر ویلش کی نگاہ دروازے قامت کے ہاتھ میں دبے ہوئے اعشاریہ تین آنٹھ کے ریوالور پر پڑی، جس کی چمک دار نیلی نال ڈاکٹر ویلش کے پیٹ سے صرف چند انچ کے فاصلے پر تھی اور اس کے دستے پر دروازے قامت کی گرفت مضبوط تھی۔ ان دونوں نے ریوالور کے زور پر زبردستی دروازہ کھلوایا۔

”ایک اچھے پیارے ڈاکٹر کی طرح برتاؤ کرو تو تمہیں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اگر اسارٹ بننے کی کوشش کی تو ہم تمہیں اڑا کر رکھ دیں گے۔۔۔۔۔ اوکے؟“

ڈاکٹر خاموش رہا۔ پھر وہ دروازے قامت اپنے پستہ قد ساتھی سے مخاطب ہوا۔ ”فیلکس! جاؤ مریض کو لے آؤ۔“ ان کا ساتھی فیلکس باہر کھڑی کار کی طرف چلا گیا۔ ڈاکٹر ویلش ہال دسے کی مدد رومنی میں پیچھے آ گیا اور دروازے قامت کا جائزہ لینے لگا جس کی نگاہیں ایک لمبے لمبے بھی اپنے ہاتھ میں تھے ہوئے اعشاریہ تین آنٹھ کے ریوالور سے نہیں ہٹتی تھیں اور وہ ڈاکٹر کی جانب سے قطعی غافل نہیں تھا۔

وہ پلہبر کیوں نہیں بنا۔۔۔۔۔ ڈاکٹر سوچتے تھے۔ پلہبروں کو رات کے تین بجے بھی پیٹ میں ریوالور کی نال کھبو کہ چکایا نہیں جاتا۔ انیس پانچوں کے علاوہ کسی اور شے کی نگرانی نہیں ہوتی۔

پھر ڈاکٹر ویلش نے رابداری میں آتے ہوئے فیلکس اور مریض کی جانب گھوم کر دیکھا۔ فیلکس اپنی سانسیں درست کرنے کے لیے چند ساعت کے لیے وہاں رک گیا تھا۔ پھر اس نے اپنے دونوں بازو، مریض کے سینے کے گرد لپیٹ لیے اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ بہ مشکل تمام اس مریض کو جو بظاہر بے ہوش لگ رہا تھا، گھسیٹتا ہوا ہال دسے میں لے آیا۔ اس کے پیچھے فرش پر پچھے ہوئے پھول دار قالین پر بائیں کے پانی اور خون کے قطرؤں کی لکیر بنی چلی آ رہی تھی۔

دراز قامت نے ایک جھٹکے سے دروازہ بند کر دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں دبا ہوا ریوالور بدستور تھاما ہوا تھا اور اس کی نال ڈاکٹر کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔

”اوکے ڈاکٹر۔۔۔۔۔ ہمیں سرجری میں لے چلو اور کسی قسم کی چال بازی مت کرتا۔“

”تم لوگ سزا سے نہیں بچ سکو گے۔“

بھی کھل گئی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کا بازو پکڑ لیا۔

”دستک کا جواب مت دینا، ویلش۔ جو کوئی بھی ہے شاید پلٹ جائے۔“

اتنے میں باہر بجلی کڑکی اور کیرا اچانک نیلی سفید روشنی میں نہا گیا۔ یہ چمک ایک لمحے کی تھی اور اسی ایک لمحے میں ڈاکٹر نے اپنی بیوی کے چہرے کے تاثرات بھانپ لیے۔ اس کا چہرہ زرد و خوف زدہ اور عمر رسیدہ لگ رہا تھا۔

”جواب دینا ہوگا، مارا۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی شدید بیمار ہو۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“

بادوں کی گڑگڑاہٹ پھر سنائی دی۔ ساتھ ہی کسی نے ایک بار پھر تین مرتبہ زوردار دستک دی۔

ڈاکٹر ویلش اکتائے ہوئے انداز میں بیڈ سے نیچے اترا پاؤں میں سلپرز پہنے اور گاؤن اٹھالیا۔ اس کی کمر میں درد ہو رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس نے سنتری ڈاکٹر کے بجائے وکیل یا پلہبر بننے کو ترجیح کیوں نہیں دی۔ وہ گاؤن پہن کر لڑکھڑاتے قدموں سے ویٹنگ روم سے ہوتا ہوا داخلی دروازے کی جانب بڑھنے لگا۔

اتنے میں دروازے پر ایک بار پھر تین مرتبہ زوردار دستک ہوئی۔

”آل رائٹ، آل رائٹ! میں آ رہا ہوں۔ اپنے منہ زور گھوڑوں کی لگا میں تمام کر رکھو۔“ اس نے چھوٹے وال لیسپ کا سوچ آن کرتے ہوئے بلند آواز سے جواب دیا اور دروازہ کھول دیا۔

باہر زوردار بارش ہو رہی تھی۔ ہوا کے زور: از سرور جھکڑوں اور اور بارش کے تھپڑوں نے بوڑھے ڈاکٹر کے چہرے اور بدن پر کچھ سی طاری کر دی۔ وہ آنکھیں میاڑے ان دو آدمیوں کو دیکھنے لگا جو دروازے کی دلیز پر کھڑے تھے۔

”ڈاکٹر ویلش؟“ ان میں سے دروازے قامت نے کہا جس کی آنکھیں بے بھر دسا لگ رہی تھیں۔

”میں ہی ہوں۔“ ڈاکٹر نے دروازے کو قدرے داکرتے ہوئے کہا۔

”ہم تمہارے لیے چھوٹا سا کام لائے ہیں، ڈاکٹر۔ تمہیں چھوٹی سی سرجری کرنی ہوگی۔“ اسی دروازے قامت نے کہا۔

”سوری، میں سرجن نہیں ہوں۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیاں، پیٹ کا درد اور بچوں کے ذمراض میرا خاصہ ہیں۔ تم لوگوں کو

سرجری کے لیے ڈاکٹر پنچمن کے پاس گاؤن میں جانا پڑے گا۔ وہ سرجن ہے۔“ ڈاکٹر ویلش نے اپنے خاکستری

وہ خواجہ اس منظر میں آن کبریٰ اور بتا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔ پھر ڈاکٹر نے لائٹ کا بجن دبا دیا۔

”آل رائٹ لیڈی۔ اوہر ڈاکٹر کے پاس چلی جاؤ۔“ وراز قامت نے اپنا ریوالور ہراتے ہوئے کہا۔

تب ماٹرا کی نگاہ وراز قامت کے ہاتھ میں دبے ہوئے ریوالور پر پڑی تو اس نے خوف زدہ نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔

”کم آن جلدی کرو۔“

”بہتر ہوگا جیسا یہ کہہ رہے ہیں، وہی کرو ماٹرا۔“

ماٹرا چھوٹے تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے شوہر کے پاس چلی گئی۔ ڈاکٹر نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے دلگسا دیا۔

جیکس اور اس کا ساتھی اپنے وہ دست کو جو بدستور بے ہوشی کے عالم میں تھا، گھینٹتے ہوئے کمرے کے وسط میں موجود ٹیبل کے پاس لے آئے اور اسے اٹھا کر ٹیبل پر لٹا دیا۔

”آل رائٹ ڈاکٹر۔ آپ ریٹ کرو۔“

”دہمقلین کی ضرورت نہیں، ڈاکٹر۔ آگے بڑھو۔“ ڈاکٹر نے قدرے تذبذب کیا پھر یہ دیکھتے ہوئے کہ اس کے پاس ان کے حکم کی تعمیل کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تو وہ سفید ٹیبل والے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہ ایک کمرے میں داخل ہو گئے جو گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور اس میں ایٹھر کی تیز بوورچی ہوئی تھی۔ اب تب ہی ڈاکٹر کے ذہن میں ایک آئیڈیا ابھرا۔

”کم آن ڈاکٹر..... لائٹ تو جلا لو!“

”مجھے سوچ تو تلاش کرنے دو۔ تم سے ذرا سا صبر بھی نہیں ہو سکتا۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

پھر وہ کمرے کے دوسرے کمرے پر دیوار گیر الماری نما خانوں کی طرف بڑھنے لگا۔ وہاں پر ایک خانے میں کنسنٹر ایڈامونیا کا جگ رکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے سوچا کہ لائٹ آن کرنے سے قبل اگر وہ جگ اس کے ہاتھ میں آجاتا ہے تو وہ اسونیا ان کے چروں پر اچھال کر انہیں وقتی طور پر اندھا کر دے گا اور چند سیکنڈ کے لیے ان کا دم گھٹ جائے گا۔ اور ڈاکٹر کو کبھی صرف چند سیکنڈ کی سہلت و رکاری تھی۔

تب وہ ان پر دیگر چیزیں پھینکنا شروع کر دے گا۔ کرسی، مزید جگ اور بوتلیں وغیرہ۔ پھر کسی نہ کسی طرح ان کے ریوالور پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ انہیں بتا دے گا کہ بوڑھا مونا اور رحم دل ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ اپنے بچاؤ کے لیے کسی کو گزند نہیں پہنچا سکتا۔

پھر وہ تقریباً دبے پاؤں آہستگی سے چلتا ہوا کینٹ تک جا پہنچا۔ اس نے اندھیرے میں ہاتھ بڑھا کر جگ کو ٹھولا اور اس کے دستے کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ پھر اس کے دھکن کو گھما کر کھولنے لگا۔

اچانک کمرے کا سکوت ایک گھٹی گھٹی چیخ نے توڑ دیا۔ وہ تیزی سے گھوم گیا۔ اسے دروازے پر ماٹرا کا ہیولا دکھائی دیا۔

”اوئے لیڈی، جہاں ہو وہیں کھڑی رہو۔“ وراز قامت نے کہا پھر ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔ ”کم آن ڈاکٹر..... لائٹ آن کرو۔“

اب بہادری دکھانے کا کوئی فائدہ نہیں، ڈاکٹر نے سوچا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ لوگ ماٹرا کو کسی قسم کا نقصان پہنچائیں۔ اب اسے وہی کرنا چاہیے جیسا کہ وہ کہہ رہے ہیں۔ اس طرح ہو سکتا ہے کہ ان دونوں میاں بوی کی زندگیاں بچ جائیں۔ وہ دل ہی دل میں ماٹرا کو کونسنٹر لگا کر

کراچی

ایک گھنٹہ

ماہنامہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ ”پاتیس بہارہ خزاں کی“ پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن وئے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہا کر سے بک کر لیں

بات ڈاکٹر کے سر ہڈ سے گزر گئی تھی لیکن اب اسے وہ بات یاد آگئی تھی۔ شریف نے جیوری اسٹور میں ایک بڑی ڈکیتی کی واردات کا ذکر کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ تین افراد تیس لاکھ ڈالر زماہیت کے ہیرے چھین کر لے گئے ہیں۔

تو پھر یہ تینوں وہی ڈاکو ہیں جنہیں پوری ریاست میں تلاش کیا جا رہا ہے، ڈاکٹر نے دل ہی دل میں کہا۔

ڈاکٹر میز کی طرف گھوم گیا اور مردہ شخص پر نظر سے جماویں۔ لگتا ہے کہ اس شخص نے عیاری سے کام لیتے ہوئے

اپنے بقیہ دو ساتھیوں کو دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ہیروں پر کسی قسم کی پلاسٹک کی کوننگ چڑھا دی تھی اور انہیں

ایک ایک کر کے نکل لیا تھا۔ اس کا ارادہ تو تھا کہ مردہ یا رینگے کیسیکو فرار ہونے کا تھا۔ لیکن بد قسمتی سے اس کے ساتھی

زیادہ ہوشیار نکلے اور انہوں نے اسے مار ڈالا۔

”اوکے ڈاکٹر! ہمارے پاس پوری رات کا وقت نہیں ہے۔ اسے چھ ڈالو!“ دراز قامت گرجا۔

”فرض کرو اگر تم انکار کرتے ہو تو.....!“ دراز قامت کے ہونٹوں پر ایک سفاکانہ مسکراہٹ ابھرائی اور وہ

زہر خندہی کے ساتھ اپنا ریوالبور مارٹر کی سمت لہرانے لگا۔ ڈاکٹر نے اس کا حکم ماننے میں عی عافیت بھی۔ اس

نے ایک ریپک پر سے اپنا سفید لیبارٹری کوٹ اتارا اور اسے پہن کر فیصل کے پاس چلا گیا۔ اس نے مردہ شخص کی

قمیص اور بنیان کاٹ کر اس کے بدن سے الگ کر دی۔ پھر اس کی چٹون نیچے کھسکا کر اس کے جسم کو ایک چادر سے ڈھانپ دیا۔

وہ دونوں ڈاکو پیچھے کھٹک کر دیوار کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر سمجھ گیا کہ انہیں چیر پھاڑ دیکھنے سے کوئی دیکھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے اپنے ہاتھوں میں ربرکے

وستانے چڑھالیے، پھر سنک کے پاس لگے ہوئے ایک کیبنٹ کے پاس چلا گیا اور ان اوزاروں کو نکالنے لگا جن کی

ضرورت اسے پیش آسکتی تھی۔

لاش کے پاس پلٹ کر اس نے قدرے توقف کیا۔ اسٹین لیس اسٹیل کا چمک دار تیز و حاد شتر اس کے ہاتھ میں تھا۔

اس نے ایک بار پھر نظر سے گھما کر ان دونوں ڈاکوؤں کی طرف دیکھا جو دیوار کے پاس سائے میں کھڑے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر کو اپنی جانب متوجہ پا کر دراز قامت چیخ پڑا۔

”چیر ڈالو ڈاکٹر!“

تب ڈاکٹر ویش نے اپنا کام شروع کر دیا۔

ڈاکٹر ویش نے ایک نگاہ اپنی بیوی پر ڈالی۔ مائرا کی آنکھوں میں آنسو دکھائی دے رہے تھے۔ ساتھ ہی اس کے ہونٹ بھی کھپکھپ رہے تھے۔ ڈاکٹر نے اپنی بیوی کو تسلی دیتے ہوئے اس کی کمر چھتپائی اور قدرے ہچکچاتے ہوئے

بھیل کی جانب بڑھ گیا۔

اس نے بھیل پر موجود شخص کا بصری معائنہ کیا اور پھر چہرہ ہی سیکڑ میں صورت حال جانچ لی۔

”سنو، لگتا ہے تم لوگوں نے اسے یہاں لانے میں دیر کر دی ہے، لڑکوں! تمہارا ساتھی مر چکا ہے۔“

”تمہیں اس سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔“ دراز قامت نے کہا۔ اس کی سیاہ آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں۔

”تم آپریٹ کرو، ڈاکٹر۔“

”آپریٹ؟ وہ کس لیے؟ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ یہ شخص مر چکا ہے۔“

”جیسا میں کہہ رہا ہوں وہی کرو ڈاکٹر۔ اسے چیر دو۔“

ڈاکٹر یہ سن کر ابھرن میں پڑ گیا۔ اس نے نظر سے اٹھا کر دراز قامت کی طرف دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک

زہریلی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ کیا یہ لوگ پاگل تو نہیں ہیں؟ ڈاکٹر سوچنے لگا۔

”فیلکس! بہتر ہوگا کہ تم ڈاکٹر کو وضاحت سے سمجھا دو۔“ دراز قامت نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”اسے بتا دو کہ اسے کیا کرنا ہے۔“

پیت قد فیلکس ڈاکٹر کے قریب آ گیا اور اپنا ریوالبور اس مردہ شخص کی جانب لہراتے ہوئے بولا۔ ”لگتا ہے کہ

ہمارے دوست کے مدھے میں کوئی تکلیف ہو رہی تھی، ڈاکٹر۔ اس نے کچھ ہیرے نکل لیے تھے جو اسے نکلنے نہیں

چاہیے تھے۔“

ڈاکٹر ویش اب بھی معاملے کو سمجھ نہیں پایا۔

”وہ سرحد پر واقع ریوالبور کے پڑوسی ملک جانے کا ارادہ رکھتا تھا..... ان تمام ہیروں کے ساتھ جو اس کے

پیٹ میں موجود تھے۔ ہم نے بس ایک گولی اس کی پیٹھ میں اتار دی اور اس سے سچ اگلا لیا۔ اب تم اسے چیر دو، ڈاکٹر۔

وہ ہیرے پلاسٹک کی کوننگ میں ہیں۔ وہ تمہاری نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکتے۔“

تب اچانک ڈاکٹر ویش پر پوری بات واضح ہو گئی۔ وہ اس سے پہلے ہی سمجھ گیا تھا تو کافی کا ایک کپ پینے کے لیے

ویش شاپ پر رک گیا تھا۔ وہاں اس کا سامنا شریف سے ہوا تھا جو اپنی پسندیدہ ڈش کھانے وہاں آیا ہوا تھا۔ اس وقت

لینن کینٹ کے برابر میں لگی ہوئی گھڑی کی سوئیاں دھیرے دھیرے حرکت کر رہی تھیں..... پانچ..... دس..... پندرہ منٹ.....

اور پھر ڈاکٹر وپلش نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک اطمینان تھا جو اپنا پیشہ وراںہ فرض سمجھنے سے سرا انجام دینے پر کسی بھی ڈاکٹر کو مل سکتا..... ہے۔ وہ مروہ شخص کا پیٹ چاک کر چکا تھا اور اسے وہل گیا تھا جس کی اسے تلاش تھی۔

”ڈاکٹر! میری انگلیوں میں کھلی ہو رہی ہے۔ ان قیمتی پتھروں کو نکالنا شروع کر دو..... اور جلدی کرو۔“

ڈاکٹر نے چیلوں اور مونچے کی مدد سے گیلے پتھروں کو باری باری نکالنا شروع کر دیا۔ پھر احتیاط کے ساتھ ان پتھروں کو ایک بڑے سے گاج کے کلوے پر رکھنے لگا۔

اسے آخری پتھر چننے میں دس منٹ لگ گئے۔ گاج پر موجود ان پتھروں کی تعداد پندرہ سے بیس کے درمیان تھی۔ ڈاکٹر نے اپنی نگاہیں ان پتھروں پر جماتے ہوئے کہا۔ ”تمام کے تمام بس یہی ہیں۔“

”آں رائٹ ڈاکٹر۔ اب تم ان پر سے پلاسٹک کوٹنگ علیحدہ کر دو۔“ وراز قاسم نے کہا۔

ڈاکٹر ایک طویل لمحے تک خاموش کھڑا رہا۔

”کام شروع کر دو، ڈاکٹر!“

”اس پلاسٹک کوٹنگ کو اتارنے کے لیے تمہیں ایک گلا دینے والے محلول کی ضرورت ہے جس میں اس کا نام لکھ دینا ہوں۔ اس سے کوٹنگ اتر جائے گی۔“ ڈاکٹر نے یہ کہہ کر قدرے توقف کیا۔ ”لیکن وہ محلول اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔“ اس نے بتایا۔

تب ان دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ ڈاکٹر نے وراز قاسم کے تیور بھانپتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔ ”وہ محلول تمہیں کسی بھی پرچون اسٹور سے مل جائے گا۔“

”پھر کیا کرنا ہوگا؟“

”ویل، ان ہیروں کو محلول والے بین میں ڈال دینا اور اس محلول کو پانچ منٹ تک ایلٹے دینا۔ اس طرح پلاسٹک کوٹنگ علیحدہ ہو جائے گی اور ہیروں کو بھی کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔“

وہ دونوں افراد ٹیبل پر پڑی اپنے ساتھی کی لاش سے نظریں جھار رہے تھے۔ وراز قاسم کے ہونٹوں پر ایک ناخوشگوار مسکراہٹ رہیں کر رہی تھی۔ اس نے گاج کو بوج کر ان کا ایک بیڈل سا بنایا اور اسے اپنے کوٹ کی جیب میں

رکھ لیا۔ پھر بوڑھے ڈاکٹر کی جانب پلٹ گیا۔ ”تم نے نہایت عمدہ کام کیا ہے، ڈاکٹر اور تم پر یہ واضح کرنے کے لیے کہ ہم تمہارے کام کی کتنی ستائش کرتے ہیں تو یہ لیں.....“

ساتھ ہی اس نے اپنے ریوالور کے دستے سے اچانک ڈاکٹر کے منہ پر ایک ضرب لگا دی۔ ڈاکٹر چاروں خانے چت فرش پر گر پڑا۔ ماٹرا کے حلق سے ایک چیخ بلند ہوئی اور وہ اپنے شوہر کی جانب دوڑ پڑی۔

”او کے ڈاکٹر!“ وراز قاسم نے اپنے کوٹ کی ابھری ہوئی جیب کو تھپتھپاتے ہوئے ایک تھپہ لگا لیا۔ ”ونڈر فل سرجن!“

اور پھر وہ دونوں ڈاکٹر تھپے لگاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

ڈاکٹر وپلش اس وقت تک کچھ نہیں بولا جب تک اس کے کالوں میں ان ڈاکٹروں کی کار کے اسٹارٹ ہونے اور کنزروی لینن کی پتھر ملی سڑک پر دوڑنے کی آواز بتدریج معدوم نہیں ہوئی۔

پھر اس نے سر اٹھا کر اپنی بیوی ماٹرا کی طرف دیکھا۔ ماٹرا پریشان نظروں سے خون کی اس بوند کو دیکھ رہی تھی جو ڈاکٹر کے زخمی ہونٹوں سے بہتی ہوئی دھیرے دھیرے اس کی ٹھوڑی تک آچکی تھی۔ اس کے باوجود ڈاکٹر کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ تھی۔

پھر یہ مسکراہٹ ایک تھپے میں بدل گئی۔

”جانتی ہو، ماٹرا۔ میں ان ڈاکٹروں کے چہرے کے تاثرات اس وقت دیکھنے کا تمنی ہوں جب وہ ان پتھروں کو ہیرے سمجھ کر غیر قانونی طور پر فروخت کرنے کی کوشش کریں گے۔ جاڈ شیرف کو فون کر دو کہ وہ یہاں آجائے۔“

”تمہارا کیا مطلب ہے؟“ ماٹرا نے تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔

”ٹیبل پر پڑی اس لاش کے پتے میں اتنی تعداد میں پتھریاں موجود تھیں کہ کسی بھی دریائی کشتی کو لٹکرا نڈا کرنے کے لیے کافی ہو سکتی تھیں۔ میں نے اصلی ہیروں کی جگہ اس لاش کے اندر سے پتے کی پتھریاں نکال کر گاج پر اکٹھا کر دی تھیں۔ دلیل، مجھے ایسی نظروں سے مت گھورو۔ شیرف کو فون کرو اور اسے بتا دو کہ ڈاکٹروں کے لوٹے ہوئے تمام کے تمام ہیرے ہمارے پاس موجود ہیں اور پھر چھوٹا خستہ ٹیک بھی بنا لو۔ شیرف خستہ ٹیک کا دیوانہ ہے۔“

احسان فقیر و سہیل



✽ ماریہ چودھری..... پاکستن
بجھدار ہی کرتے ہیں اکثر غلطیاں و نشیں
کبھی دیکھا ہے کسی پاگل کو عشق کرتے؟

✽ مادیہ ایمان، ماہا ایمان..... ہارون آباد
کس وجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے
ہاویسیوں نے چھین لیے دل کے دلوے
وہ بھی نشاطِ رومخ کے سماں نہ کر سکے

✽ محمد ابرار حسین سیکی..... جھنگ
منزلیں کسی کے گھر حاضری نہیں دیتیں
راستوں پہ چلنے سے راستے نکلتے ہیں



✽ معاویہ مغل..... ایبٹ آباد
کلیاں چن رہی ہیں آج کل
گلتا ہے کھل کر مسکرایا ہوگا وہ

✽ ملائکہ حزیم..... اوکاڑہ
اگر ہوتا ہے اتفاق تو، یہ کیوں نہیں ہوتا
وہ راستہ بھولے اور مجھ تک چلا آئے

✽ محمد قدرت اللہ نیازی..... حکیم ٹاؤن، خانیوال
اک نظر ڈال کبھی میرے مسیحا مجھ پر
تیرا کیا چائے گا بیمار کو اچھا کر کے
میں بہت جلد بھنور میں یاد آؤں گا تجھے
اتنا خوش باش نہ رہ مجھ سے کنارہ کر کے

✽ ماہین فاطمہ..... اوکاڑہ
اجالا بن کے آجاؤ مرے تاریک لحوں میں
کہ ترے بن سبھی خوشیاں مجھے ٹھکن لگتی ہیں

✽ سید محی الدین اشفاق..... فتح پور، لہ
اس کے نزدیک غم ترک و وفا کچھ بھی نہیں
مطمئن ایسا ہے وہ، جیسے ہوا کچھ بھی نہیں
میں تو اس واسطے چپ ہوں کہ تماشا نہ بنے
وہ کھتا ہے مجھے اس سے گلہ کچھ بھی نہیں

✽ اشفاق شاہین..... کراچی

اس کے سوا تو میں دد نیل کسی کو نہ دوں
دل تو بہت دور کی بات ہے

✽ داؤد اشفاق..... اوکاڑہ

ہماری روح پہ جب بھی عذاب اتریں گے
تمہاری یاد کو اس دل کی ڈھال ہونا ہے

✽ جاوید اختر رانا..... پاک پٹن شریف

ہمت التجا نہیں باقی

ضبط کا حوصلہ نہیں باقی

اک تیری دید چھین گئی مجھ سے

ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی

✽ رمضان پاشا..... گلشن اقبال، کراچی

وفا کی آس اسی یار بے وفا سے ہے
بدن ہے راکھ مگر دوستی ہوا سے ہے

✽ احسان سحر..... میانوالی

سرعام محبت کا اعلان کیا ہے
تیرے نام اپنا یہ دیوان کیا ہے
بن سنور کے بڑے اہتمام کے ساتھ
دل نے تیری یاد کو مہمان کیا ہے

✽ معراج محبوب عباسی..... ہری پور، ہزارہ
ضد، وحشی، الفز، پینچل، بیٹھے لوگ، ریلے لوگ
ہنٹ ان کے غزلوں کے مصرعے آنکھوں میں افسانے تھے
وحشت کا اعتدال ہماری، ان میں سے جو نار ٹھہری
بیکھیں گے لوگ تو کہیں گے، انشاء جی دیوانے تھے

✽ عبدالجبار رومی انصاری..... چوہنگ، لاہور
باقی ہے لبو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگ لب درخشاں صنم کرتے رہیں گے
اک طرف تعاقب ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

✽ مسٹر اینڈ مسز محمد عندر معاویہ..... خانیوال
بہت مشکل سے ہوتی ہے تجارت تیری یادوں کی
منافع کم سہی لیکن گزارہ ہو ہی جاتا ہے

✽ ڈاکٹر ظفر اسلام..... مظفر گڑھ
تیری الفت کی راہوں میں لٹا دی زندگی میں نے
دل دجاں سے لوٹنے والے تو کتنا بے وفا نکلا

✽ ایم یوسف..... نور پور
میرے ہاتھ کی لکیروں میں یہ عیب چھپا ہے حسن
میں جس شخص کو چھو لوں وہ میرا نہیں ہوتا

✽ جبران احمد ملک..... گلشن اقبال، کراچی
پھر جمیل سی آنکھوں کی پلکوں کو اٹھانا ہے
ظہرے ہوئے پانی میں اک آگ لگانا ہے
اس پیار بھی چاہو تو رہ رہ کے مہک لینا
اب سخن میں پھولوں کی دیوار اٹھانا ہے

✽ عذرا ہاشمی..... گڑھ موڈ
خوف سے فرصت ہی میسر نہیں آئی ورنہ
ہم کسی اور کے ہوتے تو تمہارے ہوتے

✽ ظفر اقبال ظفر..... کامرہ شرقی
دجاں چھوٹنے کے ایک ڈھیر کی نکتی سے کیا فائدہ
کیوں ہو رہی نہیں شہر میں مردم شماریاں

✽ اطہر حسین..... کراچی

یہ تو بات الگ ہے پھول اور خوشبو سے بھر جاؤ گے
لیکن اب کے عشق کیا تو جیتے جی مر جاؤ گے
لوگ تو چھپ چھپ کر بیٹھے ہیں روزن اور سب بند کیے
دھڑکن کی آواز کے پیچھے اب کس کے گھر جاؤ گے

✽ احمد جہانزیب..... میانوالی
وہ جو ملزم تھا ہر اک عشق میں سچا نکلا
اس پہ الزام لگا حسن سے غداری کا
منصب دار پہ فائز ہو تو کچھ بات بنے
تاج ہم بھی اسے پہنائیں گے سرداری کا

✽ جنید احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
یہ کائنات سٹ جائے تو وفا کی قسم
تمہارے نقش کف پا سے کچھ زیادہ نہیں
یہ آسمان و زمیں اڑھ کر بھی دیکھیں۔ اگر
تو بان کی گود سے بڑھ کر کوئی لباؤہ نہیں

✽ شیخ خرم ریاض..... دہلی چوک، لاہور کینٹ
ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

✽ اوریس احمد خان..... ناظم آباد، کراچی
ان کی فطرت ہے کہ مجھ کو بھول جاتے ہیں مگر
میری عادت ہے کہ ان کو یاد کر لیتا ہوں میں

✽ ریاض بٹ..... حسن ابدال
تم رنگ ہو خوشبو ہو، دھیان سے رہنا
صحرائے محبت کی ہوا تیز بہت ہے

✽ محمود علی..... اسلام آباد
جو کاغذی ہے وہ ہر ناؤ ڈوب جائے گی
تو سطح آب پہ کھل جائے گا بھرم اس کا
جو سر نہیں ہے تو دستار کی ضرورت کیا
سروں کے ساتھ عبارت ہے سچ و خم اس کا

✽ سید عیادت کاظمی..... ڈیرہ اسماعیل خان
کیا دشمنی تھی چاند کو گھر کے چراغ سے
چراغ بجھ گیا تو چاند ندی میں اتر گیا

✽ رضیہ عمیر..... کراچی
شعور و فکر کے ہے میکدوں میں سناٹا
خرد کے نام پہ زہنوں کا جام خالی ہے

✽ زوہیب احمد ملک..... گلستان جوہر، کراچی
ستم گری کی ابھی تو تمہاری باری ہے
کبھی تو آئے گا تم دیکھنا ہمارا دن
✽ علی مراد..... لاہور

تعلیٰ بن کر اڑنے والا لوٹ کے شاید آئے
گلدازوں میں پھول سجائے خواب ہی کے دیکھوں
✽ اور لیس احمد..... حیدرآباد

ہم نے دیکھا تو افق پر تھا سمندر کا سکوت
ہاں ترے ساتھ جو گزرے تھے نظارے چمکے
✽ عظیم الیاس..... فیصل آباد

پہلے تو وہ کھو جائے گا رسموں کے نگر میں
پھر گود میں رکھا مرا سر یاد کرے گا
✽ زرین نیازی..... مظفر آباد

مل جانے کی خواہش بھی پھنڑ جانے کی ضد بھی
ہاں اس کی محبت بھی، عداوت بھی عجب تھی
✽ محمد جہانگیر..... پشاور

میں اس کا درد کسی کو بھی دوں تو کیسے دوں
وہ زخم میں نے بڑی چاہتوں سے پالا ہے
✽ منصور اختر..... سیالکوٹ

تہا چھوڑ کے جانے والا آنجل لوٹ کے آیا تو
ہم نے اس کی یاد میں کیسے وقت گزارا جانے کا
✽ شازیہ کمال..... کراچی

اک میں ہی خاموش رہوں کیا سارے شہر کے سچ
جیسے بلبلا جھاگ کا کوئی اونچی لہر کے سچ
✽ محمد رشید..... بہاولپور

اک روز میں بھی کہہ گیا بچوں سے دل کی بات
اب کیا طے گا ٹوٹے کھلونوں کو جوڑ کر
✽ محمد آریز ملک..... کراچی

یا تو دریا بھی کسی طور نہ آتے تھے قریب
اور دن آئے تو قدموں میں سمندر آیا

✽ وزیر محمد خان..... بطل ہزارہ
آئی نہ رات بھر کوئی پتھٹ پتھٹ پہ سانوی
پانی میں چھپ چکے بیٹھا رہا بے قرار چاند
✽ یوسف رضا کاظمی..... لیہ

کھیتوں میں پھر سے سرسوں کی رت آگئی
دیکھے ہوئے تمہیں آج اک سال ہو گیا
✽ مدحت..... کراچی

دل کو غم حیات سے ابھی نجات نہیں
نکاہ یار سے کہہ دو کہ انتظار کرے
✽ اظہر حسین پیمار..... ہزاری، جتوئی

پھر یوں ہوا کہ جب بھی ضرورت پڑی مجھے
ہر شخص اتفاق سے مجبور ہو گیا
✽ سید عرفان شاہ، عمران عارف..... فیصل آباد

تم یوں ہی ناراض ہوئے ہو ورنہ میٹانے کا پتا
ہم نے ہر اس شخص سے پوچھا جس کے نین لٹیلے تھے
✽ بلقیس خان..... واہ کینٹ

یہ سال بھی پچھلے کئی برسوں کی طرح ہے
اس سال بھی ہر سانس گراں یاد بہت ہے
✽ انجینئر محمد سعید اقبال بھٹی..... گلبرگ، لاہور

قید میں گزری ہے جو عمر بڑے کام کی تھی
کیا میں کرتا کہ زنجیر میرے نام کی تھی
✽ مرزا گل، مرزا گل..... ڈیرہ اسماعیل خان

نہیں ہے نا اید اقبال اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی
✽ کمال انور..... اورنگی ٹاؤن، کراچی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی
✽ مشال اینڈ نوال..... جہلم

اس شہر کے انداز عجب دیکھے ہیں یارو
گوگوں سے کہا جاتا ہے بہروں کو پکارو

مختل شعروں کا مجموعہ



نام: _____
پتا: _____



استحقاق

ڈاکٹر شیر شاہ سید

بعض اوقات انسان کتنی عاقبت نااندیشی کا ثبوت دیتا ہے۔ تمام عمر مخالف سمت چلتا ہے اور درست سمت میں منزل چاہتا ہے مگر... اس شخص کو سمتوں کا ادراک تھا اور سفر کرنے کا ہنر بھی آتا تھا جب ہی تو راستوں کی کنھنائیوں میں ثابت قدم رہنے کے تمام تر تقاضوں سے واقف تھا... بس یہی ایک احساس اسے زندگی و موت کی کشمکش میں بھی رعنائیوں کی جانب نہ دھکیل سکا اور بالآخر پُر خار سفر اس کا مقدر ٹھہرا۔

زل صراطِ الحیات کو عبور کرنے کی نکالنے کا ادراک

کینسر ہو گیا تھا ان کو۔ پچھپھڑوں کا کینسر۔ بائیوپسی کے بعد پیتھالوجسٹ نے یہی رپورٹ دی تھی۔ رپورٹ دیکھ کر میں نے فیصلہ کیا کہ اہل خانہ کو اب بتانا ہوگا اور بہتر ہے کہ میں ہی بتاؤں۔ گزشتہ تین چار دنوں میں ان سے اور ان کی بیوی، بیٹا سے باتیں ہوتی رہی تھیں پھر پتا چلا کہ وہ عامر کے والد ہیں۔ عامر میرے ساتھ ہی تھا کالج

READING
Section

اپریل 2016ء

147

سپینس ڈائجسٹ

میں۔ ہم دونوں نے ساتھ ایسی بی بی ایس کیا۔ کل ڈاکٹر بن کر لندن چلا گیا جبکہ عام امریکا کا امتحان پاس کر کے وہاں چلا گیا تھا۔ پھر کچھ ہفتا نہیں چلا۔ تین سو کی کلاس میں کون کہاں جاتا ہے، کسے پتا لگتا ہے۔

وہ اپنی بیٹی کے ساتھ میرے کلینک میں آئے تھے۔ کئی دنوں سے انہیں کھانسی تھی اور اب تو بلغم کے ساتھ خون بھی آجاتا تھا کبھی کبھی۔ پہلے تو انہوں نے کسی کو بتایا بھی نہیں مگر جب ایک دن کھانسی کھانسی کر بے حال ہو گئے تو ان کی بیوی نے بیٹی کو فون کر کے بتایا جو دوسرے دن انہیں لے کر میرے پاس آگئی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ انہیں نی بی ہو گئی ہے۔ ان کے بڑے بھائی کا انتقال بھی نی بی کی وجہ سے ہوا تھا۔

وہ دہلے پٹکے، سادے سے آدی تھے۔ گہرا سانولا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، سر پر گھنے سفید بال۔ ان کے چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں ان کی آنکھیں اور ہونٹ تھے۔ دور سے ہی نظریں جیتے چٹ جاتی تھیں۔ وہ خاکی رنگ کی پینٹ اور سفید قمیض پہنے ہوئے تھے۔ پینٹ اور قمیض دونوں گہری دھلی ہوئی تھیں اور کسی نے گھر میں ہی استری کی تھی۔ پتلی ہی نظر میں وہ مجھے اچھے لگے۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پہلی ہی نظر میں اچھے لگتے ہیں یا پھر ان سے نفرت ہی ہو جاتی ہے۔ ان میں کوئی خاص کشش تھی کہ وہ مجھے متاثر کر گئے تھے۔

تفصیل سے ہسٹری لینے اور معائنے کے بعد میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بج گئی کہ شاید انہیں کچھ خطرناک بیماری ہے۔ شاید کینسر۔ میں نے ان کی گھبرائی ہوئی بیٹی کی طرف دیکھا، پھر سوچ میں پڑ گیا۔ اب کیا ہوگا؟ داخلہ، بلغم، خون، کائیسٹ، برڈووا سکوپٹی، ایکس رے، سی ٹی اسکین، ایم آر آئی، آپریشن، کیموتھراپی۔ یہ تو بڑا خرچ ہو جائے گا۔ کیسے کریں گے یہ لوگ۔ پیچر کی آمدنی ادنیٰ ہی کتنی ہے۔

وہ لائڈھی میں رہتے تھے اور ایک گورنمنٹ سیکنڈری اسکول میں پڑھاتے تھے۔ تین سال ہوئے وہاں سے ریٹائر ہونے کے بعد گھر پر ایک ٹیوشن سینٹر کھول لیا تھا انہوں نے۔

میں نے انہیں کاؤچ پر لیٹے رہنے کو کہا اور ان کی بیٹی صاحبہ کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ "انہیں داخلہ

ڈاکٹر صاحب! خیر تو ہے نا۔ ابو ٹھیک ہیں نا؟" اس نے بہت پریشانی سے پوچھا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"نہیں، ٹھیک نہیں ہیں۔" میں کبھی بھی مریضوں سے ان کی تشخیص اور ان کی حالت چھپاتا نہیں ہوں۔ خاص طور پر مریضوں کے رشتے داروں سے۔ یہ بہتر ہے کہ مریض کے رشتے داروں کو پتا ہو کہ مریض کو کیا مرض ہے اور اس سے بھی زیادہ بہتر ہے کہ مریض کو بھی اندازہ ہو کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور اگر مریض کو کینسر وغیرہ ہو تو مریض کو یہ بتانا چاہیے کہ زندگی کتنی باقی ہے۔ مریض پریشان ضرور ہوتے ہیں، ڈپریشن ہو جاتے ہیں۔ بعض دفعہ ڈاکٹر پر ناراض ہونا شروع ہو جاتے ہیں لیکن یہ سب کچھ بہت کم وقت کے لیے ہوتا ہے۔ جلد ہی وہ اپنے آپ میں واپس آ جاتے ہیں۔ سوختے ہیں، سمجھتے ہیں اور اپنی باقی ماندہ زندگی کو پلان کر لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

"کیا ہوا ڈاکٹر صاحب! نہیں..... خدا نخواستہ، علاج تو ہو سکے گا نا؟" اس نے روہانسی آواز میں پوچھا تھا۔ "ٹھیک ہو جائیں گے نا۔؟" اس کی آواز میں پریشانی بھری ہوئی تھی۔

"دیکھیں ایسا ہے کہ انجی داخلہ ہوگا پھر کچھ ٹیسٹ کرائیں گے، ہم لوگ۔ ہو سکتا ہے کہ سب کچھ صحیح نکل آئے مگر شاید کوئی خطرناک بات بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا اندازہ ٹیسٹ وغیرہ کے بعد ہی ہونے لگا۔"

اسی وقت صائمہ نے مجھے بتایا کہ اس کا بھائی بھی ڈاکٹر ہے اور سندھ میڈیکل کالج سے پڑھ کر ڈاکٹر بنا ہے۔ نام سننے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ عامر کی بات ہو رہی ہے۔ "ارے، وہ تو میری کلاس میں تھا بلکہ میرا دوست تھا، اچھا دوست لیکن ایسے بچہڑے ہم لوگ کہ پھر بھی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ کہاں ہے وہ؟" میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

"وہ تو امریکا میں ہیں۔" اس کی آواز کی اداسی سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کے امریکا میں ہونے کے ساتھ ساتھ کوئی اور سلسلہ بھی ہے۔

پھر وہ آہستہ سے بولی۔ "ابو کو مت بتائیے گا ڈاکٹر

سنہری باتیں

☆ جب عمل پختہ ہو جاتی ہے تو گفتگو کم ہو جاتی ہے۔

☆ انسان سمندر میں ڈوب کر بچ سکتا ہے لیکن آنسوؤں میں ڈوب کر نہیں۔

☆ جسے ہارنے کا خوف ہوتا ہے، وہ ضرور ہارتا ہے۔

☆ خود کو بدل دو، قسمت خود بخود بدل جائے گی۔

☆ شیریں کلام اور خوش خلق کے ساتھ محبت واجب ہو جاتی ہے۔

☆ اسلام کے نقش قدم پر چلو کیونکہ اسلام کا دامن حکمت و دانائی کے موتیوں سے بھرا ہوا ہے۔

☆ ماں باپ کی خوشنودی دنیا میں باعثِ دولت اور آخرت میں باعثِ نجات ہے۔

مرسلہ۔ ریاضِ بیٹ، حسن ابدال

مشعلِ راہ

اے ابنِ آدم جب تو دیکھے تیرا پروردگار تجھے بے درپے نہتیں عطا کیے جا رہا ہے حالانکہ تو اس کی نافرمانی کر رہا ہے تو ہوشیار ہو جا کیونکہ درگزر کرنے میں اسی کا درجہ بلند ہے جو سزا دینے میں سب سے زیادہ قدرت رکھتا ہے۔ جو لوگ آپ سے اختلاف رکھتے ہیں ان کے بارے میں پریشان نہ ہوں۔ پریشان تو ان لوگوں کے بارے میں ہوں جو آپ سے اختلاف رکھتے ہیں لیکن اس کا اظہار نہیں کرتے۔ خیر یہ نہیں ہے کہ تمہارا مال اور تمہاری اولاد زیادہ ہو جائے بلکہ خیر یہ ہے کہ تمہارا علم زیادہ ہو اور تمہاری بردباری کی صفت بڑی ہو جائے اور اپنے رب کی عبادت میں تم لوگوں سے آگے نکل جاؤ۔

اے ابنِ آدم تو آج کے دن کی فکر کر اور آئندہ کی فکر طاری نہ کر۔۔۔۔۔ جلدی کرنے کی ضرورت نہیں اگر کل تجھے موت نہیں آئی تو کل کی روزی تیرے پاس خود ہی آجائے گی اور اچھی طرح سمجھ لے کہ تو اپنی ضرورت سے زیادہ جتنا کما رہا ہے وہ دوسروں کے لیے جمع کر رہا ہے۔

مرسلہ۔ وزیر محمد خان، ٹٹل ہزارہ

صاحب کہ میں نے آپ کو غامز بھائی کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ نام نہیں سنتا چاہتے اب بھائی کا۔ انہوں نے عاق کر دیا ہے ان کو۔ بس آپ جو کچھ کر سکتے ہیں کریں۔ میں جا کر بتاتی ہوں انہیں کہ داخل کرنا ہوگا۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی اور میں سوچتا رہا کہ نہ جانے کیا ہوا ہوگا باپ، بیٹے کے درمیان۔ عاق وغیرہ تو بڑے انتہائی اقدامات ہوتے ہیں۔

میں نے انہیں وارڈ کے سائڈ والے کمرے میں داخل کر لیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا روہم کے ساتھ تھا۔ عام طور پر ہم لوگ ڈاکٹروں کے جاننے والے مریضوں کو اسی کمرے میں داخل کرتے تھے۔ جنرل وارڈ اور جنرل وارڈ کے ڈیولپمنٹ کا تو برا حال تھا۔ سرکاری اسپتالوں کا جو حشر ہے ویسا ہی حشر ہمارے وارڈ کا بھی تھا۔ میں نے خود ان کے داخلے کا فارم بھرا اور ڈاکٹر شازیہ سے کہا کہ انہیں داخل کر کے جوئیٹ رکھے ہیں ان کے کرانے کا انتظام کرے۔

عام طور پر شام کو میں اسپتال نہیں جاتا ہوں۔ ویسے بھی سرکاری اسپتالوں میں سینئر ڈاکٹر کہاں جاتے ہیں۔ بارہ ایک بجے کے بعد، صرف جوئیٹ ڈاکٹر ہوتے ہیں اور ان کی مرضی سے اسپتال چلتا ہے۔ اس دن میں اپنے کمرے میں نہ جانے کیسے ایک ضروری خط بھول کر آ گیا تھا۔ اپنے پرائیویٹ کلینک جانے سے پہلے شام تقریباً پانچ بجے میں نے سوچا کہ اپنے وارڈ سے وہ خط لیتا چلوں۔ وارڈ کے باہر میں بے شمار لوگوں کو گھنڑا دیکھ کر حیران ہو گیا۔ عام طور پر مریضوں سے ملنے کے وقت پر جمع تو ہوتا ہے لیکن اتنے زیادہ لوگ میں نے بھی نہیں دیکھے تھے۔ اپنے کمرے سے خط لے کر میں زسوں کے کمرے کی طرف جا ہی رہا تھا کہ ڈاکٹر شازیہ مل گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ سارے لوگ میرے مریض سے ملنے آئے ہیں۔ مجھے یاد آ گیا کہ میں نے آج ایک مریض داخل کیا ہے۔ میں بھی انہیں دیکھنے چلا گیا۔

ان کا کمرہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ صاعقہ اور اس کی ماں وہاں موجود تھے اور مجھے دیکھ کر حیران ہو گئے۔ میں نے خیریت پوچھی تو ماسٹر صاحب نے مسکرا کر کہا۔ ڈاکٹر صاحب! یہ خیریت کہاں ہے، سارے اسٹوڈنٹ مجھے دیکھنے آئے ہیں، مجھے میں مرنے والا ہوں۔ آپ بتادیں

زورہ حصوں کو نکالا جائے گا، پھر بجلی بھی لگے گی اور وہاں بھی وی جائیں گی۔ کیونکہ راپی ہوگی ان کی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں کینسر کے خلاف دوائیں دی جائیں گی جن کا اپنا بھی ری ایکشن ہوتا ہے اور یہ دوائیں تھوڑی مہنگی بھی ہیں۔ ”دیکھتے ہیں کچھ کریں گے آپریشن کے بعد۔“ میں نے انہیں تسلی دی تھی۔

ان کے چہرے پر ایک رنگ آیا، پریشانی کی ایک لہر پھر وہ رک کر بولے تھے۔ ”ڈاکٹر صاحب! جو بھی علاج ہے وہ تو کرانا ہی ہوگا مگر یہ بتائیں کہ زندگی کی کتنی امید ہے۔ ایک خواہش تھی کہ بیوی کے ساتھ حج کر لوں۔ اس نیک بخت نے زندگی میں کوئی بھی خواہش نہیں کی مجھ سے۔ غربت میں، مجبوری میں، جیسی زندگی گزرتی رہی وہ بھی گزارتی رہی۔ ہر بات مانی ہے اس نے، ہر فیصلہ قبول کیا ہے میرا..... کیا حج ہو جاؤں گا؟ حج کر لوں گا؟ بچوں سے فارغ ہو کر ہوائی جہاز کا کرایہ جمع کر لیا ہے میں نے۔ بس اس سال نیت تھی میری حج پہ جانے کی کہ اب بیمار پڑ گیا، وہ بھی کینسر۔“

”ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ میں نے جواب دیا۔ دل میں آیا کہ میں عامر کے بارے میں پوچھ لوں، امریکا میں رہنے والے ڈاکٹر کے ماں باپ کے لیے حج و عمرہ کوئی مسئلہ تھوڑی ہے۔ ایک ہفتے سے بھی کم خواہ میں یہ سب کچھ ہو جاتا ہے۔ ایسی کون سی بڑی بات تھی مگر میں خاموش رہا، صاحب نے منع کیا تھا۔ صاحب نے بتایا تھا کہ بھائی کو عاق کے اب گیارہ سال ہو گئے ہیں، کسی سے بھی تعلق نہیں ان کا۔ امریکا سے پانچ سال کے بعد آئے تھے تو جیسے گھر میں بہار آگئی تھی۔ ابو نے ان کے سامنے ہی آپنی کی شادی کی تھی اور بھائی سے کہا تھا کہ اگلے دو سال کے بعد....

جسب، باجی کی شادی ہوگی تو اس کی بھی شادی کریں گے پھر دو سال کے بعد بھائی پھر آئے۔ باجی کی شادی ہوئی اور شادی کے بعد بھائی نے کہہ دیا کہ وہ کسی امریکن لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ ابو کے لیے یہ قابل قبول نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ عامر کو واپس آ جانا چاہیے، کراچی میں رہنا چاہیے، اس ملک میں جہاں اس کے باپ نے ماں نے زندگی گزارا ہے۔ اس کی مٹی سے بچے جن گھر بنایا ہے۔ بچوں کو پڑھایا ہے۔ اس ملک نے اس قابل کیا

ڈاکٹر صاحب کہ سب خیر ہے تاکہ مزید نہ آئیں اور وہ وہاں میں تو میں ویسے ہی گھر چلا جاؤں گا۔“ میں نے سوچا کہ ماسٹر صاحب بھی غضب کے ماسٹر ہوں گے۔ داخلے کے چھ سات گھنٹوں کے اندر اتنے لوگ ملنے چلے آئیں، ایسا تو میں نے کم ہی ہوتے دیکھا ہے۔ میں مسکرا دیا اور خدا حافظ کہہ کر باہر آ گیا۔ شاز یہ کو میں نے ہدایت دی کہ ماسٹر صاحب کو کھانسی کے لیے دوا دے کر رات کو سلا دے۔ کل میں بروکو اسکولپنی کا انتظام کروں گا پھر دیکھتے ہیں کہ کیا ہوتا ہے۔

میرے خدشات صحیح نکلے، ابتدائی رپورٹ سے ہی پتا لگ گیا کہ انہیں بروکو جے تک کاری تو ما ہے۔ یہ پیچھے پھڑے کا کینسر ہوتا ہے جو عام طور پر سگریٹ پینے والوں کو ہوتا ہے۔ مستقل دھواں جو سانسوں سے پیچھے پھڑوں میں جاتا ہے پھر پیچھے پھڑوں میں آہستہ آہستہ کینسر کو جنم دیتا ہے۔ کراچی میں تو کینسر کے لیے سگریٹ ضروری نہیں ہے کیونکہ شہر میں ٹریک کا دھواں اتنا کثیر ہے کہ سگریٹ سے بغیر بھی پیچھے پھڑوں کا کینسر ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کراچی کے اسپتالوں میں پیچھے پھڑے کے کینسر کے مریضوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ ماسٹر صاحب نہ سگریٹ پیتے تھے، نہ پان کھاتے تھے۔ صرف چائے پیتے تھے اور خوب پیتے تھے۔ سادہ سی زندگی تھی ان کی۔ تمام عمر حج سے شام تک اسکول میں پڑھایا تھا انہوں نے۔ جب تک اسکول میں پڑھاتے رہے نہ کوئی ٹیوشن سینٹر کھولا اور نہ ہی پیسے لے کر ٹیوشن پڑھائی۔ اسکول میں گھر میں جب بھی کوئی طالب علم کچھ پوچھنے آ گیا پڑھا دیا۔ یہی زندگی تھی ان کی۔ آج کل ایسے پتھر کہاں ملتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے گھر میں رہتے ہوئے ایک بیٹے کو ڈاکٹر بنایا تھا انہوں نے اور تین بیٹیوں کی شادیاں عزت سے کروا تھیں۔ اب سلیقہ مند بیوی کے ساتھ سلیقے سے اپنے چھوٹے سے گھر میں رہتے تھے۔ ان کے چہرے پر کوئی غصہ تھا نہ ظالم۔ ایک قسم کا سکون تھا ان کی شخصیت میں۔ میں سوچتا رہا، کھوجتا رہا، بوجھتا رہا کہ غربت کے باوجود بھی انسان خوش رہ سکتا ہے۔ کیا بغیر بھکے بھی کھڑا رہ سکتا ہے۔

ماسٹر صاحب کی تینوں بیٹیوں اور وانا سے بات کرنے کے بعد میں نے انہیں تفصیل سے بتا دیا کہ انہیں کیا ہوا ہے۔ ان کا سینہ کھولا جائے گا۔ پیچھے پھڑوں کے کینسر

انسان کو انتخاب کرنا پڑتا ہے، فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ پیار، محبت، وفاء، وعدے، زندگی گزارنا کسی ایسے کے ساتھ جس سے ذہن بھی ملا ہو، یہ ضروری ہے لیکن ہمارے سماج کے اپنے بھی تو کچھ اصول ہیں۔ صدیوں کے بنے ہوئے رشتے ہیں اور ان کے اپنے مطالبے ہیں۔ میں شاید وہ نہیں کرتا جو عامر نے کیا تھا لیکن سچی بات یہ تھی کہ میں کوئی فیصلہ دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور میں فیصلہ کرنے والا تھا بھی کون مگر سوچتے پر میرا کوئی اختیار نہیں تھا۔ ذہن جلتا رہا، سوچتا رہا اور خود ہی سمجھتا رہا۔

ماسٹر صاحب سے ملنے کے لیے آنے والے بہت سے لوگ مجھ سے بھی ملتے۔ بہت سے لوگوں کا فون آتا، ان کی خیریت معلوم کرنے کے لیے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ انہوں نے بڑی محنت، ایمانداری سے بچوں کو اسکول میں پڑھایا تھا۔ ایک تعلق، رشتہ تھا ان کا اپنے طالب علموں کے ساتھ جس کی بنیاد سادگی اور ایمانداری پر تھی۔ بہت محبت کرنے والے استاد رہے ہوں گے وہ، سچی تو لوگوں کا تانتا ہے کہ ٹوٹا ہی نہیں ہے۔

جس دن ان کا آپریشن تھا اس دن مجھے پتا چلا کہ لاٹھھی کے اس اسکول میں صبح اسمبلی کے بعد ان کے لیے دعا کی گئی ہے اور آپریشن تھیمز کے باہر اسکول کے ہیڈ ماسٹر، ٹیچروں اور اسکول کے بچوں کی ایک فوج بھی کھڑی تھی۔

صائمہ نے مجھے بتایا کہ آپریشن کی رات کو انہوں نے اپنے بڑے داماد کو بلا کر کہا کہ وہ اب سچ نہیں سکیں گے کیونکہ آپریشن ٹیور کو پیچھڑوں سے نکالنے کا مگر جسم کے دوسرے حصوں سے نہیں نکال سکے گا، زندگی شاید تھوڑی بڑھ جائے مگر سچ نہیں سکے گی۔ انہوں نے صبح کیے ہوئے ایک لاکھ اہتر ہزار دو سو ترالوے روپے کا ایک چیک بھی انہیں دیا اور کہا کہ بیٹے میں مروں کہ جیوں، مگر تمہیں اس رقم سے اپنی سانس کو بچ ضرور کرانا ہے۔ میرا اب کچھ نہیں ہو سکے گا، وہ سچ کر لے گی تو میں سمجھوں گا میرا بھی سچ ہو گیا۔ جتنی محبت اس نے ساری زندگی مجھ سے، میرے بچوں سے کی ہے اس کا بدل تو کوئی نہیں ہے لیکن اس کے دل کی یہ آرزو کہ وہ سچ کر لے، اگر پوری ہوئی تو میں سکون سے مرسکوں گا اور اگر میں مر گیا تو اس کے سچ کی خبر ہی میرے لیے جنت ہوگی۔

کہ امریکا جا کر امتحان پاس کرے، قابل بنے، پیسے کمائے اور اب اس قابل ہونے کے کچھ کر سکتو کہتے ہو کہ امریکی لڑکی سے شادی کر دے یعنی اب امریکا میں ہی رہو گے۔ یہ مجھے قبول نہیں ہے۔ مجھے ایسی زندگی گزارنے کا کوئی شوق نہیں ہے جس میں میں اپنے پوتوں کے لیے بے قرار رہوں، جو تمہارے بیٹے مگر میرے پوتے بھی ہوں گے۔ میری نسل، میرے باپ دادا اور پرکھوں کی نسل۔ میرا تشخص اسلام ہے، میں پاکستانی ہوں۔ تمہاری بیوی کرپشن ہوگی، امریکن ہوگی۔ اس بے چاری کا کیا قصور۔ وہ تو وہی کرے گی جو کرنا چاہے اسے۔

انہوں نے عامر کو سمجھایا۔ مجھے امریکی لڑکی سے کوئی پیر نہیں ہے، نہ اس پر میرا زور ہے، میرا تو تم پر بھی زور نہیں ہے، میرا تو کسی پر بھی زور نہیں ہے، میرا تو صرف اپنے پر زور ہے بیٹے۔ میں سمجھوں گا تمہاری موت ہوگئی، کسی ایکسیڈنٹ میں، کسی حادثے کا شکار ہو گئے تم۔ لوگ تو مرتے ہی ہیں، یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہوگی۔ میں سمجھوں گا تم مر گئے۔ ایک ذقہ ہی مرد گئے تاتے۔ میں روز روز نہیں مرنے چاہتا۔ واپس چلے جاؤ پھر نہ ملنا مجھ سے۔ جہاں رہو خوش رہو۔ مروے کے لیے تو دعا ہی کرتا ہے آدی، دعا ہی کریں گے ہم۔ بھائی پھر نہیں آیا۔ ابو نے ایسا ہی کیا جیسا کہا تھا انہوں نے۔ شروع شروع میں بھائی خط بھی لکھتا رہا فون پر بھی بات کرنے کی کوشش کی مگر ابو نے اسے بھلا دیا، جیسے وہ پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ ہم بھی ان کے سامنے کچھ نہیں بولتے ہیں بھائی کے ہارے میں اور یہی بات تو یہ ہے کہ کسی سے تعلق بھی نہیں ہے ان کا۔

میں نے صائمہ کو بتایا کہ ابھی سچ میں آٹھ مہینے باقی ہیں مجھے پتا نہیں ہے کہ کیا ہوگا۔ ٹیور کتنا بڑا ہے، علاج کے قابل بھی ہے کہ نہیں۔ کوشش تو یہی ہوگی کہ ماسٹر صاحب اچھے ہو جائیں اور اگر سچ کر سکیں تو بہت ہی اچھا ہے مگر مجھے لگتا ہے شاید یہ ممکن نہ ہو سکے۔

صائمہ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ میں سوچتا رہا کہ انسان کیا سوچتا ہے اور کیا اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ عامر بڑا اچھا دوست تھا میرا۔ بہت اچھی طرح زندگی گزار رہی تھی اس نے کالج میں، سلجھا ہوا بندہ تھا وہ پکڑے کیوں کیا اس نے ایسا؟ بہت کچھ چھوڑ دیا۔ گھر، ماں، باپ، بہنیں، لاٹھھی، کراچی، پاکستان۔ زندگی میں

ہوئے تھے۔ پھر کمزور اور نڈھال سا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی محسوس کی تھی میں نے۔ مجھ سے ہاتھ ملا کر آہستہ سے انہوں نے شکر یہ ادا کیا تھا میرا۔

”شکر یہ، ڈاکٹر صاحب! بہت خیال رکھا ہے آپ نے۔ خدا خوش اور زندہ رکھے آپ کو کہ آپ علاج کرتے رہیں ہم جیسے لوگوں کا۔ زندگیاں بانٹتے رہیں اسی طرح، خوش رہو ہمیشہ خوش رہو بیٹے۔“

”لیکن آپ علاج کرنے کہاں وے رہے ہیں۔“ میں نے فوراً ہی جواب اس طرح سے دیا کہ گفتگو جلدی آگے بڑھ سکے۔ ”میرا مطلب ہے کہ آپ استحقاق کے فارم پہ دستخط کر دیں کیونکہ استحقاق تو جتنا ہے آپ کا۔ اس کے بعد ہم لوگ دوا منگوا کر فوراً ہی علاج شروع کر دیں گے۔ آج کل بہت اچھی دوا آئی ہوئی ہیں اور سارے کینسر کے مریضوں کا علاج اب ہر ماہ ہے۔ تھوڑا سی ایکشن ضرور ہوتا ہے۔ بالی گر جاتے ہیں الٹی ہوتی ہے مگر زندگی مل جاتی ہے تھوڑی سی اور۔ بس اب آپ دستخط کر دیں تاکہ میں دوا میں منگوا سکوں۔“

وہ تھوڑی دیر بیٹھے دیکھتے رہے پھر آہستہ سے بولے۔ ”استحقاق تو جتنا ہے بیٹے تم صحیح کہہ رہے ہو۔ غریب آدمی ہوں میں۔ اتنا مہنگا علاج نہیں کرا سکتا۔ علاج تو زکوٰۃ سے ہی ہونے چاہئے گا۔“ یہ کہہ کر وہ کچھ خاموشی سے ہو گئے پھر آہستہ سے گلا کھٹکھٹا کر کے انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ ”مگر بیٹے یہ جن لوگوں نے زکوٰۃ نکالی ہے اپنی آمدنی، اپنے منافع سے انہوں نے کوئی فارم بھرا ہے کہ جس آمدنی اور نفع پر یہ زکوٰۃ نکالی گئی، وہ آمدنی، وہ نفع کسی لوٹ مار، اسمگلنگ، بے ایمانی، بلیک مارکیٹنگ، رشوت و حاندانی سے حاصل نہیں کی گئی ہے۔ کوئی فارم بھرا ہے انہوں نے زکوٰۃ دینے سے پہلے کہ کسی اور کے استحقاق کو پامال نہیں کیا ہے ان لوگوں نے؟“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئے اور پھر انہوں نے آہستہ آہستہ رک رک کے کہا۔ ”بھیرا اس فارم کے یہ فارم تو بے معنی ہے۔“

اور اتنی گہری سوچ پر میں صرف انہیں دیکھتا ہی رہ گیا۔



میرے دل میں بس جانے کیا کیا خیال آئے۔ میں نے سوچا کہ شاید زندگی میں کبھی انہوں نے غلطی بھی نہیں بھیجا ہو گا اپنی بیوی کو، کوئی کارڈ نہیں لکھا ہو گا اور شاید منہ سے ایک بار اپنی محبت کا اقرار بھی نہیں کیا ہو۔ شاید انہیں پتا بھی نہ ہو کہ ان کی سالگرہ کا کون سا دن ہے؟ کس رنگ کا جوڑا دینا چاہیے؟ کیسا کیک ہونا چاہیے؟ اور شاید ان کی بیوی کو اس کی ضرورت بھی نہیں ہوگی لیکن آج کا کوئی پیمانہ اس محبت، الفت کی اتھاہ گہرائیوں کو ناپنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ محبت جو بڑی خاموش ہوتی ہے، اچھی ہوئی، سادہ، صرف گرم احساس لیے ہوئے۔

آپریشن تو ہو گیا اور پیچھے پھڑوں سے ٹیبر پتتا ممکن تھا، نکال بھی دیا گیا اور ساتھ ہی فیصلہ کیا گیا کہ انہیں اب کیموتھراپی کی ضرورت ہے۔ تین مختلف دواؤں کو مشترکہ طور پر دینا تھا۔ کم از کم سات دفعہ اور ہر دفعہ کی ڈوز کی قیمت تقریباً پینتیس ہزار روپے تھی۔ سرکاری اسپتال میں آپریشن تو تقریباً مفت میں ہو گیا مگر کیموتھراپی کے لیے حکومت کے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ مریض کو خود ہی دینا پڑتے ہیں یا پھر خیرات زکوٰۃ کے پیسوں سے ممکن تھا۔ میں نے شازیہ سے کہا کہ زکوٰۃ کے فارم وغیرہ بھریں کیونکہ ان کے مالی حالات تو ایسے نہیں تھے کہ وہ خود اتنا مہنگا علاج کرا سکتے۔ بیٹیاں شاید مل کر پیسے جمع کر لیں مگر یہ بھی ایک طرح سے بوجھ ہوگا اور پھر زکوٰۃ کے فنڈ میں رقم موجود تھی۔ فارم کے بعد میں خود بیوی کروں گا اور دواؤں کا انتظام ہو جائے گا۔

دوسرے دن شازیہ نے بتایا کہ انہوں نے زکوٰۃ کے استحقاق کے فارم پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا ہے اور ساتھ ہی بیٹیوں کو بھی منع کر دیا ہے کہ کیموتھراپی کے لیے پیسے نہ جمع کریں۔

مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ماسٹر صاحب نے معافے کو خواہ مخواہ پیچیدہ بنا دیا ہے۔ ان کے دستخط کے بعد بہت آسانی کے ساتھ ان کا علاج شروع ہو سکتا تھا مگر نہ جانے کیوں انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا۔ میں نے سوچا کہ میں خود ہی ان سے بات کر لیتا ہوں۔

اس دن وہ مجھے ذرا کمزور سے لگے تھے۔ آپریشن کے بعد ایسا لگتا ہے۔ صائمہ نے کرا بہت صاف ستھرا کیا تھا۔ صاف ستھرا ہونے سے وہ تین تکیوں سے نیک لگ کر لیٹے



بچائے فروخت

منظرِ امان

کبھی کبھی مجبوری میں انسان کوئی ایسا انتہائی قدم اٹھاتا ہے جس کا مقصد ناپابل برداشت دکھ سے چھٹکارا پانا یا لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا ہوتا ہے مگر بدنیت انسان ان ہمدردیوں کا بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے۔ جیسا کہ یہاں... وہ بیوپاری بھی اپنے جگر گوشوں کو غیروں کی آغوش میں دے کر مطمئن تھا کہ لوٹ کر تو اسی کے آنگن میں یہ کبوتر اتریں گے۔

رشتوں کی حجازت اور... فطرت لوگوں کے مابین بچھتا

دفتر جا کر وہ مسرور فیات میں انہیں بھول گیا تھا مگر جب واپسی میں اس نے پھر اس شخص کو اسی جگہ ان ہی بچوں کے ساتھ دیکھا تو گاڑی روک کر ان کے پاس آ گیا۔ ”بھائی صاحب! کیا آپ صبح سے یہیں کھڑے

وہ ایک درد بھرا دل رکھنے والا انسان تھا۔ دفتر جاتے ہوئے اس نے پریس کلب کے سامنے ایک محقول صورتِ شخص کو دیکھا جو دو عدد بچوں کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ بچے نو دس برس سے زیادہ عمر کے نہیں تھے۔

ہیں؟“ اس نے پوچھا۔
 ”ہاں بھائی!“ اس آدمی نے ایک گہری سانس لی۔
 ”کئی گھنٹے ہو گئے ہیں کھڑے ہوئے۔“
 ”لیکن کیوں؟“

”تو کیا کروں..... کوئی مناسب خریدار ہی نہیں ملا۔“ اس نے بتایا۔
 ”کس چیز کا خریدار؟“ انور نے حیرت سے پوچھا۔

”ان دونوں بچوں کا۔“ اس نے بتایا۔ ”میں انہیں بیچنے نکلا ہوں۔“ پھر اس نے ایک بچے کی طرف دیکھا۔
 ”بابی! انکل کو اپنے دانت دکھاؤ۔“
 بابی نامی اس بچے نے انور کو اپنے صاف ستھرے دانت دکھا دیے۔ پھر اس نے دوسرے سے کہا۔ ”ٹوٹی! انکل کو اپنے ناخن... چیک کراؤ۔“

”جناب! آپ کے بچے بالکل صاف ستھرے ہیں۔“ انور جلدی سے بولا۔ ”لیکن آپ انہیں کیوں بیچ رہے ہیں؟“
 ”تو اور کیا کروں جناب..... کون اپنی مرضی سے اور اپنی خوشی سے اپنے بچے بیچتا ہے۔“ اس نے کہا۔ ”یہ بچے کھانے تک کو ترس کر رہ گئے ہیں۔ اب میرے پاس دو ہی طریقے ہیں..... یا تو ان کو زہر دے کر مار دوں یا پھر ان کو بیچ دوں۔“

”اچھا یہ بتاؤ، کیا دام لگا یا ہے؟“
 ”یہ بڑا دالا ہے بابی پچیس ہزار کا۔“ اس نے بتایا۔ ”بابی انکل کو وہ انکلش کی لٹم سٹاؤ۔“
 بابی نے ابھی بڑھنا ہی شروع کیا تھا کہ انور جلدی سے بولا۔ ”او کے اد کے..... میں سمجھ گیا۔ پڑھے لکھے بچے ہیں اور یہ چھوٹا والا۔ یہ کتنے میں دے رہے ہیں؟“

”اس کا نام ٹوٹی ہے اور یہ بیس ہزار کا ہے۔“
 ”اگر کسی ایک کو لینا چاہوں تو؟“
 ”نہیں جناب! ایسا ہے تو۔ جوڑی یعنی ہوگی۔“ اس آدمی نے کہا۔ ”ان دونوں میں بہت محبت ہے۔ یہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔“

انور کو خود بچوں کی ضرورت تھی۔ گھر میں دو ہی افراد تھے۔ انور اور اس کی بیوی اسما۔ شادی کو پانچ برس گزر چکے تھے لیکن اولاد کے آثار نہیں پیدا ہو سکے تھے۔ اسما نے بچوں کی بہت سی تصویریں جمع کر رکھی تھیں۔ وہ ان کو دیکھ دیکھ کر روتی رہتی تھی۔ محلے کے

انور کو خود بچوں کی ضرورت تھی۔ گھر میں دو ہی افراد تھے۔ انور اور اس کی بیوی اسما۔ شادی کو پانچ برس گزر چکے تھے لیکن اولاد کے آثار نہیں پیدا ہو سکے تھے۔ اسما نے بچوں کی بہت سی تصویریں جمع کر رکھی تھیں۔ وہ ان کو دیکھ دیکھ کر روتی رہتی تھی۔ محلے کے

”سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دونوں ہی بہت

کاش...

کاش کا لفظ بہت چھوٹا سا ہے۔ اس کو بول کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سمندر کی موجیں آپس میں ملنے کے لیے بے تاب ہو رہی ہوں۔ جیسے مٹی ایک مقام سے اڑ کر دوسرے مقام تک جانے کی آرزو کر رہی ہو۔ یہ لفظ بار بار کہنے کی وجہ سے انسان کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ ایسے جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ کچھ لفظ انسان کو بکھیر دیتے ہیں اور اس کو مکمل طور پر بے صبر بنا دیتے ہیں۔

’کاش‘ بھی انہی الفاظ میں سے ایک ہے۔ یہ بہت چھوٹا سا لفظ ہے مگر اس لفظ میں اضطرابی کیفیت اور بے چینی بہت زیادہ ہے۔ کاش کا لفظ ہر دم استعمال کرنے والوں کے دلوں میں ہر آن بے چینی رہتی ہے اس لیے اس لفظ کا استعمال کم ہی کریں۔

مرسلہ۔ احسان سحر، میانوالی

نشیخی خورایے

تین دوست اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ وہ پیسے کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں کرتے۔ پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے جیب سے دس روپے کا ایک نوٹ نکالا اور اسے ماچس کی تلی جلا کر راکھ کر دیا۔ دوسرے نے جیب سے بیس روپے کا نوٹ نکالا اور اسے جلا کر راکھ کر دیا۔ تیسرے نے ہنس کر کہا۔ ”ہنس اتنی ہی ہمت تھی۔ پندیکھو۔“ اس نے جیب سے چیک بک نکالی، ایک چیک بھاڑ کر اس پر ایک ہزار روپے لکھے اور اسے لائٹر کے شعلے سے راکھ کر دیا۔“

لومڑی اور چھتری

ہالی وڈ کی ایک اداکارہ ایک دکان پر لومڑی کی کھال کا کوٹ خریدنے گئی۔ دیر تک چمک چمک کرنے کے بعد کوٹ پسند کیا۔ دام چکانے کے بعد بولی۔ ”یہ کوٹ بارش میں بھیگ تو نہیں جائے گا۔“ دکاندار جو پہلے ہی اس کی بے تکی بحث سے تنگ آچکا تھا، جھلا کر بولا۔ ”محترمہ! آپ نے کسی لومڑی کو بارش میں چھتری لگائے دیکھا ہے؟“

مرسلہ۔ ریاض بیٹ، حسن ابدال

پیارے دانے ہیں۔“ وہ آدمی ایک بچے کی طرف دیکھ کر مخاطب ہوا۔ ”بابی! ذرا فلائنگ گلک لگا کر دکھاؤ۔“

”نہیں۔ نہیں، میں سمجھ گیا ہوں کہ تمہارے دونوں بچے بہت ہوشیار ہیں لیکن ایسا نہ ہو کہ بعد میں کوئی قانونی چکر پڑ جائے۔“

”کوئی قانونی چکر نہیں پڑے گا۔“ وہ آدمی جلدی سے بولا۔ ”میں باقاعدہ حلف نامہ دینے کو تیار ہوں اور کورٹ میں معاملات طے ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے۔ تو کل یہیں آ جانا۔ میں دونوں کو خرید لوں گا۔“

انور نے گھر آ کر اسما کو بتایا۔ ”نیک بخت! اب تو خوش ہو جاؤ۔ تمہارے لیے بندوبست ہو گیا ہے۔“

”میرے لیے کس کا بندوبست کر دیا؟“

”دو بچوں کا۔ دونوں کو خرید کر لار ہا ہوں۔ صرف پینتالیس ہزار میں۔“

”یہ تو بہت ظلم کی بات ہے۔ آپ بچوں کو ماں باپ سے الگ کر رہے ہیں۔“ اسما نے کہا۔

”ارے وہ بچے خود ہی الگ ہونے کو تیار ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔“

”اور ہیں کیسے؟“

”بہت پیارے۔ بہت کیوٹ۔“ انور نے بتایا۔

”انہیں دیکھ کر تمہارا دل خوش ہو جائے گا۔“

”تو جائیں، خدا کے لیے جلدی لے کر آجائیں۔“

”کل ملیں گے۔ قانونی کارروائی بھی تو مکمل کرنی ہوگی۔ ان کے لیے کرا تیار رکھنا۔“

دوسری صبح انور نے بینک سے پینتالیس ہزار نکالے اور اس جگہ پہنچ گیا۔ وہ آدمی اپنے وعدے کے مطابق دونوں بچوں کو لیے کھڑا تھا۔

”آئیں جناب۔“ اس نے کہا۔ ”یہ دونوں تو کب سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

ایک گھنٹے کی کارروائی کے بعد دونوں بچے انور کے حوالے کر دیے گئے۔ اس آدمی نے دونوں بچوں کو پیار کرتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو، ابو کو زیادہ تنگ مت کرنا۔“

”یہ میرے ابو نہیں ہیں۔“ بابی نے احتجاج کیا۔

”نہیں بیٹا۔ آج سے ان ہی کو اپنا ابو سمجھو۔ یہ تمہیں کھلائیں گے، تمہاری پرورش کریں گے۔ تمہارا خیال

اور کھمانے بھی لے جائیں گے؟“ ٹونی نے

دیکھا۔“ انور پیلیز! واپس کر آؤ ان بچوں کو۔“

”کیا پاگل ہو گئی ہو۔ ان بچوں پر پینٹا لیس ہزار روپے خرچ ہوئے ہیں۔“

”اب تو ہم بھی کہیں نہیں جائیں گے۔“ ٹونی نے

کہا۔“ واہ، ایک تو اتنی مشکل سے اپنے گھر سے جان چھوٹی ہے اور آپ لوگ ہمیں دوبارہ بھیج رہے ہیں۔“

”اچھا بابا! کوئی نہیں بھیج رہا۔“ انور زچ ہو گیا تھا۔

”تم دونوں کو سیکس رہنا ہے۔“

اسانے ان دونوں کے لیے ایک کراٹھیک کر دیا تھا۔ اس میں ان کی ضرورت کی ہر چیز تھی۔ ان کی تفریح کے لیے کمرے میں ایک ویڈیو گیم بھی رکھ دیا گیا۔

انور اور اسما بچوں کو کمرے میں بھیجنے کے بعد بہت دیر تک ان ہی کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

کس اسکول میں ایڈمیشن دلانا ہے، ان کی ڈریننگ کیسی ہونی چاہیے، ان کو ایڈاپٹ کرنے کی خوشی میں تقریب کب ہو۔

دروازے پر ہونے والی دستک نے دونوں کو چونکا دیا۔ انور نے دروازہ کھولا۔ ٹونی کھڑا ہوا منہ بسور رہا تھا۔

”کیا ہوا بیٹا؟“ انور نے پیار کرتے ہوئے پوچھا۔

”ابو! مجھے اس کمرے میں نہیں سونا۔“ ٹونی نے کہا۔

”میں تو آپ دونوں کے ساتھ سوؤں گا۔“

”ہم دونوں کے ساتھ؟ نہیں بیٹا، تمہارے لیے وہ الگ کمرہ ہے۔ تم وہاں سو گے۔“

”نہیں۔ میں بابی کے ساتھ نہیں سوؤں گا اور اگر آپ نے نہیں سلا یا تو پھر میں زور زور سے روتے لگوں گا۔“

”اچھا اچھا روتے کی ضرورت نہیں ہے، آ جاؤ۔“

اسانے اسے دیکھ کر اپنا سر پیٹ لیا تھا۔ ”یہ تم اس کو کیوں لے کر آ رہے ہو؟“

”بچہ ہے۔ ہمارے ساتھ سونے کی ضد کر رہا ہے۔“ انور نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”ہاں ای! صرف آج رات۔“ ٹونی نے کہا۔

”صرف ایک رات آپ دونوں کے ساتھ سونا ہے اور کل سے اپنے کمرے میں سوؤں گا اور بھائی آپ دونوں کے ساتھ سوئے گا۔“

”کیا! پھر بابی سونے کے لیے آ جائے گا؟“

”ہاں ای۔ باری باری..... ایک رات میں تو ایک

”کیوں نہیں بیٹا۔ خوب میرا دل گا۔“

”اب جاؤ تم دونوں۔“

بچے بھی عجیب مزاج کے تھے۔ انہوں نے مز کر بھی باپ کی طرف نہیں دیکھا اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ”ابو! یہ گاڑی آپ کی ہے؟“ بابی نے راستے میں پوچھا۔

”ہاں بیٹا۔ یہ میری ہے۔“

”لیکن میرے اسی ابو کے پاس تو بائیک بھی نہیں ہے۔“

”بھائی تمہیں نہیں معلوم۔“ ٹونی نے جیسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”جو ابو اسی ہوتے ہیں، ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا اور جو لگی ہوتے ہیں، ان کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔“

انور بچوں کی باتیں سن کر مسکرا رہا تھا۔ یہ اچھی بات تھی کہ بچے کچھ بے پروا قسم کے تھے۔ ورنہ ماں باپ سے جدا ہو کر آسمان سر پر اٹھالیتے۔

اسانے والہانہ انداز میں دونوں بچوں کا استقبال کیا تھا۔

”بچو!“ انور نے اسما کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ تمہاری امی ہیں۔“

”یہ کیسی امی ہیں بابی۔“ ٹونی نے بابی سے پوچھا۔

”بھائی! اب یہ چھٹی بھی ہیں، ان ہی پر گزارہ کرو۔“ بابی نے کہا۔

انور اور اسما دونوں یہ جملہ سن کر حیران رہ گئے تھے۔ کم بخت نے اپنی عمر سے بڑی بات کہہ دی تھی۔ انور کا تو جو بھی رو عمل ہو لیکن اسما بھنا کر رہ گئی تھی۔ ”خدا کی پناہ۔ یہ تم کیسے بچوں کو پکڑ کر لائے ہو۔“

”اسما! جلدی میں یہی ملے تھے لیکن ہیں بہت ذہین۔“

”ان کی ذہانت تو ابھی سے پتا چل رہی ہے۔“

”ای۔“ بابی نے اسما کی طرف دیکھا۔ ”بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔ کھانے میں کیا ہے؟“

”واہ۔ کیا بچے ہیں۔“ اسما بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔

”ابو! آپ بہت اچھے ہیں۔“ ٹونی نے کہا۔ ”لیکن یہ جو امی ہیں، یہ کچھ پاگل معلوم ہوتی ہیں۔“

”ارے تو خود پاگل ہو گا۔“ اسما کی آواز آئی۔ اس نے ٹونی کی بات سن لی تھی پھر اس نے انور کی طرف

ابو، ٹوٹی نے انور کی طرف آنے کی کوشش کی۔
 "انور صاحب! یہ کیا سلسلہ ہے۔ یہ بچے آپ کے
 کیسے ہو گئے؟"

"یہ ایک درد بھری داستان ہے اکرم بھائی۔ آپ
 یہ بتاؤ ہوا کیا ہے؟"

"اب کیا بتاؤں۔ یہ دونوں بچے میرے گھر میں
 کھس گئے تھے۔" اکرم نے بتایا۔ "پھر ایک عجیب حرکت
 کی کم بختوں نے..... سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے بچوں کو
 کیسی تربیت دی ہے۔ پھر اب سے پہلے تو ان کو کبھی نہیں
 دیکھا۔ پھر یہ اچانک آپ کے بچے کہاں سے ہو گئے۔"

"میں نے بتایا تاکہ یہ ایک درد بھری داستان ہے
 لیکن آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"وہ بھی ایک درد بھری داستان ہے انور بھائی۔"
 اکرم نے کہا پھر اپنی آواز نیچی کی۔ "یہ کم بخت مجھ سے کہہ
 رہا تھا انکل، انگلش فلموں میں جس طرح پیار کرتے ہیں،
 آپ بھی آئی کو اسی طرح پیار کریں۔"

"لاخول ولا۔" انور اچھل پڑا۔ "مخاف کرنا اکرم
 بھائی۔ میں ابھی ان کے دماغ درست کرتا ہوں۔"

وہ دونوں بچوں کو پکڑ کر گھر لے آیا۔ "چلو بچو.....
 اب تم دونوں اپنے گھر جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"
 "ہاں ہاں، واپس کریں کم بختوں کو۔ یہ اگر رہ گئے
 تو پھر ہم محلے میں نہیں رہ سکیں گے۔"

ایک گھنٹے کے بعد انور دونوں بچوں کو لے کر ان
 کے باپ کے پاس کھڑا تھا۔ "خدا کے لیے بھائی۔ اپنے
 بچے واپس لے لو۔" اس نے کہا۔

"اب تو یہ نہیں ہو سکتا جناب۔ آپ سو دے سے
 انکار نہیں کر سکتے۔ اب میں آپ کو پیسے کہاں سے واپس
 کروں گا۔ وہ تو سب ادھار میں چلے گئے۔"

"ارے بابا! تم سے پیسے کون واپس مانگ رہا
 ہے۔ بس تم اپنی امانت کو سنبھالو۔ ہمارے لیے یہی
 بہت ہے۔"

"مرضی ہے آپ کی۔ چھوڑ جائیں دونوں کو۔"
 دوسری شام کو دفتر سے واپسی پر انور کو وہی آدمی
 ایک فائیو اسٹار ہومل کے سامنے بیٹھا ہوا دکھائی دے
 گیا۔ اس کے ساتھ وہی دونوں بچے تھے اور اس کے
 ہاتھ میں ایک پلے کارڈ تھا جس پر لکھا تھا..... "بچے برائے
 فروخت۔"

رات باہی۔ پھر ایک رات باہی تو ایک رات میں۔
 "انور! اب یہ بچے ناقابل برداشت ہوتے
 جا رہے ہیں۔" اساد حیرے سے بولی۔

"ای! آپ اور ابو باتیں کرتے رہیں۔ میں کچھ
 نہیں من رہا۔" ٹوٹی نے دونوں کے درمیان لیت کر
 آنکھیں بند کر لی تھیں۔

ٹھیک چار بجے کے قریب باہی بھی اپنے بھائی کو
 ڈھونڈتا ہوا اس کمرے میں پہنچ گیا تھا۔ انور کو اسے بھی اسی
 بستر پر سلا تا پڑا تھا۔

"انور! کیا تم مجھے پاگل کرنے کے لیے ایسے بچے
 اٹھا کر لے آئے ہو؟" اساد انت پیٹتے ہوئے بولی۔
 "ارے تو مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ دونوں ایسے نکلیں
 گے۔"

"میں تو کہتی ہوں کہ ان کے باپ نے انہیں بیچا
 نہیں ہے بلکہ ان سے جان چھڑائی ہے۔"
 "اب کچھ بھی ہو۔ یہ بچے ہمارے گھر کے ہیں۔

ہمارے اپنے ہیں۔ ہمیں ان کے ساتھ ہی گزارہ کرنا
 ہے۔"

"آپ دونوں اتنی باتیں کیوں کرتے ہیں۔" ٹوٹی
 اچانک بول پڑا۔ "کیا آپ لوگوں کو نیند نہیں آتی؟...
 خواجواہ ہماری خیند بھی برباد کر رہے ہیں۔"

"میرے خدا! یہ بچے ہیں یا مصیبت ہیں۔" اسما
 بوکھلا کر بولی۔

"یہ تمہارا ہی شوق تھا۔ اب خود ہی بھگتو۔"
 دوسرے دن وہ لوگ بہت ذیر سے اٹھے۔ دونوں
 بچے کمرے میں نہیں تھے۔ "خدا کی پناہ..... کہاں چلے
 گئے دونوں؟" انور نے پریشان ہو کر کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ
 بھاگ گئے ہوں۔"

"بھاگ جائیں تو اچھا ہی ہے۔"
 "کیسی بات کر رہی ہو۔ ہم قانونی چکر میں پھنس
 جائیں گے۔ میں باقاعدہ عدالت سے لے کر آیا ہوں
 دونوں کو۔ عدالت ہماری جان کھا جائے گی۔"

کچھ دیر بعد باہر سے شور و غل کی آوازیں آنے
 لگیں۔ انور اور اسما دوڑتے ہوئے گیٹ پر پہنچے۔ محلے
 کے ایک شخص نے دونوں بچوں کے ہاتھ تھام رکھے تھے
 اور زور زور سے شور کیے جا رہا تھا۔ "نالائق، بدتمیز..... نہ
 جاننے کی ادا لادیں۔"

انور اور اسما دوڑتے ہوئے گیٹ پر پہنچے۔ محلے
 کے ایک شخص نے دونوں بچوں کے ہاتھ تھام رکھے تھے
 اور زور زور سے شور کیے جا رہا تھا۔ "نالائق، بدتمیز..... نہ
 جاننے کی ادا لادیں۔"

"ای! پابی اسما کو دیکھ کر ٹھنکا۔"



صحیح الدین نواب

انتیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسین ہمو یا قوس قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پرے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا باد و باران کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... پرشے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ

Downloaded From
Paksociety.com



Downloaded From
Paksociety.com

LEADING
ACTION



یہ داستان ہے دو بھائیوں کی ماری اور اس کے عاشق مراد علی منگلی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماری، چاچا جمرو اور چاچا بیٹی کے ساتھ عمروں سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا ڈیرا شہت جلائی ایک بددیت انسان تھا جس نے ماری کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا جو تک ماری مراد کی منگلی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوشہ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا ڈیرا شہت کی منگلی گیری کرتا تھا۔ ڈیرا شہت جلائی اور اس کے بیٹے روائی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جاگہ اور بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زینت کی شادی قرآن سے کر دی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ دلچنانہ بغاوت کا راستہ اپنا یا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی نکاحیوں کا سامنی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہو گیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضائقہ علاقے میں گوشہ آگئے جہاں ماری اپنے چاچا چاچا کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ ہمیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ شہت جلائی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کر چکا تھا۔ اس کے استعمار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد دلچنانہ نے اپنی ماں کے تھکان سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کر لی اور خاموشی سے فرار ہو گئی۔ ڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرانی۔ تاکای پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرائی جو کہ دلچنانہ کے ہی قاتل کا گھر کی تھی بر باد کر کے گل کر دیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے آ کر کے اسے اپنی بیٹی کا چہرہ کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سر پرست اس کے والد کے زمانے کے مصروف نچلی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سیرا کو سیکرٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماری کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دلدادہ جان سے مرعوب لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی معنوعات کے لیے یہ طور ماڈل ماری کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی دلچنانہ کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہو گیا۔ دلچنانہ مراد کے بیٹے کو جنم دے کر دوسرے بیٹے کی پیدائش کے دوران چل بس لیکن ڈیرے پر اب اور بیٹوں کو خیر نہیں تھی کہ نہ دلچنانہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں راجہ جاتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہذا انہیں خیر نہیں کی۔ مراد قاتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماری کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کر رہا تھا۔ اسی باعث اس کی ڈیرا شہت سے دشمنی ہو گئی۔ یوں ماری کے دشمنوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوشہ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بھالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کوہا کرنے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہو گیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے بھانسا دیتے ہوئے اس کے کھینچے سے فرار ہو گیا۔ جبکہ دوسری جانب سیرا اور نچلی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مرینہ اپنے باپ کے گل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ ماری چاچا اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہو گیا کہ مرینہ ماری کو جام تھارو کے چودھری کے پاس لے جا رہی ہے لہذا مشکلات سے تندر آ کر ماوتے ہوئے اس نے ماری کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔ لیکن بد قسمتی سے ماری کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر چل کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے داخلہ جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہو گیا۔ مرینہ اور مراد میں نساہت بڑھتا جا رہا تھا۔ مرینہ کے پالتو فطرت سے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کر لے گئے۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوا جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو یو کے ساتھ مل گیا۔ مرینہ کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ادھر ماری کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آ گئی۔ مراد مرینہ کے زیر اثر آچکا تھا۔ ماری کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کر دیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ MET فیئر بن گئی تھی۔ مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر ٹینی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کر والی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے چہرے سے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہتے تھے۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کبڈی بھی آ گیا۔ ادھر مرینہ اپنے چاچا چاچا کی تھی۔ مراد نے اسے قابو کر کے اس کی سرجری کرادی اور ایک ایمپلینٹ لگا دیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈاکٹر ٹینیسن کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرا نکل گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر ٹینیسن کے بیٹے ایمان سے ہوئی۔ مرینہ بھی اسرا نکل چکی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بند کرنے لگا۔ مراد کو لندن والی فلاح میں سبکی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے سبکی براؤن کی بیٹی لگ گئی۔ ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد کے اس سے ملنا چاہا تاہم ایمان دشمنوں کی فائرنگ سے زخمی ہو کر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد نہیں ہے۔ مراد پاکستان گیا اور ماری کو لے کر لندن آ گیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماری اس سے دور ہو گئی اور پاکستان آ گئی۔ ادھر مراد دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کر کے انڈیا پہنچ گیا اور سبکی براؤن کی بیٹی کے پیچھے لگ گیا اور اسے اغوا کر لیا۔ تاہم بعد میں اسے چھوڑ دیا مگر میڈونا کو مرینہ سے بچانے کے لیے مراد اسے لے کر نکل پڑا لیکن مرینہ نے راستے میں اسے صحاب لیا۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا۔ مراد اور مرینہ شدید زخمی ہوئے۔ دونوں علاج کے باعث چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے۔ مرینہ اور مراد میں پھر صلح ہو گئی۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھانا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آرہی تھی۔ ادھر ماری سب کچھ چھوڑ

جھاڑ کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سے سرجری کے ذریعے تھپیل کر لیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجا دیا مگر وہ اس کا پورا پورا تقاضا اور اسے دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے خباروں کے ذریعے ماروی تک اپنا پیغام پہنچانا چاہا اور کئی خباروں میں دو لفظانے باندھ کر انہیں اڑا دیا۔ انہیں آری نے خباروں کو چیک کر کے انہیں آگے بڑھانے کا منصوبہ بنایا۔ وہ اس کے ذریعے مراد اور ماروی تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اب وہ خبار سے مطرب کی سمت جا رہے تھے۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے لگا یا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الرٹ ہو گئے اور وہاں خون کی ہولی پھیل جانے لگی۔ درگاہ نے مراد کو وہاں سے بھگائے نکال لیا تاہم بشری اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت گھائل ہو گئی اور اس کی کمری ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کر لیا گیا۔ وہ طیارہ ریاست باب النساء میں اترتا تاہم مراد نے جان پر کھیل کے ہائی جیکر کو زیر کر لیا۔ مراد لگے لگا کر کامہان بن گیا۔ لگنے مراد کی باتوں سے اعزازہ لگا لیا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مراد نے بھی قبول کر لیا۔ ادھر مرینہ مراد کے غم میں چل بسی۔ مراد نے لگے لگا کر اسے نکاح پڑھوایا اور بشری اور بے گلو اینی سکرٹ فورس میں شامل کر لیا۔ ماروی کا بھی محبوب سے نکاح ہو گیا۔ مراد اور نگارہ میں اختلاف ہو گیا اور یہ مختلف طلاق پڑھ چکے ہوئے۔ مراد برسرِ اقتدار آ گیا۔ بابا اجیری کی دعاؤں سے مراد کو روحانی طاقت حاصل ہوئی اور وہ ایک سے دو ہو گئے یعنی ایک مراد اور دوسرا اس کا ہم زاوہ دونوں جب چاہتے تاویدہ ہو جاتے۔ مراد نے تاویدہ کو دشمنوں کو ناکوں چتے چھوڑنے اور دشمن مراد پکڑنے کے لیے محبوب اور ماروی کے پیچھے پڑ گئے۔ تاہم مراد نے ان کی ہر سازش ناکام بنا دی اور انہیں سبق سکھایا۔ مراد کو ایک لڑکی ماہ نور مٹھی پسند آئی۔ مراد نے اسے اپنی شریک حیات بنالیا۔ مراد شریک حیات کے ساتھ اپنی ریاست جارہا تھا کہ اسے دشمنوں نے گھیر لیا۔ اس کے جہاز کو بچھراستے میں ہی روک لیا گیا۔ دشمن اسے گرفتار کرنا چاہتے تھے تاہم مراد نے انہیں دھمکی دی اور چھ گھنٹے انتظار کرنے کو کہا اس نے جہاز سے باہر آنے سے انکار کر دیا تھا۔ دشمن ناچار انتظار کرنے لگے کہ چھ گھنٹے بعد کیا ہوگا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیں

بلا سکو گئے۔ ابھی راز واری ضروری ہے۔ اس لیے لڑکی کے والدین کے سامنے اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر اسے شریک حیات بناؤ۔ بعد میں اس سے باقاعدہ نکاح پڑھو آؤ گے اور خبردار! جب تک باقاعدہ نکاح نہیں پڑھایا جائے گا تب تک تم اسے ہاتھ نہیں لگاؤ گے۔“

ہم زاوہ نے ایک بار مراد کو ناراض کیا تھا۔ اب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے زہمی کی والدہ کے سامنے کلام پاک کی ایک آیت پڑھی اور اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر پوچھا۔ ”کیا تم مجھے اپنے خاوند اپنے مجازی خدا کی حیثیت سے قبول کرنی ہو؟“

اس نے عین بار قبول کیا۔ ہم زاوہ نے بھی اسے عین بار قبول کرنے کے بعد کہا۔ ”میں تمہاری حیا کا محافظ ہوں۔ موجودہ الجھنوں سے نکلنے کے بعد باقاعدہ تم سے نکاح پڑھوانے کے بعد تمہیں ہاتھ لگاؤں گا۔ اس وقت تک ہمارے درمیان فاصلہ رہا کرے گا۔ چلو اٹھو۔ ابھی تمہیں ملکہ عالیہ کا اہم رول ادا کرنا ہے۔ میں راستے میں سمجھاؤں گا کہ معاملات کیا ہیں؟“

زہمی دوسرے کمرے میں گئی۔ اس کے پاس جو بہترین لباس تھا، اسے پہن کر باہر آ کر ایک کار میں بیٹھ گئی۔ ہم زاوہ رات کی تاریکی میں اسے ڈرائیو کرتا ہوا سرحد کے پار چلا آیا۔ وہاں سے اس نے ریاست کے منتظم اعلیٰ بشری اور بے گلو کو فون پر کہا۔ ”میں رضائی راستے سے جیس نکلتی کے راستے سے آرہا ہوں۔ اپنی سرحد کے قریب پہنچ گیا ہوں۔“

مراد اور ہم زاوہ کے لیے بازی پلٹنا بہت ہی آسان تھا۔ وہ دونوں تاویدہ ہو کر ان کے ہوش اڑا سکتے تھے لیکن ایسا کرنے سے یہ بھید کھل جاتا کہ وہ تاویدہ ہو جایا کرتے ہیں اور اس بھید کو اس لیے قائم رکھنا تھا کہ ان کے تاویدہ ہونے کی صلاحیت دائمی نہیں تھی۔ کسی دن کسی وقت بھی یہ صلاحیت ختم ہونے والی تھی۔ اس لیے مراد دوسری تدابیر سے اپنے بچاؤ کی کوششیں کر رہا تھا۔ اس نے ہم زاوہ کو کچھ اہم ہدایات دی تھیں۔ وہ مراد کی ہدایت کے مطابق اپنی ریاست میں ایک جوان حسینہ کو تلاش کرتا ہوا ایک ایسے گھر میں پہنچا جہاں ایک حسین لڑکی اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔

اس کا نام زیب النساء عرف زہمی تھا۔ اس کے دن پھرنے والے تھے۔ خوش نصیبی نے ان کے دروازے پر دستک دی۔ وہ ماں بیٹی ریاست کے حکمران کو اپنے دروازے پر دیکھ کر حیران رہے۔

اس نے مکان کے اندر آ کر کہا۔ ”حیران اور پریشان نہ ہوں ماں جی! میں نے آپ کی بیٹی کو پسند کیا ہے۔ اسے ریاست کی ملکہ بنانا چاہتا ہوں۔ کیا زیب النساء مجھے قبول کرے گی؟ کیا آپ اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینا چاہیں گی؟“

زہمی نے سر پر آچھل رکھ کر اسے گھونکھٹ بنالیا۔ مراد نے ہم زاوہ کو حسی سے کہا تھا۔ ”جیسے بھی پسند کرو، اس سے فوراً نکاح پڑھاؤ۔ فی الحال کسی قاضی وکیل اور گواہوں کو نہیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کپریڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

← ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

← ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

انہوں نے اسی لمحے میں کنٹرول ٹاور کے فونچی کو حکم دیا۔ ”مراد علی منگلی سے فوراً معذرت چاہو۔ اسے عزت و احترام سے اپنی ریاست میں جانے دو۔“

سپر پاور کے اعلیٰ حکام نے فون پر مراد سے رابطہ کر کے کہا۔ ”مسٹر ڈی مراد اتم نے درست کہا تھا۔ ہمیں سچ گھنٹے کے اندر ہی حقیقت معلوم ہوگئی ہے۔ تم طیارے کو یہاں سے لے جاسکتے ہو۔“

رہائی ملتے ہی طیارے کا انجن جاگ گیا۔ ماہ نور خوش ہو کر مراد کو بڑی محبت سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کمال کیا تھا۔ وہ ایک جگہ بیٹھے ہی بیٹھے دشمنوں کو شکست دے کر اپنی منزل کی طرف اسے لے جا رہا تھا۔

ہم زاد نے محل میں پہنچ کر بشری اور بیٹے سے تمہائی میں کہا۔ ”میں مراد نہیں ہوں اور یہ ماہ نور نہیں ہے۔ وہ دونوں طیارے میں ہیں اور دو گھنٹے کے اندر یہاں پہنچنے والے ہیں۔“

اس نے تفصیل بتائی کہ دشمن ممالک نے کس طرح مکاری سے مراد کو طیارے کے ساتھ ٹریپ کیا تھا اور کس طرح مراد اور ہم زاد نے انہیں الٹو بنایا ہے۔

بشری نے زحیٰ کو گلے لگا کر کہا۔ ”میری ایک بھابی آ رہی ہیں۔ ایک اور ہوئیں۔“

ہم زاد نے کہا۔ ”ابھی پوری طرح تمہاری بھابی نہیں ہوئی ہیں۔ ہمارا باقاعدہ نکاح پڑھایا جائے گا۔“

بیٹے نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تمہاری آدمی وائف ہے؟“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”میں نے صرف زحیٰ کی والدہ کے سامنے اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر اسے اپنی شریک حیات بنایا ہے۔ اس نے مجھے اور میں نے اسے قبول کیا ہے، تاکہ یہ میرے لیے نامحرم نہ رہے اور یہ وعدہ کیا ہے کہ جب تک باقاعدہ نکاح خوانی نہیں ہوگی۔ تب تک ہمارے درمیان فاصلہ رہے گا۔“

بیٹے نے کہا۔ ”یہ تم نے بالکل مراد کی طرح شرافت کا ثبوت دیا ہے۔ تم دونوں کا پورا نکاح آج صبح سے پہلے ہی ہوگا۔ میں ابھی قاضی صاحب کو کال کرتا ہوں۔ مراد کے آتے ہی تم دونوں کا نکاح پڑھایا جائے گا۔“

ہم زاد نے کہا۔ ”پہلے مراد کو آ جانے دو۔ ابھی بہت ہی اہم معاملات سے گزرنا ہے۔ اس کا ذہن الجھا ہوا ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ ابھی میری شادی خانہ آہادی کو مناسب نہ سمجھے۔ وہ میرے معاملے کو ایک آدھ روز کے لیے ٹال سکتا ہے۔“

ریاست کے حکمران اور ملکہ کے استقبال کے لیے عوام کثیر تعداد میں انرپورٹ پہنچے ہوئے تھے۔ پریس میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے رپورٹرز کیمرا مین اور مووی کیمرے سب ہی وہاں موجود تھے۔

جب یہ اطلاع ملی کہ ان کا حاکم اعلیٰ اپنی دلہن کے ساتھ منگلی کے راستے سے آرہا ہے تو سب ہی ادھر دوڑ پڑے پھر ایک گولی چلائے بغیر ہی جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ مراد نے فون پر سپر پاور کے اعلیٰ حاکم سے کہا۔ ”ٹی وی آن کرو اور ہماری ریاست کا چینل دکھو۔“

اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا تم جہاز میں نہیں ہو؟ یہ تمہارا فون نمبر ہے۔ تم کہاں ہو؟“

”میں نے کہا تھا کہ ٹی وی آن کرو پھر کسی وقت باتیں کروں گا۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ سپر پاور کے اعلیٰ حاکم نے ٹی وی آن کرتے ہوئے دوسرے تمام اتحادی ممالک کو اطلاع دی۔ وہ سب اپنے اپنے ٹی وی اسکرین کے سامنے آ بیٹھے پھر انہوں نے حیرانی سے دیکھا۔ ریاست کی سرحدی چوکی پر عورتوں اور مردوں کا میلا لگا ہوا تھا۔ نغمے اور موسیقی کا شور تھا۔ پٹانے پھوٹ رہے تھے اور آسمان پر آتش بازی کے رنگارنگ پھول کھل رہے تھے۔

مراد علی منگلی ایک کھلی کار میں اپنی تین دلہن کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ ریاست کے عوام والہانہ جوش و جذبے سے ان کا استقبال کر رہے تھے اور انہیں محل کی طرف لے جا رہے تھے۔

وہ سب حیرانی اور بے بسی سے دیکھ رہے تھے اور دوسری اسکرین پر اسکاٹپ کے ذریعے ایک دوسرے سے بول رہے تھے۔ ”وہ جو طیارے میں ہے اور ہماری حراست میں ہے وہ مراد علی منگلی کی ڈی ہے۔ ہم دھوکا کھا چکے ہیں۔“

سپر پاور کی آری کے اعلیٰ افسر نے کہا۔ ”میں شروع سے کہتا آرہا ہوں کہ ابھی اس سے دشمنی نہ کرو۔ اسے بخیریت ریاست پہنچا کر اس کا اعتماد حاصل کرو۔ اب دیکھو کہ ہم کبھی نادانی سے اس کا اعتماد کھو چکے ہیں۔“

ایک ملک کے حاکم نے کہا۔ ”مائی گاڈ۔۔۔ اب وہ ہمارا بدترین دشمن بن جائے گا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اس کی دشمنی کو کم سے کم کرنے کے لیے دانشمندی یہ ہوگی کہ فوراً ہی اس کی ڈی کو اور اس کے

ذاتی طیارے کو رہا کیا جائے۔“

اب تو اس ڈی کی رہائی کی شرط پر ہی کسی حد تک سمجھتا ہو سکے گا۔“

میں مرد و خنجر ہوتے ہیں۔ مردوں کی اس دنیا میں کوئی بھی حسین عورت تمہارہ کر سلاستی سے نہیں رہ سکتی۔ وہ مست ہو کر بل کھا کر سو جاتی تھی۔ کسی کی مجال نہیں ہے کہ اب کوئی میرے خوب صورت بدن کو چھو سکے۔ گاڈ مجھے میری خواہش کے مطابق سلاستی دے رہا ہے۔ میں آدمی رات کو اکیلی عیاشوں اور بد معاشوں کے درمیان سے گزرتی رہوں گی تو میرے قریب آنے والوں کی شامت آجائے گی اور میں کتنی دولت مند ہوگی ہوں۔ وہ مجھے کروڑوں ڈالرز کے ہیرے دے کر گیا ہے۔ آئندہ میں دریائے سین کے کنارے سب سے مہنگا اور شاندار بنگلا خرید سکوں گی۔

ماڈلنگ کی دنیا میں سب حیران تھے۔ اشتہاری قلم کے پروڈیوسروں نے اور کئی لوگوں نے اس نئے پوچھا تھا کہ جو لوگ فائبرنگ کرتے ہوئے اسے کہیں لے گئے تھے، ان خطرناک لوگوں سے بچ کر وہ کیسے صحیح سلامت آگئی تھی؟ وہ بڑے فخر سے کہتی پھر رہی تھی کہ ایک جن اس پر عاشق ہو گیا ہے۔ کسی کو میرے قریب آنے نہیں دیتا۔ اب کسی کی مجال نہیں ہے کہ کوئی مجھے کمزور عورت سمجھ کر چھونے آئے۔ جو آئے گا اسے میرا جن عاشق الٹا لٹکا دے گا۔ اس کی اس بات پر کسی کسی نے یقین کیا۔ باقی سب نے کہا۔ ”وہ خطرناک لوگوں سے بچ کر آئی نہیں سکتی تھی۔ کسی نے اسے اچھی طرح استعمال کرنے کے بعد واپس بھیج دیا ہے۔“

یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ وہ اپنی پارسائی جتانے کے لیے جموٹ بول رہی تھی۔ اس سانسی دور میں ایک جن کا قصہ سنا رہی تھی۔ یہ بھی کوئی یقین کرنے کی بات تھی کہ کوئی یار عاشق ہے اور وہ نظر نہیں آتا ہے۔

جینی کو پروا نہیں تھی کہ دنیا اس کے بارے میں کیا کہہ رہی ہے؟ اس نے سوچا۔ ”جو آزمانے آئے گا۔ وہ مجھے ہاتھ لگانے سے پہلے ہی ہاتھ پاؤں سے اپنا بچ ہو جائے گا۔“ راجرڈی سوزا کی انگلی کسی ہتھیار کے بغیر کیسے کٹ گئی تھی؟ یہ مہتر جینی نے دیکھا تھا۔ وہ ایسے خوش ہو رہی تھی جیسے چھونے والے کو اس نے خود سزا دی ہو۔ اب اس کے دل میں رہ رہ کر تجسس پیدا ہو رہا تھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آتا ہے اور کہاں چلا جاتا ہے؟

”مائی گاڈ! کتنا پر اسرار ہے۔ مجھے چھو لیتا ہے۔ میرے چہرے سے سفر کرتا ہوا کہاں کہاں پہنچتا رہتا ہے۔ تیز روشنی میں بھی نظر نہیں آتا۔ بڑا عجیب سا لگتا ہے اور اچھا لگتا ہے۔“

دو گھنٹے بعد ماہ نور اور مراد اپنی ریاست میں پہنچ گئے۔ وہ سب ان کے استقبال کے لیے ائرپورٹ آئے تھے۔ بشری نے ماہ نور کو گلے لگا کر پیار کیا پھر مراد سے کہا۔ ”بھائی! میری بھائی کو بتائیں کہ میں آپ کی کون ہوں اور آپ مجھ سے کتنا پیار کرتے ہیں؟“

ماہ نور نے کہا۔ ”آپ کے بھائی نے بتایا تھا کہ یہاں پہنچتے ہی ایک پاگل لڑکی آکر گلے سے لگ جائے گی اور مجھے پیار کرے گی۔ ایسے وقت مجھے ڈرنا نہیں چاہیے۔“

اس بات پر سب ہنسنے لگے۔ ماہ نور اس کے دونوں رخساروں کو چومنے لگی۔ مراد نے محل میں آکر زہی کو دیکھا۔ ہم زاد نے کہا۔ ”میں تمہاری ہدایت کے مطابق زیب النساء کو شریک حیات بنانا چاہتا ہوں۔ اس نے ہماری پلاننگ کے مطابق ہم سے بھرپور تعاون کیا ہے۔“

مراد نے ہلے سے کہا۔ ”قاشی صاحب کو کال کر دو۔ کل صبح آٹھ بجے ان کا نکاح پڑھایا جائے گا۔ زیب النساء کی والدہ کو یہاں عزت و احترام سے لایا جائے۔ آئندہ وہ اسی محل میں رہیں گی۔“

ہم زاد نے دور بیٹھی ہوئی زہی کو بڑی حسرت سے دیکھا۔ اسے چھونے کے لیے دوسرے دن تک انتظار کرنا تھا۔ اس نے دل میں کہا۔ ”تو نہ سہی اور سہی اور نہ سہی اور سہی۔ جینی بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ آج کی رات اس کے ساتھ گزرے گی۔“

مراد اسے اور ہلے کو اور شہر کے ستر کو ہدایات دے رہا تھا کہ ریاست میں کل بھی عام تعطیل ہوگی اور جشن منایا جائے۔ اپنے چیمپل سے نشر ہونے والی خبروں میں اور بریکنگ نیوز میں کہا جائے کہ ریاست کا حکمران مراد علی منگلی کل صبح اپنی قوم سے اور دنیا والوں سے مخاطب ہوگا۔

وہ سب ہی ہنسنے ہوئے تھے۔ اس نے حکم دیا کہ آج رات بے خوف و خطر گہری نیند سویا جائے۔ دوسرے دن سے پھر دشمنوں کے خلاف جہاد شروع ہوگا۔ وہ سب اپنے اپنے کمرے میں جا کر سو گئے۔ ہم زاد نے اپنے کمرے میں آکر لباس تبدیل کیا۔ آئینے کے سامنے آکر خود کو دیکھتے ہوئے ایک خوشبو لباس پر اسپرے کی۔ پھر وہ آئینہ اچانک اس کے وجود سے خالی ہو گیا۔ وہ جاچکا تھا۔

☆☆☆

جینی کو اچانک ہی پر اسرار طاقت حاصل ہو گئی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ حیوانوں میں شیر اور انسانوں

وہ بولا۔ "رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔"
وہ بولی۔ "قبہ خانے شراب خانے اور ٹائٹ کلکس
ساری رات مستی میں رہتے ہیں۔ یہاں کے ایک منگے
ٹائٹ کلب میں دنیا کے امیر ترین عیاش آتے ہیں۔" وہ
بہتے ہوئے بولی۔ "میں چاہتی ہوں، وہ مجھے تنہا دیکھ کر
لپٹائیں اور مجھے حاصل کرنے کے لیے کیونگی پر آئیں۔"
وہ سینہ تان کر بولی۔ "میں ساری دنیا کو دکھانا چاہتی
ہوں کہ مجھ اکیلی کو بڑے سے بڑا شہ زور بھی حاصل نہیں
کر سکے گا۔ یہاں سب کو حیران کرنا چاہتی ہوں۔ دنیا والوں
کو بتانا چاہتی ہوں کہ ایک جن مجھ پر عاشق ہے۔ وہ کسی
عیاش دولت مند کو کسی تیس مار خاں کو میرے قریب پہنچنے
نہیں دے گا۔"

وہ ایک مختصر سا پرکشش لباس پہن کر باہر آئی۔ باہر
سرخ رنگ کی اسپورٹس کار چھت کے بغیر کھلی تھی۔ دور سے
نظر آسکتا تھا کہ ایک اکیلی حینہ تنہا کار ڈرائیو کرتی ہوئی
جاری ہے پھر یہ کہ کار کی طرح مختصر سا لباس بھی کھلا کھلا سا
تھا۔ اس کے بدن کا نظارہ جگہ جگہ سے دعوت دے رہا تھا۔
"مرد کے چچا آؤ مجھے ہاتھ تو لگاؤ۔"

وہ ڈرائیو کرتی ہوئی ایک شاہراہ پر آگئی۔ اس نے
اونچی آواز میں آڈیو کیسٹ کو آن کر رکھا تھا۔ پاپ میوزک
اور گیت کی آواز دور تک گونجتی جارہی تھی اور یہ بتاتی جارہی
تھی کہ جینی جوزف ہوا میں اڑتی جارہی ہے۔ اسے پکڑو۔

ہم زاد برابر والی سیٹ پر بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ اس حینہ
کی مسرتوں سے اور جوش و جذبوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ پھر
مٹھے جوانوں کی ایک ٹولی اس کے پیچھے پڑ گئی۔ وہ تعداد میں
دس تھے اور پانچ موٹر سائیکلوں پر تھے۔ سیٹیاں بجاتے اور
ہلا گلا کرتے مستیاں کرتے آرہے تھے۔

اس ٹولی کی دو موٹر سائیکلیں اس کے دائیں بائیں
آگئیں۔ ایک نے اس کے بالکل قریب ہو کر موٹر سائیکل
دوڑاتے ہوئے کہا۔

"ہے..... تم جینی جوزف ہونا؟"

وہ قبہ لگا کر بولی۔ "ہاں۔ میں بھی ہوئی ہوا ہوں۔
کوئی ہوا کوٹھی میں پکڑ نہیں سکتا۔"

اس نے بھی زور دار قبہ لگا لیا پھر کہا۔ "چلیج نہ کرو۔
ہم ابھی اٹھا کر لے جائیں گے۔"

"میں پھول کی طرح ہلکی اور پہاڑ کی طرح بھاری
ہوں۔ تمہارا باپ بھی مجھے اٹھا کر نہیں لے جاسکے گا۔"

"اچھا تو دیکھو۔ ہم کس طرح تمہیں کار روکنے پر

"اپنے بدن کے مسافر کو سب ہی دیکھتے ہیں۔ میں نہیں
دیکھ پاتی۔ ایسا جس ایسی سنسنی سی جاری رہتی ہے کہ میں
اسے تھوٹی پکڑتی رہتی ہوں اور اس کی آنکھ پھولی محسوس نہیں
ہوتی۔ وہ نا دیدہ مسافر مجھے تنہا مارتا ہے۔"

اچانک اس کی سانسیں خوشبو خوشبو سی ہو گئیں۔ اس
نے ہم زاد سے کہا تھا کہ تم اچانک آ کر پکڑو گے تو ڈر جاؤں
گی۔ میری سانسیں رک جائیں گی۔ پلیز آنے سے پہلے کوئی
ہلکا سا اشارہ دیا کرو۔

ہم زاد نے کہا تھا۔ "میں اچانک آ کر نہیں پکڑوں
گا اور نہ ہی آواز دوں گا۔ جب بھی خوشبو محسوس کرو تو سمجھ لیا
کر دو کہ خوشبو خوشبو ہونے آ گیا ہوں۔"

وہ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "مائی گڈنس۔ تم آگے ہو؟"
وہ جی سی سرگوشی سنائی دی۔ "ہاں...!"

اس نے آواز کی سمت دیکھ کر پوچھا۔ "یہاں ہو؟"
اس کا ہاتھ بیڈ کے سرے پر رکھا ہوا تھا۔ خوشبو وہاں
پہنچ گئی۔ اسے اپنی تھیلی کی پشت پر سفاک ہونٹوں کا یوسہ
محسوس ہوا۔ آواز آئی۔ "یہاں ہوں..."

جینی نے وہاں دوسرا ہاتھ رکھا۔ اچانک اس کی گردن
سے زلفیں ایک طرف سمٹ گئیں۔ گردن پر سلگتے ہوئے
ہونٹ آگئے۔ "میں یہاں ہوں..."

"پلیز اپنی جینی کو ایک بار دکھائی دو۔"
"مجھے افسوس ہے۔ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔"

"تم پیدا کی اپنے نہیں ہو گے؟ تمہارے ماں باپ
نے تمہیں دیکھا ہوگا۔ تمہارے قریبی رشتے واروں نے بھی
تمہیں دیکھا ہوگا؟"

"کسی نے نہیں دیکھا ہے۔ میں نے بھی اپنے ماں
باپ کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہ بھی پیدائشی نا دیدہ تھے۔"

"او گاڈا ایسا تو کبھی دیکھنے میں سننے میں نہیں آیا۔
تھے کہا نہیں میں غائب ہو جانے والوں کی باتیں پڑھی ہیں
لیکن یہ بھی نہیں پڑھا کہ پورا خاندان نا دیدہ ہوتا ہے۔"

"تم نے نہیں پڑھا...؟" گردن پر سانسوں کا بھبکا پھپکا۔
"دنیا والوں نے بھی نہیں دیکھا... اک یوسہ لیرایا۔"

"اس کے باوجود حقیقت سامنے ہے میری جان...!"
تم ایک نا دیدہ کی آغوش میں ہو۔"

وہ آغوش میں تھی اور ایسی انوکھی مسرتیں حاصل
کر رہی تھی جو کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکتی تھیں۔

شادو کے بعد جینی نے کہا۔ "ابھی ہم آڈیو کے
لیے جا رہے ہیں۔"

چار ساتھیوں کو زخمی کیا ہے اور ہم سب کی پٹائی کی ہے۔“
جینی نے کہا۔ ”میں پاگل نہیں ہوں کہ خواہ مخواہ دس
نوجوانوں سے پیٹریز جھاڑ کر دوں گی۔ یہ سب مجھے لوٹ کا مال
سمجھ کر میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔“
پولیس افسر نے پوچھا۔ ”لیکن یہ تو بتاؤ، تم نے ان
سے تنہا کیسے مقابلہ کیا ہے؟“

وہ بڑے فخر سے بولی۔ ”ایک جن میرا والد ہے۔
یہ مجھ پر عاشق ہے۔ یہ ابھی یہاں موجود ہے، کسی کو نظر نہیں
آتا ہے۔ مجھے اپنی ملکیت بنا چکا ہے۔ جو بھی مجھے چھوئے آتا
ہے، اس کی اچھی طرح پٹائی شروع کر دیتا ہے۔“

افسر نے ناگواری سے کہا۔ ”کیا بکواس کر رہی ہو؟
بلیک میجک قانوناً جرم ہے۔ تم اپنا جرم چھپانے کے لیے کسی
جن کی بات کر رہی ہو۔ تم ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلو
اور کسی جن کا وجود ثابت کرو۔“

”کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ابھی سب
کے سامنے نہیں ثابت کر دوں گی۔“

وہ اپنی کار کا دروازہ کھول کر بولی۔ ”میں جارہی
ہوں۔ میرا جن کسی کو میرا راستہ روکنے نہیں دے گا۔“

وہ ڈرائیو تک سینٹھ پر بیٹھ گئی۔ افسر نے کہا۔ ”سیدھی
طرح ہمارے ساتھ چلو۔ ورنہ۔۔۔“

بات ادھوری رہ گئی۔ افسر کے ہولسٹر سے آپ ہی
آپ ریوالور نکلی گیا۔ اس نے بوکھلا کر دیکھا۔ وہ خود اپنے
ریوالور کے نشانے پر آ گیا تھا۔ پھر ایک گولی اس کے قدموں
کے پاس چلی۔ وہ اچھل کر پیچھے چلا گیا۔

تمام سپاہیوں نے اپنی اپنی گتیں سنبھال لیں لیکن وہ
کس پر گولیاں چلائے؟ ان کے افسر کا ریوالور بھی غائب
ہو گیا تھا۔

ہم زاونے کہا۔ ”آفسیر! ہم قانون کا احترام کرتے
ہیں۔ جینی کوئی جادوگر نہیں ہے۔ میں اس کا عاشق جن
ہوں۔ آپ سے گزارش ہے کہ اسے پریشان نہ کریں،
جانے دیں۔“

پھر اس افسر نے حیرانی سے دیکھا۔ اس کا ریوالور
اس کے ہولسٹر میں واپس آ گیا تھا۔ اس نے حیرانی اور
پریشانی سے جینی کو دیکھا پھر کہا۔ ”تم جاسکتی ہو۔“

اس نے خوشی سے مٹھی باندھ کر اسے فضا میں لہراتے
ہوئے کہا۔ ”ہپ ہپ ہرے۔۔۔“

پھر وہ کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھ گئی۔ سب پیچھے رہ
گئے۔ ہم زاونے کہا۔ ”گھر واپس چلو۔“

وہ دو موٹر سائیکلوں والے اس کا راستہ روکنے کے لیے
رفتار بڑھا کر آگے جانے لگے۔ پیچھے ان کے ساتھی بھی تیز
رفتاری سے آگے بڑھنے لگے۔ وہ آگے جا کر تمام موٹر سائیکلوں
کو بریک لگا کر اسے آگے جانے سے روک سکتے تھے۔

ایسے ہی وقت ایک کے سینے پر لٹ پڑی۔ وہ اپنے
ساتھی کے ساتھ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ موٹر سائیکل ان کے
نیچے سے نکل کر آگے کی طرف دوڑتی ہوئی سڑک کے کنارے
گر پڑی۔ دونوں سوار سڑک پر پڑے کراہ رہے تھے۔
دوسرے دو ساتھیوں کو بھی لاتیں پڑیں۔ وہ موٹر سائیکل بھی
ان کے نیچے سے نکل گئی۔ دوسری تین موٹر سائیکلیں رک گئی
تھیں وہ اپنے زخمی ساتھیوں کو سنبھال رہے تھے۔

جینی کا روک کر باہر آ گئی۔ باپ میوزک شور مچا رہا تھا۔
وہ اس کی دھن پر بیچ سڑک پر ناپٹنے لگی۔ کہنے لگی۔ ”م آں۔
تمہیں لاتیں مار کر ناچ رہی ہوں۔ آؤ مجھے اٹھا کر لے جاؤ۔“

ان میں سے ایک جوان ٹیش میں آ کر اسے دیوچ
لینے کے لیے دوڑا لیکن اس کے قریب پہنچنے سے پہلے اچھل
کر اوندھے منہ گر پڑا۔ اس کے یار نے آنے والے کی
ٹانگ پر ٹانگ ماری تھی۔ جینی تھپتھپانے لگی۔

باقی پانچ جوانوں میں سے ایک نے کہا۔ ”یہ ہماری
مردانگی کو لٹکا رہی ہے۔“

دوسرے نے پوچھا۔ ”لیکن ہمارے چار ساتھی
گاڑیوں پر سے کیسے گر پڑے؟ اور وہ راج جینی کے سامنے
اوندھے منہ کیسے گر پڑا ہے؟ کیا یہ بلیک میجک جانتی ہے؟“

تیسرے نے کہا۔ ”اگر ہم بیک وقت اس پر حملہ
کریں گے تو اس کا بلیک میجک دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔“

بات ختم ہوتے ہی کہنے والے کے منہ سے ایک کراہ
نکل وہ پیٹ پکڑ کر جھکنے لگا۔ دوسرے کے منہ پر کرائے کا
ہاتھ بڑا۔ تیسرے کے سینے پر فلائنگ گگ گئی۔ باقی دو
جوان گھونٹے اور کرائے کے ہاتھ ادھر ادھر چلائے ہوئے
پہنچنے لگے۔ ”کون ہے؟ یہاں کون حملہ کر رہا ہے؟ ہمارے
سامنے آؤ۔“

ایک کی کمر پر لٹ پڑی۔ وہ دوسرے سے ٹکرا گیا
پھر وہ سب اٹھ کر وہاں سے بھاگنے لگے۔ اس شاہراہ پر کئی
گاڑیاں رک گئی تھیں۔ کئی پولیس کی دو گاڑیاں آ گئی تھیں۔

وہ تمام نوجوان پولیس والوں سے اور دوسرے لوگوں
سے کہہ رہے تھے۔ ”آپ سب جانتے ہیں۔ یہ مشہور ماڈل
جینی جوزف ہے۔ یہ بلیک میجک جانتی ہے۔ اس نے ہمارے

گیا۔ وہ دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔ ویسے دلہا دلہن کوئی الحال تنہائی میں ملنے کا اور ایک دوسرے سے باتیں کرنے کا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ پہلے اہم سیاسی معاملات سے نمٹنا ضروری تھا۔ محل کے ایک کمرے میں۔۔۔ ٹی وی کمرے اور سائڈ ٹیبل ریکارڈنگ کے آلات سیٹ کیے جا رہے تھے۔

ٹھیک دس بجے ریاست کے عوام نے اور دشمن ممالک کے حکمران اور تمام عہدیداران نے ہم زاد اور زیب النساء کو ٹی وی اسکرین پر دیکھا۔ ہم زاد نے کہا۔ ”میں اپنے عوام کا شکر گزار ہوں۔ انہوں نے کل رات میرا اور میری دلہن کا دلہانہ استقبال کیا اور ہمیں بھرپور محبتیں دیں لیکن میں اپنے عوام سے جھوٹ بولنا نہیں چاہتا۔ سچ یہ ہے کہ میں اس ریاست کا حاکم اعلیٰ مراد علی منگلی نہیں ہوں۔“ یہ سن کر تمام مخالفین بے چینی سے پہلو بدلتے گئے۔ وہ ذرا چپ رہ کر بولا۔ ”ہزبائی نس نے پلاسٹک سرجری کے ذریعے مجھے اپنا ہم شکل بنایا ہے۔“

سپر پاور اور اتحادی ممالک اسے اسکرین پر دیکھ رہے تھے۔ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ جسے وہ اصلی مراد سمجھ رہے تھے وہ نقلی تھا۔ مراد کی ڈمی تھا۔

وہ کہہ رہا تھا۔ ”میرے عوام توجہ سے سیں۔ ہمارے ہزبائی نس اپنی دلہن کے ساتھ کراچی سے یہاں آنا چاہتے تھے اور یہ اندیشہ تھا کہ ہمارے دشمن ہمیں یہاں تک پہنچنے نہیں دیں گے۔ ان کا اندیشہ درست نکلا۔ ہزبائی نس کو یہاں آنے سے پہلے ہی ٹریپ کیا گیا۔ انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ اپنا جہاز ایک ڈیرانے میں اتاریں اور ان کے قیدی بن جائیں۔ انہوں نے جہاز اتار دیا۔ ایک پوری فوج انہیں گرفتار کرنے آئی تھی لیکن ہزبائی نس نے جہاز سے باہر آ کر قیدی بننا گوارا نہیں کیا۔ انہوں نے چہ گھنٹے کی مہلت حاصل کی۔ ان چہ گھنٹوں کے اندر دشمنوں نے ٹی وی چینل کے ذریعے دیکھا کہ ریاست کے عوام ہائی وے پر اپنے حاکم اعلیٰ کا کیسا شاندار استقبال کر رہے ہیں۔ ان دشمنوں سے کہا گیا کہ انہوں نے ہزبائی نس کے ڈیلیٹی کو ٹریپ کیا ہے۔ اصل تو اپنی ریاست میں پہنچ گئے ہیں۔ تب انہوں نے اپنی نقلی کی تلافی کے لیے ہزبائی نس کو ڈیلیٹی سمجھ کر رہا کر دیا۔“

یہ انو بنا دینے والی ایسی بات تھی کہ تمام ممالک کے حکمران اور کاربرین اسکا پ پر ایک دوسرے کا منہ تکتے گئے۔ ہم زاد کہہ رہا تھا۔ ”میرے ہم وطنو...! آپ کے

وہ بولی۔ ”ابھی نہیں۔ بڑا مزہ آرہا ہے۔ ہم یہاں کے سب سے چمکے ٹائٹ کلب میں جائیں گے۔ وہاں امیر ترین لوگوں سے جو اکیلے کا مزہ آئے گا۔“

”ٹائٹ کلب محل جائیں گے۔ ابھی میرا دلہن جانا بہت ضروری ہے۔“

وہ ناراض ہو گئی۔ واپسی پر اس نے کوئی بات نہیں کی۔ ذرا غرے دکھا کر اسے راضی کرنا چاہتی تھی۔ ہم زاد مجبور تھا۔ اسے محل میں جا کر فینڈ پوری کرنی تھی۔ دوسری صبح ایک نئی ٹی وی دلہن اس کی زندگی میں آنے والی تھی۔

وہ گھر پہنچ کر بولا۔ ”تمہاری یہ ناراضگی یہ غرے اچھے لگ رہے ہیں۔ بڑا پیار آرہا ہے تم پر۔۔۔ لیکن تمہیں منانے کا وقت نہیں ہے۔ میں بہت مصروف رہوں گا۔ اس لیے تمہیں گھنٹے کے بعد آ کر تمہیں مناؤں گا۔“

وہ چیخ کر بولی۔ ”تمہیں گھنٹوں تک انتظار نہیں کر سکتی۔ اس دوران میں کوئی دشمن آ کر مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

”جیسے ہی خطرہ محسوس کرو فوراً مس کال دو۔ میں آجاؤں گا لیکن یہ اچھی طرح یاد رکھو۔ جب زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا ہو جائے اور تم بہت مجبور ہو جاؤ، تب ہی مجھے کال کرنا۔ محض ملاقات کرنے اور ہوس منانے کے لیے بلاؤ گی تو پھر کبھی نہیں آؤں گا۔ ساری عمر مجھے ڈھونڈتی رہ جاؤ گی۔“

چینی نے آواز کی سمت ہاتھ بڑھا کر اسے ٹھولا پھر اسے پا کر اس کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ وہ پیار سے اس کے آنسو پونچھ کر وہاں سے چلا آیا۔

☆☆☆

پچھلی رات سے ریاستی چینل کے ذریعے یہ خبر سنائی جا رہی تھی کہ ہزبائی نس مراد علی منگلی اپنی قوم سے خطاب کریں گے۔ اس اطلاع نے تمام دشمنی کرنے والے ممالک میں پھل پیدا کر دی تھی۔ وہ یہ سننے کے لیے بے چین ہو گئے تھے کہ مراد ان سے کیا کہنے والا ہے؟ انہوں نے اپنی دانست میں مراد کی ڈی کو گرفتار نہیں کیا تھا۔ اس سے بدسلوکی نہیں کی تھی۔ صرف اس کا راستہ روکنے کی غلطی کی تھی پھر معذرت چاہتے ہوئے اسے اپنے طیارے میں جانے کی اجازت دے دی تھی۔

وہ امید کر رہے تھے کہ مراد ان سے راضی رہے گا کیونکہ انہوں نے نقلی کرنے کے بعد فوراً ہی تلافی کی تھی۔ وہ دن بجے سے پہلے ہی مراد کے فون نمبر پہنچ کر رہے تھے اور مایوس ہو رہے تھے۔ اس نے سم بدل دی تھی۔

آجھ بچے زیب النساء کا نکاح ہم زاد سے پڑھایا

حاکم اعلیٰ عزت مآب محترم مراد علی منگلی کل رات آپ کی نئی ملکہ کے ساتھ یہاں بچھریت کچھ گئے ہیں اور اب آپ کے سامنے تشریف لار ہے ہیں۔ ہز ہائی نس کو مجھ پر اور آپ سب پر فخر ہے کہ کل رات ایک نئی ہز ہائی نس کا استقبال کر کے انہیں دشمنوں کی قید سے رہائی دلائی ہے۔ میرے بزرگو! میری ماؤ! میری بہنو! اور میرے بھائیو! ہز ہائی نس آپ کا شکر یہ ادا کرنے تشریف لار ہے ہیں۔ ٹھیکس گاؤ۔ لیولانگ اور ہز ہائی نس مراد علی منگلی...“

یہ کہہ کر ہم زادن زیب النساء کے ساتھ اسکرین سے آؤٹ ہو گیا۔ مراد اپنی دلہن ماہ نور کے ساتھ آکر بولا۔۔۔ ”السلام علیکم۔ اللہ تعالیٰ ہی عزت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی ذلت دیتا ہے۔ ہم عبادت کرتے ہیں، نمازیں پڑھتے ہیں اور اپنی خیر مناتے ہیں۔ بہترین اعمال کے صلے میں ہی عزت ملتی ہے اور بعض اوقات سیاسی حکمت عملی سے ہی سلامتی ملتی ہے۔ یہ میری شریک حیات ماہ نور منگلی ہیں۔ میرے ہی منگلی قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ میرے دل میں رہنے والی آج سے اس ریاست کی ملکہ معظمہ ہیں۔“

معذول ہونے والی ملکہ نگارا خانم ٹی وی کے سامنے بیٹھی مزاد کو اور نئی ملکہ کو دیکھ رہی تھی۔ سینے پر سانپ لوٹ رہا تھا۔ وہ بہت اونچے مقام سے گر کر پستی میں چلی آئی تھی۔ اگر مراد کی منگولہ بن کر رہتی تو جلاوطنی کے پیرون نہ دیکھنے پڑتے۔ یہ مان رہی تھی کہ عورتوں کی حکمرانی بھی قائم نہیں کر سکتی گی۔ اب وہ ملکہ نہیں رہی تھی۔ آئندہ کسی سے شادی کرتی تو اس شوہر کو تابعدار بنا کر نہیں رکھ سکتی تھی۔

ماہ نور اسکرین سے آؤٹ ہو گئی تھی۔ مراد کہہ رہا تھا۔ ”میرا اعتماد حاصل کرنے والوں! میرے دوست بن کر رہنے والے دشمنوں! کف افسوس ملتے رہو۔ اصلی مراد علی منگلی تمہاری گرفت میں آکر کھن کے بال کی طرح نکل گیا ہے۔ تم ایک بھی گولی نہ چلا سکتے۔ میرے بدن پر ہلکی سی خراش بھی نہ ڈال سکتے۔ خود پر لعنت بھیجو کہ مجھے چھو بھی نہ سکے۔ اسے کہتے ہیں، سیاست۔ اب میں ایک ریاست کا حکمران بن چکا ہوں تو آئندہ تمہیں سیاست سکھاؤں گا۔ پہلے یہ سیکھ لو کہ مجھ جیسے ایک چھوٹی سی ریاست کے حکمران کو کسی بھی ہتھکنڈے سے اپنا ماتحت نہیں بنا سکتو گے۔ نہ اپنی طاقت سے دبا سکتو گے۔ نہ ہوائی حملوں سے ڈرا سکتو گے۔ تمہاری آری کے نیگروں سے بھی مارے گئے ہیں۔ کئی طیارے اور ہیلی کاپٹر زخاں ہو چکے ہیں۔ اسلحے کا گودام دھماکوں سے اڑا یا گیا ہے۔ آئندہ اس سے بھی زیادہ تباہی و بربادی کے مناظر دیکھو

گے۔ اگر میں اپنی حکمت عملی نہ آزماتا تو ابھی اس وقت تمہاری قید میں ہوتا۔ پھر تم کیا کرتے؟ یہ اندازہ ہے کہ مجھے تاخر سبیل میں لے جا کر مجھ پر مظالم ڈھانے کی انتہا کر دیتے اور آخر میں مجھے گولی مار دیتے۔ میرے اللہ نے مجھے سلامتی دی ہے۔ میں تمہاری کم ظرفی اور کمینگی کو بھی نہیں بھولوں گا۔ شیطان کو ہتھر ضرور مارنا چاہیے اس لیے میں انتقامی کارروائی کروں گا اور کیا کروں گا یہ آنے والا وقت بتائے گا۔ ابھی میرے عوام میری سلامتی کا جشن منا رہے ہیں۔ میں دور واز تک ان کی مسرتوں میں شریک رہوں گا۔

”دو روز تک کوئی مجھ سے فون پر بات نہ کرے۔ کوئی ہمارے منگلی اور سیاسی معاملات کو نہ چھیڑے۔ دو دنوں کے بعد میں سیاسی معاملات پر اسکاٹپ کے ذریعے باتیں کروں گا۔“ اس کی تقریر سیاسی محاذ پر تمام ممالک کو اب سیٹ کر رہی تھی۔ کئی حکمران اسے مغرور اور بددماغ کہہ رہے تھے۔ اکثر ملکوں کے عوام کہہ رہے تھے کہ سپہا اور کاظم توڑنے والا ایک جاننا آ گیا ہے۔

پوری دنیا میں پہلی سی پی ہوئی تھی۔ دنیا کے نقشے میں ذہ ریاست واقعی ایک نقطے کے برابر تھی اور پہاڑوں کی برتری تسلیم کرنے سے انکار کر رہی تھی۔ بڑی طاقتیں مجبور بھی تھیں اور مشتعل بھی ہو رہی تھیں۔ مراد علی منگلی ایک تنہا شخص تھا۔ اس کے چہنچہ کے باعث بڑی انسٹل ہو رہی تھی اور وہ انسٹل کر کے دو روز تک اپنے عوام کے ساتھ جشن منانے اور ناچنے گانے والا تھا۔

اب تک تو یہی ہوتا آیا تھا جو بھی ملک ان کی برتری تسلیم کرنے سے انکار کرتا تھا اور ان کا تابعدار نہیں جتا تھا وہ بڑی بحری اور فضائی فوج لے کر اس پر چڑھ دوڑتے تھے لیکن اس نئی سی ریاست پر حملہ کرنے کی کبھی جرأت کرنے والے نہیں تھے۔ سپہا اور اس کے اتحادی ممالک بیان دے رہے تھے کہ ہم خون خرابا نہیں چاہتے۔ اس لیے۔۔۔ ہز ہائی نس مراد علی منگلی سے امن وامان اور صلح جوئی کی توقع کرتے ہیں۔ ہم دو روز بعد ہز ہائی نس سے مذاکرات کریں گے اور وہ آپس میں یکجا ہو کر مذاکرات کر رہے تھے۔ ان کے سامنے ایک ہی بنیادی سوال کھینچ رہا تھا کہ مراد کے پاس کیسی نہ سمجھ میں آنے والی غیر معمولی قوت ہے جس کے ذریعے وہ تنہا پوری آری کو شکست دے دیتا ہے؟

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ”وہ آئندہ بھی ہمارے طیاروں کو اور ہیلی کاپٹروں کو تباہ کرے گا اور ہم پہلے کی طرح متہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ ہم کبھی معلوم نہیں کر سکیں

تھا، اسے وہاں سے بھی نکال لایا۔ اب وہ دونوں کراچی کی ایک کوچھی میں ہیں۔ اگر ہم اس کوچھی کو ان کا قید خانہ بناویں، جگہ جگہ ان کے قدموں تلے بارود بچھاویں اور انہیں یہ بتاویں کہ جب بھی وہ کوچھی سے باہر قدم رکھیں گے، ایک دھماکے سے ان کے چوتھڑے اڑ جائیں گے، تب مراد ضرور مجبور ہو جائے گا۔“

ایک نے کہا۔ ”بہت کمزور پلان ہے۔ جو شخص سمندر سے محبوب کو نکال کر لاسکتا ہے، کیا وہ اس کی کوچھی سے اسے نکال کر نہیں لاسکتے؟ سوچو اس کے بعد کیا ہوگا؟ یقیناً پھر ہماری شامت آجائے گی۔“

پلان میکر نے کہا۔ ”پہلے میری پوری بات سنیں۔ ہم ماروی اور محبوب کا محاصرہ نہیں کریں گے۔ ہماری آرمی یا پاکستان کے زر خرید سپاہی وہاں نہیں جائیں گے۔ ہم بیان دیتے رہیں گے کہ مجرموں کی وہ خطرناک تنظیمیں جو بڑھاپی ٹیس سے خدا واسطے کا پیر رکھتی ہیں، وہ ایسی دشمنی کر رہی ہیں۔ ہمارا ایک بھی سپاہی ایک بھی ہتھیار وہاں نہیں پایا جائے گا۔ مراد کو ہمارے خلاف نہ کوئی ثبوت ملے گا، نہ وہ ہمارے خلاف انتقامی کارروائی کرے گا۔“

کئی حکمران اور فوجی افسران نے تائید میں سر ہلایا۔ ایک نے کہا۔ ”ہاں۔ اس منصوبے پر غور کیا جاسکتا ہے۔ ہم اسے قابل عمل بنا سکتے ہیں۔“

ایک ملک کے حاکم نے کہا۔ ”آپ حضرات کتنے ہی منصوبے بنا لیں۔ میں تو ایک ہی بات جانتا ہوں۔ وہ نمازی ہے۔ لپکا عبادت گزار ہے۔ اسے کوئی روحانی قوت حاصل ہوگئی ہے۔ ہم اسے کبھی زیر نہیں کر سکیں گے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اور میں کہتا ہوں، انسان سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہے۔ اگر روحانی قوتوں سے ڈرتے ہو تو یہ تمہاری کمزوری ہے۔ یہ جو آندھی طوفان آتے ہیں اور زلزلوں سے تباہی ہوتی ہے تو یہ کیا ہیں؟ یہ قدرتی آفات ہیں۔ انہیں روحانی غضب ناک قوتیں کہہ لو۔ ہم انسان آندھیوں کا رخ موڑ دیتے ہیں۔ زلزلے آتے ہیں۔ تباہ کرتے ہیں اور گزر جاتے ہیں۔ ہم پھر سے نیا شہر آباد کر لیتے ہیں اگر مراد نے کوئی روحانی قوت حاصل کی ہے تو ہم اپنی ذہانت سے اور حکمت عملی سے اس طاقت کو کمزور بنا سکیں گے۔ ایک بار معلوم تو ہو جائے کہ اسے کیسی قوت حاصل ہوگئی ہے اور وہ کیسے طریقہ کار سے ہمیں ڈراتا آ رہا ہے۔ جب راستہ دکھائی دے گا تو ہم ہزار راتے بنا کر اسے دیو بچ لیں گے۔“

کے کہ اسے کسی پراسرار قوتیں حاصل ہوگئی ہیں؟“ ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”سب سے پہلے ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ وہ کیسی طرح کی پراسرار قوت کا حامل ہے۔ اس کے پاس آبدوز کتنی نہیں ہے اور اس نے گہرے سمندر میں پہنچ کر یہی کو پٹرز کو تباہ کیا تھا۔“

ایک نے تائید کی۔ ”ہاں۔ یہ ثابت ہوتا آ رہا ہے کہ وہ کسی پراسرار قوت کے ذریعے ہی ہماری آرمی کو شکست دے چکا ہے۔ آئندہ بھی وہی قوت ہمیں شکست سے دوچار کرے گی۔“

”اب سوال پیدا ہوتا ہے کیا ہم اس قوت کے مقابلے میں پھر اپنی فوج کا استعمال کرنے کی قلمی کریں گے؟“

پھر پاور کے فوجی افسر نے کہا۔ ”ہرگز نہیں۔ سب سے زیادہ ہم نے نقصان اٹھایا ہے۔ ہمارے سیکڑوں سپاہی مارے گئے ہیں۔ ہمارے طیارے اور یہی کا پٹرز تباہ ہوئے ہیں۔ ہم فی الحال اپنی فوجی قوت ضائع نہیں کریں گے۔“

ایک نے پوچھا۔ ”کیا اس کے آگے کھٹے ٹیک ویں گے؟ اسے پھر پاور تسلیم کر لیں گے؟“

پھر پاور کے ماہر سیاستدان نے کہا۔ ”ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم کبھی کسی ریاست کو پھر پاور مان لیں۔“ وہ قلمی باقاعدہ کر بولا۔ ”ہم عسکری جنگ نہیں لڑیں گے۔ سیاسی حربے آزما لیں گے۔“

ایک نے پوچھا۔ ”وہ سیاسی حربے کیا ہوں گے؟“ ”یہی کہ فی الحال ہم اس کے ہر فیصلے کو تسلیم کریں گے۔ اسے یہ تاثر دیں گے کہ ہم شکست خوردہ ہیں۔ اس کی انتقامی کارروائی کو برداشت کر لیں گے۔ جو اپنی کارروائی نہیں کریں گے اور چپ چاپ کئی طرح کے ہتھکنڈے سے اس کی پراسرار قوت کا سراغ لگا لیں گے۔ پھر اس قوت کا توڑ معلوم کریں گے۔ اس سے غشٹنے کے لیے اچھا خاصا وقت لگے گا۔ جہیوں گزر جائیں گے لیکن ہم اس کا پھیر معلوم کر کے اس کا توڑ ضرور کریں گے۔ ہمیں بہت مبرور عمل سے کام لینا ہوگا۔“

ایک ماہر پلان میکر نے کہا۔ ”ہم مراد کی ایک اور بڑی کمزوری سے عمل کر سکتے ہیں۔“

سب نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے کہا۔ ”ماروی اور محبوب کو وہ دل و جان سے چاہتا ہے۔ ان دونوں سے کتنا گہرا لگاؤ ہے۔ اس کا اعزازہ اس بات سے کریں کہ وہ لندن میں ماروی کو تحفظ فراہم کرتا رہا پھر اسے کراچی لے آیا۔ محبوب کو سمندر میں قیدی بنا کر رکھا گیا

مراد وہاں موجود تھا۔ ان کی تمام باتیں سن رہا تھا۔ وہ اجلاس کے اختتام پر وہاں سے چلا آیا۔
☆☆☆

کاتبِ تقدیر نے دونوں تک عیش و آرام لکھ دیا تھا۔ ماہ نور، مراد، ذیب النسا، ہم زاوہ بشری اور بے نے تمام مسائل کو اور تمام دشمنوں کو ذہن سے نکال دیا تھا۔ یہ طے کر لیا تھا کہ ہر ٹم سے بے نیاز ہو کر ہتھے بولتے، ناچتے گاتے اور خوب گھومتے پھرتے رہیں گے۔ ریاست کے عوام بھی دل کھول کر جشن منارہے تھے۔

ہم زاو کوئی دلہن مل گئی تھی۔ وہ تیس گھنٹے کے لیے جینی کو بھول گیا تھا۔ وہ جینی کے سامنے ڈرا پرانی ہو گئی تھی۔ زہمی اس پر سحر طاری کر رہی تھی۔ وہ اچھی لگ رہی تھی اور پتا نہیں وہ کب تک اچھی لگتی رہتی۔ وہ پارہ صفت تھا۔ ریل گاڑی کی نظریں ہنساؤں بدلتے ہوئے زندگی کا سفر طے کرنا چاہتا تھا۔

مراد ماہ نور کو پا کر بہت خوش تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ ایک اچھی لائف پارٹنر ثابت ہوگی۔ وہ اس کے ساتھ ایک کار میں بیٹھ کر پوری ریاست میں گھومتا پھرتا رہا۔ بشری اور بے بھی ان کے ساتھ رہے۔ ایسے وقت وہ اپنے ساتھ ایک بھی سکیورٹی گارڈ نہیں رکھتے تھے۔ مراد اور ہم زاو وقتاً فوقتاً تمام دشمنوں کے اجلاس میں جاتے تھے۔ ان کی تنہائی میں ہونے والی رازدارانہ گفتگو بھی سنتے تھے پھر خاموشی سے واپس آجاتے تھے۔ انہیں اطمینان ہو گیا تھا کہ دو روز تک کوئی دشمنی کرنے نہیں آئے گا۔

حالات رہ رہ کر وٹس بدلتے رہتے ہیں۔ اب اس طرح کر ڈٹ بدل رہے تھے کہ ہیروں کی کان کے مالک راجر ڈی سوزا نے اخبارات میں بیان دیا تھا۔ جینی اس کے قلعے سے کروڑوں ڈالرز کے ہیرے لے گئی ہے لیکن میں اسے نہ روک سکا نہ اور کوئی روک سکے گا۔ اس نے مزید کہا تھا کہ جینی کے پیچھے کوئی پراسرار قوت ہے کوئی شخص چھپا رہتا ہے۔ وہ نظر نہیں آتا۔ وہ راجر ڈی سوزا کے کئی سکیورٹی گارڈز کو ہلاک کر چکا ہے۔

راجر ڈی سوزا نے کہا تھا کہ وہ جینی کے خلاف کوئی رپورٹ درج نہیں کرائے گا۔ اس کے ناویدہ دو گار سے دشمنی مول لینے کی غلطی نہیں کرے گا۔

اس سے سوال کیا گیا۔ ”کیا جینی کو کسی طرح کی پراسرار قوت حاصل ہو گئی ہے یا واقعی اس کے ساتھ کوئی ناویدہ قوت ہے جو اس کی محافظ ہے اور اسے فائدہ پہنچاتی ہے؟“
اس نے جواب دیا۔ ”میں جن بھوت کو ماننا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ کوئی جن اس پر عاشق ہو گیا ہے۔“
جلد ہی اس کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔ دوسری رات شہر کے ایک پولیس افسر نے اور دس نوجوانوں نے بیان دیا کہ جینی کو پراسرار قوت حاصل ہو گئی ہے۔ وہ اپنی زبان سے کہہ رہی تھی کہ اس پر ایک جن عاشق ہو گیا ہے۔ کوئی مائی کالال اسے ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔

پولیس افسر نے بیان دیا تھا۔ ”میں نے زندگی میں پہلی بار ایسا جاوکی تماشا دیکھا ہے۔ میرا ریوالور میرے ہولسٹر سے خود بخود نکل کر میرے سامنے آ گیا تھا۔ اس جن نے مجھے گولی نہیں ماری۔ میرے قدموں کے پاس قائم کرنے کے بعد ریوالور کو واپس میرے ہولسٹر میں رکھ دیا۔ وہ کوئی بہت ہی نیک جن ہے۔ کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا ہے بلکہ دل سپیک بد معاش جوانوں کو سزا میں ڈیتا ہے۔ اگر ہمارے ملک میں ایسے دو جا رہیں اور پیدا ہو جائیں تو یہاں سے بے شرعی، گناہ اور جرائم ختم ہو جائیں گے۔“

یہ بیانات یورپ کے تمام اخبارات میں جینی کی تصویروں کے ساتھ شائع ہوئے تھے۔ کئی ملکوں کے حکام اور فوجی افسران نے ان بیانات کو پڑھا۔ ان سب کے دماغوں میں الجھن سی پیدا ہوئی۔ یہ خیال آیا کہ وہ سچ سچ کوئی جن ہے تو اس سے بہت بڑا کام لیا جاسکتا ہے۔

ایک بار پھر تمام اعلیٰ حکام اور فوجی افسران اسکا پ کے ذریعے ایک دوسرے سے بولنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ”وہ جن ناویدہ رہ کر مراد کی پراسرار قوتوں کا راز معلوم کر سکے گا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اور وہی جن اس کی پراسرار قوتوں کا توڑ کر سکے گا۔ مراد اس نظر نہ آنے والے جن کے آگے گھٹنے ٹیک دے گا۔ یعنی ہمارے قدموں میں آجائے گا۔“

تیسرے نے شبہ ظاہر کیا۔ ”مجھے تو یقین نہیں آتا۔ کہیں یہ قصے کہانیوں والی بات نہ ہو؟“
دوسرے نے کہا۔ ”سناؤ کو کیا آجی؟ جینی کو گورنر ہاؤس میں طلب کریں۔ اگر کوئی جن ہوگا تو اس کے ساتھ آئے گا۔“

فوراً ہی سرکاری طور پر جینی کو گورنر ہاؤس میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔ پہلے تو وہ پریشان ہوئی۔ سوچنے لگی کہ ایک ملک کے حکمران اسے کیوں بلا رہے ہیں؟ سپاہی چاہتے تو اسے گرفتار کر کے لے جاسکتے تھے لیکن انہوں نے بڑی عزت سے اسے حاضر ہونے کو کہا تھا۔

پھر اس نے سوچا۔ ”مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔

وہی آواز میں ایک دوسرے سے کچھ بولنے لگے۔ پھر ایک نے جینی سے کہا۔ ”سمجھ لو کہ تم ابھی مصیبت میں ہو۔ ہم نے تمہیں حراست میں رکھا ہے۔ جب تک اسے نہیں بلاؤ گی تمہیں رہائی نہیں ملے گی۔“

”مجھے حراست میں لینے کی بات کرو گے تو وہ آپ حضرات کا دشمن بن جائے گا۔ اس کی دشمنی بہت مہنگی پڑے گی۔“

”ہم اسے دشمن نہیں بننے دیں گے۔ اسے سمجھائیں گے کہ صرف اس سے ملاقات کرنے کے لیے دشمنی کا بہانہ کیا ہے۔“

”وہ اسے دھوکا سمجھے گا۔ وہ بہت غصے والا ہے۔ جھوٹ بول کر اسے بلاؤ گے تو وہ کسی کی نہیں سنے گا۔ میں اسے سمجھاؤں گی تب بھی نہیں سمجھے گا۔“

ایک نے کہا۔ ”آٹھ گھنٹے رہ گئے ہیں۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔ ہم اسے دوست بنا سکیں گے۔ دشمن نہیں۔“

حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ”جینی! تم اگلے آٹھ گھنٹے تک یہاں آرام سے رہو۔ ہمیں اس کا انتظار کرنا۔“

وہ بولی۔ ”سوری۔ یہاں جتنا بھی آرام ملے گا، وہ میرے اپنے گھر جیسا نہیں ہوگا۔ میں وعدہ کرتی ہوں۔ جب وہ میرے پاس آئے گا تو میں اسے سمجھا بجا کر آپ سے ملاقات کرنے کو کہوں گی۔“

”ہمیں اطمینان نہیں ہوگا۔ وہ ہمارے پاس آنے سے انکار کر سکتا ہے۔ پلیز یہاں رہ جاؤ۔ صرف آٹھ گھنٹے کی تو بات ہے۔ ہم اسے دوست بنانا چاہتے ہیں۔“

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ”ایک ملک کا حکمران تم سے گزارش کر رہا ہے۔ پلیز مان جاؤ۔“

وہ مان گئی۔ اگلے آٹھ گھنٹے اس محل میں گزارنے لگی۔ وہ نمبرون ماڈل گرل اتنی حسین اور پرکشش تھی کہ اسے دیکھ کر سب ہی لپکاتے تھے۔ بے اختیار اسے چھونے کو جی چاہتا تھا۔ اسے قریب سے دیکھ کر کتنے ہی عہدیداروں کے دل چلنے لگے تھے۔ وہ اسے تصویر کی چورتھائی میں حاصل کر رہے تھے۔ وہ سب بے حد طاقتور تھے۔ وسیع اختیارات کے مالک تھے۔ اسے جبراً حاصل کر سکتے تھے لیکن اس اصول بدن کے جملہ حقوق صرف ایک ناویدہ جن کے لیے تھے اور ان میں سے کوئی ایک جن سے پناہ نہیں لے سکتا تھا۔

آخر آٹھ گھنٹے گزر گئے۔ وہ خوشبو محسوس کرتے ہی خوشی سے کھل گئی۔ ”ٹھیکس گاڈ! تم آگے۔“

”ہاں مگر یہ تم کہاں ہو؟“

”میں گورنر ہاؤس میں ہوں۔ میں کیا بتاؤں۔ میری عزت اور شان و شوکت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ حکومت کے

کوئی گزربڑ ہوگی تو فوراً ہی اپنے جن کو مس کال دوں گی۔ وہ پلک جھپکتے ہی میرے پاس آجائے گا۔“

وہ پولیس کے ایک اعلیٰ افسر اور سپاہیوں کے ساتھ ان کی گاڑی میں بیٹھ کر گورنر ہاؤس میں پہنچی۔ وہاں حکومت کے چند اعلیٰ عہدیدار بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اسے عزت دی، اسے خوش آمدید کہا۔ وہ ان کے قریب ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ”مس جینی! ہم سائنس اور ٹیکنالوجی کے دور میں جن اور بھوتوں کی باتوں کو محض بچکانا مین سمجھتے ہیں لیکن تم کہتی ہو، کوئی جن تم پر عاشق ہو گیا ہے اور وہ کسی کو نظر نہیں آتا ہے۔“

وہ بولی۔ ”جی ہاں۔ مجھے بھی نظر نہیں آتا ہے۔“

”پھر تم اس سے کس طرح ملتے ہو؟“

”جس طرح خوشبو نظر نہیں آتی اور ہم اسے پالیتے ہیں۔ اسی طرح میں اسے پالیتی ہوں۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتی۔ وہ میرے قریب آتا ہے تو میں اسے چھو لیتی ہوں۔ پکڑ لیتی ہوں۔ بنا کر کیسا کچھ بخوبی مجھ پر جاؤ کرتی رہتی ہے۔“

”کیا تم ابھی اس سے مل سکتی ہو؟“

”نہیں۔ اس نے کل رات کہا تھا کہ میں گھنٹے بعد آئے گا۔ بائیس گھنٹے گزر چکے ہیں۔ مجھ سے اس کی جدائی برداشت نہیں ہوتی۔ میں بے چینی سے انتظار کر رہی ہوں۔“

”تم بے چین ہوتی ہو، اس سے ملنا چاہتی ہو تو کیا اسے پکارنے سے وہ آجاتا ہے؟“

”پکارنے کی کیا ضرورت ہے۔ جدید ٹیکنالوجی ہے۔ میں فون کے ذریعے کس کال دیتی ہوں۔ وہ آجاتا ہے۔“

”ابھی مس کال دو۔ ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”نہیں۔ اس نے سختی سے تاکید کی ہے کہ صرف اہم ضرورت کے وقت اسے کال کروں۔“

”عقل سے سمجھو، کیا یہ اہم نہیں ہے کہ اس ملک کا حکمران تمہیں حکم دے رہا ہے؟“

”آپ کا حکم میرے لیے اہم ہے۔ اس کے لیے نہیں ہے۔ آپ مائنڈ نہ کریں وہ صرف میرے پاس آتا ہے اور کسی سے ملنے نہیں آئے گا۔“

”ابھی تم نے کہا ہے وہ تمہاری اہم ضرورت کے وقت آتا ہے۔ وہ اہم ضرورت کیا ہوتی ہے؟“

”مجھ پر کوئی مصیبت آئے، میں خطرات میں گھر جاؤں تب اسے کال کر سکتی ہوں۔“

ان تمام عہدیداروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

تمام اعلیٰ عہدیدار اور حاکم اعلیٰ ڈرائنگ روم میں ہیں۔ وہ تم سے دوستی کرنے کے لیے مجھے سر آنکھوں پر بٹھا رہے ہیں۔“

”وہ مجھ سے کیوں دوستی کرنا چاہتے ہیں؟“

”تم ایسے عجب و غریب ہو کہ سب ہی تم سے ملنا اور دوستی کرنا چاہیں گے۔ یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہے

کہ پورا حکمران طبقہ مجھے وی آئی پی ٹریٹمنٹ دے رہا ہے۔“

”تم بہت چھوٹی ہو کر سوچ رہی ہو۔ اعزاز انہیں حاصل ہو رہا ہے کہ تمہارے ذریعے وہ مجھ سے باتیں کریں گے۔ میں انکار کروں تمہیں یہاں سے لے جاؤں تو وہ

ہماری خوشامدیں کرنے لگیں گے۔“

”تم درست کہتے ہو۔ پلیز ڈرائنگ روم میں چلو۔ وہ انتظار کر رہے ہیں۔ ان سے دوستی کرو۔“

”میں تمہارے کہنے سے آنکھیں بند کر کے دوستی نہیں کروں گا مگر تمہارے ساتھ چلوں گا۔ یہ معلوم کروں گا کہ وہ

مجھے دوست کیوں بنانا چاہتے ہیں؟“

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں آگئے۔ حاکم اعلیٰ اور دوسرے تمام عہدیدار اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ جینی کو تنہا دیکھ

رہے تھے۔ ان سب کی آنکھوں میں سوال تھا۔

وہ مسکرا کر بولی: ”کیا آپ حضرات کچھ تہذیبی محسوس کر رہے ہیں؟ خوشبو محسوس کر رہے ہیں؟“

ایک عہدیدار نے سر ہلا کر کہا: ”ہاں، تمہارے آتے ہی خوشبو آتی ہے۔“

”یہ میرے حاشق کی خوشبو ہے۔“

انہیں آواز ستانی دی۔ ”ہاں.....“

وہ سب چمک کر جینی کے آس پاس آنکھیں بھاڑ کر دیکھنے لگے۔ کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم زاد نے کہا:

”میں یہاں موجود ہوں۔ جینی میری جان ہے۔ اس کی خاطر اپنی آواز سنا رہا ہوں۔ آپ حضرات کھڑے نہ رہیں۔“

وہ سب بیٹھ گئے۔ ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا: ”ہم کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔“

”ضرور پوچھیں۔ جواب دوں گا۔“

اس نے سوال کیا: ”کیا آپ کی صرف آواز ہے یا وجود بھی ہے؟“

وہ بولا: ”وجود ہے۔ تب ہی جینی میری آغوش میں کھینکتی ہے۔ یہ میرے وجود کی گواہ ہے۔“

اعلیٰ حاکم نے پوچھا: ”کیا ہم سے مصافحہ کریں گے؟“

اعلیٰ حاکم نے اپنی جگہ سے اٹھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ

بڑھایا تو ہم زاد نے اسے قہام لیا۔ وہ خوش ہو کر بولا: ”اومائی گاڈ! آپ کا وجود ہے۔ آپ مجھ سے مصافحہ کر رہے ہیں۔“

وہ دونوں ہاتھوں سے ہم زاد کا ہاتھ پکڑ کر کہہ رہا تھا۔

”کتنا عجیب لگ رہا ہے۔“

ہم زاد اپنا ہاتھ پھٹا کر جینی کے پاس آ گیا۔ اعلیٰ حاکم نے پوچھا: ”مسٹر! ہم آپ کو کس نام سے پکاریں؟“

وہ بولا: ”جو دیکھنا نہ جائے اسے کن سین کہنا چاہیے۔ مجھے ان سین کہا جائے۔“

”مسٹر آن سین! ہم بڑی مصیبتوں میں گرفتار ہیں۔ ہم سے ہمدردی کرو۔ ہم سے دوستی کرو۔“

وہ بولا: ”مجھے آپ حضرات سے ہمدردی بھی ہے اور میں آپ کا دشمن بھی نہیں ہوں۔ مصیبتیں کیا ہیں؟“

توج کے اعلیٰ افسر نے کہا: ”ہمارے ایک دشمن کو نہ جانے کیسی پراسرار قوتیں حاصل ہو گئی ہیں۔ اس نے تنہا

ہو کر ہمارے سیکڑوں سپاہیوں کو مار ڈالا ہے۔ ہمارے طیاروں کو اور ٹیلی کاسٹروں کو پرواز کے دوران تباہ کر دیا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے ایسی جادوئی قوت

کہاں سے حاصل ہو گئی ہے۔“

ہم زاد نے پوچھا: ”یا اللہ خیر۔ کیا آپ مراد علی منگلی کی بات کر رہے ہیں؟“

وہ سب ہی ہاں ہاں کے انداز میں سر ہلانے لگے۔ ایک نے پوچھا: ”آپ اسے جانتے ہیں؟“

وہ بولا: ”وہ میرا بدترین دشمن ہے۔ میں اپنے دشمن کو صرف جانتا ہی نہیں۔ پھانسا بھی ہوں۔“

وہ سب خوشی سے گل گئے۔ اعلیٰ حاکم نے کہا: ”ہمارا دشمن آپ کا بھی دشمن ہے۔ پھر تو آپ ہماری مدد ضرور کریں گے۔“

”میں مدد نہ کروں، تب بھی مدد ہوتی رہے گی۔ وہ اس طرح کہ میں اس دشمن سے لڑتا رہوں گا تو گویا تمہارے لیے بھی لڑائی جاری رہے گی۔“

”آپ درست کہتے ہیں۔ پلیز ہمیں بتائیں۔ اس کی پراسرار قوتیں کیا ہیں؟ اور اسے کہاں سے حاصل ہو گئی ہیں؟“

”وہ بہت بڑا عامل ہے۔ جنات کو تسخیر کرنے کا پراسرار علم پڑھتا رہتا ہے۔ اس وقت میں جنات اس کے معمول مطیع اور فرمانبردار ہیں۔“

”میں جنات.....“ ان سب نے حیرانی اور پریشانی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک نے مایوسی سے پوچھا:

”وہ معمول اور مطیع بن کر رہنے والے جنات بھی آپ کی طرح نادیدہ رہتے ہوں گے۔“

متفرق معلومات

- ☺ دنیا میں سب سے پہلے نوبل انعام باوام کیوری نامی عورت نے حاصل کیا۔
 - ☺ دنیا کا سب سے بڑا مسجد سائنس دان امریکا کا ایڈیسن ہے۔
 - ☺ دنیا کا سب سے تیز رفتار جانور چیتا ہے۔
 - ☺ دنیا میں سب سے زیادہ آتش نشاں پہاڑ فلپائن میں پھٹتے ہیں۔
 - ☺ دنیا کی سب سے قیمتی وھابت پلائیم ہے۔
 - ☺ دنیا میں سب سے پہلے ایٹم بم ادین ہیر نامی سائنس دان نے بنایا۔
- انتخاب۔ رانا حبیب الرحمن، سینٹرل جیل، لاہور

گا۔ پھر وہ نہیں رہے گا تو وہ بیس جنات ہم سے دشمنی نہیں کریں گے۔

”ایسی کوئی زیر دست پلاننگ ہوگی تو میں ضرور اس کے مطابق عمل کروں گا لیکن ایک بات ذہن میں رکھیں کہ آپ کسی بھی اجلاس میں یا بند کمرے میں جو بھی پلاننگ کرتے ہیں یا رازداری سے کوئی بھی بات کرتے ہیں تو مراد کا کوئی جن آکر سنا رہتا ہے۔ وہ آپ کو نظر نہیں آتا اور مراد کو معلوم ہو جاتا ہے کہ آئندہ آپ کیا کرنے والے ہیں۔“

وہ سب پریشان ہو کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ایک نے کہا۔ ”دائقی ماضی میں ایسا ہو چکا ہے۔ ہم کہیں بھی چھپ کر باتیں کرتے رہے ہیں، وہ راز میں نہیں رہی ہیں۔ مراد ان سے آگاہ ہوتا رہا ہے۔“

ان کی تنہائی کی اور رازداری کی اہمیت نہیں رہی تھی۔ انہیں یوں لگ رہا تھا جیسے اس وقت بھی مراد کا کوئی جن وہاں موجود ہے اور ان کی تمام باتیں سن رہا ہے۔ ایک نے پوچھا۔ ”کیا اس کا کوئی جاسوس جن ابھی یہاں موجود ہوگا؟“

ہم زاد نے کہا۔ ”نہیں۔ پریشان نہ ہوں۔ ہم جنات ایک دوسرے کی بو پا لیتے ہیں۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔ کوئی یہاں ہوتا تو مجھے معلوم ہو جاتا۔“

ان سب نے اطمینان کی سانس لی۔ ایک عہدیدار نے کہا۔ ”ہم کیا کریں؟ رازداری کی باتیں کہاں کریں؟ یہ تو بہت ہی پیچیدہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔“

”بے شک! ہم جنات ہیں کسی کو نظر نہیں آتے لیکن کسی کی صورت بنا کر دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس وقت بھی ایک جن مراد علی سنگی کی صورت بنا کر اس کے ساتھ محل میں رہتا ہے اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ پلاسٹک سرجری کے ذریعے ڈمی مراد بن گیا ہے۔ سب اسے مراد کا ہم زاد کہتے ہیں۔“

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ”ہاں۔ ہم نے اسے ٹی وی اسکرین پر دیکھا ہے۔ کیا باقی جن بھی مراد کے ساتھ محل میں رہتے ہیں؟“

”نہیں۔ صرف وہ ہم زاد اس کے ساتھ دن رات رہتا ہے۔ باقی جن پوشیدہ رہتے ہیں۔ اس وقت آتے ہیں، جب مراد کسی کام سے انہیں کال کرتا ہے۔ وہ چشم زون میں اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔“

ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ”اب معلوم ہو رہا ہے کہ اس کی پراسرار قوت کیا ہے؟ بیس جنات نے اس کے حکم سے ہمارے سیکڑوں سپاہیوں کو ہلاک کیا تھا۔ اس کے حکم سے چشم زون میں جا کر ہمارے بیلی کاپٹروں کو تباہ کر کے محبوب علی چانڈیو کو بحری جہاز سے نکال لائے تھے۔“

دوسرے عہدیدار نے تائید کی۔ ”یہ انسانوں کے بیس کی بات نہیں تھی۔ جنات نے اس کے سارے کام کیے ہیں۔“

ایک نے کہا۔ ”اور آئندہ بھی کریں گے۔“

”مسٹر ان سین! ہم برباد ہو رہے ہیں۔ کیا آپ اس کے حملوں کو روک سکیں گے؟“

ہم زاد نے کہا۔ ”اس نے پراسرار عمل کے ذریعے بیس جنات کو تخریب کیا ہے۔ مجھے بھی جکڑنا چاہتا ہے لیکن میں اس کے علم کا تو ذکر کرنا جانتا ہوں۔ اس کے حملوں سے بچتا آ رہا ہوں۔ ابھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں اس پر کس طرح کامیاب حملے کر سکتا ہوں۔ ابھی تدبیر سوچ رہا ہوں۔“

”ہم تمہارے لیے آسانی کریں گے۔ ہم پلاننگ کریں گے۔ تم اس پر عمل کرو گے تو تمہارے ساتھ ہمیں بھی ہمیشہ کے لیے اس سے نجات مل جائے گی۔“

”آپ کوئی بھی تدبیر سوچیں، اس پر عمل کرنے کے لیے مراد سے ٹھکانا ہوگا۔ اس سے ٹھکانے کا مطلب ہے بیس جنات سے مقابلہ کرنا اور میں تمہارا ان سے مقابلہ نہیں کر سکتا گا۔“

فوجی افسر نے کہا۔ ”کسی سے لڑنا ضروری نہیں ہوگا۔ ہم ایسی پلاننگ کریں گے کہ انہیں خبر بھی نہیں ہوگی اور تم ناپید نہ کرنا ایسا کام کر جاؤ گے۔ ایک بار ہماری پلاننگ پر عمل کرو گے تو مراد ہمارے قابو میں آ جائے گا یا مارا جائے

پولیس کی درجنوں گاڑیاں لوگوں کو دور بھگانے کے لیے پہنچ گئی تھیں۔ پھر ٹی وی چینلز کے ذریعے ساری دنیا نے دیکھا کہ ایک خانی کار دوڑتی جا رہی تھی۔ کوئی ڈرائیور نہیں تھا اور ٹریفک کے ہجوم میں نوجوانوں کی موٹر سائیکلیں اسپورٹس کار کے ساتھ دوڑتی جا رہی تھیں پھر یہ عجیب جذبائی تماشا دکھائی دیا کہ جینی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھی تو وہ سیٹ سے کچھ ادا پر دکھائی دے رہی تھی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے نادیہ عاشق کی گوڈ میں بیٹھی ہے۔ اس کی پشت اسٹیئرنگ کی طرف تھی۔ وہ کار نہیں چلا رہی تھی۔ کسی سے ہم آغوش ہو گئی تھی اور کار خود بخود اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ رہی تھی۔

ٹی وی کے ناظرین گم سم سے ہو کر وہ منظر دیکھ رہے تھے اور کنٹری کرنے والے کہہ رہے تھے۔ "یہ کمپیوٹر کی ہوئی کوئی گرا لک فلم نہیں ہے۔ ہزاروں لوگوں کی موجودگی میں سچ سچ ایسا ہو رہا ہے۔ یہ لائیو مناظر پیش کیے جا رہے ہیں۔"

تبرہ کرنے والے کہہ رہے تھے۔ "جینی اور سٹران سین کو سرعام ایسا تماشا نہیں کرنا چاہیے۔"

اور جینی نے ٹی وی چینلز کے ذریعے کہا تھا کہ وہ آئندہ لوگوں سے کترانے کی اور چھپ کر رہا کرے گی۔

☆☆☆

مراد اپنے بہت سے معاملات میں مصروف تھا۔ اس نے ایک بار ہم زاد کو جینی کے ساتھ دیکھا تھا لیکن اس کا محاسبہ کرنے کی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ اس نے ٹی وی پر جینی کے ساتھ ہونے والے تماشے کو دیکھا تو اسے بلا کر پوچھا۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کیا تم نے جینی کو باقاعدہ اپنی شریک حیات بنایا ہے یا گناہ کے مرتکب ہو رہے ہو؟"

ہم زاد نے کہا۔ "گناہ اور ثواب کی باتیں رہنے دو۔ میں تمہارا ہم زاد ہوں۔ تمہارے وجود کا ایک ٹیکٹیو پہلو ہوں۔ ٹیکٹیو ہی رہوں گا۔"

مراد نے سختی سے کہا۔ "میں اپنے وجود کا کوئی پہلو بھی داغ دار نہیں رکھتا چاہتا۔"

"نہ جاننے کے باوجود انسان ہو۔ بے داغ فرشتہ نہیں بن سکتے۔ انسان خطا کا پتلا ہے۔ کسی نہ کسی پہلو سے خطا کا مرتکب ہوتا ہی رہتا ہے۔ پلیز مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ خطا کرنے والوں کے دلوں میں بھی خوف خدا ہوتا ہے۔ میرے دل میں اس حد تک خوف ہے کہ میں شریک حیاتوں سے نمٹنے کے لیے ہمیشہ تمہارے ہی ساتھ رہوں گا۔ عبادت کرتا رہوں گا۔ انصاف کے تقاضے پورے کرتا رہوں گا۔ پلیز میرے ذاتی معاملات میں مداخلت نہ کرو۔"

دوسرے نے کہا۔ "آئندہ ہم جب بھی رازداری سے کوئی پلاننگ کرنا چاہیں گے تو ان سین کو بلا لیا کریں گے۔"

ہم زاد نے کہا۔ "میں وہاں جنات کی پوحسوس کروں گا تو وہ بھی میری پوحسوس کر لیں گے۔"

ایک نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوگا؟"

"یہ ہوگا کہ میں انہیں دیکھتے ہی بھاگ جاؤں گا ورنہ وہ میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔"

وہ مانوس ہو گئے۔ ہم زاد نے کہا۔ "ویسے میں وہاں سے فرار ہو کر کہیں جا کر فون کے ذریعے تم سب کو ان کی موجودگی کی خبر کروں گا۔"

وہ خوش ہو گئے۔ ہم زاد نے کہا۔ "اب میں جا رہا ہوں۔ پھر کسی وقت آؤں گا۔"

"یہ تو تادہ، ہم تم سے رابطہ کیسے کریں؟"

"جینی کے ذریعے....."

پھر خاموشی چھا گئی۔ جینی نے کہا۔ "وہ جا چکا ہے۔ میرے گھر میں انتظار کرنے کا۔ مجھے فوراً جانا چاہیے۔"

وہ اسے سزکاری گاڑی میں گھر پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ بولی۔ "میں یہاں سے پیدل جاؤں گی۔ وہ میری اسپورٹس کار لے کر آ رہا ہے۔"

وہ پیدل جانے لگی تو یورپ کی سب سے حسین ٹاپ ماڈل گرل کو دیکھ کر لوگوں کی بھیڑ لگنے لگی۔ درجنوں سپاہی اس کے چاروں طرف آگے اور لوگوں کو اس کے قریب آنے سے روکنے لگے۔ ادھر ہم زاد اس کے پیچھے سے اسپورٹس کار ڈرائیو کرتا آ رہا تھا۔ وہ کار جہاں سے گزر رہی تھی لوگ حیران ہو کر دیکھ رہے تھے۔ اس کا ڈرائیور نظر نہیں آ رہا تھا۔ لوگ اس کار کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ وہ کسی ڈرائیور کے بغیر جا رہی تھی۔

بے شمار کاریں اور موٹر سائیکلیں اس کے آگے پیچھے دائیں بائیں دوڑنے لگیں۔ لڑکیوں نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "ہائے یہ تو وہی جینی کا عاشق ہے۔ وہ کتنی خوش نصیب ہے، اسے ایسی شہرت مل رہی ہے۔"

پورا مجمع شور مچاتا ہوا اسپورٹس کار کے ساتھ اپنی گاڑیاں دوڑا رہا تھا۔ کتنے ہی اسٹل اور مووی کیمرے والے اس کے قریب ہونے کی کوششیں کر رہے تھے اور خانی دوڑتی ہوئی کار کی تصویریں اتار رہے تھے۔

وہ گاڑی جینی کے قریب آ کر رکھی تو وہاں بھی تماشاخیوں کا ہجوم تھا۔ جینی ٹی وی چینلز کے کیمرے آگے تھے۔ موبائل

دوسرے ملک کے حاکم نے کہا۔ ”آپ اور آپ کے عوام تقریباً آدھی دنیا سے کٹ جائیں گے۔ ہمارے زیر اثر جو چھوٹے ممالک ہیں، وہ بھی اپنی سرحدیں بند کر دیں گے۔ آپ کی ریاست کے طیاروں کو کسی بھی ملک کی سرحد سے گزرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔“

”ہم تمہاری یا کسی بھی ملک کی اجازت حاصل نہیں کریں گے۔ ہمارے عوام ویزا حاصل کیے بغیر جس ملک میں جانا چاہیں گے آزادی سے جائیں گے۔ الرٹ ہو جاؤ۔ نکل ایک طیارہ ہماری ریاست کے سیاحوں کو لے کر جرمنی فرانس اور یو کے۔۔۔۔۔ جائے گا۔ ان کے پاس صرف اس ریاست کا پاسپورٹ ہوگا۔ یہ میرا چیلنج ہے کوئی میری ریاست کے کسی ایک فرد کو بھی وہاں آزادی سے گھومنے پھرنے سے نہیں روک سکے گا۔ ہمارا طیارہ ان تین ممالک کی سرحدیں عبور کرے گا۔ اس طیارے کے اترنے کے لیے تمام ملکوں کے رن دے کو خالی رکھنا ہوگا۔ ہمارا شیڈول نوٹ کرو۔ ہمارا طیارہ کل صبح دس بجے یہاں سے روانہ ہوگا اور پہلے جرمنی کے شہر فرینکفرٹ میں پہنچے گا۔ چالیس گھنٹے کے بعد وہ طیارہ فرانس کے شہر پیرس جائے گا۔ پھر چالیس گھنٹوں کے بعد یو کے کے شہر لندن پہنچے گا۔ یوں سمجھو کہ مجھے حراست میں لینے کی جو دشمنی کی تھی، اس کا انتقام لینے کے لیے میں جبراً سرحدی قوانین کی خلاف ورزی کروں گا۔ دنیا والوں کے سامنے تمام سپر طاقتوں کو جھاگ کی طرح بٹھا دوں گا۔ آئندہ کسی بھی معاملے میں گفتگو کرنے کے لیے میری وزارت داخلہ سے رابطہ کیا جائے۔ میں کسی سے براہ راست گفتگو نہیں کروں گا۔“

اس کے بعد اس نے کسی کی بات نہیں سنی۔ رابطہ ختم کر دیا۔ ہم ڈاؤ سے کہا۔ ”ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ میرے اس فیصلے کا رد عمل کیا ہو رہا ہے۔ میں جرمنی جا رہا ہوں۔ تم فرانس جاؤ۔“

دوسرے ہی لمحے میں وہ دونوں ہوا ہو گئے۔

☆☆☆

مراد نے فیصلہ سنانے کے بعد ان کی ایک نہیں سنی تھی۔ رابطہ ختم کر کے یہ اچھی طرح جتایا تھا کہ اس کے سامنے سپر طاقتیں کچھ نہیں ہیں۔ دنیا دیکھے گی کہ وہ جب چاہے گا، اپنے فیصلے کے آگے انہیں جھکا تارے گا اور وہ بے بسی سے جھکتے رہیں گے۔ وہ سب غصے سے تملار ہے تھے۔ لندن کے اکابرین نے تمام اتحادی ممالک کو یہ چشم دید واقعہ سنایا تھا کہ انہوں نے ایک نادیدہ جن سے ملاقات کی

مراو خاموش ہو گیا۔ اس نے بحث نہیں کی۔ یہ سوچ کر چپ رہا کہ اس کے اعمال اس کے ساتھ ہیں۔ خدا کو منظور ہوگا تو وہ راہ راست پر آ جائے گا۔

ہم ڈاؤ نے اسے بتایا کہ دشمن ممالک کے ایک حاکم اعلیٰ اور اس کے اہم عہدیداروں سے کس طرح ملاقات ہوئی اور کیا باتیں ہوئیں۔ وہ سب اس بات سے پریشان ہیں کہ مراد کے بیس عدد جن چپ چاپ آ کر ان کی نظیہ باتیں سنتے رہتے ہیں۔

جنس منانے کے دو دن گزر گئے۔ مراد نے ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے اعلان کیا کہ اب وہ سیاسی امور پر باتیں کرے گا۔ کسی بھی ملک کے اکابرین اس کا پ کے ذریعے گفتگو کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلے پیرا پور کے اکابرین نے ہی رابطہ کیا اور کہا۔ ”ہم ہڑ ہائی ٹس سے گفتگو کا شرف حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے ممالک کے اکابرین بھی اس کا پ کے ذریعے ہم سے رابطہ کرتے رہیں گے۔“

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”سب سے پہلے ہم اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔ ہم نے آپ کے طیارے کو اور آپ کو گھیرنے اور حراست میں لینے کی بہت بڑی بھول کی تھی۔“

مراو نے کہا۔ ”آپ نے بھول نہیں کی تھی۔ سچ سچ مجھے حراست میں لیا تھا۔ البتہ مجھے رہا کرنے کی سب سے بڑی احمقانہ غلطی کی ہے۔“

”یہ اچھا ہی ہوا کہ ہم نے احمقانہ غلطی کی اور آپ کو رہا کر دیا۔ آپ ہماری اس غلطی کو نظر انداز کر دیں۔“

”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم لوگوں نے مراو اعلیٰ منگی کو حراست میں لے کر مار ڈالا ہے۔ وہ مر چکا ہے۔ یہ جو یہاں بیٹھا ہے، یہ نیا مراد ہے۔ میرے اللہ نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ سیدھی سی بات ہے میں اس نئی زندگی میں سانچوں کو دو دھنکس پلاؤں گا۔“

”تم سے اور تمہارے تمام اتحادی ممالک سے سفارتی تعلقات نہیں رکھوں گا اور نہ ہی تمہارے ملکوں کے انجینئروں و ڈاکٹروں کو اور مختلف شعبوں کے ماہرین کو اپنی ریاست میں آنے کی اجازت دوں گا۔ تمہارے ملکوں کے جو باشندے یہاں ملازمت کر رہے ہیں انہیں اس وقت تک عزت اور سلامتی دی جائے گی، جب تک وہ ہماری ریاست کے وفادار رہیں گے۔ ورنہ ان کی بھی چھٹی کر دی جائے گی۔“

اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”سفارتی تعلقات نہیں رکھیں گے تو آپ کے عوام پیر دنی ممالک جانے کے لیے ویزا کہاں سے حاصل کریں گے؟“

وہ اٹھ گیا۔ اس نے دو سپاہیوں سے کہا۔ ”اے اچھی طرح مضبوطی سے پکڑے رہو۔ اسے نہ چھوڑنا۔“ انہوں نے کرسی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ وہ آہستہ آہستہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کچھ نہیں ہوا۔ کوئی جنم بھوت نہیں تھا۔ وہ ناگواری سے بولا۔ ”کیا بکواس ہے۔ ابھی جو ہوا اس پر غور کرنا ہوگا۔ چلو ہٹو یہاں سے۔“

وہ سپاہی کرسی کو چھوڑ کر دور ہو گئے۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔ ”ہاں تو میں کیا کہہ رہا تھا کہ...“ وہ بات پوری نہ کر سکا۔ مراد اور ہم زاوے نے کرسی کو اٹھا کر فضا میں ڈرا لپٹا دیا۔ پھر اسے دور پھینک دیا۔ وہ چلتا ہوا کرسی کے ساتھ فضا میں اڑتا ہوا سامنے دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑا۔ اس کی چیخیں سن کر دوسرے افسران بھی دوڑے چلے آئے۔ وہ اسے فرش سے اٹھا کر کرسی کو سیدھا کر کے پھر اسے بٹھانا چاہتے تھے۔ وہ تڑپ کر ان کی گرفت سے نکل کر دور بھاگتے ہوئے بولا۔ ”نہیں بیٹھوں گا۔ اس کرسی پر وہ... وہ بیٹھا ہے۔“

ایک افسر نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کون بیٹھا ہے؟ یہاں تو کوئی نہیں ہے۔“

”وہ نظر نہیں آ رہا ہے۔ وہ جن ہے۔ میں مانتا ہوں۔ جنات کا وجود ہے اور وہ جنات مراد علی مکی کے سپاہی ہیں۔“ ایک افسر نے کہا۔ ”آپ اتنی جلدی ہار مان گئے۔ اگر اس نے آپ کو اٹھا کر پھینکا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہماری پوری آری سے بھگی ٹکرا جائے گا۔ ہم سپاہی ہیں میدان نہیں چھوڑیں گے۔ اسے چلن کر رکھ دیں گے۔“ یہ کہتے ہی اس کے حلق سے کراہ نکلی۔ منہ پر گھونسا پڑا تھا۔ پھر دوسرا گھونسا پڑا تو وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

تب انہوں نے آواز سنی۔ کوئی کہہ رہا تھا۔ ”سپر پاور کی آری میرے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ تمہاری کیا حیثیت ہے؟ باہر ہالکونی میں جاؤ اور اپنے طیاروں کو دیکھو۔“

وہ حیرانی سے سن رہے تھے۔ بولنے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ سب ہالکونی میں آئے۔ سامنے وسیع دعویریں گراؤنڈ میں کئی جنگی طیارے کھڑے ہوئے تھے۔ انہیں آواز سنائی دی۔ ”تم کہتے ہو میں تمہاری پوری آری سے مقابلہ نہیں کر سکتوں گا اور ابھی میں چاہوں تو ان تمام طیاروں کو تباہ کر سکتا ہوں لیکن پہلے کسی ایک کو تباہ کر رہا ہوں۔“

ہم زاوہ ایک طیارے کے اندر ٹائم بم رکھ کر چلا آیا۔ مراد کہہ رہا تھا۔ ”اس اتریں کے اندر اور باہر سخت سکیورٹی ہے۔ یہاں ایک پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔ یہ لو

ہے۔ اس سے مصافحہ کیا ہے۔ اس سے باتیں بھی کی ہیں۔ وہ ناویدہ جن مراد کا دشمن ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ تیس عدد جن مراد کے معمول اور تابعدار ہیں۔ ان ہی جنات نے سیکڑوں سپاہیوں کو ہلاک کیا تھا۔ طیاروں اور ہیلی کاپٹروں کو تباہ کیا تھا اور بیچ سمندر میں کھڑے ہوئے بحری جہاز سے محبوب علی چانڈیو کو کال لائے تھے۔

پہلے تو وہ جن نامی مخلوق کو مانتے نہیں تھے پھر ایک ملک کے اکابرین نے گواہی دی کہ وہ ایک جن سے ملاقات کر چکے ہیں۔ پھر انہوں نے ٹی وی کی خبروں کے دوران میں ڈرائیور کے بغیر چلنے والی کار کو دیکھا تھا اور سرعام چینی سے اس کا رومانس دیکھا تھا۔ اس طرح وہ قائل ہو گئے تھے۔ یہ مان لیا تھا کہ مراد نے تیس عدد جنات کو تسخیر کیا ہے اور وہ دوسرے دن ریاست کے طیارے کو اپنی سرحد میں داخل ہونے اور فریئر کنگرفٹ کے ائر پورٹ پر اترنے سے نہیں روک سکیں گے۔

ایک اسکے مراد کے مقابلے میں اپنی کمزوری اور توہین برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ آری کے ایک اعلیٰ افسر نے ناگواری سے کہا۔ ”میں کسی جن بھوت کو نہیں مانتا۔ یہ جاہلانہ باتیں ہیں۔ میں حکم دیتا ہوں۔ جیسے ہی وہ طیارہ ہماری سرحد میں داخل ہو، اسے مار گراؤ۔“

وہ حکم دیتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھنے جا رہا تھا۔ وہ کرسی اچانک پیچھے ہٹ گئی۔ وہ فرش پر گر پڑا۔ جہاز کو گرانے سے پہلے خود ہی کرا پھر فوراً ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ پیچھے گھوم کر سپاہیوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کس مزدو نے یہ حرکت کی ہے؟“

ایک سپاہی نے کہا۔ ”سرا ہم سب دور کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ کرسی خود بخود پیچھے ہٹ گئی تھی۔“

وہ غصے سے زحماڑتے ہوئے بولا۔ ”وہاٹ نان سنس۔ یہ آپ ہی آپ پیچھے کیسے جا سکتی ہے؟“

وہ کرسی آہستہ آہستہ اچھل کر ناچتی ہوئی اس کے قریب آگئی۔ وہ بے تہمتی سے ویدے بھاڑ بھاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔ اسے چھو کر یقین کرنے لگا کہ جو آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، وہ درست ہے اور کرسی اس کے قریب آگئی ہے۔

اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا۔ ”ادھر آؤ۔ کرسی پر بیٹھو۔“ وہ قریب آ کر کرسی کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر بہت سنبھل کر بیٹھ گیا۔ کرسی پہلے جہاں تھی، اب وہیں آگئی تھی۔ تھوڑی

دیر پہلے جو ہوا، وہ ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ اس نے سپاہی کو حکم دیا۔ ”اٹھو۔“

پرنہ وہاں پہنچ گیا۔“

اسی لمحے میں ایک زبردست دھماکا ہوا۔ ایک جنگی طیارے کے پرچے اڑنے لگے۔ وہ شدید جہرائی اور پریشانی سے اپنے ایک طیارے کی تباہی دیکھ رہے تھے۔

جب دھماکے کا شور کم ہوا تو مراد نے کہا۔ ”یہ ہماری طاقت کا ایک نمونہ ہے۔ اب بولو تمام طیاروں کی تباہی کا مشہور دیکھنا چاہو گے؟ ہمیں روک سکو گے؟“

سب ہی جلدی جلدی انکار میں سر ہلانے لگے۔ مراد نے کہا۔ ”کل ہمارا طیارہ اس ملک کی سرحد میں داخل ہوگا اور تم اسے نشانہ بنانا چاہو گے تو اس سے پہلے ہی تمہارے تمام طیاروں کو نابود کر دیا جائے گا۔ اب کل ملاقات ہوگی۔“

اس نے ایک افسر کے سر پر چپت مار کر کہا۔ ”وش یو بیڈلک۔“

وہ دونوں وہاں سے آرمی ہیڈ کوارٹر میں آگئے۔ وہاں یہ خبر پہنچی تھی کہ ان کے اتریں کے ایک طیارے کو تباہ کر دیا گیا ہے اور کسی جن نے ایک اعلیٰ افسر کی پٹائی کی ہے۔

وہ سب پریشان تھے۔ انہوں نے بڑے حوصلے سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ریاست کا طیارہ ان کی سرحد میں داخل ہوگا تو اسے زمینی حملوں سے مار گرائیں گے لیکن وہ فوجی عزم سے کیا ہوا فیصلہ اب کمزور پڑ گیا تھا۔

ہیڈ کوارٹر میں آرمی کے کمانڈر اور کئی افسران نے کسی نادریدہ کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”کل جو ہونے والا ہے، وہ آج ہو جائے۔ اس ہیڈ کوارٹر میں کل جو تباہی ہونے والی ہے، اس کا ایک نمونہ پیش کرنے آیا ہوں۔“

کمانڈر نے کہا۔ ”پلیز مسٹران سین اہم آپ کو چیلنج نہیں کر رہے ہیں۔ کل آپ کے طیارے کی طرف کوئی انگلی بھی نہیں اٹھائے گا۔ یہ ہمارا وعدہ ہے۔“

”اپنے وعدہ پر قائم رہو گے تو تمہاری سلامتی ہے۔ ورنہ ایک ناقابلِ برداشت نقصان اٹھانے کے لیے تیار رہنا۔ کل تمہاری ایک غلطی کے باعث ہزاروں فوجیوں کے گھروں سے ماتم کرنے کی آوازیں گونجتی رہیں گی۔“

مراد اور ہم زاد وقت سے پہلے انہیں تباہی کا مشہور دکھا کر وارننگ دے چکے تھے۔ یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ ریاست سے آنے والے سیاحوں کو نقصان پہنچانے کی غلطی نہیں کریں گے۔ دیکھا جائے تو دشمن مرعوب ہو چکے تھے۔ ان پر اچھی خاموشی و پشت طازمی ہو گئی تھی۔ وہ آرمی کے حوالے سے بڑے نقصانات اٹھا چکے تھے یہ یقین ہو رہا تھا کہ وہ آئندہ

مراد کے خلاف حماد آرائی کی جرأت کرنے کی نادانی نہیں کریں گے۔ اب سے پہلے ہی مراد نے یقین سے یہی سوچا تھا اور ان کی دوستی پر بھروسہ کیا تھا لیکن انہوں نے اچانک ہی اسے طیارے سمیت ٹریپ کر لیا تھا۔ ان کی دوستی دوستی سے سبق حاصل ہوا تھا کہ آئندہ بھی ان پر اعتماد نہ کیا جائے۔

سانپ کی فطرت ہے ڈستا۔ انہیں لاکھ وودھ پلاؤ۔ وہ ڈسنے سے باز نہیں آئیں گے۔ مراد نے اسکا پ کے ذریعے پھر ان سے رابطہ کیا اور کہا۔ ”میں نے اپنے پروگرام میں ایک تبدیلی کی ہے۔ یہاں کے سیاح ریاست کے طیارے میں نہیں جائیں گے۔ آپ حضرات ایک خصوصی طیارہ یہاں بھیجیں گے۔“

ایک نے پوچھا۔ ”آپ ایسا کیوں چاہتے ہیں؟“ اس نے کہا۔ ”میری ریاست میں وہی مسافر بردار طیارے ہیں۔ میں ان میں سے کسی کو سیاحوں کے لیے استعمال کروں گا تو دوسرے مسافروں کو پریشانی ہوگی۔ میں اس سے زیادہ وضاحت نہیں کروں گا۔ آپ ایک طیارہ ان کے لیے بھیج دیں۔“

وہاں تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ وہ اسکا پ کو آف کر کے ایک دوسرے سے بولتے رہے۔ ایک نے کہا۔ ”وہ بہت گہرا ہے۔ اس نے کچھ سوچ کر ہم سے ہمارے طیارے کا مطالبہ کیا ہے۔“

دوسرے نے ناگوارمی سے اور بے بسی سے کہا۔ ”مطالبہ تو پورا کرنا ہوگا۔ ورنہ رنجش اور بڑھیس گی۔ ہم اس کی باتیں مان کر بھی اختلافات کو کم کر سکتے ہیں۔“

انہوں نے پھر اسکا پ کے ذریعے کہا۔ ”ویل ہز ہائی نسن! ہم آپ کو خوش کرنا اور اختلافات کو کم سے کم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ ہمیں اور چوبیس گھنٹے کا وقت دیں۔ ہم کل ہمیں، پرسوں صبح آپ کے پاس ایک طیارہ پہنچا دیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”شکریہ۔ آپ مجھ سے تعاون کر رہے ہیں۔ واقعی آپ حضرات کے ایسے ہی طریقہ عمل سے اختلافات ختم ہوتے رہیں گے۔“

ان سب سے رابطہ ختم ہو گیا۔ وہاں مراد کے ساتھ اس کا ہم زاد بشری اور بلا بیٹھے ہوئے تھے۔ اس نے کہا۔ ”تم تینوں توجہ سے سنو۔ مجھے یہ اندیشہ ہے کہ دشمن پھر چالبازیوں سے باز نہیں آئیں گے۔ اس بار وہ ہمارے طیارے کو صرف ٹریپ نہیں کریں گے، اسے اپنی سرحدی حدود میں مار گرائیں گے۔ اب یہ اندیشہ ختم ہو گیا ہے۔ طیارہ ان کا ہوگا۔ مسافر ہمارے ہوں گے۔“

گے وہاں قانون کے محافظوں کی نیندیں حرام کر دیں گے۔
وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولنا۔ ”بھئی میری
انتقائی کارروائی ہوگی۔“

بشریٰ نے تالی بجاتے ہوئے کہا۔ ”واہ بھائی! کیا
کمال کا آئیڈیا ہے۔ آپ یہاں بیٹھے رہیں گے۔ کچھ نہیں
کریں گے اور وہاں بڑے بڑے سے انتقائی کارروائی
ہوتی رہے گی۔“

اس نے بشریٰ سے کہا۔ ”تم بیلے کے ساتھ ان
قیدیوں سے ملنے کے لیے جیل میں جاؤ گی۔ ان میں سے دو
قیدی عورتیں ہیں۔ ان سے کہا جائے گا کہ ان سب کو ایک
طیارے میں فرینکفرٹ بھیجا جا رہا ہے۔ وہ سیاحوں کی
حیثیت سے جا رہے ہیں۔ وہاں پہنچ کر وہ اپنی اصلیت بیان
کریں گے اور ان سے پناہ مانگیں گے۔ اگر انہیں پناہ نہیں
ملے گی اور وہ واپس آئیں گے تو ان کے لیے سزائے موت
اور عمر قید لازمی ہوگی۔ لہذا وہ واپس آنے کی نادانی نہ
کریں۔ وہیں کسی طرح زندہ رہیں۔“

پھر اس نے ہم زاد سے کہا۔ ”تم ان دس مجرموں کی
نگرانی کرو گے اور دشمنوں کا ردعمل دیکھتے ہوئے اپنے طور پر
کارروائی کرتے رہو گے۔ میں ماروی اور محبوب صاحب کے
پاس جا رہا ہوں۔ وہاں دشمن ایک نئی چال چل رہے ہیں۔“

وہ وہاں سے اٹھ کر اپنی خواب گاہ میں ماہ نور کے
پاس آیا۔ وہاں ایک دیوار پر ایک بڑی سی اسکرین تھی۔ اس
اسکرین پر اسٹیل جنس ڈیپارٹمنٹ کے کئی اہم عہدیدار نظر
آ رہے تھے۔ ریاست کے تمام حساس شعبوں میں خفیہ
اکیسے اور بائک نصب کیے گئے تھے۔ ماہ نور وہاں بیٹھی
جیتل بدل بدل کر ہر شعبے کے عہدیداروں کو اور دیگر اہم
افراد کو دیکھتی رہتی تھی۔ ان کی باتیں سنتی رہتی تھی۔ ہم زاد کی
شریک حیات زیب النساء بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ اپنی
خواب گاہ میں اسی طرح مصروف رہتی تھی۔ چالاک جاسوس
اور آری کے افسران ان خفیہ کیسروں اور مانگرڈون سے اس
لیے بے خبر تھے کہ مراد اور ہم زاو نے نا دیدہ ہو کر بڑی
رازداری سے انہیں وہاں نصب کیا تھا۔

ان میں سے کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان کی
خفیہ باتیں گل کی خواب گاہوں تک پہنچ رہی ہیں۔ ماہ نور اور
زیب اہم اور قابل اعتراض باتوں کی ریکارڈنگ کو محفوظ کرتی
رہتی تھیں۔ جو لوگ حکومت کے اور ریاست کے خلاف
باتیں کرتے تھے، ان کے نام بلیک لسٹ میں آ جاتے تھے۔
یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صرف باتیں کرتے ہیں لیکن مراد کے

ہم زاد نے سر ہلا کر کہا۔ ”میں سمجھ گیا۔ اس طرح وہ
اپنے طیارے کو تباہ نہیں کریں گے۔ یہاں سے جانے
والے ہمارے سیاح محفوظ رہیں گے۔“

بشریٰ نے کہا۔ ”بھائی! ان امیر کبیر ممالک کے لیے
ایک چھوٹا طیارہ کیا اہمیت رکھتا ہے۔ آپ نے ان کے کئی
طیارے مار گرائے ہیں۔ ایک طیارہ اور سبھی۔ وہ اسے مار
گرائیں گے تو ہمارے تمام سیاح مارے جائیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”درست کہتی ہو۔ کتوں کی دم ٹیڑھی
رہتی ہے۔ وہ ٹیڑھے ہی رہیں گے۔ پھر نقصان اٹھائیں
گے۔ ہم انہیں پھر سبق سکھائیں گے۔ وہ اپنا طیارہ تباہ کریں
گے اور اپنا سر پکڑ لیں گے۔ ہمارا ایک بھی سیاح مارا نہیں
جائے گا۔“

تینوں نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ ”ہمارا کوئی سیاح
کوئی مصدوم شہری اس طیارے میں نہیں جائے گا۔ صرف
بہروپے سیاح جائیں گے۔“

بلے نے پوچھا۔ ”وہ بہروپے سیاح کون ہوں گے؟“
مراد نے کہا۔ ”وہ ہوں گے جن کے مقدر میں
موت لکھی جا چکی ہے۔ جنہیں ہر حال میں مرنا ہی
مرنا ہے۔“

وہ سب اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس
نے کہا۔ ”میں نے جیلر سے معلوم کیا ہے۔ ہماری ریاست کی
جیل میں چھ قیدی ایسے ہیں جو بہت ہی بے رحم اور سنگدل
مجرم ہیں۔ جن کے جرائم ناقابل معافی ہیں۔ عدالت انہیں
سزائے موت کا حکم سن چکی ہے۔ اب انہیں یہاں پھانسی
نہیں دی جائے گی۔ وہ طیارے میں جا کر دشمنوں کے
ہاتھوں مارے جائیں گے۔“

بشریٰ نے کہا۔ ”واہ بھائی! کیا زبردست آئیڈیا ہے۔“
مراد نے کہا۔ ”اور چار مجرم ایسے ہیں جو عمر قید کی
سزا کاٹ رہے ہیں۔ انہیں بھی طیارے میں بھیج دیا جائے
گا۔ اب سوچو کہ وہاں کیا ہوگا؟ اگر دشمنوں نے اپنے جہاز
کو تباہ نہ کیا اور وہ دس مجرم زندہ رہ جائیں گے تو وہاں پہنچتے
ہی ہماری ریاست کے عدالتی فیصلے سے آزاد ہو جائیں
گے۔ یہاں واپس نہیں آئیں گے۔ وہ سب ان ممالک سے
پناہ کی درخواست کریں گے۔ انہیں پناہ نہیں دی جائے گی تو
وہ وہاں کے شہروں اور مختلف علاقوں میں بھاگتے اور چھپتے
پھریں گے۔ ہماری ریاست میں واپس نہیں آئیں گے۔
یہاں انہیں موت ملے گی۔ وہاں روپوش رہ کر زندگی ملتی
رہے گی۔ وہ دس مجرم بہت خطرناک ہیں۔ جہاں جائیں

رہیں۔“

آفس گیا تھا، اسی کار میں اسی سوٹ میں واپس آیا ہے۔ وہ سب اچھی طرح نگرانی کر رہے تھے۔ جلد بازی میں دھوکا کھانا نہیں چاہتے تھے۔ دن رات یہی دیکھ رہے تھے، محبوب معمول کے مطابق کوشی سے آفس جاتا تھا۔ اندر کا حال کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ شام کو محبوب آفس کا دروازہ اندر سے بند کرتا تو مراد حاضر ہو جاتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے لباس تبدیل کرتے تھے۔ پھر مراد کبھی دن کو برقع پوش کنیز کے ساتھ آؤٹنگ کے لیے بھی جاتا تھا۔ اسے شائنگ بھی کراتا تھا۔

دشمنوں کو یقین ہوتا جا رہا تھا کہ ماروی اور محبوب اسی کوشی میں ہیں۔ ایسے وقت مراد اس ناجرم کنیز کے ساتھ ایک چھت کے نیچے نہیں رہتا تھا۔ اپنی خواب گاہ کا دروازہ بند کر کے ماہ نور کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ اس کے ساتھ رات گزارتا تھا۔ شاور لے کر فجر کی نماز پڑھنے محبوب کی کوشی میں آ جاتا تھا۔

تین دن اور تین راتوں تک اچھی طرح نگرانی کے بعد دشمنوں کو یقین ہو گیا کہ وہ دھوکا نہیں کھا رہے ہیں۔ انہوں نے جینی کے ذریعے اس کے ناویدہ پار مسٹران سین کو بلا یا۔ اس سے کہا۔ ”محبوب کی کوشی میں جا کر دیکھو۔ وہاں وہ ماروی کے ساتھ موجود ہے یا نہیں؟“

ہم زاو نے تھوڑی دیر بعد آ کر کہا۔ ”وہاں محبوب ہے لیکن میں ماروی کو صورت سے پہچانتا نہیں ہوں۔“ انہوں نے اسے نمبرہ کی تصویر دکھائی۔ وہ آخری بار لندن سے نمبرہ کی صورت لے کر آئی تھی۔ محبوب نے رازداری سے پھر اس کی پلاسٹک سرجری کرائی تھی۔ ماروی کو اس کا اصلی چہرہ واپس مل گیا تھا۔ یہ دشمن... نہیں جانتے تھے۔

ہم زاو نے نمبرہ کی تصویر دیکھ کر کہا۔ ”ایسی صورت والی اس کوشی میں نہیں ہے۔ محبوب نے کسی ماہر سے اس کا چہرہ بدل دیا ہوگا۔ تمہارے وہ تمام نگرانی کرنے والے کیا کہتے ہیں؟“

”انہوں نے ماروی کو ہمیشہ عبا اور نقاب میں دیکھا ہے۔ اسے صورت سے نہیں پہچانتے ہیں۔ اب یہ کیسے معلوم ہو کہ ماروی کسی دوسرے روپ میں وہاں ہے یا نہیں؟“ ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”مسٹران سین! پلیز وہاں تھوڑی دیر رہ کر دیکھیں۔ ماروی ہوگی تو محبوب اس کے ساتھ بیڈروم میں جائے گا یا کسی وقت اسے ماروی کے نام سے پکارے گا۔“

”اچھی بات ہے، میں وہاں جا کر تھوڑی دیر تک

خلاف عملی طور پر کچھ کرتے ہوئے ڈرتے تھے اور وہ بار اپنے کان پکڑتے تھے اور جو عملی طور پر کچھ کر رہا جانتے تھے ان کی لاشیں شہر کے چوراہوں پر انٹی لنگی ہوئی دکھائی دیتی تھیں اور بڑے سے بلیک بورڈ پر ان کے جرائم کی تفصیل لکھی ہوئی دیکھی جاتی تھی۔ اس کے بہترین نتائج سامنے آ رہے تھے۔ عوام کے ذہنوں میں یہ حقائق نقش ہو گئے تھے کہ موجودہ حکمران کی سیکرٹ فورس بہت فعال ہے۔ وہ تاریکی میں بھی ان کی حرکتوں کو دیکھ لیتے ہیں۔

☆☆☆

مراد نے پہلے ہی محبوب کو یہ بتا دیا تھا کہ دشمن اب اس کے اور ماروی کے لیے پرائلم بننے والے ہیں۔ اس بار وہ بڑی پلاننگ سے دشمنی کرنے والے ہیں۔ جرائم کی دنیا کی جو جرمناہ تنظیمیں ہیں ان کے ہی ناموں سے مجرموں کا لشکر کراچی بھیجنے والے ہیں۔ لہذا اس سے پہلے ہی بچاؤ کی تدابیر پر عمل کرنا لازمی ہو گیا تھا اور وہ عمل کر رہے تھے۔ ماروی جن کوشی میں رہتی تھی، وہاں تین کنیزیں خدمت گزار کی لیے آگئی تھیں۔ ان میں سے ایک کنیز یروے کی سخت پابندی۔ کوشی کے باہر نہیں آتی تھی۔ چھپ کر نگرانی کرنے والے دشمنوں نے اس کو اوز ماروی کو بھی گھڑکی اور دروازے پر بھی نہیں دیکھا تھا۔

محبوب کے آفس کے پیچھے ایک بہت ہی آرام دہ کرا تھا۔ وہ بیچ کے بعد وہاں ایک آؤٹنگ کے لیے لیٹے جاتا تھا۔ اس نے اس کمرے کو عارضی طور پر اپنی رہائش گاہ بنا لیا۔ ایک رات ماروی کو بڑی رازداری سے وہاں لے آیا۔ تمام سکیورٹی گارڈز کو تاحید کی۔ یہ کہا کہ کسی سے یہ ذکر نہ کیا جائے کہ اس کے ساتھ ایک خاتون وہاں آ کر رہنے لگی ہے۔

وہ تمام گارڈز وفادار تھے۔ کسی سے ذکر کرنے والے نہیں تھے۔ یوں ماروی کو کوشی سے چپ چاپ وہاں ٹرانسفر کروا گیا تھا۔ اس کے بعد محبوب کو مراد کا انتظار تھا۔ جب وہ آیا تو اس روز محبوب شام تک دفتر میں مصروف رہا۔ پھر مراد نے کہا۔ ”دروازہ بند کرو۔“

اس نے دروازے کو اندر سے بند کروا دیا۔ اسی لمحے میں مراد بالکل اسی سوٹ میں حاضر ہو گیا جیسا کہ محبوب نے پہنا ہوا تھا۔ محبوب اس سے مصافحہ کر کے پیچھے رہا کسی کمرے میں ماروی کے پاس چلا گیا۔ مراد دروازہ کھول کر آفس سے باہر آیا تو سب اسے محبوب سمجھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ باہر آ کر محبوب کی کار میں بیٹھ کر کوشی میں پہنچ گیا۔ نگرانی کرنے والے دیکھ رہے تھے کہ محبوب جو سوٹ پہن کر جس کار میں

وہ چلا گیا۔ سب ہی بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔۔۔ ہم نے پندرہ منٹ بعد آکر کہا۔ ”وہ اس حسینہ کے ساتھ بیڈروم میں گیا ہے، اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا ہے۔“

پھر کسی طرح کے شے کی گنجائش نہیں رہی۔ انہوں نے اسی وقت فون کے ذریعے کہا۔ ”تصدیق ہو گئی ہے۔ ماروی اور محبوب ابھی کوٹھی کے اندر ہیں۔ اس کوٹھی کو چاروں طرف سے گھیر لو۔ پھر ہمیں رپورٹ دو۔ ہم انتظار کر رہے ہیں۔“

تھوڑی دیر بعد ہی مراد نے اسکاٹپ کے ذریعے ان سے رابطہ کیا۔ پھر غصے سے کہا۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ ابھی محبوب صاحب نے مجھے فون پر کہا ہے کہ ان کی کوٹھی کو درجنوں مسلح افراد نے گھیر لیا ہے اور حکم دے رہے ہیں کہ کوٹھی کے اندر جتنے ہتھیار ہیں، انہیں باہر پھینک دیا جائے۔ سامنے کا دروازہ کھلا رکھا جائے۔ وہ مسلح افراد اندر آ کر انہیں قیدی بنانے والے ہیں۔“

یہ سن کر وہ سب ہی اندر سے خوش ہو رہے تھے۔ بظاہر پریشانی ظاہر کر رہے تھے۔ ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”ہز ہائی نٹس! ہم سے قسم لے لو۔ ہم کچھ نہیں جانتے۔ یہ باتیں ہم آپ کے منہ سے سن رہے ہیں۔ ہم ابھی اپنے ذرائع سے معلوم کرتے ہیں کہ وہاں کون لوگ ہیں اور ایسی حرکتیں کیوں کر رہے ہیں؟“

مراد گل میں بیٹھا اسکاٹپ کے ذریعے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ایک فوجی افسر کئی اعلیٰ عہدیدار فون پر کسی نہ کسی سے بول رہے تھے۔ پھر ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”ہز ہائی نٹس! یہ معلوم ہو رہا ہے کہ مجرموں کی ایک خطرناک تنظیم ریڈارٹ اور اس کی اتحادی تنظیمیں آپ کے خلاف ایسا کر رہی ہیں۔ میں نے انہیں آپ کا فون نمبر دیا ہے۔ وہ آپ سے باتیں کرنے والے ہیں۔“

وہ منٹ کے بعد ہی کسی نے مراد سے کہا۔ ”ہیلو! کیا تم مراد علی سگلی ہو؟“

”ہاں۔ میں ریاست ارض اسلام کا حاکم اعلیٰ مراد علی سگلی ہوں۔ تم کون ہو؟“

وہ حقارت سے بولا۔ ”اونہہ۔۔۔ ایک بدترین مجرم، ایک سٹاک ٹائل سر پر تاج پہن کر بادشاہ نہیں بن جاتا۔ تم دو کوڑی کے مجرم ہو، مجرم ہی رہو گے۔“

مراد اسکاٹپ کو آف کر کے پلک جھپکتے ہی بولنے والے کے سامنے پہنچ گیا۔ وہ ایک ایئر کنڈیشنڈ ڈرائنگ روم میں فون کو کان سے نکالے بیٹھا تھا۔

”میں ریڈارٹ کا موجودہ سربراہ جنکی براؤن ہوں۔ تم نے میرے باپ کو چاقو اور میرے بزرگ برنارڈ کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ آج تم میری منگی میں آرہے ہو۔ میرے چار درجن شوئرز نے تمہاری جیتی ماروی کو اور محبوب علی چانڈیو کو ان کی کوٹھی میں قید کر دیا ہے۔ میرے ایک اشارے پر ان دونوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔“

”پہلے تو یہ کہہ دوں کہ میں جنکی براؤن کے لب و لہجے کو خوب پہچانتا ہوں۔ تم جنکی براؤن نہیں ہو۔ اگلا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے سچ بولو، تم کون ہو؟ اور کس کے اشارے پر ناچنے کے لیے ماروی اور محبوب کی طرف گئے ہو؟“

”تم نہ مانو کہ میں جنکی براؤن ہوں۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ دیکھو کہ وہ دونوں میری قید میں ہیں اور اپنی زندگی کی چند آخری سانسیں لے رہے ہیں۔“

”اچھا تو چلو اپنے اوپر والوں سے پوچھ لو کہ تمہارے آدمیوں کو کب اس کوٹھی کے اندر جا کر ان دو قیدیوں کو ہلاک کرنا ہے۔ میں انہیں بچانے کے لیے کراچی جا رہا ہوں۔“

مراد نے رابطہ ختم کر دیا۔ اس شخص نے فوراً ہی اپنے فون پر نمبر شیخ کیے۔ مراد اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے رابطہ ہوتے ہی کہا۔ ”مرا میں نے مراد سے باتیں کی ہیں۔ وہ وحوش میں نہیں آ رہا ہے۔ اسے مجھ پر شبہ ہو گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں جنکی براؤن نہیں ہوں۔ آپ بتائیں، اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

اسی وقت مراد نے اس سے فون چھین کر اپنے کان سے لگایا۔ وہ شخص حیرانی سے اور خوف سے منہ کھول کر دیکھنے لگا۔ اس کا فون فضا میں معلق تھا۔ اس نے ڈرتے ہوئے اپنے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا تو منہ پر کرائے کا ہاتھ پڑا۔ وہ صوفے پر سے نیچے فرش پر گر پڑا۔ پھر وہاں سے اٹھنے کی جرأت نہ کر سکا۔

دوسری طرف سے ایک حاکم اعلیٰ کہہ رہا تھا۔ ”اپنے شوئرز سے بولو، وہ کوٹھی میں کھس کر ماروی اور محبوب کو ہتھکڑیاں پہنادیں۔ یہ نشین کر لو کہ وہ واقعی شکستے میں آ گئے ہیں۔“

مراد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اچھا تو مسز سپر پاور! یہ تم ہو۔ کرائے کے شوئرز کے کاندھوں پر بندوق رکھ کر چٹارہے ہو۔“

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”کون ہو تم؟“ مراد نے پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں ہز ہائی نٹس

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک میں



جاسوسی ڈائجسٹ، سسٹمز ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سمر گزشت

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

امریکی گنیڈا آئرن پلیرا برنیوز لیٹڈ کے لیے 9,000 روپے

ایٹھن مالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک اوقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد
رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے
ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ تکہ دیے ہوئے پتے پر
رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

آپ کی طرف سے نیا ڈاک کیے پتے میں بھیجیں گے۔
بیرہن ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے
ذریعے رقم ارسال کریں۔ کس اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر
بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

0301-2454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C، ایف۔ ایف۔ 63، سٹیٹ انٹرنیٹ بینک، ڈیڑھ راجہ
فون: 021-35802551، 021-35895313

... کا ایک تابعدار جن ہوں۔ ابھی تمہاری اخصیلت بتانے
اپنے آقا کے پاس جا رہا ہوں۔“

ادھر اس نے فون بند کیا۔ ادھر سپر پاور اور اس کے
اتحادیوں کے ہوش اڑ گئے۔ اگر مراد اتنی لمبی چال نہ چلتا تو دشمن
کبھی اعتراف نہ کرتے کہ وہ پھر کیننگی دکھارے ہیں۔ اعلیٰ حاکم
نے دوسرے ماتحت سے کہا۔ ”ہمارا بھید کھل رہا ہے۔ فوراً کوٹھی
میں گھس کر ماروی اور محبوب کو اپنے ٹھکانے میں لو۔ مراد کی یہ بہت
بڑی کمزوری ہمارے ہاتھ میں رہے گی۔“

پھر اس نے جیننی کے ذریعے سمران سین کو بلا یا اور
کہا۔ ”مراد کے سامنے پھر ہماری دشمنی کھل رہی ہے۔ پلیز
اس کوٹھی میں جاؤ۔ مراد کے کسی جن کو رکاوٹ نہ بننے دو۔“
ہم زاد نے کہا۔ ”میں ابھی جاتا ہوں۔ مراد سے
انتقام لینے کا یہ بہترین موقع ہے۔“

ادھر کئی شوڑہاتھوں میں گن لیے محتاط انداز میں کوٹھی
کے اندر آئے۔ وہ بار بار لٹکا رہے تھے۔ ”خبردار! کوئی
گولی چلائے گا تو ہم یہاں کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔
محبوب علی چائے پو ا زندہ رہنا چاہتے ہو تو باروی کے ساتھ
ہمارے سامنے آ جاؤ۔“

وہ لٹکا رہے تھے اور کوٹھی کے ایک ایک حصے میں
جا رہے تھے۔ تین کینزوں کو گرفتار کیا گیا اور کوئی نظر نہیں
آیا۔ ایک نے ڈانٹ کر پوچھا۔ ”وہ دونوں کہاں ہیں؟“
ایک کینز نے کہا۔ ”ہماری مالکن کوئی چار دن پہلے
کبھی چلی گئی ہیں۔ پھر واپس نہیں آئیں۔“

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔ ہم نے کل ہی دیکھا ہے۔
وہ محبوب کے ساتھ کار میں بیٹھ کر شاپنگ کے لیے گئی تھی۔“
کینز نے کہا۔ ”وہ میں تھی۔ عبا اور نقاب میں باہر
جاتی ہوں۔ گھر کی ضرورت کا سامان لانے کے لیے مالک
کے ساتھ گئی تھی۔“

”تمہارا مالک محبوب کہاں ہے؟“
”وہ ایک گھنٹا پہلے یہاں اپنی خواب گاہ میں تھے۔“
”ہم خواب گاہ میں دیکھ چکے ہیں۔ وہ نہیں ہے۔ وہ
اس کوٹھی سے باہر کیسے جاسکتا ہے؟“
دوسری کینز نے کہا۔ ”ہم خود حیران ہیں کہ وہ کہاں گم
ہو گئے ہیں۔ ہمیں یہاں سے جانے دو۔“

ایک شوڑہ نے کینز کے بالوں کو کٹھی میں جکڑ کر ایک
جھاگا دیتے ہوئے کہا۔ ”سیدھی طرح نہیں بتاؤ گی تو.....“
جانتا اور پوری ترہ گئی۔ اس کے حلق سے ایک کراہ
کئی۔ اس نے جن ہاتھ سے اس کے بالوں کو جکڑا تھا، اس

کریں گے؟“

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ”تم ہمارے لیے کچھ نہ کر سکتے۔ تمہاری جنائی تو تمہارے کسی کام نہیں آسکتی۔“
 ”میں کہہ چکا ہوں کہ تمہا ہوں اور وہ کئی تھے۔ ان کی جنائی تو تمہیں مجھ سے زیادہ ہیں۔ میں آئندہ بھی تمہارے کام نہیں آسکوں گا۔ آئندہ جینی کی طرف رخ نہ کرنا۔ میں اس کے ساتھ عیش و آرام سے رہوں گا۔ کسی نے جینی کو نقصان پہنچانا چاہا تو اس کی شامت آجائے گی۔ میرے خلاف نیا محاذ کھولنے کی حماقت نہ کرنا۔“

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”مسٹر ان سین ایلیز ناراض ہو کر نہ جاؤ۔ ہم تم سے دوستی رکھنا چاہتے ہیں۔“
 انہیں کوئی جواب نہیں ملا۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ وہ جا چکا ہے۔ ایک پلان میکر نے کہا۔ ”اب کیا ہوگا؟ آپ حضرات اپنی تھیلیوں پر دیکھتے ہوئے انگارے رکھ کر مراد سے دوستی کی قسمیں کھا نہیں گئے، تب بھی وہ ہم پر یقین نہیں کرے گا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”ہاں، اب تو وہ کبھی ہم پر اعتماد نہیں کرے گا۔ پتا نہیں وہ کیسی انتقامی کارروائیاں کرنے والا ہے۔ اب ہمیں صرف اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچ کر ان پر عمل کرنا ہے۔“
 ایک نے کہا۔ ”یہ ممکن نہیں ہے۔ ہم نظر نہ آنے والے جنات کی دشمنی سے خود کو بچا نہیں پائیں گے۔“

ایک مشیر نے کہا۔ ”میرا مشورہ ہے۔ ہم مراد کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کا اعلان کریں۔ بین الاقوامی عدالت کی طرف سے مراد کو کہا جائے گا کہ ہتھیار ڈالنے والے سپاہیوں کو معاف کر دیا جاتا ہے۔ لہذا وہ انتقامی کارروائی نہ کرے۔“

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”اس طرح ہم اس کی انتقامی کارروائیوں سے محفوظ رہیں گے لیکن ہم پوری دنیا میں سپر پاور کہلاتے ہیں۔ ہماری بڑی توہین ہوگی۔ ہمارا رعب اور دبدبہ ختم ہو جائے گا۔ وہ ناخن برابر ریاست سپر پاور کہلائے گی۔ ہم کئی معاملات میں اس کے تابعدار بن کر رہ جائیں گے۔“

ایک نے کہا۔ ”نہیں۔ ہمیں اس قدر خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ کیا کرتا ہے؟“

دوسرے نے کہا۔ ”ہاں، اسے انتقامی کارروائیاں کرنے دو۔ دیکھتے ہیں کیا ہوگا؟ ہم کچھ نقصان اٹھاتے رہیں گے اور بچاؤ کی تدابیر پر عمل کرتے رہیں گے۔ آگے جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔“

ہاتھ پر کوئی ٹیکسی چیز چسپی تھی وہاں سے لہو بہ رہا تھا۔ پھر دوسرے ہاتھ میں وہی تکلیف دہ چیمن ہوئی تو گن چھوٹ کر فرش پر گر پڑی۔ اس ہاتھ سے بھی لہو بہ رہا تھا۔ پھر دوسرے تیسرے شوٹر کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ان کے خون آلود ہاتھوں سے ہتھیار نکل کر فرش پر گر پڑے۔ وہ سب ہم گئے۔ ان کیزروں سے دور ہو کر ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ ”یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہاں کوئی ہے۔ ہم پر حملے کر رہا ہے اور نظر نہیں آ رہا ہے۔“

وہاں مراد کے علاوہ ہم زاد بھی تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں چاقو تھے۔ وہ ایک ایک شوٹر پر چاقو چلانے لگے۔ انہیں ہلاک نہیں کر رہے تھے، صرف زخمی کر رہے تھے۔ وہ سب پیچھے چلا تے ہوئے کوشی سے باہر بھاگنے لگے۔ باہر جن شوٹرز نے کوشی کا محاصرہ کیا تھا، ان پر بھی یہ عذاب نازل ہونے لگا۔ وہ سب زخمی ہو رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زخمی کرنے والے کہاں ہیں اور انہیں کس سمت گولی چلانا چاہیے؟ وہ اپنی سلامتی کے لیے بھاگتے چلے گئے۔

ذرا سی دیر میں کوشی کے اندر اور باہر ویرانی چھا گئی۔ وہاں ایک بھی ہتھیار والا نہ رہا۔ کوشی کے اندر صرف تین کیزریں رہ گئیں۔ محبوب نے فون کے ذریعے انہیں سلی وی کہ وہ پریشان نہ ہوں۔ آرام سے کوشی میں رہیں۔ وہ سب محفوظ ہیں۔ اب کوئی مصیبت نہیں آئے گی۔

سپر پاور اور اس کے اتحادی اسکا پ کے ذریعے رابطے میں تھے۔ ہم زاو نے آ کر کہا۔ ”ہم سب دھوکا کھا گئے۔ اس کوشی میں ایک جن محبوب کی صورت بنا کر رہتا تھا۔ تمہارے شوٹرز اذر گرائی کرنے والے جا سوس اسے محبوب علی چانڈیوتھتے رہے۔“

ایک نے سوال کیا۔ ”تم اسے کیوں نہ پہچان سکتے؟“
 اس نے جواب دیا۔ ”ایک جن دوسرے جن کے اندر گھس نہیں سکتا، اس کی اصلیت معلوم نہیں کر سکتا۔ جب محبوب اچانک اس کوشی سے قائب ہوا، تب پتا چلا کہ وہ ایک جن تھا۔ اس کے بعد کئی جن وہاں آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں چاقو تھے اور وہ تمہارے درجنوں شوٹرز کو زخمی کرتے جا رہے تھے۔ میں چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ میں بزدل نہیں ہوں لیکن اکیلا ان تمام جنات سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ نہ مراد نے نہ محبوب نے کسی سے مقابلہ کیا ہے، وہ اپنے اپنے گھر میں بیٹھے ہیں اور آپ حضرات مات کھا رہے ہیں۔ وہاں میدان صاف ہو چکا ہے۔ اب آپ کیا

وہ ٹوٹ جانا چاہتے تھے لیکن جھکنا نہیں چاہتے تھے۔
پولیس انہیں زبردستی طیارے میں بٹھا کر ریاست میں
پہنچاوتی۔

☆☆☆

مجرموں کو کسی مجرم کے ہی گھر میں پناہ مل سکتی تھی۔ وہ
دس مجرم کئی کئی مثل تنظیموں کے لیے کام کرتے رہے تھے۔
انہوں نے ایسی تنظیموں سے رابطے کیے اور کہا کہ وہ ان کے
لیے واردات کرتے رہیں گے۔ فی الحال ان کی مدد کی
جائے۔ ان سب نے التجا کی کہ انہیں فی الحال ایسی جگہ چھپا
دیا جائے، جہاں قانون کے محافظ انہیں گرفتار نہ کریں اور
انہیں ریاست میں واپس جانے پر مجبور نہ کر سکیں۔

ریڈ الرٹ کے سربراہ جنکی براؤن نے کہا۔ ”ہم
تمہیں پناہ دیں گے۔ شرط یہ ہے کہ مراد کو گولی مارو گے۔“
ایک نے کہا۔ ”ہم مراد سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں
اور آپ ہمیں اس کے پیچھے لگانے کی بات کر رہے ہیں۔“
جنکی براؤن نے کہا۔ ”وہ روز اول سے ہمارا ایک
ایسا دشمن ہے جو ہمارے نشانے پر نہیں آ رہا ہے۔ اسے مار کر
ہی تم سب ہماری پناہ میں رہ سکو گے۔“

”ہم ریاست میں نہیں جائیں گے۔ وہ ریاست
سے باہر کسی بھی ملک میں آئے گا تو ہم اسے زندہ نہیں
چھوڑیں گے۔“

”چلو یہی سہی۔ اسے ہلاک کرنے تک تم ہمارے لیے
دوسرے کام کرتے رہو گے۔ ہم نوے گھنٹے پورے ہونے
سے پہلے تم سب کو کسی خفیہ پناہ گاہ میں پہنچا دیں گے۔“

بہر حال وہ چھپے ہوئے بد محاش تھے۔ انہوں نے
اپنے لیے پناہ حاصل کرنے کی جگہ ڈھونڈ لی۔ سپر پاور اور
اس کے اتحادی ممالک سب سے ہونے سے انتظار کر رہے تھے
مراد کی طرف سے کسی وقت بھی انتہائی کارروائی ہونے کی
توقع تھی لیکن ایک دن اور ایک رات گزرنے کے بعد بھی
اس کی طرف سے بڑی پراسرار خاموشی تھی۔ وہ کوئی راز
ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ اور یہ اس لیے کہ مراد علی منگلی کے غبارے
سے ہوا نکل رہی تھی۔ بابا اجیری نے کہا تھا کہ ناویدہ ہونے
اور چشم زدن میں کہیں بھی پہنچ جانے کی صلاحیتیں عارضی ہیں
کسی وقت بھی یہ صلاحیتیں نابود ہو جائیں گی اور وہ وقت
آ ہی گیا۔

انسان ہمیشہ بچہ نہیں رہتا۔ ہمیشہ جوانی کی چھلائیں
نہیں مار سکتا۔ جوانی کو زوال ہے اور بڑھاپے میں جینا محال
ہے اور آدمی نہ ہی سدا با کمال رہتا ہے۔ اس دنیا میں اس
سے سب کچھ چھین جاتا ہے۔

ناویدہ ہوجانے کی میعاد پوری ہو چکی تھی۔ اس نے

وہ جہاز ریاست کے دس نام نہاد مسافروں کو لے کر
فرینکفرٹ پہنچ گیا۔ وہاں کی پولیس اور اٹلی جنس والے یہ
شہ نہیں کر سکتے تھے کہ وہ ریاست کے دس مجرم ہیں۔
سیاح بن کر آئے ہیں۔ اوپر سے یہ احکامات جاری ہوئے
تھے کہ ان سب کو وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیا جائے۔ کسی کو
تاراج ہونے کا موقع نہ دیا جائے لیکن انہوں نے
اخبارات اور ٹی وی والوں کے سامنے یہ بیان دیا کہ وہ
خطرناک مجرم ہیں، قاتل ہیں۔ ریاست کی عدالت نے
انہیں سزائے موت کا اور عمر قید کا حکم سنایا ہے۔

یہ حیرانی کی بات تھی کہ موت کی سزا پانے والوں کو
اور آہنی سلاخوں سے بھی باہر نہ آنے والوں کو مراد نے ان
کے ملک میں بھیج دیا تھا۔ ان سے سوال کیا گیا۔ ”وہاں تمہیں
دی ہوئی سزاؤں پر عمل کیوں نہیں کیا گیا؟ تم سب کو رہا
کیوں کر دیا گیا ہے؟“

ایک نے کہا۔ ”ہمیں بظاہر رہائی ملی ہے۔ ہم سے کہا
گیا ہے کہ ریاست میں واپس جائیں گے تو سزائے موت
کے احکامات کے مطابق ہمیں پھانسی کے پھندوں سے لٹکا دیا
جائے گا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”ہم اسی طرح زندہ رہ سکتے ہیں کہ
یہاں سے واپس نہ جائیں۔ آپ کی حکومت سے التجا کر رہے
ہیں کہ ہمیں یہاں کی شہریت دے کر ہم پر احسان کریں۔ ہم
یہاں شرافت سے اور امن و امان سے رہیں گے۔“

حکومت کے اکابرین نے ان کے بیانات سن کر کہا۔
”ہر ہائی نس مراد علی منگلی نے ہم سے کہا ہے کہ ان کے دس
سیاحوں کو یہاں کوئی نقصان نہ پہنچے۔ وہ تیس گھنٹے جرمنی میں،
تیس گھنٹے فرانس میں اور تیس گھنٹے یو کے میں گزاریں گے۔
نوے گھنٹوں کے بعد انہیں خیر خیریت سے ریاست واپس
بھیجا جائے۔ ہمیں انسوس ہے۔ ہم تمہیں یہاں کی شہریت
نہیں دیں گے۔ ہر ہائی نس سے جو معاملات طے ہو چکے
ہیں اس کے مطابق ٹھیک تیس گھنٹے کے بعد ہمارا طیارہ
تمہیں اس ملک کی سرحد سے باہر کر کے فرانس کے شہر پیرس
پہنچا دے گا۔“

وہ دس مجرم گرداب میں پھنس گئے۔ نہ اس کنارے
اتر سکتے تھے نہ اس کنارے جا سکتے تھے۔ وہ ریاست واپس
جا کر موت کو گلے نہیں لگا سکتے تھے اور وہ تینوں ملکوں میں
نولے گھنٹوں سے زیادہ نہیں گزار سکتے تھے۔ وہاں کی

ہیں۔ میرا دل گھبرا رہا ہے۔ آپ تھا کس طرح ان سے نمٹ سکیں گے؟ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میں آپ کے لیے کیا کروں؟“

”دل سے عبادت کرتی رہو۔ اللہ تعالیٰ کا راز ہے۔ بابا اجیری نے بشارت دی ہے کہ میرا اللہ مجھ سے راضی ہے۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتا۔ رب راضی تو جگ راضی۔“

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ ہم زاد کھڑا تھا۔ چہرے سے پریشانی ظاہر تھی۔ اس نے سر جھکا کر بڑے کرب سے کہا۔ ”میں ابھی غائب ہو کر کہیں جانا چاہتا تھا مگر نہ جاسکا۔“

مراد نے جبراً مسکراتے ہوئے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”پریشان کیوں ہو؟ ہم جیسے تھے ویسے ہی رہیں گے۔“

وہ ایک سرو آہ بھر کر بولا۔ ”بابا صاحب نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہمیں عارضی صلاحیتیں مل رہی ہیں۔ یہ کسی وقت بھی ہوا ہو جائے گی لیکن ہم بھول گئے تھے۔“

مراد نے کہا۔ ”میں نہیں بھولا تھا۔ ہر نماز میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا تھا اور کسی دن محرومیت کا جھکا کھانے کے لیے تیار رہتا تھا۔ یہ جھکا تم سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔“

”ہاں، محرومیت نے ہلا کر رکھ دیا ہے۔“

”صاف بولو کہ اب جیننی کے پاس نہیں جاسکو گے۔ اب راستے میں سمندر ہے، پہاڑ ہیں، دشمن ہی دشمن ہیں۔ کانٹے ہی کانٹے ہیں۔ اب دنیا والوں کو اندھا کر کے چشم زدوں میں وہاں پہنچ نہیں پاؤ گے۔“

وہ بڑی پریشانی سے خلا میں تک رہا تھا۔ مراد نے کہا۔ ”تمہیں معلوم تھا کہ ہمیں یہ عارضی صلاحیتیں حاصل ہوئی ہیں لیکن عشق و محبت کی رنگینیوں میں بھول گئے تھے۔“

”نہیں۔ مجھے یاد تھا لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اچانک ہی یہ صلاحیت ختم ہو جائے گی۔ اب کیا ہوگا۔ میں جیننی کے پاس کیسے پہنچوں گا؟ وہ ہزاروں میل دور ہے۔“

”تجربہ ہے۔ تمہیں صرف جیننی کی فکر ہے۔ بے شمار دشمنوں کی طرف سے تشویش نہیں ہے۔“

”میں ابھی یہی کہنے والا تھا۔ آئندہ ہم ان سے کیسے نمٹ سکیں گے؟ انہیں معلوم ہو جائے گا کہ کوئی جن ہمارا تابعدار نہیں ہے۔“

”انہیں معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ ابھی ایک عرصے تک ان کے دلوں پر دہشت طاری رہے گی۔ وہ ناویدہ جنات

خواب میں حضرت صلاح الدین اجیری کو دیکھا۔ وہ فرما رہے تھے۔ ”انسان اپنی دنیا میں انسانی صلاحیتوں سے کامیابیاں حاصل کرتا ہے۔ روحانی صلاحیتیں صرف ان مومنین کو حاصل ہوتی ہیں جو دنیاوی مصروفیات کم سے کم کر کے دین و ایمان کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دیتے ہیں۔ تم اپنی ذات تک عبادت گزار ہو۔ نیک اعمال کے حامل ہو لیکن دشمنوں سے نمٹنے کے لیے کبھی جھوٹ بولنے اور فریبی چالیں چلنے پر مجبور ہو جاتے ہو۔ دنیاوی معاملات میں اچھے والے ہمیشہ سچ نہیں بول سکتے۔ ہیرا پھیری سے باز نہیں آسکتے۔ بے شک تم نیک مقاصد کے لیے ایسا کرتے ہو لیکن مومن وہ ہے، جو جان دے دیتا ہے لیکن جھوٹ نہیں بولتا۔ چال بازیوں ہمارے دین میں ممنوع ہیں اور تم حالات سے مجبور ہو کر کبھی کبھی دینی احکامات کے خلاف زندگی گزارتے رہو گے۔ اس لیے اس لمحے سے تمہاری روحانی صلاحیتیں ختم ہو رہی ہیں۔ یہ تمہارے لیے بد نصیبی کی بات ہے۔ تم خوش نصیب ہو کہ تمہاری عبادت گزار اور نیک اعمال کے باعث اللہ تم سے راضی ہے۔ لہذا میں بھی کبھی تمہاری راہ نمائی کے لیے آتا رہوں گا۔“

خواب تمام ہوا۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اب تک کی شہ زوریوں کے بعد کمزوری نے آنکھیں کھولیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا اندر سے روح نکل گئی ہے۔ وہ فقط جسمانی ڈھانچہ رہ گیا ہے۔ وہ حوصلہ ہارنا نہیں چاہتا تھا لیکن اچانک نکلنے والی توانائی اچانک ہی چلی گئی تھی۔ اس لیے ذہن کو شدید جھکا لگا تھا۔ سنبھلنے میں وقت لگ رہا تھا۔

ماہ نور شاد رے کرا آگئی تھی۔ وہ بھی شاد رے لینے کے بعد بالکوئی میں آکر اس کے ساتھ نماز پڑھنے لگا۔ وہ دونوں خاموشی سے عبادت میں مصروف رہے۔ پھر مراد نے دعا مانگنے کے بعد ماہ نور سے کہا۔ ”تم میری راز دار ہو۔ ایک اور راز کی بات سنو۔ میری ناویدہ ہو جانے کی صلاحیتیں ختم ہو چکی ہیں۔“

اس نے چونک کر مراد کو دیکھا پھر پوچھا۔ ”کیا آئندہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکیں گے؟“

”نہیں۔ وہ ایک عارضی صلاحیت حاصل ہوئی تھی۔“

وہ بہت پریشان ہو گئی تھی۔ اس کے بازو سے لگ کر بولی۔ ”یا اللہ...! آپ کی پریشانیاں بڑھ جائیں گی۔ دشمن بے حساب ہیں اور وہ بے حساب عسکری قوتیں رکھتے

ہماری کوشش ہوگی کہ دشمنوں کو یہ راز معلوم نہ ہو۔ وہ اسی فریب میں جتلا رہیں کہ میں اپنی پراسرار قوتوں کے ذریعے انہیں سزا میں دے سکتا ہوں۔ جب تک ان پر دہشت طاری رہے گی تب تک ہم اپنی سلامتی کی تدابیر پر عمل کرتے رہیں گے۔“

وہ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ محبوب اپنے طور پر مشورے دیتا رہا پھر رابطہ ختم ہو گیا۔ اس نے بشری اور بچے کو بھی موجودہ مشکلات سے آگاہ کیا۔ وہ دونوں مراد کے بہت قریب رہتے آئے تھے۔ اس کے احسان مند بھی تھے اور اس کے لیے جان کی بازیاب لگانے والے سا بھی تھے۔

بشری پریشان ہو گئی تھی۔ بچے نے کہا۔ ”ہم پہلے بھی کسی غیر معمولی صلاحیت کے بغیر بدترین حالات سے نکلنے آئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو آئندہ بھی حالات کے زلزلے ہمیں توڑ پھوڑ نہیں سکیں گے۔ اہم مرداں مدد خدا...“

مراد نے اسکاٹپ کے ذریعے سپر پاور کے اکابرین سے رابطہ کیا۔ ان اکابرین نے دوسرے ٹی وی پر اپنے اتحادیوں سے رابطہ کر لیا۔ یوں مراد کی باتیں ان تمام حکمرانوں تک پہنچنے لگیں۔

اس نے کہا۔ ”میں نے ایک طویل خاموشی اختیار کی تھی۔ اپنے حالات اور آپ حضرات کے موجودہ حالات پر غور کرتا رہا۔ یہ بات سمجھ میں آئی کہ اس دنیا میں ڈنڈے کے زور پر اپنے آپ کو منوایا جاتا ہے اگر میں غلط بول رہا ہوں تو آپ بولیں۔ میرے ڈنڈے کو مان رہے ہیں؟ کیا مجھے اپنے برابر ایک طاقتور حکمران تسلیم کر رہے ہیں؟ اگر تسلیم کر رہے ہیں تو میں برابری کی سطح پر دوستی کروں گا۔ ہمارے درمیان پھر سے سفارتی تعلقات قائم ہوں گے۔“

سپر پاور کے حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ”ہم تسلیم کرتے ہیں۔ بے شک ہزہائی نس ایک طاقتور حکمران ہیں۔ اگر آپ ہمارے ساتھ مل جائیں تو ہم پوری دنیا پر حکومت کر سکیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”میں پوری دنیا پر حکومت نہیں کرنا چاہتا۔ اگر کرنا چاہوں تو مجھے آپ کی ضرورت نہیں ہوگی۔ میرے بیس جنات ہی مجھے پوری دنیا کا ناقابل شکست حکمران بنادیں گے۔“

”ہزہائی نس کیا چاہتے ہیں؟“

”میں جین الاٹوای قوانین کا پابند رہوں گا۔ آئندہ سیاسی اور عسکری معاملات میں اپنے جنات کو استعمال نہیں کروں گا۔ وہ جنات میرے بہت سے پرسل معاملات میں

سے ڈرتے رہیں گے۔ یہ بعید کھلتے تک ہم آزاد خارجہ پالیسی کے ذریعے امریکا، روس اور چین سے مضبوط تعلقات قائم کریں گے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بڑا ملک ہم پر ناجائز دباؤ ڈالے گا تو ہم باقی دو بڑے ملکوں سے فوجی امداد حاصل کریں گے۔ جب ہم ایک کے مقابلے میں دوسروں کو اہمیت دیں گے تو وہ ایک خود بخود دورست ہو جائے گا۔ آئندہ ہمیں سیاسی حکمت عملی سے کام لینا ہوگا۔“

پھر وہ دونوں گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ آنے والے دن ان کے لیے پیچھے بن گئے تھے۔ اگر دشمنوں کو معلوم ہو جاتا کہ ان کی پراسرار قوتیں ختم ہو چکی ہیں تو وہ اپنی تمام فوجی قوتوں کے ساتھ ان پر چڑھ دوڑتے۔ پھر اسی طرح روپوش رہ کر زندگی گزارنے کے دن آجاتے۔ تمام بادشاہت خاک میں مل جاتی۔

مارووی اور محبوب کی سلامتی کا بھی مسئلہ تھا۔ اب وہ ہزاروں میل دور بیٹھ کر انہیں تحفظ فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ بڑی پریشانیاں تھیں۔ بڑے پیچیدہ مسائل تھے۔ بے حساب مسائل سے نمٹنا آسان نہیں تھا۔

اس نے فون کے ذریعے محبوب سے پوچھا۔ ”وہاں کے کیا حالات ہیں۔ آپ دونوں خیریت سے ہیں؟“

اس نے پوچھا۔ ”فون پر کیوں بول رہے ہو۔ تھوڑی دیر کے لیے آ جاؤ۔ یہاں باتیں ہوں گی۔“

وہ بہت ہی ادا اس سبب میں بولا۔ ”محبوب صاحب! بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ مجھے تاویدہ ہو جانے کی حاضمی صلاحیت حاصل ہوئی تھی۔ وہ حاضمی وقت گزر چکا ہے۔ میں اس روحانی صلاحیت سے محروم ہو گیا ہوں۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”یا خدا! ہم سب پر رحم فرما۔ یہ کیا ہو گیا مراد؟ اب تو بڑے مسائل پیدا ہوں گے۔ تمہاری ریاست پر ہر طرف سے حملے ہوں گے۔“

”آپ ریاست کی بات چھوڑیں۔ یہ پہلے بھی نہیں تھی، اب بھی نہیں رہے گی۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مجھے اپنی بھی فکر نہیں ہے۔ میں روپوش رہ کر گورنر بلا جنگ لڑنا جانتا ہوں۔ لگر آپ کی اور مارووی کی ہے۔ میں یہاں سے آپ دونوں کی سیکورٹی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔“

”میں فی الحال مارووی کے ساتھ آئس کے پچھلے حصے میں چھپ کر رہوں گا۔“

”آپ ابھی روپوشی اختیار نہ کریں۔ ابھی تمام دشمن دہشت زدہ ہیں۔ وہ آپ کی طرف رخ نہیں کریں گے۔“

آثار یہ تھے کہ آئندہ اسے جنات کا ڈراما پلے کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ آنے والے دنوں میں سیاسی سطح پر تعلقات قائم رہیں گے۔ یہ کسی کو معلوم نہیں ہو سکے گا کہ وہ نابدیدہ ہونے والی غیر معمولی صلاحیت سے محروم ہو گئے ہیں۔

اس نے فون پر محبوب سے کہا۔ ”میں سیاسی حکمت عملی سے کام لے رہا ہوں۔ دشمن دوست بن رہے ہیں۔ آئندہ بھی سیاسی چالیں چلتا رہوں گا۔ کسی کو جانی دشمن نہیں بننے دوں گا۔ آپ وہاں آزادی سے رہیں۔ کوئی آپ کو نقصان پہنچانے نہیں آئے گا۔“

محبوب نے کہا۔ ”شاہاں مراد اتم بڑی ذہانت سے دشمنوں کو دوست اور سیاہ کو سفید بنا رہے ہو۔“

اس نے کہا۔ ”میں جلد ہی پاکستان سے سفارتی تعلق قائم کروں گا۔ اس طرح ہمارے آنے جانے اور ایک دوسرے سے ملنے کے سلسلے میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔“ وہ خوش ہو کر بولا۔ ”واہ کیا بات ہے مراد واقعی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ ہم کسی روک ٹوک کے بغیر جب چاہیں گے، ایک دوسرے کے پاس آتے جاتے رہیں گے۔“

اس نے کہا۔ ”فی الحال دور تک آپ کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں ابھی زیادہ باتیں نہیں کر سکوں گا۔ بہت مصروف ہوں۔ پھر کسی وقت کال کروں گا۔“

واقعی مصروفیات حد سے زیادہ تھیں۔ اس کا ہم زاد ایل اور بشری کے علاوہ ریاست میں کئی ماہر سیاستدان اور مختلف شعبوں کے ماہرین مراد کے ساتھ دن رات مصروف ہو گئے تھے۔ دوسرے دن سے کئی ممالک کے نمائندے آنے لگے۔ ان سے مذاکرات ہونے لگے اور معاملات طے ہونے پر تحریری معاہدے ہونے لگے۔ پھر کئی ملکوں کے سفارت خانے قائم ہو گئے۔ ان کے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ پاکستان سے بھی سفارتی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔

ان تمام معاملات سے نمٹنے میں کئی ماہ گزرتے جا رہے تھے اور ریاست ارض اسلام کی سیاسی حیثیت مسلم ہوتی جا رہی تھی۔ مراد کی حکمت عملی یہ بھی تھی کہ وہ اپنے ریاستی چیمبرل کے ذریعے ہم زاد کے ساتھ دنیا والوں کے سامنے آتا تھا اور کہتا تھا۔ ”ایک پیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ ایک ملک کے دو حکمران بھی نہیں ہوتے کیونکہ دنیا والوں کو یہ تھی اور انوکھی بات معلوم ہو جائے کہ ہم دونوں ہی مراد علی منگی ہیں۔ ہم دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے اور ہم

کام آتے رہیں گے۔ میں ایک طرح سے آپ سب کو خوف و دہشت سے نکال رہا ہوں۔ یہ اطمینان کر لیں کہ اپنی پراسرار قوتیں کسی بھی بڑے یا چھوٹے ملک کے خلاف استعمال نہیں کروں گا لیکن یاد رہے۔ کوئی مجھے مجبور نہ کرے۔ کوئی ماروی اور محبوب علی چانڈیو کی طرف رخ نہ کرے۔ آئندہ کسی نے سازش کی اور چھپ کر دشمنی کرنی چاہی تو میں منٹوں میں اس کی فوجی قوت کو نیست و نابود کر دوں گا۔“

پھر وہ ٹھہرے ہوئے سخت لہجے میں بولا۔ ”اور تباہی کیسے آتی ہے۔ اس کے کئی نمونے آپ حضرات دیکھ چکے ہیں۔“

”بے شک ہم نے دیکھا ہے اور تسلیم کر رہے ہیں کہ آپ طاقت میں اور حاکمیت میں ہم سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔“

”میں چاہوں گا کہ آپ حضرات مجھے پھر بھی دشمنی اور انتقامی کارروائیوں پر مجبور نہ کریں۔ آئیں دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔ اپنے نمائندوں کو یہاں بھیجیں اور بھرپور اعتماد کے ساتھ سفارتی تعلقات کا پھر سے آغاز کریں۔“

انہوں نے خوش ہو کر دلی مسرتوں سے مراد کو دیکھ لیا اور کہا کہ ان تمام ممالک کے نمائندے دوسرے ہی دن ریاست میں پہنچیں گے اور باہمی تعاون سے دوستی کو مضبوط کریں گے۔ وہ مراد سے رابطہ ختم ہونے کے بعد ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ آئندہ اس سے بے لگی دشمنی نہیں کی جائے گی۔ گویا وہ اپنے اپنے کان پکڑ رہے تھے۔

ایک اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”مراد کو اپنی سطح کا طاقت ور حکمران مان لینے میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ وہ ہمیں اچھی طرح نقصانات پہنچا کر اپنی طاقت کا لوہا منوا چکا ہے۔ اب ہم نقصانات اٹھانے والی کوئی غلطی نہیں کریں گے۔“

ایک حاکم نے کہا۔ ”ہماری دنیا میں کئی طاقتور اور خود مختار ممالک ہیں۔ ان کے بعد ریاست ارض اسلام کا اضافہ ہو جائے گا تو ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”فرق اس وقت پڑے گا جب ہم دوستی اور باہمی مفادات کو پیش نظر نہیں رکھیں گے۔“

ایک فوجی افسر نے کہا۔ ”ہماری غلطی یہ ہے کہ ملک نگار کے بعد ہم نے مراد کو وہاں کا حکمران تسلیم نہیں کیا۔ اسے ایک عالمی سطح کا مجرم سمجھ کر اس خوش فہمی میں رہے کہ جلد ہی اسے پھل ڈالیں گے۔ بہر حال سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو منوا چکا ہے اور اسے مان کر ہی ہم باہمی بہتری کی راہوں پر چلتے رہیں گے۔“

مراد نے ٹیڑھا ہو کر سب کو سیدھا کر دیا تھا۔ فی الحال

کر رہے تھے۔ کس کی مجال تھی کہ کوئی اسے ایک مجرم کہہ دینا؟ ایک گدھا گاڑی والے کو دنیا سلام کر رہی تھی۔ اس معمولی شخص نے آگ اور لہو کے دریاؤں سے گزرتے ہوئے ایسے کارنامے انجام دیے تھے، ایسی ذہانت کا ثبوت دیا تھا کہ ایک معمولی انسان سے غیر معمولی اور ناقابلِ شکست حکمران بن گیا تھا۔

دنیا کے بے شمار ٹی وی چینلز اسے بھرپور کورج وے رہے تھے۔ اس کے تمام اپنے پرانے تمام دوست اور دشمن اسے سپر ہیرو کے حاکم اعلیٰ کے ساتھ اخبارات کے پہلے صفحات پر دیکھ رہے تھے۔ ٹی وی اسکرین پر ان دونوں کی تقریریں سن رہے تھے۔

حاکم اعلیٰ نے کہا: ”ہم واپی ریاست ہزبائی نس مراد علی منگی کے تہ دل سے شکر گزار ہیں۔ ہزبائی نس نے ہماری دعوت قبول کی ہے اور یہاں تشریف لائے ہیں۔ ہم انیس یقین و لاتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں ہمارے درمیان دوستی مستحکم ہوتی رہے گی۔ ہزبائی نس نے ہمیں بھی ریاست کا دورہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ جسے ہم شکر یہ کے ساتھ قبول کر رہے ہیں۔“

مراد نے کہا: ”اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے، عزت دینا ہے جسے چاہتا ہے، ذلت دینا ہے۔ یا اللہ! مجھے اپنے تہرہ غضب سے بچالے آمین۔ میں نے ایک تھکا دینے والی جدوجہد کے بعد یہ موجودہ مقام حاصل کیا ہے۔ آئینہ میل حاکم اعلیٰ کا شکر گزار ہوں۔ مجھے ان کی میزبانی کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ آنے والے دنوں میں ہماری دوستی مزید مستحکم ہوتی رہے گی۔“

اس نے ریاست کی بہتری کے لیے ان سے کئی معاہدے کیے۔ ان میں یہ معاہدہ اہم تھا کہ ریاست کے طلبا و طالبات کو یورپ اور امریکا کے کسی بھی شہر میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیمات حاصل کرنے کی سہولتیں حاصل ہوں گی اور ریاست کے ضرورت مند افراد کو ان ممالک میں ملازمتیں دی جائیں گی۔ وہ اپنی ریاست کو مضبوط اور خوش حال بنانے کے کئی معاہدے کر رہا تھا۔

روحانی صلاحیت کے ختم ہونے کے بعد بڑی انقلابی تبدیلیاں آئی تھیں۔ اس سلسلے میں ہم زکوٰۃ کو ایک نقصان پہنچا تھا۔ وہ حسینہ عالم جینی سے محروم ہو گیا تھا۔ اس نے محروم ہونے کے چند گھنٹوں کے بعد ہی اسے فون پر مخاطب کیا وہ چیخ کر بولی۔ ”میرے یار! میرے دلدار! کہاں ہو تم؟ کیا تمہیں میری تنہائی اور بے چینی کا ذرا بھی احساس نہیں ہے؟“

دونوں ہی اس ریاست کے حکمران ہیں۔“
ہم زکوٰۃ کہتا تھا۔ ”حکمران ایک ہی ہے اور وہ میں ہوں۔ مراد علی منگی۔ واپی ریاست ارض اسلام۔“

اس کے ساتھ کھڑا ہوا مراد کہتا تھا۔ ”حکمران میں ہوں مراد علی منگی۔ واپی ریاست ارض اسلام۔۔۔۔۔ اور یہ بھید بھی نہیں کھٹے گا کہ ہم میں سے کون پیدائشی مراد علی منگی ہے۔“
مختلف ملکوں کے نمائندوں سے علیحدہ میٹنگ ہال میں گفتگو ہوتی تھی اور وہ نمائندے بید پکھتے تھے کہ ایک ہی وقت میں دو مراد ان سے گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ سوچتے رہ جاتے تھے کہ اصلی مراد اور اصلی حکمران ان میں سے کون ہے؟

مراد کی اس حکمت عملی کے دور رس نتائج سامنے آئے۔ سپر ہیرو نے اسے اپنے ملک کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ اس نے فوراً ہی دعوت قبول کر لی۔ اب سپر ہیرو اور دوسرے تمام ممالک کے اکابرین کے ذہنوں میں ایک سوال چب رہا تھا۔ ان دو مراد میں سے کون دعوت نامہ قبول کر کے آنے والا ہے؟ کیا روپوش رہنے والا اور کبھی منظر عام پر کھلم کھلا نہ آنے والا مراد آزادانہ سپر ہیرو کے ملک میں آئے گا؟

کسی نے کہا۔ ”نہیں۔ وہ اتنا نادان نہیں ہے۔ ہم نے پچھلی بار اسے طیارے سمیت اپنے گھنٹے میں لے لیا تھا اور وہ بڑی چالاکی سے بچ نکلا تھا۔ وہ پھر یہی غلطی نہیں کرے گا۔“

کسی نے کہا۔ ”جو مراد دوستی اور خیر سگالی کے نام پر دورہ کرنے آ رہا ہے، وہ اصلی نہیں ہوگا۔ اس کی ڈمی ہوگا۔“
حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ”اس بحث میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر اصلی مراد آئے گا تب بھی ہم دشمنی کرنے کی غلطی نہیں کریں گے۔ اس کے ساتھ سیاسی سطح پر مضبوط تعلقات نہیں رکھیں گے تو روس اور چین اس سے دوستی بڑھانے کی کوششیں کریں گے۔“

دوسرے حاکم نے کہا۔ ”بے شک وہ ریاست جغرافیائی اور عسکری حوالے سے ہم تمام بڑے ممالک کے لیے اہم ہے۔ ہمیں ہر قیمت پر اسے دوستی کے گھنٹے میں رکھنا ہے۔“

اب ہر پہلو سے حالات مراد کے موافق ہو گئے تھے۔ وہ طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے خاص مشیروں کے ساتھ سپر ہیرو کے ملک میں پہنچا تو جہاز سے اترتے ہی اسے اکبرین توپوں کی سلامی دی گئی۔ تمام اکابرین اس کے استقبال کے لیے ایئر پورٹ کے رن وے پر آئے تھے۔
ان کھڑی ہوئی آرمی کے سپاہی اسے گاڑ آف آؤٹ پش

یو جینی!

”آہ! میں تڑپ رہی ہوں۔ میرے نادیدہ یار...! میں مرجاؤں گی۔“

ہم زادن نے اپنے فون کو چوما تو وہ رونے لگی۔ اس نے تھوڑی دیر تک اسے تسلیاں دینے کے بعد رابطہ ختم کر دیا۔ بڑی محبت سے سوچنے لگا کہ اس کے پاس کیسے جائے؟ اس کا پھول جیسا نرم و نازک بدن تصور میں کھل رہا تھا۔

جینی کے پیار کی ایک ایک ادا اسے تڑپا رہی تھی۔ اگر وہ خود اس کے پاس جانا چاہتا تو کیا ہوتا؟ وہ پہلے کی طرح نادیدہ ہو کر نہیں جاسکتا تھا۔ اول تو وہ نظر آنے والے کو قبول نہ کرتی۔ اگر قبول کرتی تو ایک ریاست کے حکمران کو اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ جاتی۔ صرف جینی ہی نہیں تمام دشمن بھی اسے ریاست سے بیکس تک سفر کرتے ہوئے دیکھتے تو کہیں نہ کہیں اس پر جال پھینکتے۔ وہ مراد کوئی الجھنوں میں الجھانا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے سوچا تھا کہ کسی وقت مراد سے جینی کے بارے میں باتیں کرے گا لیکن وہ بے حد مصروف تھا۔ ریاست کے سیاسی حالات بدل رہے تھے۔ کئی ملکوں کے نمائندے مذاکرات کے لیے آتے جاتے رہتے تھے۔ ان سے کئی معاملات پر فیصلے کرنے اور ان پر عمل کرنے میں کمی مہینے گزر رہے تھے۔

ادھر دو ماہ کے اندر ہی جینی نے فون پر خوشی سے چیخنے ہوئے کہا۔ ”میرے یار! میرے ولد! ایک بہت بڑی خوش خبری سنا رہی ہوں۔“

اس نے پوچھا۔ ”تم بہت زیادہ ایکسٹنڈ ہو رہی ہو۔ تمہیں ایسی کیا خوشی مل گئی ہے؟“

”ہائے تم سامنے ہوتے تو مجھے سینے سے لگا کر خوب چومتے۔ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔“

ہم زاد کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلدی باپ بن جائے گا۔ وہ ایک طویل عرصے تک رنگینوں میں دن رات گزارنا چاہتا تھا لیکن اس خواہش کو نہیں پہنچ رہی تھی۔

ویسے باپ بننے کا اعزاز حاصل کرنا بھی ایک بڑی بات تھی۔ جینی نے پوچھا۔ ”تم چپ کیوں ہو؟ کیا خوش نہیں ہو؟ پلیز جلدی بولو۔“

وہ فون کو چومتے ہوئے یولا۔ ”تم نے بڑی خوش خبری سنائی ہے لیکن مجھ پر یہ صدمہ حاوی ہو رہا ہے کہ میں زنجیروں میں جکڑا ہوا قیدی ہوں۔ اگر آزاد ہوتا تو ابھی

وہ ایک سرو آہ بھر کر یولا۔ ”آہ میری جان! میری

جینی! میں مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہوں۔“

اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”کیا ہوا ہے۔ تم بہت گلست خوردہ سے لگ رہے ہو؟“

”ہاں۔ میں گلست کھا چکا ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرے دشمن مراد نے پراسرار عمل کے ذریعے میں جنت کو تسخیر کیا ہے، انہیں اپنا معمولی اور نا اہل بنا لیا ہے۔“

”ہاں تم نے بتایا تھا پھر...؟“

”پھر یہ کہ اس نے پراسرار عمل کے ذریعے مجھے بھی اپنے گلستے میں لے لیا ہے۔ میں چونکہ باغی ہوں، اس کی غلامی قبول نہیں کر رہا ہوں اس لیے اس نے مجھے زنجیروں پہنا دی ہیں اور مجھے پاتال کی تاریکیوں میں قیدی بنا لیا ہے۔“

یہ سنتے ہی وہ رونے لگی۔ کہنے لگی۔ ”اب کیا ہوگا؟ کیا تم میرے پاس نہیں آسکو گے؟“

”نہیں۔ وہ مجھے پاتال سے باہر نہیں آنے دے گا۔“

”اوہ گاڈ! میں کیا کروں؟ تم نہیں ملو گے تو میں مرجاؤں گی۔“

”آہ جینی...! میں کس دن سے کہوں کہ مجھے بھولی جاؤ۔“

”تمہارے کہنے سے کبھی تمہیں بھول نہیں پاؤں گی۔ میں اپنے طور پر ہزار کوششیں کروں گی۔ جب بھی مجھے نظر آنے والا کوئی محبوب یا شوہر کبھی متاثر نہیں کرے گا۔ میرے نادیدہ یار سے ہی میری تسلی ہوگی۔ میں تمہاری عادی ہو گئی ہوں۔ کوئی تدبیر کرو۔ کسی طرح ایک بار میرے پاس آ جاؤ۔“

”میں مجبور ہوں جینی! شاید اس کی قید سے نکلنے کی کوئی تدبیر سمجھ میں آئے گی تو پھر یہاں سے نکل سکوں گا۔“

”تم مجھے بتاؤ کہاں ہو؟ میں وہاں آؤں گی۔“

”میں گھپ اندھیرے میں ہوں۔ یہ نہیں جانتا کہ

کہاں ہوں۔ میرا اندازہ ہے کہ اس نے اپنی ریاست میں ہی کہیں کسی بیخانے میں قید کیا ہے۔“

”میں تمہیں تلاش کرنے آؤں گی۔ مراد تک پہنچنے کی کوشش کروں گی۔ اس سے تمہاری رہائی کی ہبیک مانگوں گی۔“

”ابھی نہ آؤ۔ وہ بہت غصے میں ہے۔ اپنے دشمنوں سے نمٹ رہا ہے۔ تمہاری فریاد اور تمہارے آنسو اس پر اثر

نہیں کریں گے۔ ذرا صبر کرو۔ مجھے اپنے طور پر رہائی کی کوشش کرنے دو۔“

”میں صبر سے انتظار کروں گی۔ تم سے فون پر تو باتیں

ہوتی رہیں گی۔“

”ہاں۔ میں فون پر تم سے پیار کرتا رہوں گا۔ آئی تو

بچتا پھر رہا ہے۔ آخر اس کے شکنجے میں چلا ہی گیا۔“
 دوسرے عہد یادار نے کہا۔ ”مراد کا ستارہ بلندی پر
 چمک رہا ہے۔ یہاں ہم نے بھی اس سے سمجھوتا کر لیا ہے۔
 دوست بن کر رہنے میں ہی بہتری ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کیا
 تمہارے ناویدہ یار کو رہائی پانے کی امید ہے؟“
 ”ہاں۔ وہ کوششیں کر رہا ہے اور میں دعائیں مانگ
 رہی ہوں۔ امید ہے کہ وہ رہائی حاصل کر لے گا۔“
 ”جب بھی وہ تمہارے پاس آئے تو ہمیں فوراً اطلاع
 دو۔ ہم بے چینی سے انتظار کرتے رہیں گے۔“

نہ وہ آنے والا تھا، نہ انتظار ختم ہونے والا تھا۔ دن
 اور مہینے گزرتے جا رہے تھے۔ سپر پاور اور دیگر ممالک سے
 جو معاہدے کیے گئے تھے، ان کے مطابق ریاست کے
 سیکڑوں افراد بیرونی ملکوں میں جا کر ملازمتیں حاصل
 کر رہے تھے۔ ان بیرونی ممالک سے بھی مختلف شعبوں
 کے ماہرین ریاست کے کئی پروڈیکٹس میں کام کرنے آ گئے
 تھے۔ وہاں آنے والوں کو پولیس اور ایٹمی جنس والے سختی
 سے چیک کرتے تھے۔ جن پر ذرا بھی شبہ ہوتا تھا، انہیں فوراً
 واپس جانے کا حکم دیتے تھے۔

بشریٰ بلا اور سیکرٹ فورس کے جاں نثاران تمام آنے
 والوں کی اور تمام سفارت خانوں کی نگرانی کر رہے تھے۔
 ایسے وقت ایک انوکھی بات ہوئی۔ بشریٰ اور بلا فرانس
 سفارت خانے کی ایک دو شیزہ کوڈ کچھ کن جو تک گئے۔

ان کے سامنے جیسے ماروی آگئی تھی۔ وہ دو شیزہ ہو بہو
 ویسی ہی تھی۔ فرانسیسی سفیر کی بیٹی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ اور
 بھائی بہنوں کے ساتھ آئی تھی۔ بشریٰ نے اس سے مصافحہ
 کرتے ہوئے پوچھا۔ ”ہیلو تمہارا نام کیا ہے؟“

وہ بڑے محصوم سے لہجے میں بولی۔ ”میرا نام...؟
 میرا نام...؟ پلیز ویٹ اے منٹ، ابھی بتاتی ہوں۔“
 وہ سوچتے لگی۔ بتے نے اس کے سفیر باپ سے
 پوچھا۔ ”مسٹر ہارورڈ! کیا آپ کی صاحبزادی اپنا نام بھول
 جاتی ہے؟“

ہارورڈ نے کہا۔ ”یہ بچپن سے کندھ بن ہے۔ یادداشت
 اتنی کمزور ہے کہ کبھی کبھی ہمیں بھی بھول جاتی ہے۔ ہم اسے کہیں
 تہا جانے نہیں دیتے۔ یہ گھر کا راستہ بھی بھول جاتی ہے۔“
 پھر اس نے بیٹی سے کہا۔ ”جیسی! کم آن اپنا نام بولو۔“

وہ تالی بجانے کے انداز میں اپنی ہتھیلیوں کو ایک
 دوسری سے ٹکراتے ہوئے بولی۔ ”یاد آ گیا جیسیکا۔ میرا نام
 جیسیکا ہے۔ میری مام اور ڈیڈ مجھے جیسی کہتے ہیں۔ یہ جو چٹکی

تمہارے پاس ہوتا۔ ہم دونوں اتنی بڑی خوشی کو ایک ساتھ
 اچھوائے کرتے۔“

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”میں بد نصیب ہوں۔
 تمہاری قربت سے محروم ہوں اور خوش نصیب بھی ہوں۔
 تمہارا بچہ تمہارے پیار کی نشانی میرے وجود کے اندر
 پرورش پائے گا۔ نو ماہ بعد اسے گود میں لے کر خوب پیار
 کروں گی۔ میرا دل کہتا ہے، تم اس وقت تک آزاد ہو کر
 یہاں آ جاؤ گے۔“

”میں پوری کوشش کروں گا۔ ہمیں کم سے کم
 باتیں کرنا چاہئیں کیونکہ فون کی بیٹری ڈاؤن ہو جائے گی تو
 اسے ری چارج نہیں کرا سکوں گا۔ یہاں تہ خانے میں بجلی
 نہیں ہے۔“

اس نے فون کے ذریعے اسے چوم کر رابطہ ختم
 کر دیا۔ وہ لمبے یو آئے تھا۔ جوانی کی رنگینوں میں مست
 رہنا چاہتا تھا لیکن جینی نے اچانک اس کے مزاج کو بدل دیا
 تھا۔ باپ بننے والی بات خوش خبری بھی تھی اور پریشانی کا
 سبب بھی تھی۔ باپ بننا اچانک ہی اچھا لگ رہا تھا۔ لیکن وہ
 اپنے ہونے والے بچے کی ماں کو آغوش میں بھرنے کے
 لیے نہیں جاسکتا تھا۔ کئی مشکلات درپیش تھیں۔

بنیادی مشکل یہی تھی کہ وہ ناویدہ ہو کر نہیں جاسکتا
 تھا۔ بھیس بدل کر جانا تھا اور جینی کو قائل کرنا تھا کہ وہی اس کا
 ناویدہ یار دلدار ہے۔ وہ کسی طرح اسے تار بند کر لیتا۔ لیکن
 ہمیشہ اپنے بچے اور اس کی ماں کے ساتھ پیرو پیانہ کر نہیں
 رہ سکتا تھا۔ ایک باپ کو اپنی اصلی شکل سے بچر تھ بچے کے
 ساتھ رہنا تھا۔

مشکل یہ تھی کہ بچے کی بیہوشی ماں پر بھروسا کرنے
 اور خود کو مراد کی حیثیت سے ظاہر کرنے کے معاملے میں اسے
 ہزار بار سوچنا تھا۔ ایسے سنگین معاملے میں وہ مراد سے مشورہ
 کیے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ادھر اس ملک کے دو
 اکابرین نے فون پر جینی سے رابطہ کیا پھر کہا۔ ”ہم مسٹران سین
 سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ اسے کہو تمہارے پاس آئے۔“

جینی نے کہا۔ ”وہ نامعلوم مدت تک نہیں آسکیں
 گے۔ میں بہت بڑا صدمہ جھیل رہی ہوں۔ مراد علی سنگی نے
 دوسرے جنات کی طرح میرے یار کو بھی اپنے شکنجے میں کس
 لیا ہے۔“

پھر سن کر سب ہی پریشان ہو گئے۔ ایک اعلیٰ
 عہد یادار نے کہا۔ ”اس نے ہم سے کہا تھا کہ مراد پر اسرار
 علوم کے ذریعے اسے بھی تسخیر کرنا چاہتا ہے اور وہ اس سے

ہوتی ہیں، یہ میری نام ہیں۔ مجھے سب یاد ہے۔ میری یادداشت کمزور نہیں ہے۔

ماں نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ”میری بیٹی بہت ذہین ہے۔ تمام باتیں یاد رکھتی ہے۔“

بچے نے اس کے والدین سے کہا۔ ”ماروی کا نام دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک مشہور ہو گیا ہے۔ آپ نے اخبارات میں اس کی تصویریں دیکھی ہوں گی۔ مراد کے حوالے سے کئی ٹی وی چینلز پر اس کا ذکر ہوتا رہا ہے۔ کیا آپ نے ماروی کی تصویریں دیکھی ہیں؟“

مام نے کہا۔ ”دیکھی ہیں اور اس کی تصویریں ایک قائل میں حفاظت سے رکھی ہیں۔ ہم ماروی اور ہزہائی نس کے بارے میں بہت کچھ سنتے رہے ہیں۔“

اس کے ڈیڑی ہارورڈ نے کہا۔ ”ایک بار یہ گھر سے باہر ایک تھلی کو پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑتے چلی گئی۔ ایک اسٹریٹ سے دوسری اسٹریٹ میں پہنچ گئی۔ گھر کا راستہ بھول گئی۔ ہم یہ سوچ کر پریشان ہو گئے کہ اسے ماروی سمجھ کر کسی نے اجوا کیا ہے۔ بہر حال کشتی پولیس نے اسے گھر پہنچا دیا۔“

مام نے کہا۔ ”ہمیں دھڑکا لگا رہتا ہے کہ ہزہائی نس کے دشمن اسے نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ سیکورس گاڈ! اب حالات بدل گئے ہیں۔ ہمارے ملک اور آپ کی ریاست کے درمیان دوستی اور گہری محبت قائم ہوئی ہے۔“

ہارورڈ نے کہا۔ ”جب مجھے یہاں کا سفیر بنا کر بھیجا گیا تو جیسے میرے دل کی مرادیں پوری ہو گئیں۔ میں دل سے چاہتا تھا کہ ہماری بیٹی ہزہائی نس کی ریاست میں ان کے سائے میں رہے۔ ہم آج تک یہ دیکھتے آرہے ہیں کہ ہزہائی نس باکمال ہیں۔ انہوں نے بھی کسی دشمن کو ماروی کے سائے تک بھی پہنچنے نہیں دیا۔ ہماری جیسی بھی یہاں محفوظ رہے گی۔“

بشرٹی نے معنی خیز نظروں سے بچے کو دیکھا پھر ہارورڈ سے کہا۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ آپ جیسی کے ساتھ ہزہائی نس سے ملاقات کریں۔ وہ ماروی کی ہم شکل کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ اس کے لیے سیکورٹی کے خاص انتظامات کریں گے۔“

سبز ہارورڈ خوش ہو کر بولیں۔ ”یہ ہمارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہوگی۔ اگر ہزہائی نس جیسی پر خصوصی توجہ دیں گے تو اس کی دماغی کمزوری دور ہو جائے گی۔ سنا ہے وہ پراسرار علوم جانتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے علوم سے اس کا علاج کر سکیں گے۔“

بشرٹی نے جیسی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ”آپ کو یہ اعتماد ہے تو پھر ابھی ہمارے ساتھ چلیں۔“

ہارورڈ نے کہا۔ ”ابھی اچانک کیسے جا سکتے ہیں۔ پہلے ہزہائی نس کے پی اے سے ملاقات کے لیے اپنا ٹائمٹ ٹیٹا ہوگا۔“

”کوئی ضروری نہیں ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ ابھی ان سے ملاقات ہو جائے گی۔“

وہ سب سفارت خانے سے باہر آ کر اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ کر محل کی طرف جانے لگے۔ بشرٹی اور بچے کو محل کے اندر جانے سے کوئی گارڈ نہیں روکتا تھا لیکن اندر جا کر ویٹنگ روم میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ اگر وہ مصروف ہوتا تو انہیں بھی وہاں بیٹھ کر انتظار کرنا پڑتا اور اس وقت وہ بہت مصروف تھا۔ ایک ہال میں تمام مشیروں اور فوج کے اعلیٰ افسروں کے ساتھ اہم معاملات پر باتیں کر رہا تھا۔

اس کے پی اے نے اسے فون پر کہا۔ ”میزم بشرٹی ابھی آپ سے ملنے کی ضد کر رہی ہیں۔ میں نے انہیں سمجھایا ہے کہ آپ بہت مصروف ہیں لیکن...“

مراد نے بات کاٹ کر کہا۔ ”بشرٹی سے بات کراؤ۔“

دوسرے ہی لمحے میں اس کی آواز سنائی دی۔ ”بھائی! تمام مصروفیات کو چھوڑ کر ابھی ہال سے باہر آئیں۔“

”ابھی کیا بات ہے؟ کیوں مجھے فوراً آنے کو کہہ رہی ہو؟“

”آپ کے لیے ایک بہت بڑا سرپرائز ہے۔ آپ اسے دیکھیں گے تو ساری دنیا کو بھول جائیں گے۔“

”تم کیا دکھانا چاہتی ہو؟ کیوں میرا وقت ضائع کر رہی ہو؟“

”بھائی! میں کہتی ہوں سیدھی طرح آجائیں۔ ورنہ میں اس کا نام لوں گی تو یکفخت دوڑتے ہوئے آئیں گے۔“

”اگر یہ تمہارا چیلنج ہے تو میں نہیں آؤں گا۔“

”تو پھر کان کھول کر سنیں۔ ماروی آپ سے ملنے آئی ہے۔“

”کیا...؟“ وہ حیرت سے چیخ پڑا۔ ”یہ ناممکن ہے۔ دیکھو بشرٹی ایسا مذاق نہ کرو۔“

”یہ مذاق نہیں ہے۔“

وہ تو ماروی کا نام سنتے ہی تڑپ گیا تھا۔ تمام مصروفیات کو بھول گیا تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا باہر آیا پھر ماروی کو دیکھتے ہی ٹھنک گیا۔ جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ بلا سفیر اور اس کی دائف احتراماً کھڑے ہو گئے۔ جیسی بھی اپنے والدین کے ساتھ کھڑی ہوئی تو مراد نے اس کا سراپا دیکھا پھر فوراً ہی سمجھ گیا کہ وہ ماروی کی ہم شکل ہے

بشرٹی نے جیسی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔ ”آپ کو یہ اعتماد ہے تو پھر ابھی ہمارے ساتھ چلیں۔“

ہارورڈ نے کہا۔ ”ابھی اچانک کیسے جا سکتے ہیں۔ پہلے ہزہائی نس کے پی اے سے ملاقات کے لیے اپنا ٹائمٹ ٹیٹا ہوگا۔“

”کوئی ضروری نہیں ہے۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ ابھی ان سے ملاقات ہو جائے گی۔“

وہ سب سفارت خانے سے باہر آ کر اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ کر محل کی طرف جانے لگے۔ بشرٹی اور بچے کو محل کے اندر جانے سے کوئی گارڈ نہیں روکتا تھا لیکن اندر جا کر ویٹنگ روم میں بیٹھنا پڑتا تھا۔ اگر وہ مصروف ہوتا تو انہیں بھی وہاں بیٹھ کر انتظار کرنا پڑتا اور اس وقت وہ بہت مصروف تھا۔ ایک ہال میں تمام مشیروں اور فوج کے اعلیٰ افسروں کے ساتھ اہم معاملات پر باتیں کر رہا تھا۔

اس کے پی اے نے اسے فون پر کہا۔ ”میزم بشرٹی ابھی آپ سے ملنے کی ضد کر رہی ہیں۔ میں نے انہیں سمجھایا ہے کہ آپ بہت مصروف ہیں لیکن...“

مراد نے بات کاٹ کر کہا۔ ”بشرٹی سے بات کراؤ۔“

دوسرے ہی لمحے میں اس کی آواز سنائی دی۔ ”بھائی! تمام مصروفیات کو چھوڑ کر ابھی ہال سے باہر آئیں۔“

”ابھی کیا بات ہے؟ کیوں مجھے فوراً آنے کو کہہ رہی ہو؟“

”آپ کے لیے ایک بہت بڑا سرپرائز ہے۔ آپ اسے دیکھیں گے تو ساری دنیا کو بھول جائیں گے۔“

”تم کیا دکھانا چاہتی ہو؟ کیوں میرا وقت ضائع کر رہی ہو؟“

”بھائی! میں کہتی ہوں سیدھی طرح آجائیں۔ ورنہ میں اس کا نام لوں گی تو یکفخت دوڑتے ہوئے آئیں گے۔“

”اگر یہ تمہارا چیلنج ہے تو میں نہیں آؤں گا۔“

”تو پھر کان کھول کر سنیں۔ ماروی آپ سے ملنے آئی ہے۔“

”کیا...؟“ وہ حیرت سے چیخ پڑا۔ ”یہ ناممکن ہے۔ دیکھو بشرٹی ایسا مذاق نہ کرو۔“

”یہ مذاق نہیں ہے۔“

وہ تو ماروی کا نام سنتے ہی تڑپ گیا تھا۔ تمام مصروفیات کو بھول گیا تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا باہر آیا پھر ماروی کو دیکھتے ہی ٹھنک گیا۔ جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ بلا سفیر اور اس کی دائف احتراماً کھڑے ہو گئے۔ جیسی بھی اپنے والدین کے ساتھ کھڑی ہوئی تو مراد نے اس کا سراپا دیکھا پھر فوراً ہی سمجھ گیا کہ وہ ماروی کی ہم شکل ہے

بشرٹی نے معنی خیز نظروں سے بچے کو دیکھا پھر ہارورڈ سے کہا۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ آپ جیسی کے ساتھ ہزہائی نس سے ملاقات کریں۔ وہ ماروی کی ہم شکل کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ اس کے لیے سیکورٹی کے خاص انتظامات کریں گے۔“

سبز ہارورڈ خوش ہو کر بولیں۔ ”یہ ہمارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہوگی۔ اگر ہزہائی نس جیسی پر خصوصی توجہ دیں گے تو اس کی دماغی کمزوری دور ہو جائے گی۔ سنا ہے وہ پراسرار علوم جانتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے علوم سے اس کا علاج کر سکیں گے۔“

بشرٹی نے معنی خیز نظروں سے بچے کو دیکھا پھر ہارورڈ سے کہا۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ آپ جیسی کے ساتھ ہزہائی نس سے ملاقات کریں۔ وہ ماروی کی ہم شکل کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ اس کے لیے سیکورٹی کے خاص انتظامات کریں گے۔“

سبز ہارورڈ خوش ہو کر بولیں۔ ”یہ ہمارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہوگی۔ اگر ہزہائی نس جیسی پر خصوصی توجہ دیں گے تو اس کی دماغی کمزوری دور ہو جائے گی۔ سنا ہے وہ پراسرار علوم جانتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے علوم سے اس کا علاج کر سکیں گے۔“

بشرٹی نے معنی خیز نظروں سے بچے کو دیکھا پھر ہارورڈ سے کہا۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ آپ جیسی کے ساتھ ہزہائی نس سے ملاقات کریں۔ وہ ماروی کی ہم شکل کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ اس کے لیے سیکورٹی کے خاص انتظامات کریں گے۔“

سبز ہارورڈ خوش ہو کر بولیں۔ ”یہ ہمارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہوگی۔ اگر ہزہائی نس جیسی پر خصوصی توجہ دیں گے تو اس کی دماغی کمزوری دور ہو جائے گی۔ سنا ہے وہ پراسرار علوم جانتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے علوم سے اس کا علاج کر سکیں گے۔“

بشرٹی نے معنی خیز نظروں سے بچے کو دیکھا پھر ہارورڈ سے کہا۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ آپ جیسی کے ساتھ ہزہائی نس سے ملاقات کریں۔ وہ ماروی کی ہم شکل کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ اس کے لیے سیکورٹی کے خاص انتظامات کریں گے۔“

سبز ہارورڈ خوش ہو کر بولیں۔ ”یہ ہمارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہوگی۔ اگر ہزہائی نس جیسی پر خصوصی توجہ دیں گے تو اس کی دماغی کمزوری دور ہو جائے گی۔ سنا ہے وہ پراسرار علوم جانتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے علوم سے اس کا علاج کر سکیں گے۔“

بشرٹی نے معنی خیز نظروں سے بچے کو دیکھا پھر ہارورڈ سے کہا۔ ”ہم چاہتے ہیں کہ آپ جیسی کے ساتھ ہزہائی نس سے ملاقات کریں۔ وہ ماروی کی ہم شکل کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ اس کے لیے سیکورٹی کے خاص انتظامات کریں گے۔“

سبز ہارورڈ خوش ہو کر بولیں۔ ”یہ ہمارے لیے بڑے اعزاز کی بات ہوگی۔ اگر ہزہائی نس جیسی پر خصوصی توجہ دیں گے تو اس کی دماغی کمزوری دور ہو جائے گی۔ سنا ہے وہ پراسرار علوم جانتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ اپنے علوم سے اس کا علاج کر سکیں گے۔“

لیکن ماریوی نہیں ہے۔
اس نے جینز اور سیلو لیس شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ ماریوی ایسا لباس نہیں پہنتی تھی۔ اس کی گوری اور گلابی رنگت اور شانوں تک تراشیدہ زلفیں کہہ رہی تھیں کہ وہ یورپ کے کسی ملک سے تعلق رکھتی ہے۔

طرح نارمل ہو جاتی تو ہمارے بہت کام آسکتی تھی۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ آئندہ مجھے اپنی بیٹی کو گھر میں چھپا کر رکھنا چاہیے۔ ورنہ مراد کے دشمن اسے ماریوی سمجھ کر نقصان پہنچائیں گے۔“

اس نے مسکرا کر کہا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں۔ آپ کے اکابرین کیوں اس سے دلچسپی لے رہے تھے؟ کیوں اس کا مہنگا علاج کر رہے تھے؟ اور اس کے نارمل ہونے کے بعد اس سے کیا کام لینا چاہتے تھے۔ مجھے آپ کی بیٹی سے ہمدردی ہے۔“

جب سے جیسی محل میں آئی تھی تب سے ہم زاد سے چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ ادھر ان کی باتیں سن رہا تھا۔ ادھر اس کا دل کھینچا جا رہا تھا۔ ایسی محسوس ہی تھی کہ اسے دیکھتے رہنے کو جی چاہتا تھا۔ وہ وہاں آیا تو دوسرے مراد کو ریاست کے دوسرے حکمران کو دیکھ کر سب ہی احتراماً کھڑے ہو گئے۔ جیسی خوشی سے چیخ پڑی۔ تالیاں بجاتے ہوئے بولی۔ ”ایک سے درد ہو گئے۔“

مراد نے کہا۔ ”پلیز! اسے چپ نہ کرائیں۔ یہ چمکتی ہوئی چیز یا کتنی محسوس لگ رہی ہے۔ کیا یہ اینارل ہے؟“

جی ہاں۔ اینارل کہہ سکتے ہیں۔ حقیقتاً یا درداشت کمزور ہے۔ اسے بھونے کی بیماری ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں جیسی کے سلسلے میں کچھ کہنا چاہوں گا۔“

وہ دوڑتی ہوئی ہم زاد کے پاس آ کر بولی۔ ”کیا تم بھی بادشاہ ہو؟ میں تمہیں چھو کر دیکھوں؟“

وہ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”مجھ سے ٹیک وینڈ کرو گے؟“

ہم زاد نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ یوں لگا مکھن کی نکلے ہاتھ میں آئی ہے۔ اگر وہ اسی طرح ہاتھ میں رہے گی تو پھٹکتی ہوئی اس کے اندر سما جائے گی۔

پھر اس نے سوچا۔ ماریوی کا یہ چہرہ مزاد کی جاگیر ہے۔ وہ اسے دیکھتے ہی پاگل ہو رہا ہوگا۔ یہ اس کی امانت ہے۔ مجھے اس کی طرف نہیں پھسلنا چاہیے۔

جیسی نے کہا۔ ”تم دونوں میں کون اصلی بادشاہ ہے؟“

ہم زاد نے کہا۔ ”ہم دونوں ہی اصلی بادشاہ ہیں۔“

وہ بولی۔ ”کیا دو ملک کا ایک بادشاہ بھی ہوتا ہے؟“

”ہم دو ملک کے ایک بادشاہ نہیں ایک ملک کے دو بادشاہ ہیں۔ تم غلط بول رہی ہو۔“

وہ اپنا سر کھجاتے ہوئے بولی۔ ”سوری۔ میں یہی بولنا چاہتی تھی۔ کیا کروں بھول ہو جاتی ہے۔“

اس کا ہاتھ ابھی تک ہم زاد کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا میں تمہارا ہاتھ چھوؤں؟“

وہ چونک کر اپنا ہاتھ کھینچ کر بولی۔ ”اوہ سوری۔ میں بھول گئی تھی۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا؟“

اس نے پوچھا۔ ”کیا ہو گیا تھا؟“

بٹے نے کہا۔ ”یہ فرانس کے سفیر مسز جیمس ہارورڈ ہیں۔ یہ ان کی وائف مسز مارتھا ہارورڈ ہیں اور یہ ان کی صاحبزادی مس جیسیکا عرف جیسی ہیں۔“

مراد نے مسز اور مسز ہارورڈ سے مصافحہ کیا۔ جیسی نے مراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ڈیڈ! یہ وہی ہیں۔ میں نے ان کو ٹی وی کے ایک ڈرامے میں دیکھا تھا۔“

ماں نے کہا۔ ”بیٹی! یہ ڈرامے کے ایکٹریں نہیں ہیں۔ اس ریاست کے بادشاہ ہیں۔ تم نے انہیں ٹی وی کے نیوز چینلز میں دیکھا ہے۔ تم تو اچھی بیٹی ہو۔ بھولتی نہیں ہو۔“

اس نے پوچھا۔ ”مام! یہ بادشاہ ہیں مگر ان کے سر پر تاج نہیں ہے۔ انہوں نے زرق برق لباس نہیں پہتا ہے۔ ان کی کمرے ٹکوار نہیں لگ رہی ہے۔“

ہارورڈ نے کہا۔ ”بیٹی! چپ ہو جاؤ۔ ہم تمہیں بعد میں سمجھائیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”پلیز! اسے چپ نہ کرائیں۔ یہ چمکتی ہوئی چیز یا کتنی محسوس لگ رہی ہے۔ کیا یہ اینارل ہے؟“

جی ہاں۔ اینارل کہہ سکتے ہیں۔ حقیقتاً یا درداشت کمزور ہے۔ اسے بھونے کی بیماری ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں جیسی کے سلسلے میں کچھ کہنا چاہوں گا۔“

”آپ اجازت حاصل کرنے کے پابند نہ رہیں۔ جو بات دل میں ہے۔ اسے آزادی سے بیان کریں۔“

وہ بولا۔ ”میں نے آپ کے بارے میں سنا ہے کہ پراسرار علوم جانتے ہیں۔ اگر یہ درست ہے تو ایسے علوم سے میری محسوس بیٹی کا علاج ہو سکے گا؟“

مراد نے کہا۔ ”آپ نے غلط سنا ہے۔ جو شخص زیادہ شہرت حاصل کرتا ہے اس کے بارے میں بھولتی جگیا باتیں پھیلتی ہی رہتی ہیں۔ آپ مشہور و معروف اور تجربہ کار دماغی امراض کے ڈاکٹر سے رجوع کریں۔ علاج کتنا ہی مہنگا ہو میں اس کے اخراجات پورے کر دوں گا۔“

ہارورڈ نے کہا۔ ”مم بیس میں تھے۔ وہاں سرکاری طور پر بہت مہنگا علاج کرایا گیا۔ یہ ماریوی کی ہم شکل ہے۔“

”آخر انہوں نے ناکام ہو کر کہا کہ یہ دماغی طور پر پوری ہے۔“

ہے، یہ ہوس ہے۔ میری آزمائش ہے کہ ماہ نور جیسی بہترین عبادت گزار شریک حیات کے ہوتے ہوئے کیا مجھے دوسری عورت کی ہوس کرنی چاہیے؟ خواہ وہ ماروی ہی کیوں نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، صابر و شاکر رہو۔ ضرورت سے زیادہ نہ چاہو۔ جو مل رہا ہے اس پر قناعت کرو۔ میں نے مصلے پر بیٹھ کر اپنے رب سے وعدہ کیا تھا کہ ماروی محبوب کے نکاح میں آکر میرے لیے نامحرم ہوگئی ہے۔ مجھے اس کا نام بھی زبان پر نہیں لانا چاہیے۔ زبان سے اس کے نام کو اور ذہن سے اس کے تصور کو ہمیشہ کے لیے مٹا دینا چاہیے اور میں یہی کرتا آرہا ہوں۔ اب اگر جیسی کی ہوس دل میں ہوگی۔ اگر میں اسے طلب کروں گا تو گویا اس کے روپ میں ماروی پھر میری زندگی میں آجائے گی۔ میں جیسی کو منکوحہ بنا کر اسے آغوش میں لوں گا تو لا شعوری طور پر ماروی کو دھڑکنوں سے لگاتا رہوں گا۔ حقیقتاً ماروی کی طرف بھٹکنے کے لیے جیسی کا وجود ایک بہانہ بن جائے گا۔ شیطان اسی طرح بہکاتا ہے۔ ہوس اسی طرح ذہن کو سوچنے سمجھنے کے قائل نہیں رہنے دیتی۔ نہیں، ماروی میرے لیے فنا ہو چکی ہے۔ اب ایک کے بعد دوسری تیسری آجائے تو میں کسی کو اپنی زندگی میں آنے نہیں دوں گا۔ جو میرے لیے فنا ہو چکی ہے اسے کسی بھی بہانے زبردہ نہیں ہونے دوں گا۔“

وہ بولی۔ ”مجھے اچھا لگ رہا تھا۔ پھر کبھی آؤں گی تو پھر میرا ہاتھ پکڑو گے نا؟“

اس بات پر اس کے ماں باپ جھینپ رہے تھے۔ ہارورڈ نے کہا۔ ”جیسی! پلیز اتنا تو سمجھو یہ حاکم اعلیٰ ہیں۔ ان سے اس طرح بے تکلفی سے نہیں بولنا چاہیے۔“

مراد نے کہا۔ ”مسٹر ہارورڈ! میں نے کہا تھا یہ چپکٹی ہوئی چیز یا ہے۔ اسے بولنے دیں۔ یہ جو چاہتی ہے، وہ کرنے دیں۔“

پھر وہ ہم زاو سے بولا۔ ”یور ہائی نس! میں میٹنگ میں بہت مصروف ہوں۔ یہ ہمارے مہمان خصوصی ہیں۔ انہیں کہنی دیں۔ یہ ڈنر کے بعد یہاں سے جائیں گے۔“

ہم زاو نے کہا۔ ”یور ہائی نس! آپ جائیں۔ میں مہمانوں کا خاص خیال رکھوں گا۔“

مراد چلا گیا۔ جیس ہارورڈ نے کہا۔ ”میں حیران ہوں۔ آپ دونوں ایک دوسرے کو یور ہائی نس کہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی تعظیم کرتے ہیں۔ جبکہ یہ کہادت درست ہے کہ ایک سر نیام میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ ایک ملک کے دو بادشاہ بھی نہیں ہوتے۔“

ہم زاو نے کہا۔ ”یہاں ہو گئے ہیں۔ یہ ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔ یہ کہادت پرانے زمانے کی ہے۔ جب تلواریں چلا کر تھیں، اب بندوقس چلتی ہیں اور ایک بندوق میں کئی ہلٹس سما جاتے ہیں۔“

ادھر مراد میٹنگ ہال میں آیا۔ وہاں اس کے تمام مشیر اور آری کے اعلیٰ افسران کئی معاملات پر بحث کر رہے تھے اور ان معاملات پر مراد کے فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسی کو دیکھنے کے بعد ماروی اس کے اندر چھپ رہی تھی اور بول رہی تھی۔ ”میں آگئی ہوں۔ وہ جیسی نہیں ہے۔ وہ میں ہوں۔ میں نے شادی شدہ ماروی کو محبوب کے پاس چھوڑ دیا ہے۔ اسے وہیں رہنے دو۔ جس طرح تم ایک سے دو مراد ہو گئے ہو، اسی طرح میں ایک سے دو ماروی ہو گئی ہوں۔ یہ دوسری تمہارے پاس آگئی ہے۔“

مراد نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ ایک مشیر اعلیٰ نے پوچھا۔ ”یور ہائی نس! آپ کچھ پریشان ہیں؟“

وہ سر اٹھا کر بولا۔ ”سوری جٹلمین! میں واقعی اپ سیٹ ہوں۔ معذرت چاہتا ہوں۔ میٹنگ برخاست کریں۔ ہم کل صبح نو بجے یہیں ملیں گے۔ میں تنہا چاہتا ہوں۔“

مراد نے ہال سے اٹھ کر جانے لگے۔ ہال خالی ہو گیا۔ وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ یہ جو دوسری ماروی آئی

وہ اس ہال سے اٹھ کر تیزی سے چلتا ہوا اپنی خواب گاہ میں آیا۔ ماہ نور نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے آپ نے وقت سے پہلے اجلاس کو برخاست کر دیا ہے؟“

مراد نے اسے سمجھ کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ پھر اس کی گردن کو اوپر چہرے کو چومتے ہوئے کہا۔ ”ابھی میں ڈوب رہا تھا اس لیے تمام مصروفیات کو ملتوی کر کے تمہارے پاس آیا ہوں۔ مجھے کنارے لگا دو۔“

وہ کیا کنارے لگاتی؟ وہ تو اس کے والہانہ پیار میں غرق ہو رہی تھی۔ دونوں کی سانسیں ٹکرا رہی تھیں۔ وہ ہانپتی ہوئی بولی۔ ”میں نے سنا ہے، کوئی ماروی کی ہم شکل آئی ہے؟“

”میرا امتحان لینے آئی ہے لیکن میری ماہ نور کے حقوق مجھ سے نہیں لے سکے گی۔“

”میں آپ کی محبت پر اور دیانت داری پر جتنا بھی فخر کروں کم ہے۔ خدا آپ کو میرے بعد بھی سلامت رکھے۔“

دوسری طرف جیسی کی گفتگو اور لہجے میں ایسی معصومیت اور ایسا بچوں جیسا انداز تھا کہ ہم زاو دل ہی دل میں قربان ہو رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ ”یا خدا... ایہ میرے سامنے کیوں آگئی ہے؟ میرا دل بے ایمان ہو رہا ہے۔ اب

”مجھ سے بے ایمانی کیسے ہوگی؟ میں نہیں سمجھا۔ مجھے سمجھاؤ۔“
”وہ تمہاری ماروی ہے۔ صاف صاف کہتا ہوں کہ اس پر میرا دل آ گیا ہے۔“

”ماروی کی ہم شکل ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اس پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا ہوں۔ مجھے اس حسینہ جیسی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تمہاری طرح جگہ جگہ دل بٹھکنے والا عاشق نہیں ہوں۔“
وہ خوش ہو کر بولا۔ ”کیا سچ کہہ رہے ہو؟ تمہیں سچ سچ اس سے دلچسپی نہیں ہے؟“

”کہہ تو رہا ہوں نہیں ہے لیکن یہ بہت ہی غلط بات ہوگی اگر تم اس کے چکر میں پڑو گے۔ یہاں تمہاری محبت کرنے والی نیک سیرت شریک حیات ہے۔ اس کے علاوہ تم کسی جینی نام کی حسینہ سے...“

وہ بولتے بولتے رک گیا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ”ارے ہاں۔ اس حسینہ کے پاس تو تم جا نہیں سکتے ہو۔ کیا اسے دودھ کی کھمی کی طرح دل سے نکال کر پھینک دیا ہے؟“

”میں نے اسے دل سے نہیں نکالا ہے اور اب تو اس سے اور بھی گہرا رشتہ ہو گیا ہے۔“

وہ چند قدموں کے فاصلے پر آرام دہ کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ ہم زاد نے کہا۔ ”جینی میرے لیے بہت اہم ہوگی ہے کیونکہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے۔“

مراد نے چونک کر اسے بے چینی سے دیکھا پھر پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو؟“

”میں جینی سے فون پر باتیں کرتا رہتا ہوں۔ تم اتنے مصروف رہتے ہو کہ تم سے اتنی اہم بات نہ کہہ سکا۔ آٹھ ماہ گزر چکے ہیں اور ایک ماہ بعد وہ بچے کو جنم دے گی۔ اسے الٹراساؤنڈ کے ذریعے معلوم ہوا ہے کہ بیٹا پیدا ہوگا۔ مراد...! جینی سے میرا رشتہ جائز ہے یا نہیں ہے؟ لیکن وہ بیٹا میرا ہے۔ اسے میرے سائے میں میرے دینی ماحول میں پرورش پانا چاہیے۔ اگر وہ میرے ساتھ نہیں رہے گا تو اس بچے کی ماں اسے بیووی بنا دے گی۔“

مراد نے پریشان ہو کر کہا۔ ”یا اللہ.....! یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم کیسی فطنتی کر بیٹھے ہو؟“

وہ بولا۔ ”میں نے جینی سے کہا ہے کہ مراد نے دوسرے جنات کی طرح مجھے بھی اپنے شکنجے میں لے لیا ہے۔ میں مراد کی تابعداری سے انکار کر رہا ہوں اس لیے اس نے مجھے زنجیریں پہنا کر ایک تہ خانے میں قید کر دیا ہے۔ اس نے میرے جھوٹ کو بیچ مان لیا ہے کہ میں شکنجے میں ہوں،

سے پہلے میں ماہ نور کے سلسلے میں بے ایمان ہو گیا تھا۔ میں نے مراد کو دھوکا دیا تھا لیکن مراد اسے نکھن کے بال کی طرح نکال کر لے گیا تھا۔ مجھے ماہ نور سے دست بردار ہونا پڑا تھا۔ اس بار بھی وہ جیسی کو میرے ہاتھ لگنے نہیں دے گا۔ بہتر ہے کہ میں اس مصحوم حسینہ سے دور ہو جاؤں۔ یہ سامنے رہے گی تو مجھے پاگل بنانی رہے گی۔“

وہ اس وقت جیسی اور اس کے والدین کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر تھا۔ بشری اور تارا بھی تھے۔ وہ کھانا چھوڑ کر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”معذرت چاہتا ہوں۔ مجھے جانا ہوگا۔ سپر پاور کے حاکم اعلیٰ سے ایک اہم معاملے میں گفتگو کرنے کا وقت مقرر ہے۔ مجھے انجی اسکائپ کے ذریعے ان سے رابطہ کرنا ہے۔“

اس نے بشری اور تارے سے کہا۔ ”تم دونوں میزبانی کے فرائض ادا کرو۔ ہزبانی بس تھوڑی دیر بعد یہاں آئیں گے۔“
جیسی نے کہا۔ ”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں۔ میں بھی اسکائپ کے ذریعے بولوں گی۔“

وہ بولا۔ ”سوری جیسی! کچھ سیاسی رازدارانہ باتیں ہیں۔ ایسی باتیں تمہاری میں کی جاتی ہیں۔“

”تم جاؤ گے تو میں تنہا رہ جاؤں گی۔ تم بہت اچھے ہو۔ میری تعریفیں کرتے رہتے ہو۔“

”تم تنہا نہیں رہو گی۔ ابھی وہ میرے ہم شکل ہزبانی اس... آئیں گے۔ وہ بھی تمہاری خوب تعریفیں کریں گے۔“

وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا کر بولی۔ ”پھر تو تم جاؤ۔“
ہم زاد وہاں سے چلا ہوا محل کے مختلف حصوں سے گزرتا ہوا مراد سے ملنے کے لیے اس کی خواب گاہ کے دروازے پر آیا۔ وہ عشا کی نماز پڑھ کر اٹھ رہا تھا۔ دستک کی آواز سن کر دروازہ کھول کر باہر آیا پھر پوچھا۔ ”کیا مہمان چلے گئے؟“

ہم زاد نے کہا۔ ”مہمان تمہارے ہیں۔ تم نے مجھے مہمان نوازی میں الجھایا ہوا ہے۔ پلیز جاؤ اور انہیں سنبھالو۔ میں انہیں کبھی نہیں دوں گا۔“

”کیا ان مہمانوں سے تکلیف پہنچ رہی ہے؟“
وہ ایک سر دھڑا کر بولا۔ ”تکلیف صرف اس حسینہ سے ہو رہی ہے جو ماروی کی ہم شکل ہے۔“

”کیا اس کے ایذا دل ہونے سے پریشان ہو گئے ہو؟“
”اس کے ایذا دل ہونے کی اور ایک بھی سی ہنسی کی طرح بولنے کی ادائیں ایسی ہیں کہ دل بے ایمان ہونے لگا ہے۔ پھر تم سے بے ایمانی کرنے کو جی چاہنے لگا ہے۔“

مسائل پیدا ہو جائیں، تب تیسری شادی کی اجازت ہے۔“
ہم زاد نے کہا۔ ”میرے ساتھ بھی مسائل ہیں۔ اپنی
اولاد کو مسلمان بنائے رکھنے کے لیے اس کی یہودی ماں سے
شادی کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ یہاں تک تو میں راہِ راست
پر ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ تیسری کے خواب نہ دیکھو۔ جیسی کو دل
سے نکال دو۔ ابھی جاؤ اور انہیں یہاں سے رخصت کر دو۔
فضول بحث میں میرا وقت ضائع نہ کرو۔“

مراد جانے کے لیے اٹھ گیا۔ ہم زاد نے کہا۔ ”جیسی
میری آخری آرزو ہے۔ اس کے بعد میں کسی کی تمنا نہیں
کروں گا۔“

”وہ آرزو نہیں ہے۔ گناہ کی طرف لے جانے والی
ہوس ہے۔ باز آ جاؤ۔“

”پلیز! مولوی بن کر نصیحتیں نہ کرو۔ یہ زندگی صرف ایک
ہی بار جینے کے لیے ملتی ہے۔ موت کے بعد پھر نہیں ملے گی۔
مجھے اپنے مزاج کے مطابق لائف کو اچھائے کرنے دو۔“

وہ فوراً ہی پلٹ کر مراد کی مزید کوئی بات سنے بغیر اپنی
خواب گاہ میں آ گیا۔ وہاں زیب النساء عشا کی نماز پڑھ رہی
تھی۔ وہ لباس تبدیل کر کے پھر جیسی اور اس کے والدین
کے پاس پہنچ گیا۔ وہ سب احتراماً اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔
لباس تبدیل ہونے کی وجہ سے یہی سمجھ میں آیا کہ دوسرا مراد
آ گیا ہے۔ ہم زاد نے بھی یہی ظاہر کیا۔ جیسی نے پوچھا۔
”کہاں چلے گئے تھے؟ کب سے انتظار کر رہی ہوں۔ جاؤ
میں تم سے نہیں بولوں گی۔“

اس کی مام نے کہا۔ ”بیٹی ایہ وہ نہیں ہیں۔ وہ تم سے
بڑن کر گئے تھے کہ یہ آنے والے ہیں۔ کیا تم بھول گئیں؟“
وہ بولی۔ ”مسٹر تم دونوں مجھے نشیوز کر رہے ہو۔ تم وہ
نہیں ہو۔“

ہم زاد نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ جو تھوڑی دیر پہلے گیا تھا
وہ ایک اہم معاملے میں مصروف ہو گیا ہے۔ میں تمہیں تمہینی
دینے آ رہا ہوں۔“

جیمس ہارڈوڈ نے کہا۔ ”ہم آپ کے ممنون ہیں۔
آپ بہت زیادہ مصروف رہنے کے باوجود ہمیں اپنا وقت
دے رہے ہیں۔“

ہم زاد نے کہا۔ ”مسٹر ہارڈوڈ! آپ خوب سمجھ رہے
ہیں کہ میں آپ کی صاحبزادی میں دلچسپی لے رہا ہوں کیونکہ
یہ ہو بہو ماروی دکھائی دے رہی ہے۔“

”یور ہائی نس! میں سمجھ رہا ہوں۔ میں آپ سے اپنے

اس کے پاس نادیدہ ہو کر نہیں جا سکوں گا۔ وہ میری رہائی کا
اشکارا کر رہی ہے۔“

”یہ بولو کہ بیٹے کو کیسے حاصل کرو گے؟ اسے ہمارے
دینی ماحول میں پرورش پانا چاہیے۔“

”میں نے اس مسئلے پر غور کیا ہے۔ یہ تدبیر سمجھ میں
آ رہی ہے کہ تم فرانس کے اکابرین سے یہ بولو کہ تم نے جینی
کے عاشق ان سین کو اپنے بھتیجے میں لے لیا ہے لیکن وہ تمہارا
تابع دار بن کر رہنے کی ایک شرط پیش کر رہا ہے۔ شرط یہ ہے
کہ اگر تم جینی کو ریاست میں بلا کر اسے اس کے عاشق کے
ساتھ رہنے دو گے تو وہ دوسرے جنات کی طرح تمہارا غلام
بن جائے گا۔ اس طرح جینی یہاں آ کر رہنے لگے گی۔“

”ہوں۔ تدبیر اچھی ہے لیکن جب وہ یہاں آئے گی
تو اپنے نادیدہ عاشق کے ساتھ رہنا چاہے گی اور تم نادیدہ
نہیں ہوسکو گے۔ پھر کیا ہوگا؟“

”ہاں یہ ایک مسئلہ ہے۔ اسے بھی کسی طرح حل کیا
جائے گا۔ پہلے وہ آ تو جائے۔ میں بیٹے کو اپنی تحویل میں
رکھوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ تم مراوین کر فرانس کے اکابرین سے
باتیں کرو۔ جینی کو جلد ہی یہاں آنا چاہیے۔“

”میں کل کسی وقت ان سے اسکا پ کے ذریعے
باتیں کروں گا۔ ابھی جیسی اور اس کے والدین ہمارے
مہمان ہیں۔ میں مراوین کر ان کے پاس جا رہا ہوں۔“

مراد نے اسے گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارا
ارادہ کیا ہے؟ کیا جیسی سے بھی ٹکڑ کر دو گے؟“

”میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر وعدہ کرتا ہوں کہ گناہ
گار نہیں بنوں گا۔ وہ راضی ہوگی تو اسے اپنی منگواہ بنا لوں گا۔“

”لعنت ہے تمہاری ہوس پرستی پر۔ تم زیب النساء
جیسی نیک سیرت شریک حیات پر سوگن لانا چاہتے ہو۔“

”میں زیب النساء کو راضی کر لوں گا۔ وہ میری
دوسری شادی پر اعتراض نہیں کرے گی۔“

”دوسری نہیں، تیسری کہو۔ جینی یہاں آئے گی تو کیا
اپنے بچے کی ماں کو منگواہ نہیں بناؤ گے؟ کیا دنیا والوں کے
سامنے اپنے بچے کو جائز نہیں بناؤ گے؟“

”ہاں، اس سے بھی نکاح پڑھوانا ہوگا۔ کوئی بات
نہیں دین میں چار شادیوں کی اجازت ہے۔“

”عاشقی کے لیے چار شادیوں کی اجازت نہیں ہے۔
اگر پہلی بیوی آرزو دہنی وظیفہ ادا کرنے کے قابل نہ ہو، تب
دوسری شادی لازمی ہے۔ دوسری کے ساتھ بھی ناقابل حل

کیا۔ ایک گارڈ نے ان کے لیے کار کا دروازہ کھولا۔ وہ دونوں ہم زاو کے ممنون و مشکور ہو کر وہاں سے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد پلے نے کہا۔ ”مراد ایہ تو میں جانتا تھا کہ ماروی کی ہم شکل کو دیکھتے ہی پاگل ہو جاؤ گے لیکن یہ توقع نہیں تھی کہ۔۔۔ منکوحہ بنائے بغیر اس نامحرم کو اپنے محل میں رکھو گے۔“

وہ بولا۔ ”میں مراونہیں ہوں۔“

بشری اور پلے نے اطمینان کی سانس لی۔ بشری نے کہا۔ ”میرے بھائی جان سلامت رہیں۔ میں جانتی تھی۔ وہ دین کے خلاف کوئی کام نہیں کریں گے۔“

پلے نے ہم زاو سے کہا۔ ”تم بعض اوقات مراو کے مزاج کے خلاف کام کرتے ہو اور وہ برداشت کر لیتا ہے۔ اس نے یقیناً تمہیں نیک ہدایات کی ہوں گی۔“

اس نے کہا۔ ”سوری۔ میں اپنے پرسنل معاملات میں تم سے اور بشری سے کبھی نہیں بولوں گا۔ تم دونوں مراو کے ہی رہو گے میرے کبھی نہیں ہو سکو گے۔“

وہ کوئی جواب سے بغیر منہ پھیر کر چلا گیا۔ پلے نے کہا۔ ”میں حیران ہوں۔ مراد ماروی کا دیوانہ ہے لیکن اس سے دور رہو اور یہ ہم زاو اس پر ڈور سے ڈال رہا ہے۔“

بشری نے کہا۔ ”بھائی خوب سمجھتے ہیں کہ اس کی صورت ماروی کی ہے۔ جیسی بار بار پیدا ہو کر بھی ماروی جیسی نہیں بن سکتے گی۔ میرے بھائی جان بہت اچھے ہیں۔ ہمیشہ ایک بیوی کے ساتھ گزارہ کرتے رہیں گے۔ وہ تیرے اور ہم زاو کے جیسے نہیں ہیں۔“

”اے امین نے کیا کیا ہے؟ کیا تم پر سوکن لارہا ہوں؟“ انہیں لارہا ہے لیکن دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کسی دن لے آئے گا۔ تم مرووں پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔“

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”یہ اچھا ہے۔ جس بیوی کے دل میں سوکن کا دھڑکا لگا رہتا ہے، وہ تیری طرح دن رات شوہر کی خدمت گزار بن کر رہتی ہے تاکہ دوسری کا خیال ہی نہ آئے۔ اب چل یہاں سے۔ بہت رات ہو گئی ہے۔“

وہ دونوں محل سے باہر آ کر اپنی کار میں بیٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔ جیمس ہارورڈ اور اس کی بیوی دونوں ہی خوش تھے۔ ان کی ایبٹارٹل بیٹی شاہی محل میں صبح و آرام سے محفوظ رہنے والی تھی۔ جیمس نے گھر آ کر بیوی کو آغوش میں لے کر چوم لیا پھر اس نے فون پر اپنے ملک کے حاکم اعلیٰ سے رابطہ کیا۔

اس نے رابطہ ہوتے ہی کہا۔ ”سر! بہت بڑی خوش

اندہ کی بات چھپانا نہیں چاہتا۔ جب سے مجھے اور میری مسز کو معلوم ہوا ہے کہ ہماری بیٹی ماروی کی ہم شکل ہے اور آپ ماروی کی حفاظت اور سلامتی کے لیے زمین و آسمان ایک کر دیتے ہیں، تب سے ہمارے دل میں یہ بات ہے کہ ہماری بیٹی ماروی بن کر آپ کی پناہ میں رہے۔ تب ہماری تمام فکر اور پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔“

ماں نے کہا۔ ”ایک تو ہماری بیٹی ایبٹارٹل ہے۔ اس کا دماغ بہت کمزور ہے۔ تھوڑی دیر پہلے کی باتیں بھول جاتی ہے۔ پھر یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ آپ کے ذہن اسے ماروی سمجھ کر کسی وقت بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ یورہائی نس! ایک ماں آپ سے الٹجا کرتی ہے کہ اسے اپنی پناہ میں رکھ لیں۔ یہ آپ کے پاس محفوظ رہے گی۔“

وہ ماں باپ ہم زاو کے دل کی باتیں کر رہے تھے۔ جیسی کے قریب رہنے کا راستہ خود ہی ہموار ہو رہا تھا۔

اس نے پوچھا۔ ”کیا آپ دونوں یہ چاہتے ہیں کہ جیسی میرے اس محل میں رہے؟“

جیمس ہارورڈ نے کہا۔ ”بانی گاڈ ہم یہی چاہتے ہیں۔“

”کیا یہ اپنے نام اور ڈیڈ کے بغیر یہاں رہتا چاہے گی؟“ ”ہم یہاں سے جائیں گے تو یہ چند گھنٹوں کے بعد ہمیں بھول جائے گی۔ جب ہم سامنے آئیں گے تو پھر ہمیں پہچاننے لگے گی۔“

ہم زاو نے دو کنیزوں کو بلا کر کہا۔ ”مس جیسی کا لیے ایک خواب گاہ مخصوص کرو۔ وہاں ان کی ہر ضرورت کا سامان پہنچاؤ۔ تم دونوں ان کا خاص خیال رکھو گی۔“

جیسی کی ماں نے کہا۔ ”بیٹی! یہ تمہاری کنیزیں ہیں۔ تمہیں اس محل کی سیر کرائیں گی۔ ان کے ساتھ جاؤ۔“

وہ محل کی سیر کرنے کے لیے راضی خوشی چلی گئی۔ جیمس ہارورڈ نے کہا۔ ”اچھا ہوا یہ چلی گئی۔ ہم اس کی غیر موجودگی میں یہاں سے جائیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ بھول جائے گی کہ کس کے ساتھ محل میں آئی تھی۔ ہمیں جانا چاہیے۔“

ہم زاو ان کے ساتھ چلتا ہوا صدر دروازے سے باہر ان کی کار کے پاس آیا پھر اس نے سکیورٹی افسر کو بلا کر کہا۔ ”یہ مسٹر جیمس ہارورڈ فرانس کے سفیر ہیں اور یہ ان کی مسز ہیں۔ ان کی صاحبزادی مس جیسی کا شاہی خاندان کی ایک فرو بن چکی ہیں۔ ان ماں باپ کو ہمیشہ دی آئی بی ٹریٹمنٹ دیا جائے۔ یہ جب بھی اپنی صاحبزادی سے ملنے آئیں انہیں کسی روک ٹوک کے بغیر آنے جانے دیا جائے۔“

سکیورٹی افسر نے ہارورڈ اور مسز ہارورڈ کو سیلیوٹ

خبری سنار ہا ہوں۔ جیسی شاہی محل میں پہنچ گئی ہے۔“

دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ ”صرف پہنچی ہے؟“
اس نے جواب دیا۔ ”نوسرا مراد تو ماروی کا دیوانہ ہے۔ اس کی ہم شکل جیسی کو دیکھتے ہی اس پر لٹو ہو گیا ہے۔ اب جیسی اس کے ساتھ محل میں رہے گی۔ ہم اسے وہاں چھوڑ کر ابھی گھر آئے ہیں۔“

حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ”دیل ڈن مسٹر ہارورڈ! یہ کامیابی ہماری توقع سے زیادہ ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اتنی جلدی وہ ایک چھلانگ میں محل کے اندر رہنے چلی جائے گی۔“
”اور اب وہ دونوں مراد معما نہیں رہے۔ صاف سمجھ میں آ گیا ہے کہ جیسی کی طرف مالک ہونے والا اور اسے محل میں اپنے قریب رکھنے والا ہی اصلی مراد ہے۔“

”ہاں۔ یہ سمجھ میں آ رہا ہے لیکن یقین نہیں کرنا چاہیے۔ ہم پہلے دھوکا کھا چکے ہیں۔ جیسی اس کے قریب رہے گا تو وہ اسے اپنی بیوی بنانے کا پھر بیرونی ممالک کے دروں میں اپنے ساتھ لے جایا کرے گا تو ہمیں یقین ہوتا رہے گا۔“
”سرا دہ مراد کے اتنے قریب پہنچ گئی ہے کہ ہم اس کے بہت سے اندرونی رازوں تک پہنچنے رہیں گے۔“

”بے شک۔ بڑی سہولت سے بڑے اعتماد سے اپنے مشن پر ڈٹے رہو۔ کسی بھی معاملے میں جلد بازی کر دے تو ہم پہلے کی طرح نقصان اٹھائیں گے۔ اسکی غلطی ہرگز نہ کرنا۔“

”آل رائٹ سرا ہم بہت محتاط رہیں گے۔“
فون کا رابطہ ختم ہو گیا۔ دوستی آسانی سے ختم ہو جاتی ہے۔ دشمنی مشکلات سے گزر کر بھی ختم نہیں ہوتی۔ پیر یار اور دوسرے تمام بڑے ممالک نے پہلے ہی پلاننگ کی تھی کہ مراد علی منگی جب دشمنی سے زیر نہیں ہوگا تو اسے محبت سے زیر کیا جائے گا۔ اسی پلاننگ کے مطابق ایک ایبارنل لڑکی کو پیار کے پھول کھلانے کے لیے وہاں پہنچا دیا گیا تھا۔

☆☆☆

ہم زاد نے دوسری سچ جینی سے فون پر کہا۔ ”میری کوئی تدبیر کام نہیں آئے گی۔ میں مراد کے گلے سے نہیں بچ سکوں گا۔“

وہ بولی۔ ”میرا کیا ہوگا؟ کیا میں تمام عمرا کیلی رہوں گی؟ کسی دن بھی ڈیلیوری ہو سکتی ہے۔ تمہارا بیٹا میری گود میں آنے والا ہے۔ ایسے وقت تمہیں میرے پاس ہونا چاہیے۔“

جینی نے سوچا ہے کہ مجھے تمہارے پاس رہنا چاہیے۔ اپنے بچے کو ہاتھوں میں لے کر چومنا چاہیے۔“

”ہائے میرے دلدار! کسی طرح آ جاؤ۔“
”اس طرح آ سکتا ہوں کہ مراد کی غلامی منظور کر لوں۔ پھر وہ مجھے اس حد تک آزاد کرے گا کہ تم یہاں آؤ تو میں تم سے مل سکوں۔ میں تمہاری خاطر اس کا غلام بن جاؤں گا۔“

”کیا وہ ہمیں ہمیشہ ملنے رہنے کی اجازت دے گا؟“
”وہ بھی تم سے ملنے کی چھٹی دے دیا کرے گا۔“
”چلو یہی سہی۔ نہ ملنے سے بہتر ہے کبھی کبھی ملنے رہیں گے لیکن ایک پر اہم ہے۔ ڈاکٹر حاملہ عورت کو لمبے سفر کی اجازت نہیں دیتے۔ پھر یہ کہ میری میڈیکل رپورٹ تشویش ناک ہے۔“

”کیا رپورٹ ہے..... کیا ہمارا بچہ صحت مند نہیں ہے؟“
”بہت زیادہ صحت مند ہے۔ رپورٹ کے مطابق بچہ غیر معمولی جسامت رکھتا ہے۔ عام بچوں کی طرح نہیں ہے۔ اپنے حجم میں طویل قامت ہے۔ مگر آپریشن کے ذریعے ڈیلیوری ہوگی۔ یہ سن کر پریشان ہوں کہ زچگی معمول کے مطابق نہیں ہوگی۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”یا خدا یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ یہ بچہ تو بڑے مسائل پیدا کر رہا ہے۔“

وہ بڑے جذبے سے بولا۔ ”نہیں جینی! ایسے وقت میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا۔ تمہارے قریب رہوں گا لیکن...“
”لیکن کیا؟ کسی طرح آ جاؤ۔ اس کے غلام بن جاؤ۔“

”غلام بننے کے بعد اس کی شرط یہ ہوگی کہ وہ میرے نادیہ بننے کی قوت چھین لے گا۔ میں تمہارے پاس کسی انسان کی شکل میں آؤں گا۔“

”کیا پھر میں تمہیں دیکھ سکوں گی؟“
”ہاں۔ پوری دنیا مجھے دیکھے گی۔ جب مراد کو مجھ سے کوئی کام لینا ہوگا تو وہ مجھے نادیہ بنا دے گا۔ وہ بڑے خطرناک پراسرار علوم جانتا ہے۔ میں اس کے آگے بے بس ہوں۔“

”اس کی بات نہ کرو۔ مجھے غصہ آتا ہے۔ کیا تم کسی انسان کے روپ میں میرے پاس آؤ گے؟“

”ہاں انسان کے ہی روپ میں آؤں گا لیکن تمہارے پاس نہیں آ سکوں گا۔ اس کی شرط ہوگی کہ میں ریاست سے باہر کہیں نہ جاؤں۔ اس لیے تمہیں یہاں آنا ہوگا۔“

”ادہ گا ڈ...! ایسا ہو کہ مجھے پر لگ جائیں اور میں تمہارے پاس آ جاؤں۔ میں ابھی ڈاکٹروں سے التجا کروں گی کہ مجھے ریاست تک سفر کرنے کی اجازت دیں۔“

”میں ابھی مراد کا تابعدار بن جاؤں گا تو وہ تمہارے ملک

”ہم ایک خاص طیارے میں اس کے لیے ایک چھوٹا سا اسپتال قائم کر دیں گے۔ لیڈی ڈاکٹر بھی ہوگی۔ ہنگامی سچویشن میں آپریشن کرنے والے سرجن بھی ہوں گے۔“

”جب ایسے زبردست انتظامات ہو سکتے ہیں تو اسے کل ہی کسی وقت وہاں سے روانہ کریں۔“

معاظت طے ہو گئے۔ جینی دوسرے دن کسی وقت بھی ہم زاو کے پاس آنے والی تھی۔

مراوی توجہ ماروی اور محبوب پر تھی۔ وہ ان سے ملنا اور ان کے لیے زیادہ سے زیادہ سیکورٹی کو مستحکم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے صدر پاکستان سے گزارش کی تھی کہ وہ پیدائشی پاکستانی ہے اور دو چار دنوں کے لیے اپنے وطن میں آنا چاہتا ہے۔

صدر پاکستان نے کہا تھا۔ ”آپ کی آمد باعث مسرت ہوگی۔ آپ بصد شوق تشریف لائیں۔ ہمیں آپ کی میزبانی کا شرف حاصل ہوگا۔ پاکستان کے عوام بڑے خوش و خروش سے اپنے ہم وطن بادشاہ سلامت کا استقبال کریں گے۔“

یہ طے پا گیا کہ وہ چار دنوں کے بعد اپنے طیارے میں وہاں آئے گا۔ ماہ تور نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”آپ مجھے بھی ساتھ لے جائیں گے؟ وہ میرا بھی وطن ہے۔“

”اگر میں کہوں کہ تم نہ جاؤ تو؟“

”آپ کا حکم سراسر آنکھوں پر۔ میں ضد نہیں کروں گی لیکن میں اسوس کرتی رہوں گی۔“

مراو مسکرانے لگا۔ وہ بولی۔ ”آپ مذاق کر رہے ہیں نا؟ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے نا؟“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”میں جاؤں گا تو تمہیں لے جاؤں گا اور میرے نہیں جا رہا ہوں۔“

”ابھی آپ صدر پاکستان سے کہہ رہے تھے کہ...“

”سیاست میں کہا کچھ جاتا ہے کیا کچھ جاتا ہے۔ میں پھر سپر پاور اور اس کے اتحادیوں کو فریب دینے والا ہوں۔ ہم زاو... وہاں جائے گا۔ میں دشمنوں کو پھرا بھادوں گا۔“

وہ بولی۔ ”یہ سب جانتے ہیں کہ ریاست کی ملکہ... ماہ نور بھی پیدائشی پاکستانی ہے۔ سوال پیدا ہوگا کہ ریاست کے بادشاہ کے ساتھ ملکہ اپنے وطن کیوں نہیں آئی ہے؟“

”تم دو روز بعد بیمار بن جاؤ گی۔ یہاں کے ڈاکٹر بیان دیں گے کہ تم سفر کرنے کے قابل نہیں ہو۔ ہم زاد کے ساتھ اس کی وائف زیب النساء نہیں جائے گی۔ اس طرح سب ہی اسے مراد سمجھتے رہیں گے۔“

وہ چند لمحوں تک سر جھکا کر سوچتا رہا پھر بولا۔ ”ہم زاد کے ساتھ جیسی جائے گی۔“

کے اکابرین سے کہے گا کہ تمہیں یہاں فوراً بھیج دیا جائے۔“

”پلیز! میری خاطر اس کے تابعدار بن جاؤ۔ میرے اندر یہ بات ساگنی ہے کہ زندگی کا بھر و سانس نہیں ہے۔ میں ایسے وقت تمہارے پاس رہنا چاہتی ہوں۔“

اس نے وعدہ کیا کہ ابھی مراد سے معاملات طے کرے گا، اس کے آگے جھک جائے گا پھر جینی کو ریاست آنے کی سہولتیں حاصل ہو جائیں گی۔

اس نے رابطہ ختم کر کے اس ملک کے اعلیٰ حاکم کو فون پر مخاطب کیا۔ اس نے کہا۔ ”آپ نے مجھے یاد فرمایا ہے شکر یہ... میرے لائق کوئی خدمت؟“

ہم زاو نے کہا۔ ”میرس میں ایک مشہور ماڈل جینی جوزف ہے جس پر ایک جن عاشق ہو گیا ہے۔“

”میں یورپائی نس! ہمیں معلوم ہے۔ وہ ماڈل جینی ہم سے رابطے میں رہتی ہے۔“

”میں نے اس کے عاشق کو تخریب کیا ہے۔ وہ میری قید میں ہے۔ وہ کجنت بہت ضدی ہے۔ میری اطاعت قبول نہیں کر رہا ہے۔ میں نے اسے زنجیریں پہنا دی ہیں۔ اپنے پراسرار علوم سے اس کے تادیبہ ہونے کی صلاحیت چھین لی ہے۔“

وہ بولا۔ ”بے شک آپ پراسرار علوم کے زبردست عامل بن گئے ہیں۔ میں جینی کو اطلاع دوں گا کہ وہ آپ کی قید میں ہے۔“

”میں چاہتا ہوں، آپ جینی کو میری ریاست میں بھیج دیں۔ اس کا عاشق میرے آگے اس شرط پر گھٹنے ٹیکنا چاہتا ہے کہ میں اس کی محبوبہ کو اس کے پاس پہنچا دوں۔ میں چاہتا ہوں جینی کو جلد از جلد اس کے حوالے کر دوں تاکہ وہ میرا غلام بن جائے۔“

”یہ کوئی پرابلم نہیں ہے، میں جینی سے بات کرتا ہوں۔ کل ہی اسے یہاں سے روانہ کر دیا گیا۔ ابھی اس سے باتیں کرنے کے بعد آپ کو کال کروں گا۔“

رابطہ ختم ہو گیا پھر اس نے ایک گھنٹے کے بعد کہا۔ ”یورپائی نس! ڈاکٹر کہتے ہیں پچھ دس بارہ دنوں میں جنم لے گا۔ ایسے وقت اسے طویل سفر نہیں کرنا چاہیے لیکن جینی اپنے محبوب کے پاس جانے کی ضد کر رہی ہے۔“

ہم زاو نے کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ بچہ اور زچہ کو کوئی نقصان پہنچے لیکن اس کا محبوب بھی میری قید میں جمل رہا ہے۔ اس سے طے کے لیے بے تاب ہے۔ میرا قاعدہ یہ ہے کہ وہ جلد سے جلد میرا غلام بن جائے گا۔ کیا جینی کو لیڈی ڈاکٹر اور سرجن وغیرہ کی ہم کے ساتھ خصوصی طیارے میں بھیج سکتے ہیں؟“

ہم زاو نے کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ بچہ اور زچہ کو کوئی نقصان پہنچے لیکن اس کا محبوب بھی میری قید میں جمل رہا ہے۔ اس سے طے کے لیے بے تاب ہے۔ میرا قاعدہ یہ ہے کہ وہ جلد سے جلد میرا غلام بن جائے گا۔ کیا جینی کو لیڈی ڈاکٹر اور سرجن وغیرہ کی ہم کے ساتھ خصوصی طیارے میں بھیج سکتے ہیں؟“

ہم زاو نے کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ بچہ اور زچہ کو کوئی نقصان پہنچے لیکن اس کا محبوب بھی میری قید میں جمل رہا ہے۔ اس سے طے کے لیے بے تاب ہے۔ میرا قاعدہ یہ ہے کہ وہ جلد سے جلد میرا غلام بن جائے گا۔ کیا جینی کو لیڈی ڈاکٹر اور سرجن وغیرہ کی ہم کے ساتھ خصوصی طیارے میں بھیج سکتے ہیں؟“

ہم زاو نے کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ بچہ اور زچہ کو کوئی نقصان پہنچے لیکن اس کا محبوب بھی میری قید میں جمل رہا ہے۔ اس سے طے کے لیے بے تاب ہے۔ میرا قاعدہ یہ ہے کہ وہ جلد سے جلد میرا غلام بن جائے گا۔ کیا جینی کو لیڈی ڈاکٹر اور سرجن وغیرہ کی ہم کے ساتھ خصوصی طیارے میں بھیج سکتے ہیں؟“

ٹریپ کرنے کی حماقت کریں گے؟“
 ”آپ دیکھتے آرہے ہیں۔ دشمن ہماری نقصانات اٹھانے کے باوجود دشمنی سے باز نہیں آتے ہیں۔ اس لیے میں احتیاطاً ایسی چال چل رہا ہوں۔“
 ”بے شک تم دانشمندی کا ثبوت دے رہے ہو۔“
 مراد نے اسے ماروی کی ہم شکل جیسی کے متعلق بتایا کہ وہ ایک اینٹارٹل دو شیزہ ہے۔ ہم زاواں سے قمرٹ کر رہا ہے۔ دشمن دھوکا کھائیں گے کہ مراد پھر کسی ماروی کا دیوانہ ہو گیا ہے۔ اسے بیرونی ممالک کے دورے پر بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”دشمن اپنی چالیں چلیں گے۔ میں اپنی چل رہا ہوں۔ یہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ انجام کیا ہوگا؟“
 محبوب نے کہا۔ ”مراد! یہ اچانک دوسری ماروی کہاں سے پیدا ہوگئی ہے؟ ایک تو ہم دونوں ہم شکل ہیں۔ اب ماروی کی بھی ہم شکل آگئی ہے۔ اتفاقاً یہ کیا ہو گیا کہ وہ سیدھی تمہاری ریاست پہنچی اور اس نے پہنچنے ہی تمہارے محل میں جگہ بنا لی۔ مجھے تو یہ کھلم کھلا ٹوٹکی لگ رہی ہے۔“

مراد نے کہا۔ ”میں فریب میں آنے والا نہیں ہوں۔ اسی لیے میں نے اس کا دیوانہ عاشق بننے سے گریز کیا ہے۔ جیسی اور اس کے ماں باپ ہم زاد کو مراد سمجھ رہے ہیں۔ وہ اس کے ساتھ پاکستان کا دورہ کرے گا تو تمام مخالفین بھی اسے شک و شبہ کے بغیر مراد سمجھ لیں گے۔ جیسی کو محل میں آئے ہوئے ابھی میں گھنٹے گزر رہے ہیں۔ محل کی تین کینز ہیں اور ایک خادم میرے جاسوس ہیں۔ اب تک ان کا بیان یہی ہے کہ وہ سچ سچ اینٹارٹل ہے۔ سفیر جیس ہارورڈ اور اس کے ملک کے اکابرین اس بنڈل لڑکی کے ذریعے اپنا ٹیم پلے کر رہے ہوں گے۔ پھر یہ کہ ہم زاد رنگین مزاج ضرور ہے لیکن اپنے فرائض کی ادائیگی میں محتاط اور حاضر دماغ رہتا ہے۔ ان کی سازشیں جلد ہی کھل کر سامنے آئیں گی۔“

”خدا کرے، سازشیں کرنے والے بے نقاب ہو جائیں۔ تم یہاں نہیں آؤ گے۔ میں فون کے ذریعے تمہیں یہاں کے حالات بتاتا رہوں گا۔ جیسی کو بھی دیکھوں گا اور اپنے طور پر اسے سمجھنے کی کوشش کروں گا۔“
 ماہ نور نے آکر کہا۔ ”اپنی مصروفیت ختم کریں۔ عصر کی اذان ہو رہی ہے۔“

مراد نے فون پر کہا۔ ”اچھا محبوب صاحب! ہم پھر کسی وقت باتیں کریں گے۔ اللہ حافظ۔“
 وہ فون بند کر کے نماز کے لیے اٹھ گیا۔

ماہ نور نے کہا۔ ”ہم زاواں سے اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ کیا اس کا ساتھ چانا مناسب ہوگا؟“
 وہ بولا۔ ”یہ سیاسی چال بازی ہے۔ کل رات سے اب تک تمام مخالفین کو یہ معلوم ہو چکا ہوگا کہ مراد علی منگلی ماروی کی ہم شکل جیسی کا عرف جیسی پر عاشق ہو گیا ہے۔ اس نے جیسی کو اپنے محل میں رکھا ہے۔ وہ اس کے ساتھ پاکستان جائے گی تو سب ہی کو پورا یقین ہو جائے گا کہ دیوانہ مراد اپنی دوسری ماروی سے دور نہیں رہتا ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔“

وہ سر ہلا کر بولی۔ ”واقعی اس طرح سب ہی کو یقین ہو جائے گا کہ آپ دوسری ماروی کے بھی دیوانے ہو گئے ہیں۔ اسے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔“

وہ مراد کے سینے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔ ”میں بہت خوش نصیب ہوں۔ آپ نے میری خاطر ماروی بن کر آنے والی کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اللہ آپ کو میری زندگی بھی عطا کرے۔“
 وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”اپنی دعاواں لیں لو۔ تمہاری زندگی ملے گی تو میں عورت بن جاؤں گا۔ ماہ نور کہلانے لگوں گا۔“
 وہ دونوں ہنسنے لگے۔ پھر مراد نے فون پر محبوب سے پوچھا۔ ”آپ خیریت سے ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”اوپر خدا ہے اور نیچے تم ہو۔ پھر خیریت کیسے نہیں ہوگی۔ یہاں کی پولیس اور انٹیلی جنس والے مجھ پر مہربان ہو گئے ہیں۔ آئی جی آف پولیس اور انفارمیشن سٹر نے مجھے فون پر کہا ہے کہ ان کا پورا ڈیپارٹمنٹ میری سکیورٹی کے لیے شب و روز الرٹ رہے گا۔ میں ان سے جیسی بھی سہولتیں حاصل کرنا چاہتا ہوں وہ مجھے فوراً ہی حاصل ہوتی رہیں گی۔“

مراد ہنستے ہوئے بولا۔ ”مراد علی منگلی کا ڈنڈا سروں پر بچ رہا ہے۔ میں آج سے چار دنوں کے بعد وہاں آنے والا ہوں۔ آپ دیکھیں گے کہ جسے قاتل اور مفروضہ مجرم کہا جاتا تھا اور جس کے لیے میرے وطن کی زمین تنگ کر دی گئی تھی، اسی مجرم کا وہاں شاہانہ انداز میں استقبال کیا جائے گا۔“

”واقعی مراد! تم نے ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے۔ ایک عام سا پاکستانی ایک ریاست کا حکمران بن کر آ رہا ہے۔ پورا پاکستان تم پر فخر کرے گا اور میں تم پر کتنا فخر کرتا ہوں یہ میرا خدا جانتا ہے۔“

”ایک نماز کی بات کہہ رہا ہوں۔ یہ صرف آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ میں نہیں آ رہا ہوں۔ ہم زاد آنے والا ہے۔“
 ”خدا جانتا ہے...! کیا تمہیں اندیشہ ہے کہ دشمن پھر تمہیں

کہہ رہی تھی۔ ”دروازہ نہیں کھلتا ہے۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔
مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ دروازہ کھولو۔“

دروازہ کھلا تو وہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ مراد کو سوالیہ
نظروں سے دیکھنے لگی۔ یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ
کون ہے؟ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ غلاب کا
پھول شبنم میں نہا رہا تھا۔ رونے والی کا حسن و آئینہ ہو گیا
تھا۔ ہم زاد نے اس کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”یا کرو۔
میں یہاں کا بادشاہ ہوں۔ تم میرے محل میں رہنے آئی ہو۔ تم
نے کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھا یا تھا۔“

وہ یاد کرنے کے انداز میں ٹھہر ٹھہر کر سر ہلانے لگی۔
اسے کچھ کچھ یاد آ رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھتے
ہوئے پوچھا۔ ”میں اس کمرے میں کیسے آئی تھی؟“

وہ کنیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”تم
ان کے ساتھ آنکھ پھولی کھیل رہی تھیں۔ یہاں چھپنے کے لیے
آئی تھیں۔ تم تو بہت سمجھدار ہو، یا کرو۔“

وہ پھر اشبات میں سر ہلانے لگی۔ ہم زاد نے کنیزوں
اور ملازموں کو وہاں سے جانے کا حکم دیا۔ پھر ان کے جاتے
ہی دل بے ایمان ہونے لگا۔ اس کے دونوں ہاتھ جھبھی کے
شانوں پر تھے۔ بدن سے آٹھ آ رہی تھی۔ وہ اس کے آنسو
پونچھنے کے بہانے ملائم چہرے پر انگلیاں پھیرتے ہوئے
بولا۔ ”کچھ یاد آ رہا ہے؟“

وہ اسے بڑے اعتماد سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہاں
بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ تم بادشاہ سلامت ہو۔ تم نے
میرا یہ ہاتھ پکڑا تھا۔ پھر ایک بار پکڑو۔“

اس نے بڑی مصومیت سے اپنا دایاں ہاتھ اس کی
طرف بڑھایا۔ وہ بہت ہی بھولے پن سے ہم زاد کو چھونے
اور پکڑنے کا حوصلہ دے رہی تھی۔ اس نے ہاتھ تمام کر تجب
سے پوچھا۔ ”میں نے کب تمہارا ہاتھ پکڑا تھا؟“

”وہ جب میں یہاں آئی تھی تو تم نے مصافحہ کیا تھا۔
مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ جب میں رات کو سونے لگی تو ایسا لگا
کہ تم میرا ہاتھ پکڑے ہوئے ہو۔ ابھی تمہیں پہچاننے کی
کوشش کر رہی تھی تو یاد آیا کہ تم نے ہی میرا ہاتھ پکڑا تھا۔ اسی
لیے جلدی پہچان گئی۔“

”ابھی میں نے تمہارا ہاتھ پکڑا ہے۔ کیسا لگ رہا ہے؟“
”بہت اچھا لگ رہا ہے۔ تم میرے آنسو پونچھ رہے
تھے تو میں تمہاری انگلیوں اور ہاتھوں کے بیچ آ گئی تھی۔ میں
نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے
کیا ہو رہا ہے؟ پلیز بولو نا۔ مجھے کیا ہونے لگا ہے؟“

ہم زاد پورے محل میں جیسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے
جیسی کی خاص کنیزوں کو بلا کر پوچھا۔ ”جیسی کہاں ہے؟“
ایک کنیز نے کہا۔ ”وہ آنکھ پھولی کھیلنے کی ضد کر رہی
تھیں۔ ہم نے کہا کہ وہ کہیں جا کر چھپ جائیں۔ ہم انہیں
تلاش کریں گے۔“

دوسری کنیز نے کہا۔ ”چتا نہیں، وہ کہاں جا کر چھپ
گئی ہیں۔ ہم محل کے کئی حصوں میں دیکھ چکے ہیں۔“
ہم زاد نے کہا۔ ”اسے ڈھونڈو۔ گارڈز اسے محل سے
باہر نہیں جانے دیں گے۔ وہ اندر ہی کہیں ہوگی۔“

وہ خود اسے ڈھونڈنے لگا۔ اس محل میں تقریباً سو
چھوٹے بڑے کمرے ڈرائنگ روم اسٹڈی روم میٹنگ ہال
اور اتنے ہی اسٹور روم تھے۔ کئی بیچ در بیچ راہداریاں
تھیں۔ وہاں رہنے والوں کو ہی یاد رہتا تھا کہ وہ محل کے کس
حصے میں ہیں اور انہیں کہاں سے گزر کر اپنے مطلوبہ مقام تک
پہنچنا ہے اور جیسی کے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ اس کی یادداشت
کمزور تھی۔ وہ ایک کمرے میں جا کر چھپ گئی تھی۔ اس نے
دروازے کو اندر سے بند کر کے دیکھا۔ وہ ایک بہت بڑا کمرہ
تھا۔ دراصل وہ مراد کا وہ پرائیویٹ روم تھا جہاں وہ بیٹھ کر
اسکا پ کے ذریعے پھر پورا دران کے اتحادیوں سے گفتگو
کیا کرتا تھا۔ اس کی انتہائی خفیہ فائلیں اور ریاست کے تمام
حساس اداروں کے اہم ریکارڈز وہاں رکھے ہوئے تھے۔

وہ اس کمرے میں بند ہو کر کمپیوٹر کے پاس آ کر
چاروں طرف بول دیکھنے لگی جیسے وہاں کی ہر چیز اس کے
لیے تھی ہو اور وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ سب کیا ہے؟ چند لمحوں
کے بعد ہی بھول گئی کہ وہ پہلے کہاں تھی اب کہاں ہے؟

ہم زاد اور کنیزوں کے ذہنوں میں یہ بات تھی کہ وہ مراد
کے کافیڈنشل روم کی طرف نہیں جائے گی۔ ایک ملازم نے
دوڑتے ہوئے آ کر ہم زاد کے سامنے تنظیم سے جھک کر کہا۔
”عالی جاہ! وہ حضور کے اسٹڈی روم میں بند ہو گئی ہیں۔ اندر
سے دروازہ پیٹ رہی ہیں۔ میں نے وہاں جا کر دروازے کو
باہر سے کھولنے کی کوشش کی۔ وہ مقفل ہو گیا ہے۔“

مراد کے اس کمرے کی ایک چابی ہم زاد کے پاس
تھی۔ اس کا لاک ایسا تھا کہ کوئی چوری چھپے وہاں جاتا تو
دروازہ از خود مقفل ہو جاتا تھا۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں
قیدی بنی رہی۔ ہم زاد دوڑتا ہوا آیا تو اندر سے اس کے
رونے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس نے فوراً ہی چابی سے
دروازے کو کھولا۔ وہ فرش پر دوڑا نو ہو کر بیٹھی تھی اور رو رو کر

ایک شہیہ کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔

ہم زاد نے پوچھا۔ ”کیوں رو رہی ہو؟“

وہ سسکتے ہوئے بولی۔ ”معلوم نہیں۔ مجھے رونے دو۔“

ہم زاد نے پہلی بار اپنی ہوس پرستی پر ندامت محسوس کی۔ وہ جوان تھی لیکن اس کے اندر ایک ایسی مصوم بچی تھی جس کی مصومیت اور پاکیزگی کو شخص پہنچانا مناسب نہیں تھا۔

دوسرے پہلو سے یہ حقیقت تھی کہ دنیا کی ہر بچی جوان ہو کر جوانی کے تقاضے پورے کرتی ہے۔ جیسی کی عمر کا بھی یہی تقاضا تھا۔ اسی لیے ہم زاد کی قربت سے بھٹک رہی تھی۔ اس کا بچکانہ ذہن سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ اپنے بادشاہ سلامت سے کیا چاہتی ہے؟

ہم زاد نے بڑی سنجیدگی سے فیصلہ کیا کہ اسے محض عیاشی کا کھلونا نہیں سمجھے گا۔ وہ کالج سے بھی زیادہ نازک ہے۔ اسے کبھی ٹوٹنے نہیں دے گا۔ اسے دل کی تجوری میں بڑی حفاظت سے رکھے گا۔ اسے بھٹکنے کے لیے کسی تنہا نہیں چھوڑے گا۔

فون سے کالنگ ٹون ابھرنے لگی۔ ہم زاد نے فون دبا کر اسے کان سے لگایا۔ مزاد کی آواز سنائی دی۔ ”جہاں بھی ہو، ابھی یہاں آ جاؤ۔ میں محل کے اس حصے میں ہوں جہاں تمہاری جینی کے لیے ایک مینی اسپتال قائم کیا جا رہا ہے۔“

اس نے کہا۔ ”ابھی آ رہا ہوں۔“

جیسی نے پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟ میں بھی چلوں گی۔“ اس نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اپنے ہم شکل کے پاس تھوڑی دیر کے لیے جا رہا ہوں۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ میں ابھی آ جاؤں گا۔“

وہ دروازہ کھول کر اس کے ساتھ باہر آیا تو وہ اس سے لگی ہوئی تھی۔ اسے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ ہم زاد نے کینیزوں کو حکم دیا۔ ”جیسی کو اس کے کمرے میں لے جاؤ۔ اس کا خیال رکھو۔ یہ اپنے کمرے سے باہر جائے گی تو پھر پورے محل میں بھٹکتی رہے گی۔“

وہ جیسی کو چھپک کر بولا۔ ”ان کے ساتھ جاؤ۔ میں ویر نہیں کروں گا۔ جلدی آ جاؤں گا۔“

وہ چلی گئی۔ ہم زاد محل کے اس حصے میں آیا جہاں تین کمروں کو اسپتال بنا دیا گیا تھا۔ ایک کمرے کو لیبر روم اور آپریشن تھیٹر بنا دیا گیا تھا۔ وہاں نرسیں اور دارو ڈپو آگے تھے۔ دوسرے دن جینی کے وہاں پہنچنے سے پہلے ریاست

وہ نہ تو دل بھانے والی ادائیں دکھا رہی تھی اور نہ ہی اپنے حسن و شباب کا چار اڈال رہی تھی۔ وہ اپنی مصومیت سے اسے لوٹ رہی تھی۔

وہ اسے آغوش میں سمیٹ کر بولا۔ ”تم خود ہی سمجھو کہ تمہیں کیا ہونے لگتا ہے۔“

وہ شہیہ کی چیز بن گئی۔ یہ نہیں جانتی تھی کہ کوئی صیاد کیسے جال پھینکتا ہے۔ اس کی مام سمجھایا کرتی تھی۔ ”بیٹی! مردوں سے دور رہنا۔ کبھی کسی کو چھونے اور پکڑنے نہ دینا۔ تمہاری دعاغی کمزوری اور مصومیت نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔ میں جو سمجھاتی ہوں وہ تمہیں یاد نہیں رہتا ہے۔“

اس کے باپ جیمس ہارورڈ نے کہا تھا۔ ”بس ایک ہی راستہ ہے۔ ہم دن رات اسے اپنی نظروں میں رکھیں۔ ہمارا ایک ہی مشن ہے، اسے مراد علی منگی تک پہنچانا۔ تب تک ہم اسے کسی کے ہاتھ نہیں لگنے دیں گے۔“

ان لمحات میں اس چیز یا کو یا آیا۔ اس نے کہا۔ ”مام کہتی تھیں کسی مرد کے قریب نہ جانا۔ یہ بات میں بھول گئی تھی! ابھی تم اپنے بدن سے لگا رہے ہو تو یا آ رہا ہے۔ مجھے بتاؤ مام کیوں منع کرتی تھیں؟ کیا یہ اچھی بات نہیں ہے؟ لیکن مجھے تو اچھا لگ رہا ہے۔“

اس نے سمجھایا۔ ”ایک جوان لڑکی کو کسی ایک لائف پارٹنر کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ کیا تم یاد رکھو گی کہ میں تمہارا لائف پارٹنر ہوں اور تم اسی طرح میری آغوش میں آ جا یا کرو گی؟“

وہ عیسائی تھی۔ اس کے گلے میں سونے کی ایک چینن کے ساتھ ایک صلیب تھا۔ اس نے ہم زاد سے الگ ہو کر اس صلیب کو تھام کر کہا۔ ”مجھے یاد آ گیا ہے۔ مام نے کہا تھا۔ گاڈ سے مدد مانگنا ہو تو اسے دونوں ہاتھوں سے تھام کر پورے اعتماد سے چومو۔ پھر جو مانگنا چاہو مانگو۔ گاڈ تمہاری ہر خواہش پوری کرے گا۔ تم مجھے چھو رہے ہو۔ پکڑ رہے ہو تو بہت سی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ پلیز انتظار کرو۔ میں گاڈ سے تمہیں مانگ رہی ہوں۔“

وہ صلیب کو چوم کر اسے سینے سے لگا کر جیسی آواز میں بولنے لگی۔ ”میرے خدا۔۔۔ اچھ پر رحم فرما۔ مجھے عقل دے۔ مجھے اتنا سا حافظہ دے کہ مجھے سینے سے لگانے والے بادشاہ سلامت کو ہمیشہ یاد رکھوں۔ یہ مجھے اچھا لگتا ہے۔ میں اس کے سینے سے لگنے والی بات یاد رکھوں گی تو پھر اسے کبھی نہیں بھولوں گی۔ اے خدا۔۔۔ امیری مدد فرما۔ آمین۔“

وہ دعا ختم کرتے ہی اس کے سینے سے آ کر لگ گئی پھر

کے ماہر ڈاکٹر اور سرجن آنے والے تھے۔ ان کے علاوہ جینی کے ساتھ بھی اس ملک کی معروف لیڈی ڈاکٹر اور سرجن آنے والے تھے۔

مراد اور ہم زاد وہاں کے اختیارات سے مطمئن ہو کر دوسرے کمرے میں آگئے۔ مراد نے کہا۔ ”میں نے سنا ہے جیسیکا میرے کانفیڈنشل روم میں گئی تھی اور وہاں ایک گھنٹے تک رہی تھی۔ دروازے کو اندر سے بند کر لیا تھا؟“

ہم زاد نے کہا۔ ”تم تو جانتے ہو۔ اس کمرے کا دروازہ خود بخود لاک ہو جاتا ہے۔ وہ وہاں قید ہو کر رہ گئی تھی۔“

اس نے سختی سے کہا۔ ”وہ کھیل تماشے کرنے نہیں گئی تھی۔ جان بوجھ کر لاکڈ ہو گئی تھی۔ کیا تم اندازہ کر سکتے ہو کہ ان نے ایک گھنٹے میں کمپیوٹر کے ذریعے ہمارے کتنے خفیہ معاملات کے کوڈز معلوم کیے ہوں گے اور کتنی اہم فائلیں پڑھ چکی ہوگی؟“

ہم زاد نے کہا۔ ”وہ سچ سچ ذہنی مریضہ ہے۔ اس پر شبہ نہ کرو۔ اس کمپیوٹر کو اپن کرنے کے پاس ورڈ صرف ہم دونوں جانتے ہیں۔ کوئی تیسرا نہ جانتا ہے نہ جان سکے گا۔ پلیز اس پر شبہ نہ کرو۔ میں اسے اچھی طرح دیکھا اور پرکھتا رہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے میں تم پر بھروسہ کر رہا ہوں۔ خدا کرے جیسیکا معصوم اور بے ضرر ہو۔“

دوسری طرف سپر یادر اور اس کے اتھاوی اسکواپ کے ذریعے بول رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ ”جیسیکا کے محل میں کتنے ہی ہمیں پہلی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ جیسیکا دو مراد میں جس سے بھی بولتی ہے، اس کی ریکارڈنگ ہمارے پاس پہنچ جاتی ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”ریکارڈنگ روم میں ہمارے جاسوس ون رات اس مشین کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ انہوں نے ابھی ایک آڈیو کیسٹ میرے پاس پہنچایا ہے۔ اسے آپ حضرات سنیں۔“

اس نے ایک ریکارڈر کو آن کیا۔ چہ لچوں کے بعد جیسیکا کی آواز سنائی دی۔ وہ دروازہ پیٹ رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ”دروازہ کھولو۔ یہ بند ہو گیا ہے۔ مجھ سے ٹکس کھل رہا ہے۔ پلیز ہیلپ می۔ کم اور ریئر۔ فارگاسیک اوپن اٹ۔۔۔“

دو تھے دو تھے سے دروازہ پھٹنے کی اور اس کے چہنچہ چلائے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر وہ رونے لگی۔ رونے رونے سے کہنے لگی۔ ”اوگاؤ! میں کہاں ہوں؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ کیا یہاں کوئی دروازہ کھولنے والا نہیں ہے؟“

پھر ایک ملازم کی آواز سنائی دی۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ ”بی بی! کیا آپ کے پاس دروازے کی چابی نہیں ہے۔“

وہ روتے اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔ ”نہیں ہے۔ چابی نہیں ہے۔ تم کون ہو؟ مجھے یہاں سے نکالو۔“

”آپ نہ روئیں بی بی جی! میں ابھی حضور اعلیٰ کو خبر دیتا ہوں۔ وہ ابھی آ جائیں گے۔“

پھر دروازے کے دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ صرف جیسیکا کے رونے اور سسکتے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ایک ملک کے حاکم نے پوچھا۔ ”یہ کبھی لڑکی کہاں جا کر پھنس گئی ہے؟ وہ آٹومیک لاکڈ ہو جانے والا دروازہ ہوگا۔ کسی خاص کمرے کے دروازے ہی ایسے ہوا کرتے ہیں۔“

دوسرے نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے، وہ محل کے کسی کانفیڈنشل کمرے میں جا کر پھنس گئی ہے۔“

ایک ملک کے حاکم نے کہا۔ ”جیسیکا نے کچھ راز کی باتیں معلوم کی ہوں گی۔“

سپر یادر کے اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”فار پور انفارمیشن وہ نہیں جانتی کہ راز کیا ہوتا ہے اور جاسوسی کیسے کی جاتی ہے۔ وہ دماغی طور پر بہت کمزور ہے۔ حافظہ تو نہ ہونے کے برابر ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی ہے کہ اس کے گلے سے جو صلیب لٹک رہا ہے اس کے اندر موبائل فون کی ایک سم رکھی ہوئی ہے۔ وہ صلیب دراصل ایک فون ہے۔ اس کی پیٹری بہت یاد رکھیں ہے۔ جو ہمیں گھنٹے آن رہنے کے باوجود کبھی ڈاؤن نہیں ہوگی۔ ہم وہاں ہونے والی تمام اہم اور غیر اہم باتیں سننے رہیں گے۔“

ایک نے کہا۔ ”صرف باتیں سننے سے کیا حاصل ہوگا؟“

”بہت کچھ حاصل ہوگا۔ ہمیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا کہ ان دو میں سے کون اصلی مراد علی متکی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ آج سے چار دنوں کے بعد پاکستان کے دورے پر مراد جا رہا ہے یا ڈی مراد جانے والا ہے۔“

وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ ریکارڈر سے مراد کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر جیسیکا کے پاس آ گیا تھا۔ وہ اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ مراد کہہ رہا تھا۔ ”یاد کرو۔ میں یہاں کا بادشاہ ہوں۔ تم میرے محل میں رہنے آئی ہو۔ تم نے کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھایا تھا۔“

مراد اور جیسیکا کی باتوں سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کینزوں کے ساتھ آنکھ بھولی کھیلتے ہوئے اس کمرے میں چہنچہ کے لیے آئی تھی۔ اب مراد کے سامنے رفتہ رفتہ اسے پہچان رہی تھی۔ وہاں تمام سننے والے اکابرین کو معلوم ہو رہا

تھا کہ وہ نوخیز دو شیزہ اپنی عمر کے فطری تقاضوں کے مطابق مراد سے متاثر ہو گئی ہے اور اسے بڑی مصومیت سے طلب کر رہی ہے۔ پھر وہ صلیب کو ہاتھوں میں لے کر اسے چوم کر دعا میں مانگ رہی تھی۔

ایک حاکم نے کہا۔ ”یہ لڑکی عقل سے محروم ہے لیکن مراد کی آغوش میں جا کر اپنی مام کی گزری ہوئی باتیں یاد کر رہی ہے۔ اسے مجزہ کہنا چاہیے۔ یہ کچھ عقل کی باتیں کر رہی ہے۔ ایک نارمل لڑکی کی طرح گاڈ سے مراد کو طلب کر رہی ہے۔“

وہ یونے والا چپ ہو گیا۔ اس وقت مراد فون اٹینڈ کر رہا تھا۔ پھر اس نے جواباً کہا۔ ”ابھی آ رہا ہوں۔“ جیسی نے پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟ میں بھی چلوں گی۔“ مراد کی آواز سنائی دی۔ وہ اسے ولا سا دینے کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ”میں اپنے ہم شکل کے پاس تھوڑی دیر کے لیے جا رہا ہوں۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ میں ابھی آ جاؤں گا۔“

تمام ملکوں کے اکابرین یہ سن کر بے چین ہو گئے کہ وہ دوسرے مراد سے ملنے جا رہا ہے۔ پھر جلد ہی انہیں مایوسی ہوئی کیونکہ جیسی اپنے بیڈروم میں چلی گئی تھی۔ خبریں پہنچانے والی صلیب بھی اس کے ساتھ چلی گئی تھی۔ انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ دو مراد کہاں ملاقات کر رہے ہیں اور کن معاملات پر باتیں کر رہے ہیں۔ اکابرین میں سے ایک نے جھنجھلا کر کہا۔ ”یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ جب اہم باتیں معلوم ہونے والی ہیں تو جیسی کو دور کر دیا گیا ہے۔“

اعلیٰ حاکم نے کہا۔ ”ہمیں صبر سے انتظار کرنا چاہیے۔ ابھی رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے۔ آئندہ بھی کسی رکاوٹ کے بغیر معلومات حاصل ہوتی رہیں گی۔“

دوسرے حاکم نے کہا۔ ”اتنا تو معلوم ہو گیا ہے کہ جیسیکا سے جو پیار کر رہا ہے، وہی ماروی کا دیوانہ مراد علی منگلی ہے اور وہ مراد اپنی نئی ماروی کو اپنے ہم شکل کی آغوش میں جانے نہیں دے گا۔“

”ہاں۔ اصل مراد کی نشاندہی ہو رہی ہے۔ پھر بھی ہماری طرف سے انتہائی کارردائی نہیں ہوگی۔ ہم ایک ہی مدت تک ٹھہرنے کی باتیں نہیں کریں گے۔ دونوں مراد کو مختلف حالات میں مختلف واقعات میں پرکھتے رہیں گے۔ اس دوران دوستی اور محبت کی سیاست کرتے رہیں گے۔ اگر ہماری سیاسی دوستی سے باہمی تعلقات بہتر ہوتے جائیں تو

ہم دوستی بحال رکھیں گے۔ دشمنی بھول جائیں گے۔“ پھر وہ جینی کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ایک اعلیٰ عہدیدار نے کہا۔ ”مراد مسٹران سین (ہم زاد) کی محبوبہ سے اچانک ہی دلچسپی لینے لگا ہے۔ اس ماں بیٹے والی ماڈل کو اپنی ریاست میں بلا رہا ہے۔ سوچنے کی بات ہے۔ میری سمجھ میں آ رہا ہے کہ اس ماڈل جینی کے پیچھے گہری رازداری ہے۔ مراد کسی خاص مقصد کے لیے اسے اپنے قریب بلا رہا ہے۔“

”مقصد یہ ہے کہ جینی کا عاشق جن اسی وقت مراد کی تابعداری قبول کرے گا، جب اس کی محبوبہ کو اس عاشق کے پاس ریاست میں پہنچایا جائے گا۔“ ”کیا وہ عاشق جن مسٹران سین اس ریاست میں رہتا ہے؟“

”مراد نے اسے وہاں قیدی بنا کر رکھا ہے۔“ آری کے ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ ”ہمارا ذہن ایسی باتوں کو تسلیم نہیں کر رہا ہے۔ یہ قصے کہانیوں والی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔“

حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ”پہلے ہم بھی تسلیم نہیں کرتے تھے لیکن ہماری آری کے سیکڑوں سپاہی مارے گئے۔ ہمارے جہاز، ہیلی کاپٹر اور اسلحے کے گودام بم دھماکوں سے اڑ گئے۔ ہم نے دو ہی دنوں میں کروڑوں ڈالرز کا نقصان اٹھایا ہے۔ ایک تہا مراد ہمیں اتنی بڑی تباہی سے دوچار نہیں کر سکتا تھا۔ پھر ہم نے مسٹران سین کو اپنے اعلیٰ عہدیداروں کے درمیان موجود پایا تھا۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن ہم سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ اپنی حرکتوں سے یہ ثابت کرتا رہا ہے کہ ہماری دنیا میں جنات کا وجود ہے اور یہ قصے کہانیوں والی باتیں نہیں ہیں۔ نئی سو بات کی ایک بات کہہ چکا ہوں۔ ہم ایک لمبی مدت تک مراد کے خلاف نہ سوچیں گے، نہ مخالفت میں کوئی قدم اٹھائیں گے۔ ایجنٹارل جیسیکا کے اور دیگر سراغ رسالوں کے ذریعے جو جاسوسی کر سکتے ہیں اور اہم خفیہ معلومات حاصل کر سکتے ہیں، وہ چپ چاپ رازداری سے کرتے رہیں گے۔“

ان سب کے موجودہ فیصلے کے مطابق آئندہ مراد سے نہ جنگ ہونے والی تھی، نہ کسی طرح کی محاذ آرائی کی نوبت آنے والی تھی۔ دشمنوں کو عقل آگئی تھی۔ فی الحال جیسے کا تپ تقدیر نے آرام و سکون اور امن و امان لکھ دیا تھا۔

لیکن دنیا ایک تماشہ گاہ ہے۔ تماشے نہ ہوں تو دنیا و لچپیوں سے خالی ہو جائے گی۔ لہذا ایک سمت سے ہنگامے رکھتے ہیں تو دوسری سمت سے شروع ہو جاتے ہیں۔ ریاست

ناکام رہتی ہیں اسی لیے وہ خوب بھتی ہیں۔ وہ دس مجرم بھی بے لگام ہو گئے تھے۔

وہ اعلان کر رہے تھے۔ ”مراد ایک ہی شرط پر زندہ سلامت رہ کر لمبی عمر گزار سکتا ہے۔ وہ ایک ناقابل شکست اور طاقتور مجرم تھا۔ وہ مجرم اب بھی اس کے اندر ہے۔ اسے ہم نیک مشورہ دیتے ہیں کہ وہ دنیا کے تمام مجرموں کا سرپرست بن جائے۔ اپنی ریاست کو ہم سب کی محفوظ پناہ گاہ بنا دے۔ تمام مفرور اور روپوش رہنے والے مجرم اس کی ریاست میں آباد ہوں گے اور کسی اندیشے کے بغیر وہاں آزادی سے زندگی گزاریں گے۔ ریاست اس کے بس کی بات نہیں ہے۔ وہ مجرم ہے، مجرم ہی رہے گا۔ اس کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ راضی خوشی تمام مجرموں کا سرپرست بن کر جرائم کی دنیا کا شہنشاہ کہلائے۔ اگر وہ ہماری یہ شرط تسلیم نہیں کرے گا۔ ہمارے نیک مشوروں پر عمل نہیں کرے گا تو ہم رفتہ رفتہ گوریلا جنگ لڑتے ہوئے اس کے محل میں گھس آئیں گے۔ اسے پھانسی پر لٹکا کر وہاں کے حکمران بن جائیں گے۔ مراد نے ایک ریاست کا حکمران بن کر ہمیں یہ سمجھا دیا ہے کہ ہم مجرم بھی اپنی ایک حکومت قائم کر سکتے ہیں اور اپنی مملکت میں اپنے مجرم بھائیوں کو پناہ دے سکتے ہیں اور ہم جلد ہی ایسا کرنے والے ہیں۔“

ہم زائد نے ٹی وی کی آواز کم کرتے ہوئے کہا۔ ”مراد...! ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہمارے خلاف مجرموں کا یہ نیا محاذ کھل جائے گا۔ تم کیا سوچ رہے ہو؟“

وہ بولا۔ ”ان کم بختوں نے ایک نئی اور چولکا دینے والی بات کی ہے کہ دنیا کے تمام مجرموں کا ایک الگ ملک اور الگ حکومت ہونی چاہیے۔ یہ ایسی بات ہے کہ دنیا کی تمام انڈر ورلڈ مافیا اور سنڈیکیٹ ان کا ساتھ دیں گی۔ تمام مجرموں کی یہ دلی خواہش ہوگی کہ وہ مفرور نہ کہلائیں۔ روپوش نہ رہیں۔ آزادی سے گھومنے پھرنے کے لیے ان کا ایک ملک اور ان کی اپنی حکومت ہو۔ وہ موت کی سزا پانے والے دس مجرم جو یہاں سے گئے تھے، بڑا زبردست ٹیم کھیل رہے ہیں۔ انہیں تمام انڈر ورلڈ کے چھٹے ہوئے مجرموں کی سرپرستی حاصل ہوگئی ہے۔“

وہ دونوں تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو گئے۔ ایسے وقت کہا جاسکتا ہے کہ دشمنوں نے بولتی بند کر دی تھی۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گورڈین ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

میں سزائے موت اور عمر قید کی سزا پانے والے دس مجرموں نے مراد کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی۔ ان کی پشت پر مجرموں کی سب سے خطرناک اور طاقت ور تنظیم ریڈ ارٹ تھی۔ باقی دوسری کرمٹل تنظیمیں بھی ریڈ ارٹ کے سربراہ جنکی براؤن کے ساتھ ہو گئی تھیں۔

ان دس مجرموں نے کئی اخبارات اور ٹی وی چینلز کے ذریعے مراد کو مخاطب کیا اور کہا۔ ”ہمیں سزائے موت کا حکم سنانے والے اب تمہاری موت لازمی ہوگئی ہے۔ تم نے سوچا تھا کہ ہمیں ریاست سے باہر دوسرے ملکوں میں پہنچاؤ گے تو ہم بد نصیبوں کو کوئی ملک پناہ نہیں دے گا۔ ہم ان ملکوں میں مارے جائیں گے یا پھر سزائے موت پانے کے لیے ریاست واپس آئیں گے۔ تم یہ بھول گئے تھے کہ ہمیں کسی ملک میں پناہ ملے یا نہ ملے، جرائم کی دنیا میں ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور یہی ہو رہا ہے۔ ہمیں سلامتی مل گئی ہے۔ خفیہ پناہ گاہیں اور بے حساب اسلحہ مل گیا ہے۔ مختلف ملکوں میں ہمارے اکاؤنٹس کھل گئے ہیں۔ درجنوں تنظیموں نے بڑی فراخ دلی سے ہمارے اکاؤنٹس میں لاکھوں ڈالر پہنچا دیے ہیں۔ اب ہم تمہاری طرف سے مستوجب کیے ہوئے دس مجرم نہیں ہیں۔ ہم دس ہزار ہو گئے ہیں۔ تمہاری زندگی حرام کر دیں گے۔ ابھی یہ لکھ لو کہ جب تک ریاست کے اندر ہو سلامت ہو۔ تم اور تمہارا وہ نوٹنگی... ہم شکل مراد جب بھی اپنی سرحد سے باہر آئے گا مارا جائے گا۔ اگر کسی ملک کا دورہ کرنے والے ہو تو زندہ رہنے کے لیے اسے منسوخ کر دو۔ اگر کبھی حالات سے مجبور ہو کر ریاست کو چھوڑنا پڑا تو ہم تمہیں کسی ملک میں سیاسی پناہ لینے نہیں دیں گے۔ تمہارا جینا مشکل کر کے موت کو آسان بنا دیں گے۔ ابھی یہ ابتدا ہے۔ دو چار ماہ کے بعد ہمارے جاسوس اور سیکڑوں شوٹرز تمہاری ریاست میں گھس آئیں گے۔ تمہاری آرمی سے گوریلا جنگ لڑیں گے اور تم دیکھو گے کہ ہمارے پاس اسلحہ اور کرنسی کی کمی نہیں ہوگی۔ جب تک تم زندہ رہو گے۔ جب تک ہم سانس لیتے رہیں گے۔ وہ گوریلا جنگ جاری رہے گی۔ سمجھ لو کہ تمہاری ریاست کے عوام کا بھی امن و سکون غارت ہونے والا ہے۔“

مراد اور ہم زائد سن رہے تھے۔ وہ دس مجرم بے یار و مددگار نہیں تھے۔ ان کے پاس اسلحہ کرنسی اور خفیہ پناہ گاہیں تھیں۔ ان کی پشت پناہی کرنے والی کرمٹل تنظیمیں تھیں ان دونوں بولتی بند کر دی تھیں۔ کسی بھی ملک کی پولیس اسکی چھن اور آزادی انڈر گراؤنڈ تنظیموں کو لگام دینے میں



دام

علی اختر

مفاد پرستی کی عادت نہ تو ذات پات دیکھتی ہے اور نہ ہی اونچ نیچ کا خیال کرتی ہے۔ نہ اپنا مقام دیکھتی ہے، نہ رشتوں کا احساس کرتی ہے۔ بس یہ ایک خوب صورت جال ہے جو اپنے مطلوب کے گرد گھبرا تنگ کرتا... اور مخالفین کی جھانپتی کرتا رہتا ہے... کچھ یہی انداز اس جوڑے کا تھا جو کچھ کی نظروں میں انتہائی بے جوڑ تھا لیکن وہ آپس میں اسی طرح جڑے رہے جیسے ایک کے بغیر دوسرا ادھورا ہے... مگر... کوئی نہیں جانتا تھا کہ کون کس کے دام میں الجھا اور کس نے جال پھیلا یا۔

پولیس کو دیے گئے ابتدائی بیان میں اس کی موت کی وجہ خود کشی لکھوائی گئی تھی۔ سیزھیوں اور کمرے کے درمیان کوریڈور میں ابھی تک بار برا گلاہسی کی لاش اوندھے منہ بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کی دونوں بائیس اطراف میں پھیلی ہوئی تھیں جن میں سے ایک بازو کے ہاتھ کے قریب پسل پڑا ہوا تھا اور اس کی کپڑی سے نکلی ہوئی خون کی پتی سی دھار بہہ کر زمین تک آ گئی تھی۔ اس وقت اس چھوٹے سے گھر میں صرف دو افراد اس لاش کے نزدیک

READING
Section

نہیں لے سکی ہے۔ رات اس کی طبیعت بے حد خراب تھی۔ ہم تینوں قریبی ڈاکٹر کے پاس بھی گئے تھے جہاں سے بار بار کا علاج چل رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسے کوئی بیماری لاحق ہے۔ یہ ظاہر وہ ٹھیک ٹھاک نظر آتی تھی لیکن اندری اندر اسے کوئی ڈپریشن یا شدید نفسیاتی مرض لاحق تھا۔ جس کی وجہ سے وہ بات بات پر اونچی آواز میں رونے لگتی تھی اور ہر وقت انتہائی غصے میں رہتی تھی۔ کھانا پینا بھی اس نے بہت کم کر رکھا تھا۔ آج صبح جب میں واش روم میں تھا تو میں نے گھر میں موجود سنگار میز کی دراز کھلنے کی آواز سنی اور پھر اس کے اٹھتے ہوئے تیز قدموں کی چاپ بچھے سنائی دی۔ اس کے بعد اچانک ہی مجھے فائر کی آواز سنائی دی۔ میں فوراً واش روم سے نکلا تو یہ بھی باہر کھڑی تھیں۔ ہم دونوں بھاگتے ہوئے کوریڈور میں آئے۔ تو اس وقت تک بار بار دم توڑ چکی تھی۔ اس نے خود کو پٹی پر گولی مار کر خود کشی کر لی تھی۔“

انسپکٹر نے جان اشکرافٹ کا ابتدائی بیان لکھا۔ اتنی دیر تک اس کا ماتحت وقوعہ کا نقشہ بنا چکا تھا۔ جب انسپکٹر اپنی نشست سے اٹھا۔ اس نے جیب سے رومال نکالا اور بار بار اس کے اس پھیلے ہوئے بازو کے قریب دوڑا نو بیٹھ کر پائل کے حلقے میں اس کی پھنسی انگلی کو آہستہ سے نکالا اور پائل کو رومال ہی میں لپیٹ کر بڑی احتیاط سے اٹھالیا۔ اتنی دیر میں نیچے سڑک پر ایمبولینس پہنچ چکی تھی اور رضا کار۔۔۔ اسٹریچر لے آئے تھے۔

”پوسٹ مارٹم کے لیے لاش کو اسپتال لے چلو۔۔۔۔۔“ پولیس انسپکٹر نے انہیں کہا اور خود ایک بار پھر ان دونوں کے قریب آیا۔

”دیکھیں۔۔۔۔۔ جب تک پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نہیں آجاتی، اس وقت تک آپ دونوں شہر سے باہر نہیں جائیں گے۔ ہمیں کسی لمحے بھی آپ کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیے تو انسپکٹر نے مزید ضروری کوائف لیے اور ان دونوں کو پریشان چھوڑ کر چلا گیا۔ ”وہ مجھے بہت عزیز تھی۔ اب اس کا خلا کس طرح پورا ہوگا۔۔۔۔۔“ اپریل گلابی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تو جان فوراً آگے بڑھا۔ اس نے اپریل کے گالوں پر اترنے والے آنسوؤں کو اپنی انگلی کی پوروں سے صاف کرتے ہوئے اسے دلا سادیا۔

”اسے خداوند کی رضا جان کر صبر کرو۔۔۔۔۔“ انسپکٹر نے جاتے جاتے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تو ناچار اسے بھی

یہ ظاہر پریشان کھڑے تھے۔ ایک اٹھارہ بیس سال کی عمر کا لڑکا جان اشکرافٹ اور دوسری انتہائی خوب صورت اور متناسب جسمت کی حامل پندرہ بیس چالیس سال کی اپریل گلابی جو خود کشی کرنے والی باربرا کی ماں تھی۔ اس کے خوب صورتی سے کئے بالوں کی پریشان لہکیں اس کے چہرے پر جمول رہی تھیں۔ جان اشکرافٹ خود بڑا پریشان لیکن یہ ظاہر مطمئن نظر آ رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی کمرے میں پڑے ٹیلی فون سے مقامی پولیس اسٹیشن فون کر کے ہٹا تھا اور دوبارہ لاش کے پاس آ کے کھڑا ہو گیا تھا۔

اپریل گلابی نے اپنی موٹی اور غلابی آنکھوں سے جان اشکرافٹ کی طرف دیکھا تو جان اشکرافٹ نے اس کی آنکھوں میں آئے سوال کو پڑھ کر آنکھوں ہی سے سب اچھا کی رپورٹ دی۔ چند لمحوں کے بعد ان کے قلبیٹ میں پولیس پہنچ چکی تھی۔ انسپکٹر نے اندر آتے ہی زمین پر اوندھی پڑی لاش کی طرف دیکھا۔ لاش کے لائے ہاتھوں کے خوب صورت اور بدور نانتوں پر گہرے سرخ رنگ کی نل پالش بہت سج رہی تھی۔ اس کی ادھ کی آنکھوں میں ابھی تک حیرت جاگ رہی تھی۔ صحت کے لحاظ سے وہ خاصی کمزور اور بکھرے بالوں سے پریشان لگ رہی تھی۔ لاش کے ارد گرد چلنے کے بعد اس نے اپنے ماتحتوں کو کچھ حکم دیا اور خود گھروالوں کے ساتھ کمرے میں آ گیا۔ کمرے میں رہی کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے کاغذ سنبھالا اور گھر میں موجود افراد کا بیان لینا شروع کر دیا۔ پہلا سوال اس نے اشکرافٹ سے کیا۔

”آپ مرنے والی کے کیا لگتے ہیں؟“

”جی، میں اس کا یو اے فرینڈ ہوں۔ میرا نام جان اشکرافٹ ہے۔“

”پولیس اسٹیشن فون آپ نے ہی کیا تھا؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”جی سر۔۔۔۔۔!“

”اور آپ۔۔۔۔۔“ انسپکٹر کا اگلا سوال اپریل گلابی سے تھا۔

”میں اس کی بد نصیب ماں ہوں۔۔۔۔۔“ اپریل گلابی کی آنکھوں کی نمی چھلکنے لگی۔

”یہ واقعہ کب ہوا۔۔۔۔۔؟“ انسپکٹر نے سوال کیا۔

”آج صبح۔۔۔۔۔ میں رات ادھر ہی تھا۔ میں اور باربرا کمرے میں تھے۔ میں صبح اٹھ کر واش روم گیا تو باربرا جاگ رہی تھی لیکن بے حد پریشان اور ابھی ابھی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے سوچا شاید رات وہ پوری طرح اپنی

صدے سے نڈھال اپریل گلابی کا کندھا تھپتھپاتا پڑا۔

☆☆☆

کیش اینڈ کیری سے باربرا اگلی صبح کا ناشا سرشام ہی لے جایا کرتی تھی۔ اس روز بھی شام ابھی گہری نہیں ہوئی تھی۔ باربرا ناشا اور دیگر لوازمات لے کر کیش اینڈ کیری سے نکلی تھی۔ ابھی وہ تھوڑا دور ہی گئی تھی کہ ایک قریبی گلی سے وہ ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو لے کر اس پر پل پڑا۔ وہ قد کاٹھ میں خاصا لمبا اور ہاتھ پاؤں کا مضبوط سیاہ قام تھا۔ اس نے آتے ہی اسے اپنے مضبوط اور کھلے ہاتھوں سے قابو میں کر لیا اور اسٹریٹ لائٹس سے ہٹ کر اندھیرے میں گھسیٹ کر لے گیا۔

”مجھے امید ہے، ہنسی گڑیا کہ تم چننے کی بے وقوفی نہیں کرو گی۔ ورنہ دیکھ رہی ہو میرے چاقو کا پھل بہت تیز ہے.....“ وہ غزایا۔ باربرانے خوفزدہ ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”شاہاش، جلدی سے جو کچھ تمہارے پاس ہے میرے حوالے کر دو..... جلدی کرو..... میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“ اس نے چاقو کی نوک اس کی گردن میں چھوئی تو باربرانے خوفزدہ ہو کر خریدی ہوئی اشیاء کے علاوہ اپنا پرس بھی اس کے حوالے کر دیا۔ ابھی اس سیاہ قام نے وہ پرس پکڑا ہی تھا کہ مخالف سمت سے آنے والی کار کی بھرپور لائٹوں میں وہ دونوں تباہ گئے۔ کار کے پیچھے ان کے نزدیک آ کر سختی سے چرچمائے اور دروازہ کھول کر اسٹیرنگ پر بیٹھا ہوا نوجوان نیچے اتر آیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ لگتا تھا کہ اسے دور ہی سے معاملے کی نوعیت کا پتا چل گیا تھا۔

”چھوڑو اسے ورنہ پستول کی ساری گولیاں تمہارے جسم میں اتار دوں گا۔“ آنے والے نے دھمکی دی تو وہ اسے وہیں چھوڑ کر اسی اندھیری گلی میں چلا گیا۔ باربرا کا خریدیا ہوا سامان زمین پر بکھرا ہوا تھا۔ پرس بھی اس کے پاؤں کے قریب پڑا تھا۔

”میرا خیال ہے، تم بچ گئی ہو۔“ وہ زمین سے سامان اٹھانے میں اس کی مدد کرنے لگا۔

”ہاں..... شکریہ تم وقت پر آ گئے۔“ باربرانے کہا۔

”میں نے دور سے دیکھ لیا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ زبردستی کر رہا ہے۔ سچی میں نے کار کو بڑی تیزی سے دوڑایا تھا۔“ باربرانے لشکرانہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا اور اپنا سامان سنبھالتی ہوئی ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کرنے لگی۔ اور وہ ہاتھ ہلاتا ہوا چلا گیا۔ باربرا اپنے فلیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی ماں ابھی تک اپنی جاب سے داہیں نہیں آئی تھی۔ اس نے سامان فریج میں رکھا۔ اس دوران

میں وہ اسی واقعے کے بارے میں سوچتی رہی اگر وہ مزاحمت کرتی۔ تو کیا وہ اسے چاقو سے قتل کرویتا اور اگر وہ کار والا نوجوان وقت پر نہ پہنچتا تب بھی وہ اس کے ساتھ ہاتھ پائی ضرور کرتا۔ اس نے ان غنڈوں کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا اور زندگی میں شاید پہلی بار اسے اس واقعے کا حصہ بننا پڑا تھا، مگر وہ نوجوان کون تھا؟ اس کی نظروں میں دونوں کا حلیہ گھوم گیا۔ سیاہ قام غنڈا جس کی آنکھوں میں سفاکیت تھی اور وہ کسی بھی صورت میں اسے مار ڈالنے کی کوشش کرتا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت جھانک رہی تھی اس کی نسبت نیلی آنکھوں اور براؤن بالوں والے دراز قد نوجوان کی وجاہت اور مہذب رویہ اس کے دل میں گھر کر چکا تھا۔

اس نے سوچا کہ ماں کو بتا دینا چاہیے اگر اس نے بتایا بھی تو اس کی ماں اسے احتیاط برتنے کا کہہ کر خاموش ہو جائے گی مگر وہ نوجوان ابھی تک اس کی نظروں میں گھوم رہا تھا۔ کیا وہ روزانہ اسی راستے سے گزرتا ہے اگر ایسا ہے تو وہ کل شام کو اس کا وہیں انتظار کرے گی۔ اس کی ماں کب گھر آئی، اسے خبر نہیں ہوئی۔ ہاں البتہ اسے اس کے آنے کی خبر اس وقت ہوئی جب اس نے آواز دے کر پوچھا۔

”باربرا..... کچن کا سامان لے آئی ہو.....؟“
”جی ماما..... کب کا..... آپ کس وقت آئیں؟“
باربرانے اپنے بستر پر لیٹے لیٹے پوچھا۔

”کچھ دیر پہلے..... میں نے سمجھا تم سوچکی ہو۔ کھانا کھالیا کہ نہیں.....؟“ اس کی ماں نے دوبارہ استفسار کیا۔
”میں تو کھا چکی ہوں، آپ کے لیے رکھا ہے۔“
باربرانے جواب دیا۔

”دیکھو باربی، میں صبح جلد کام پر چلی جاؤں گی۔ تمہارے اٹھنے سے پہلے ہی تمہارا ناشا بنا کر رکھ جاؤں گی۔ اٹھ کر کھا لینا اور کالج چلی جانا ادا کے.....“ اس کی ماں نے بتایا۔

”ٹھیک ہے ماما.....“ باربرانے جواب دیا۔

☆☆☆

باربرا گلابی کو اپنے خوب صورت نقوش کی وجہ سے دیکھنے والے یہ کہتے تھے کہ وہ اپنی ماں۔۔۔ اپریل گلابی کا دوسرا جنم ہے۔ بڑی بڑی ہرے کالج کی سی آنکھیں ستواں ناک اور سرخ و سفید رنگت پر گلاب کی پتھریوں کے سے ہونٹ جن کی رنگت قدرتی سرخ تھی۔ لمبی انگلیوں کے بیٹھوسے ناخنوں پر اسے شروع سے ہی سرخ رنگ کی تیل پالش لگانے کا شوق تھا۔ جب وہ چھوٹی تھی تو کئی بار اسے اس بات

تھا۔ اس نے سوسوں کی پلیٹ سامنے رکھی تو وہ بھی باربرانے اپنے سامنے سرکالی اور نندیدوں کی طرح کھانے لگی۔

”مجھے بھی تو بھوک لگی ہے.....“ جارج منمنایا۔

”اوہ تو جارج..... تم بھوک برداشت کر سکتے ہو مگر

میں نہیں۔“ وہ بڑی تیزی سے کھاتے ہوئے بولی۔ اس سے

آگے اس کی سہیلیاں بیٹھی سب دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔ پلیٹ

صاف کر کے اسے ڈسٹ بن ڈالتے ہوئے وہ کافی کا

گھونٹ لینے لگی تو جارج غصے کے مارے اٹھ کر چلا گیا۔

جارج کے جاتے ہی سب لڑکیوں کا ایک بھرپور ہتھیابھرا۔

اس واقعے کے بعد جب بھی جارج اسے اکیلا ملتا تو

وہ اسے تنگ کر کے مزہ لیتی۔ پھر آہستہ آہستہ خود ہی جارج

اس کی طرف متوجہ ہونے لگا۔ پھر ایک لمحہ ایسا بھی آیا کہ وہ

باربر کے بغیر خود کو ادھورا سمجھنے لگا۔ وہ ہر وقت باربر کے

ساتھ نظر آنے لگا۔ تب اس کی ایک دوست نے باربر کے

ساتھ ایک روز شرط لگائی۔

”باربر..... تم نے جس طرح جارج کو قابو کر کے

اپنے ساتھ بھی لیا ہے، کیا اسی طرح اسے اپنے سے جدا بھی

کر سکتی ہو؟“

”یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے لیزا.....“ باربرانے

ہنس کر جواب دیا۔

”کننی دیر میں.....“ لیزا نے پوچھا۔

”صرف ایک ہفتے کے اندر اندر.....“ باربرانے

مضبوط لہجہ میں کہا۔

”دیکھ لیتے ہیں.....“ لیزا نے ہنس کر اسے اسکا یا۔

اس روز سے باربرانے جارج سے بے رحمی اختیار کرنا

شروع کر دی۔ جارج اس کے ٹیکر بدلتے روپے کو دیکھ کر ایک

روز بولا۔ ”باربر..... میں کتنے دنوں سے تمہارا بدلتا ہوا روپہ

دیکھ رہا ہوں۔ کتنی تم مجھ سے اکٹا تو نہیں گئی ہو.....؟“

”ہوں..... بس کچھ ایسا ہی سمجھو.....“ باربرانے

آگے سے تنگ کر جواب دیا۔

”وجہ جان سکتا ہوں.....؟“ جارج نے دوبارہ

پوچھا۔

”ضروری نہیں کہ ہر بات کی وجہ بتائی جائے.....

میں بس چاہتی ہوں کہ تم میرا پیچھا چھوڑ دو.....“ باربر

مصنوی غصے سے بولی۔

”آخر کوئی میری غلطی بھی تو ہو..... یاد کرو اس محبت

کی ابتدا بھی تم نے ہی کی تھی۔“ جارج آہستہ آہستہ کھٹکنے لگا۔

”یہ میری بے وفائی تھی.....“ باربرانے ترت جواب دیا۔

پراپنی ماں سے جھڑکیاں بھی سننے کو ملی تھیں مگر اس کا یہ شوق عمر

کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ اپنی ابتدائی تعلیم کھل کرنے

کے بعد اب وہ کالج میں داخلہ لے چکی تھی۔ کالج میں حلو ط

تعلیم تھی اور باربر اپنی کلاس کی ذہین ترین لڑکی ہونے کے

ساتھ ساتھ غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی

تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کالج کی مقبول ترین لڑکی بن چکی تھی۔

کالج میں ہر دوسرا لڑکا اس سے تعلقات بڑھانے کی کوشش

میں تھا مگر وہ کسی کو گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ اپنی پختہ طبیعت اور

عادت کے مطابق وہ اپنے دل کا ایک دردانہ ہمیشہ کھلا رکھتی

تھی۔ اس دردانے سے وہ ہر اس لڑکے کو اتنی چھوٹ و بے

دیتی کہ وہ اس کی چاہت کی ہنسی ڈور پکڑ کر اس کے ذریعے

اس کے من میں داخل ہو جاتا اور جب وہ دیکھتی کہ آنے والا

اس کے دل پر دستک دینے لگا ہے تو وہ فوراً اس سے کنارہ

کشی کر لیتی اور اگر کوئی پھر بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑتا اس کی

شکایت پر سہل سے کر دیتی۔

جارج واکر اس کی کلاس کا سب سے سنجیدہ لڑکا تھا۔

مستطرا لے سنہری بالوں اور براؤن آنکھوں والا۔ سب

لڑکیاں اس کی قربت حاصل کرنے کی خواہاں تھیں مگر وہ کسی

کو بھی سنجیدگی سے نہ لیتا تھا۔ یہی وہ لڑکیوں میں مشرور سمجھا

جانے لگا تھا۔ باربر اگلا ہی اور اس کی دوستوں نے باقاعدہ

ایک پروگرام کے تحت اس کا غرور توڑنے اور اس کی انا کو

تکست دینے کا پروگرام بنایا اور اس کے لیے باربر کو آگے

کر دیا گیا۔ باربرانے بھی ہنس کر یہ ذمے داری قبول کر لی۔

یہ انہی دنوں کی بات ہے۔ باربر کالج کی تک شاپ پر بیٹھی

تھی کہ ایک پلیٹ میں سمو سے اٹھائے لے کر آتا ہوا جارج

اسے نظر آیا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں کافی تھی۔

باربر کو شرارت سوجھی۔ وہ فوراً اپنی سیٹ سے اٹھی۔

اس کے قریب پہنچی اور تیزی سے ہاتھ بڑھا کر جارج کے

ہاتھ سے کافی کا ٹک پکڑ کر کہنے لگی۔

”ارے جارج! تم نے بھلا یہ تکلیف کیوں کی۔ تم

بہت اچھے ہو۔“

جارج نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”لیکن یہ تمہارے لیے نہیں ہے۔“ وہ آہستگی سے بولا۔

”سب کے سامنے اب میری سبکی کراؤ گے۔ چلو آؤ“

یہ کہتے کہ باربرانے اس کا بازو پکڑا اور اپنے سامنے کی

کرسی پر بٹھالیا۔

جارج زندگی میں پہلی بار ایک عجیب و غریب صورت

جال میں پھنسا اس کے سامنے بیٹھی ملی کی طرح خاموش بیٹھا

یازدہ کی دوسری سہیلی مارٹی بازو سے پکڑ کر اسے ایک طرف کھینچ لے گئی۔

”تم نے بہت برا کیا باربرا..... اس بے چارے کو رسوا کر کے اچھا نہیں کیا۔ پتا نہیں تم کیوں نہیں سمجھتیں۔ لیزا نے تمہارے ساتھ ایک بڑی چال چلی تھی۔ وہ خود جارح کو چاہتی تھی مگر جارح اسے اتنا موقع ہی نہیں دیتا تھا۔ وہ تو ہر وقت تمہارے ساتھ چپکار رہتا تھا۔ اس نے تمہاری اس بچکانا عادت سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور تمہارے ہاتھوں جارح کو رسوا کر دیا۔ اب دیکھ لینا۔ وہ جارح کی محبت کو جیت لے گی اور تم اپنے بیویوں سے اس کے دام کا شکار ہو کر رہ گئی ہو.....“

”نہیں مارٹی..... ایسا نہیں ہو سکتا۔“ باربرا کی ہنسی سنجیدگی میں بدل گئی تھی اور پھر وہی ہوا جو مارٹی نے بتایا تھا۔ اس واقعے کے کچھ ہی روز کے بعد لیزا اور جارح اکٹھے نظر آنے لگے۔ مارٹی نے ایک روز پھر باربرا کو بتایا کہ اس نے لیزا کو اس واقعے پر بڑی لعن طعن کی تھی تو لیزا نے بڑی ڈھٹائی سے بتایا کہ اس نے جارح کو حاصل کرنے کے لیے ہر دام بچھلایا تھا۔ باربرا کی بے وقوفی کہ وہ اس دام میں پھنس گئی اور وہ جارح کو کھو بیٹھی لیکن لیزا جیت گئی۔

☆☆☆

اس روز اپریل گلاہی اپنے آفس سے جلدی واپس آ گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ گھر جاتے جاتے وہ کیش اینڈ کیری سے خود ہی صبح کے ناشتے کے لیے سامان لے آئے۔ وہ کیش اینڈ کیری میں داخل ہوئی تو وہاں کافی رش تھا۔ وہ لائن میں اپنی باری کا انتظار کرنے لگی تو معاً اس کی نظر ایک دراز قدم نیلی آنکھوں اور براؤن بالوں والے نوجوان پر پڑی جو کیش اینڈ کیری میں ابھی ابھی داخل ہوا تھا۔ اس کی نظریں ادھر ادھر کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ جتنی دیر تک اپریل گلاہی کی باری آئی وہ ہال میں اسے مسلسل گھورے جا رہا تھا۔ اپریل گلاہی نے اپنے سامان کی ادائیگی کی اور سامان مختلف شاپر میں ڈال کر فارغ ہوئی۔ وہ نوجوان شاید اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اپریل گلاہی کیش اینڈ کیری سے باہر نکلنے والی تھی کہ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا اس کے قریب آیا اور آہستگی سے بولا۔

”معاف کرنا..... آپ وہی تو نہیں جسے کچھ روز پہلے میں نے ایک غنڈے سے بچایا تھا؟“

اپریل نے بڑی حیرانی سے اس کو دیکھا اور لٹی میں جواب دے کر آگے بڑھنے والی تھی کہ وہ پھر اس کے سامنے

”یہ تم نے درست کہا باربی..... ہم جس معاشرے میں سانس لے رہے ہیں، وہاں محبت واقعی بے وقوفی ہے، پلٹنا اب میرے بس میں نہیں رہا۔“ جارح سنجیدگی سے بولا۔

”کلاس میں اور بھی بہت سی لڑکیاں ہیں، پھر اس کے علاوہ پورا کالج مجھ ایسی بے وقوف لڑکیوں سے بھرا پڑا ہے۔ کئی اور مقدر آزما کر لو اور پھر محبت کرنا ایسی کون سی مجبوری ہے۔ دیکھو جارح! اگر تم میرا اچھا نہیں چھوڑو گے تو میں دوسرا رستہ بھی اختیار کر سکتی ہوں۔“ باربرا نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

”میری بلا سے..... مگر سن لو، اگر تم میری نہ ہو میں تو کسی دوسرے کی بھی نہ ہو سکتی.....“ جارح نے سختی سے کہا۔

”یہ تمہاری طرف سے دھمکی ہے، تو یہ بھی جان لو..... ہمارے معاشرے میں عورت سے ایسا رویہ اختیار کرنے پر قانوناً تمہیں سزا بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن فی الحال میں تمہاری شکایت پر سہل سے کر رہی ہوں۔“ باربرا نے درشت لہجے میں کہا تو جارح بھی خاموش ہو گیا۔ انہیں اونچی آواز سے باتیں کرتے دیکھ کر لیزا اور ان کی دوسری دوست وہاں آگئیں۔ انہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر جارح بڑبڑاتے ہوئے دوسری طرف نکل گیا۔

”تمہیں تمہارا یہ رویہ بہت مہنگا پڑے گا۔“

”ہوں، دھمکی دیتے ہو.....“ باربرا نے اسی لہجے میں کہا اور پھر اس کے جاتے ہی ساری سہیلیاں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگیں۔

”باربی..... تم نے تو کمال کر دیا.....“ وہ سب ایک زبان ہو کر بولیں۔

”نہیں۔ کمال تو اب ہونے والا ہے۔“ باربرانے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر اس نے پرنسپل کو درخواست دے دی کہ جارح اسے ہراساں کر رہا ہے۔ پرنسپل نے دونوں کو اپنے آفس میں بلا لیا جہاں جارح کو جرمانے کے ساتھ ساتھ تہیہ بھی کی گئی۔ جارح منہ لٹکائے جب پرنسپل کے آفس سے نکلا تو پوری کلاس پرنسپل آفس کے باہر کھڑی تھی۔ جارح احساس شرمندگی کی وجہ سے ان سے آنکھ نہیں ملا پارہا تھا۔ اسی دوپہر جارح نے جرمانہ ادا کر دیا۔ وہ ساری لڑکیاں لائن میں کھڑی تھیں۔ جب لیزا ان سب کے سامنے شرط کی رقم باربرا کو پکڑ رہی تھی تو اس نے نہایت آہستگی سے کہا۔

”باربرا! میں نہیں جانتی تھی کہ تم اس قدر کٹھور بھی ہو سکتی ہو۔“ اس پر باربرا ہلکلا کر ہنس دی۔ اسی دوران

پنی کر چلے جانا....." اپریل نے اسے آفری۔
 "جی..... جی یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔" جان بولا۔
 "اگر پارکنگ کا مسئلہ نہ ہو تو گاڑی ساتھ لے
 لوں.....؟" جان نے دریافت کیا۔

"یہیں نزویک تو ہے، گاڑی ادھر ہی رہنے دو....."
 اپریل نے بتایا۔ "ہم پیدل ہی گھر چلے جاتے ہیں۔ میں
 نے اپنا تعارف تو تمہیں کرایا ہی نہیں۔ میرا نام اپریل گلاہسی
 ہے، میں مائیکروسافٹ کمپنی میں پروجیکٹ مینیجر ہوں اور
 باربرا گلاہسی....." ابھی وہ بات پوری نہ کر پائی تھی کہ جان
 دوبارہ بول اٹھا۔

"اچھا..... اچھا وہ باربرا گلاہسی ہیں، یقین کریں اگر
 ہشتے ہوئے آپ کے رخساروں میں ڈھیل نہ پیدا ہوتے
 ہوں تو آپ بالکل اپنی چھوٹی بہن باربرا ہی لگیں۔" جان
 کا یہ بات سن کر اپریل کھلکھلا کر ہنس دی۔
 "باربرا میری بیٹی ہے..... میری چھوٹی بہن
 نہیں....." اپریل نے بتایا تو وہ حیران ہو کر اس کی طرف
 دیکھنے لگا۔

"یہ مذاق تو نہیں.....؟" جان نے حیرانی سے پوچھا۔
 "نہیں یہ سچ ہے....." اپریل نے بتایا۔
 "مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا۔ یقیناً آپ اچھا مذاق
 کر لیتی ہیں۔" جان دوبارہ بولا۔

اسنے میں ان کا فلیٹ آگیا۔ اپریل نے دروازے کا
 لاک کھولا اور دونوں فلیٹ میں داخل ہو گئے۔ جان خاموشی
 سے اس کے پیچھے چلتا ہوا فلیٹ میں داخل ہوا تو اپریل نے
 باربرا کو آواز دی۔
 "ماما..... میں اپنے کمرے میں ہوں....." باربرا
 نے جواب دیا۔

تب اپریل نے دزدیدہ نظروں سے جان کی طرف
 دیکھا تو جان نے اثبات میں سر ہلایا۔
 "ویسے یقین مجھے اب بھی نہیں آ رہا۔ مجھے یہ آپ
 دونوں کی سازش لگتی ہے۔" جان نے ہنستے ہوئے کہا باربرا
 کی آواز آئی۔

"ماما..... کس سے باتیں کر رہی ہیں؟"
 "یہ کوئی تمہارے واقف کار ہیں۔" اپریل نے
 جواب دیا۔ تو باربرا براہ راست آگئی۔

"ارے آپ....." باربرا نے حیران ہو کر پوچھا۔
 "ہوں..... کوئی شک ہے کیا....." جان نے جواب دیا۔
 "ماما یہ آپ کو کہاں سے مل گئے.....؟" باربرا نے

"مجھے یقین ہے تم ہی ہو..... مجھے پچھاؤ....."
 "تعارف کروانے کا یہ انتہائی بھونڈا انداز ہے....."
 اپریل نے اس پر آنکھیں گاڑتے ہوئے جواب دیا۔
 "معاف کرنا، شاید مجھے اندازہ لگانے میں غلطی ہو گئی
 ہو۔ بہر حال وہ آپ ہی نہیں یا پھر شاید آپ کی چھوٹی بہن
 ہو۔" اس کے لہجے میں سنجیدگی برقرار تھی۔
 اپریل نے یہ سنا تو اس کے لہجے میں بھی نرمی آ گئی۔
 "کہو....." اب وہ دونوں کیش اینڈ کیری سے باہر
 نکل آئے تھے۔

"میرا نام جان اشکرافٹ ہے اور میں یہاں سے کچھ
 دور ایک کاسمیٹک بنانے والی فیکٹری کا لیبارٹری انچارج
 ہوں۔ آپ مجھے صرف جان بھی کہہ سکتی ہیں۔ آج سے کچھ
 روز پہلے میں شام کے وقت فیکٹری سے واپس آ رہا تھا۔ میں
 نے دور سے دیکھا۔ ایک کیم جیم جمشی ایک لڑکی کو گھیرے
 ہوئے تھا۔ میں گاڑی تیزی سے ان کے قریب لے آیا۔
 خوش قسمتی سے اس وقت میرے پاس پٹیل بھی تھا۔ میں
 نے کار روک کر پٹیل کو اس کی طرف کرتے ہوئے اسے
 لٹکا رہا تو وہ جمشی سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلا..... وہ لڑکی بالکل
 آپ کے خدو خال کی تھی۔ ایسا ہی رنگ روپ، آپ جتنا
 قدر..... اور تو اور اس کے جسمانی خدو خال بھی آپ جیسے
 تھے۔ آج میں ادھر سے دوبارہ گزر رہا تھا۔ میں نے سوچا
 اسی کیش اینڈ کیری سے وہ سامان لے کر نکلی ہوگی۔ ممکن ہے
 آج بھی وہ سودا سلف خریدنے کے لیے ادھر آئی ہو..... اس
 لیے میں کیش اینڈ کیری میں اس کی ایک جھلک دیکھنے آ گیا۔
 آپ کو دیکھ کر مجھے اسی کا شبہ ہوا کہ میں نے آہستہ آہستہ بتایا۔
 "کیا تم اسے پہلے سے جانتے ہو؟" اپریل نے نرمی
 سے پوچھا۔

"نہیں..... بالکل نہیں..... میں تو اس کا نام تک نہیں
 جانتا۔" جان نے جواب دیا۔

"وہ میری....." ابھی اپریل نے بات بھی پوری نہ کی
 تھی کہ وہ جلدی سے بول اٹھا۔

"یقیناً وہ آپ کی چھوٹی بہن ہوگی۔ شکل و صورت
 سے ہی لگتا ہے۔ دراصل گاڑی بعض انسانوں میں اس قدر
 مشابہت پیدا کر دیتا ہے کہ پہلی نظر میں پہچاننا مشکل ہو جاتا
 ہے۔" جان نے اپنی بات پوری کی۔

"یہیں نزدیک ہی ہمارا فلیٹ ہے، اگر تمہیں برا نہ
 لگے تو ایک کپ چائے یا کافی جو بھی پسند کرو ہمارے ساتھ

مصنوعات....." جان نے ہنس کر جواب دیا۔
"کاسمیٹک میں مجھے صرف نیل پالش ہی پسند ہے
اور کچھ نہیں....." باربر نے کہا۔
"کیا تم مجھے اجازت دو گی کہ میں کبھی بکھار تم سے
ملنے آجایا کروں؟ مجھے تم اچھی لگی ہو۔" جان نے بلا تھجک
کہہ ڈالا۔

"جب چاہو..... مگر شام کو اگر آؤ تو زیادہ بہتر ہے کہ
میں شام کو کالج سے گھر واپس آ جاتی ہوں اور ماما تو شام کے
بعد ہی گھر لوٹتی ہیں۔ کبھی کبھی تو رات بھی باہر رہ جاتی ہیں۔
ان کی ملازمت ہی کچھ ایسی ہے۔" باربر نے وضاحت کی۔
"ہاں..... ہاں تم مطمئن رہو۔ میں بھی شام ہی کو
ادھر سے گزرتا ہوں۔"

☆☆☆

محبت اگر معاشرتی پابندیوں سے آزاد ہو تو بہت جلد
انسانی احساسات کو فتح کر لیتی ہے۔ جان اشکرافت رفتہ رفتہ
اس کے خاندان کا حصہ بن چکا تھا۔ اب اس کی اکثر راتیں
ادھر ہی گزرتی تھیں۔ باربر کو ابھی تک اس بات کا افسوس
تھا کہ اس نے جارج کو بے جا تنگ کیا۔ حالانکہ جارج کو اب
لیزانے بڑے اچھے انداز سے سنبھال لیا تھا مگر پھر بھی کالج
میں جب اس کا جارج سے سامنا ہوتا تو جارج کی آنکھوں
میں ملتھیانہ پیاس بڑی واضح نظر آتی تھی جس کی وجہ سے
باربر کا احساس جرم اور بھی بڑھ جاتا۔ اس روز باربر کا
ہیریزہ خالی تھا اور وہ تنگ شابہ جا رہی تھی جب ہیری نے اس
کا راستہ روک لیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ہیری کو دیکھا
تو وہ بڑے نمدیدے پن سے بولا۔

"ہیلو گڑیا..... ہیرے کالج کے سمندر میں ہمارا بھی
ڈوبنے کو جی چاہتا ہے۔ کبھی ہمیں بھی ٹنٹ کرادو۔"
"تمہیں ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم آتی چاہیے۔"
باربر نے درشتگی سے جواب دیا۔

"دیکھو گڑیا، یہ جارج تو ہے نہیں جسے تم ڈرا دھمکا
لو گی۔ مجھے جو چیز پسند آجائے، میں اس کو زبردستی بھی اڑا
لے جاتا ہوں۔" ہیری نے ہنس کر کہا۔ "کالج ٹائم کے بعد
تم میرے ساتھ چلو گی۔ آرام سے یا زبردستی، فیصلہ اسی
دقت ہوگا۔" ہیری یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا اور باربر اوہیں
کھڑی سوچنے لگی۔

ہیری کا شمار کالج کے ان طالب علموں میں ہوتا تھا جو
پڑھنے کے لیے کالج میں داخلہ نہیں لیتے۔ آوارگی اور
بد معاشری کرنا ان کی عادت بن چکا ہوتا ہے۔ اس لیے باربر

"اسی جگہ سے جہاں کچھ روز پہلے سیاہ فام تمہیں
لوٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔" جان نے بتایا۔

"اوہ ماما..... میں آپ کو بتانا بھول گئی۔ کچھ روز پہلے
جب شام کو میں کیش اینڈ کیری سے سامان لے کر آرہی تھی تو
ایک سیاہ فام لے مجھے لوٹنے کی کوشش کی اور انہوں نے
میری جان بچائی تھی۔" باربر نے آہستہ آہستہ بتایا۔

"ڈارلنگ! ڈرا دھیمان رکھا کرو....." اپریل نے کہا۔
"لو تم اپنے مہمان کو سنبھالو..... بے چارہ کیش اینڈ کیری میں
تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک چلا تھا۔" اپریل نے ہنس کر
کہا تو باربر اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔

"باربی..... ایک بات تو بتاؤ..... یہ واقعی تمہاری سگی
ماما ہیں۔" جان نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"جی، سبھی سچ ہے۔ یہ میری بہت پیاری ماما ہیں۔"
باربر نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"ویسے لگتا تو نہیں ہے۔ ان کی جسمانی ساخت سے تو
لگتا ہے ابھی یہ خود غیر شادی شدہ ہیں۔" جان نے دوبارہ کہا۔
"تمہیں ایک اور بات سن کر حیرانی ہو گی کہ میری ماما
سنس امریکا کا نائٹل جیت چکی ہیں۔" باربر نے کافی کا گ
جان کو پکڑاتے ہوئے انکشاف کیا۔

"اوہ، کیا یہ بھی سچ ہے اور تم....." جان نے ورطہ
حیرت سے پوچھا۔

"میں کالج میں پڑھتی ہوں۔ اپنی ماما کی اکلوتی بیٹی
ہوں۔ میرے نام سے تو واقف ہو ہی گئے ہو۔ میرا مکمل نام
باربر گلاہی ہے لیکن مجھے سب میرے پہلے نام باربر سے
ہی پکارتے ہیں۔"

"میں بھی اپنا تعارف کروانا بھول گیا۔ میرا نام جان
اشکرافت ہے۔ میں ایک کاسمیٹک بنانے والی فیکٹری میں
لیبارٹری انچارج ہوں اور روز اسی راستے سے گزر کر اپنے
گھر آتا جاتا ہوں۔ اس واقعے کے بعد تم مجھے نظر نہیں
آئیں۔ آج بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں کیش اینڈ

کیری میں تمہیں ڈھونڈنے نکلا تو تمہاری ماما سے ملاقات
ہوئی۔ لیکن کرو باربی..... اگر تمہاری ماما کے ساتھ اس قدر
مشابہت نہ ہوتی تو میں تم تک نہ پہنچ پاتا۔" جان نے بتایا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب مجھے نیل پالش مفت ملا
کرے گی۔" باربر نے اپنے ناخن کو دانتوں سے کترتے
ہوئے کہا۔

صرف نیل پالش بلکہ ہماری فیکٹری کی ہر

بھی اس سے خائف تھی۔ بار بار ابھی وہیں کھڑی تھی کہ جارج اس کے قریب سے گزرا۔
”مجھے پوچھنے کا حق تو نہیں لیکن پوچھ رہا ہوں کیوں پریشان کھڑی ہو؟“

”ویسے ہی.....“ بار برانے شرمندگی سے کہا۔
”یہ ہیری تمہارے پاس کھڑا تھا۔ کیا کہہ رہا تھا؟“
اس نے دوبارہ پوچھا۔

پہلے تو بار برانے چپکاتی رہی پھر اس نے سب بتا دیا۔
”وہ بہت خطرناک غنڈا ہے..... اس سے بچ کر رہنا.....“ جارج یہ کہہ کر چلا گیا۔ تب بار برانے کے ذہن میں آیا کہ وہ یہ تمام بات جان کو موبائل پر بتا دے مگر وہ کیا کرے گا۔ ہو سکتا ہے اسے چھینی نہ ملے اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ بھی جارج کی طرح خاموشی اور مصلحت سے کام لے۔ پرانی آگ میں کون کونسا ہے۔ گھبرا کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے گویا کانچ کے ہرے سمندر میں سیلاب آ گیا تھا۔

اس روز جب وہ کانچ سے باہر نکلی تو بس اسٹاپ پر ہیری کھڑا نظر آیا۔ وہ واپس کانچ جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ اس کی گرخت آواز آئی۔

”ہے گڑیا..... کہاں چلیں۔ تمہارے چاہنے والے تو ادھر کھڑے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک جست لگائی اور اسے بازو سے پکڑ کر کھینچنے لگا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں پستل تھا۔ کچھ لڑکوں اور مردوں نے آگے بڑھ کر اس کی مدد کرنا چاہی تو اس نے پستول کو آسمان کی طرف کر کے چار پانچ فائر کر دیے۔ بار برانے کچھ اور سہم گئی تھی۔ اس کا حلق خشک ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں حیرت و خوف سے پھیل چکی تھیں۔ اسی اثنا میں نہ جانے جارج کدھر سے وحشیانہ طریقے سے بھاگتا ہوا آیا اور ہیری سے بھڑ گیا۔ ہیری اس اجانک حملے سے سنبھل نہ پایا اور پیچھے گر گیا۔ اس کی جرات دیکھتے ہوئے کانچ کے مزید طالب علم بھی اس پر پل پڑنے اور اسے لاتوں اور گھونسوں پر رکھ لیا۔ ان سب نے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ بار برانے پریشانی کے عالم میں وہیں کھڑی تھی۔ جب کسی نے جا کر کانچ کے پستل کو اطلاع دے دی۔ وہ بھی باہر نکل آیا۔ اسے آتے دیکھ کر طالب علموں نے ہیری کو چھوڑ دیا جو زخمی حالت میں زمین پر پڑا ڈکڑا رہا تھا۔ ہیری کو اٹھا کر کانچ کی ڈسپنری لایا گیا جہاں سے مرہم پٹی کر کے اسے قابض کر دیا گیا۔

بار برانے جب گھر پہنچی تو وہ خاصی خوف زدہ تھی۔ اس

نے آتے ہی موبائل پر جان کے نمبر ملائے مگر دوسری طرف سے کوئی رسپانس نہ ملا۔ تب اسے یاد آیا کہ فیکٹری میں موبائل جام کر دیے جاتے ہیں۔ پھر اس نے آفس کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب جان تھا۔

”ہیلو بار برانے.....“ آواز ابھری۔
”جان..... آج تمہاری بار برانے مر چکی تھی۔“ اس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”مطلب.....“ دوسری طرف جان گھبرا گیا۔
توقف کے بعد پھر جان نے پوچھا۔ ”کیا آج وہی واقعہ پیش آ گیا؟ پھر کوئی غنڈا مل گیا تھا.....“ جان نے جلدی سے پوچھا۔

”نہیں..... آج کانچ کا ایک غنڈا مجھے اغوا کرنے لگا تھا۔ وہ اسلحے کے زور پر مجھے گھسیٹ رہا تھا۔ جب قدرت کو میرے حال پر رحم آ گیا اور کوئی دوسرا اس سے بھڑ گیا۔“ اس نے بھکی آواز میں بتایا۔

”میں آفس سے جلدی آ جاؤں گا۔ پھر ہم آڈیٹنگ پر چلیں گے تاکہ تمہارے ذہن پر چھایا ہوا خوف دور ہو سکے۔ کوئی بات نہیں۔ زندگی میں ایسے اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔“ جان نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ تو وہ بھی اوندھے منہ بستر پر گر پڑی۔ اس کی ماں ابھی تک آفس سے واپس نہیں آئی تھی۔ شام کو جب اپریل واپس آئی تو بار برانے نے رو کر آج کا سارا واقعہ اس کے گوش گزار کر دیا۔

”ماما..... آج کے بعد میں کانچ نہیں جاؤں گی۔“
بار برانے بچکیوں کے درمیان کہا تو اپریل فوراً بول اٹھی۔
”ارے ارے یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میرے تو بڑے خواب تم سے وابستہ ہیں۔ میں جان سے کہوں گی۔ وہ تمہیں کانچ ڈراپ کر دیا کرے گا۔ اس طرح کانچ کے طالب علموں کو بھی پتا چل جائے گا کہ تمہیں تحفظ دینے والا موجود ہے..... مگر دیکھو ایجوکیشن نہ چھوڑنا..... زمانہ بڑی تیزی کے ساتھ انسانی قوت مدافعت چھین رہا ہے۔“ اپریل نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”ہوں.....“ بار برانے کہا اور دوبارہ بستر پر لیٹ گئی۔
جان اپنے وقت سے پہلے ہی واپس آ گیا تھا اور آتے ہوئے فیکٹری سے بہت سی نسل پالش اور کاسمیٹک کا دوسرا سامان لیتا آیا تھا۔

”ارے یہ کیا..... مجھے تو صرف نسل پالش پسند ہے۔
بقیہ اشیا کیوں اٹھا لائے؟“ بار برانے اس سے پوچھا۔
”ویسے ہی..... باقی آٹنی لے لیں گی۔“ اس نے کہا۔

میں کب کی اپنی تعلیم کو ادھورا چھوڑ چکی ہوتی۔“ باربرا نے جواب دیا۔

”چلو یار! میری چھٹی سے فائدہ اٹھاؤ، آج کا دن باتوں میں ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ ہم ساحل سمندر پر اچھل کود کے دن گزاریں۔ آج سورج نے بھی اپنا چہرہ دکھایا ہے۔ دھوپ میں ساحل سمندر کی نیم گرم ریت پر سن باتھ بھی لے سکیں گے۔“ جان نے تجویز پیش کی۔

”یہ ٹھیک رہے گا۔ میں ماما کو بھی یہ تجویز بتاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر باربرا ابھاگ کر دوسرے کمرے میں گئی۔ اپریل ابھی تک اپنے بستر پر ہی تھی۔

”ماما..... ہم ساحل سمندر پر جا رہے ہیں۔ آپ بھی ساتھ چلیں۔“ باربرانے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

”ارے نہیں..... میرے سر میں شدید درد ہے۔ میں نہیں جاسکوں گی، تم کس کے ساتھ جا رہی ہو؟“ اپریل نے پوچھا۔

”جان میرے ساتھ ہے.....“ باربرانے بتایا۔

”ٹھیک ہے، تم جاؤ..... میں گھر پر ہی آرام کروں گی۔“ اپریل نے کہا۔

”تو ٹھیک ہے ماما۔ ہم شام کا کھانا لیتے آئیں گے۔ آپ نے انتظام نہیں کرنا تو کے.....“ باربرانے جواب دیا۔

کچھ دیر کے بعد وہ دونوں ساحل سمندر پر چلے گئے۔

☆☆☆

ساحل سمندر ان جیسے منچلوں سے کھپکا کھچ بھرا ہوا تھا۔ نوجوانوں کی ٹولیاں رنگ برنگے نرم فٹ بالوں سے کھیل رہی تھیں۔ سب ایک دوسرے کے ساتھ شرارتیں کرنے میں مصروف تھے اور بے شمار لوگ سورج کی نرم گرم دھوپ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ باربرا اور جان بھی ان لوگوں میں شامل ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنی گاڑی پارکنگ میں کھڑی کی تو جان کے کچھ دوست انہیں مل گئے۔ وہ بھی اپنے بچوں کو لے کر ساحل سمندر پر آئے ہوئے تھے۔ جان کے دوست کی بیوی نے فرط انبساط سے باربرا کا ہاتھ تھام لیا۔

”جان! آپ کی پسند بڑی عمدہ ہے۔“ اس کی بیوی نے کہا۔

”میں ان کی نہیں بلکہ یہ میری پسند ہیں۔“ باربرانے ہنس کر جواب دیا۔

”بہر حال کھل بہت اچھا ہے۔“ پھر اس نے باربرا کے بکڑے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ مارا تو بے ساختہ بولی۔

”ارے یہ ریڈنیل پالش تو نیلو پر اس طرح لگی رہی ہے جیسے

”آئی بھی میک اپ پسند نہیں کرتیں۔ انہیں لپ اسٹک اور نیل پالش ہی پسند ہے۔“

ان دونوں کی آوازیں سن کر اپریل بھی وہاں آگئی تھی۔ بستر پر رکھا ہوا کامیک کا سامان دیکھ کر اس نے جلدی سے لپ اسٹک اٹھائی۔

”چلو آؤ..... باہر چلتے ہیں۔ رات کا کھانا وہیں کھالیں گے۔“ جان نے کہا۔

”ہمیں تیاری تو کر لینے دو.....“ باربرانے کہا پھر دونوں جان کی گاڑی میں بیٹھ کر باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

”تمہارے ڈیڈ کا کیا ہوا۔ میرا کافی دنوں سے تم سے تعلق ہے مگر میں نے انہیں آج تک نہیں دیکھا۔“ جان نے ایک روز باربرا سے سوال کیا۔

”میں نے تو خود انہیں نہیں دیکھا۔ میں نے اپنی ماما سے کئی بار پوچھا مگر وہ ہمیشہ ٹال مٹول کر گئیں۔ تم خود بھی پوچھ لو..... اگر انہوں نے بتا دیا تو مجھے بھی بتانا۔“ باربرانے روہانے لہجے میں جواب دیا۔

”مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہارا دل دکھایا۔“ جان نے باربرا کی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو اپنی انگلیوں کی پوروں پر سنبھالتے ہوئے کہا۔

”ارے نہیں۔ ایسی بات نہیں۔ بس سبھی سبھی میں خود کو بہت تنہا محسوس کرتی ہوں۔“ باربرانے اسی لہجے میں جواب دیا۔

”میں تمہارے دکھ کو سمجھتا ہوں۔ ایسی ہی کچھ کہانی میرے ساتھ بھی وابستہ ہے۔ تھوڑا سا انتظار کر لو۔ تمہاری پڑھائی مکمل ہوتے ہی میں تمہیں اپنالوں گا.....“ جان نے دلار سے جواب دیا۔

”کیا انہی نہیں ہو سکتی یہ شادی.....؟“ باربرانے جلدی سے پوچھا۔

”ابھی کچھ میری اپنی بھی مجبوریاں ہیں لیکن یقین کرو میں تمہیں سب سے حد چاہتا ہوں..... ارے ہاں یاد آیا تمہارے اس دشمن کا کیا ہوا جس نے تمہارے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی تھی؟“ جان نے بات پلٹتے ہوئے پوچھا۔

”اسے کالج سے نکال دیا گیا ہے۔ باہر آتے ہی اس نے اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر پینک ڈبلیٹی میں جھلکا اور پینک ڈبلیٹی آج کل جیل کی ہوا کھا رہا ہے.....“

اگر اس وقت نانا مجھے نہ سمجھاتیں اور تمہارا ساتھ نہ ہوتا تو

کھینچنا۔ تو بار بار اس کے چوڑے چکلے سینے سے آگلی.....
 "سویٹ ہارٹ....." جان کے منہ سے جذباتی طور پر نکلا۔

"تم نام کے جان ہی نہیں۔ بار بار کی بھی جان ہو....." بار بار نے اس کے کندھے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔
 ☆☆☆

موسموں کے تیز اور انسانی رویے بدلتے ویر نہیں لگتی۔ جان کی آنکھوں میں اترا ہوا بیگانہ پن بار بار کتنے دنوں سے محسوس کر رہی تھی۔ ایک روز اس نے پوچھ ہی لیا۔

"جان..... میں کتنے دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ اب تمہاری نظروں میں میرے لیے وہ پہلی سی چاہت نہیں رہی۔ کیا میں اس کا سبب جان سکتی ہوں؟"

"کچھ نہیں۔ بس ذرا میری فیکٹری میں مصروفیت بڑھ گئی ہے۔ اس لیے ادھر کم کم آتا ہوں۔" جان نے جواب دیا۔

"ذبحہ بھی ہے یا چاہت کے سلسلے بدل گئے ہیں؟" بار بار نے دوبارہ پوچھا۔

"مطلب....." جان نے وضاحت چاہی۔

"یہی کہ آج کل تمہارا ماما کے ارد گرد زیادہ گھوم رہے ہو اور ماما کی نگاہیں بھی تمہیں ڈھونڈتی رہتی ہیں۔" بار بار نے برجستہ کہا۔

"بار بی! تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔ وہ تمہارا ماں ہیں۔" جان نے تیزی سے جواب دیا۔

"یہ حقیقت ہے اور سچائی بتانے میں کیا حرج ہے۔" بار بار نے اسی لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ میں نہ آیا کروں۔" جان نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"پہلے جب تم میرے لیے آتے تھے، تو مجھے بہت اچھے لگتے تھے مگر اب مجھے یقین ہے کہ تم ماما کے لیے آتے ہو تو مجھے زہر لگتے ہو۔ میں جانتی ہوں، ماما کے جسمانی....

خود خال مجھ سے بہتر ہی نہیں بہتر ہیں۔ یہ تم ہی نہیں میرے اور ماما کے کئی ملنے والے کہتے ہیں کہ اپریل بار بار سے کہیں چھوٹی لگتی ہے۔

"آج مجھے پتا چلا کہ میری ماں ان لوگوں میں سے ہے جو اپنی اولاد کی خوشیوں کو بھی چھیننے سے نہیں چوتیں۔"

بار بار نے سخت غصے میں چار حانہ انداز اپنا رکھا تھا۔

"تم بے وقوف ہو، تمہیں اپنی ماں پر یہ الزام لگانے

کسی نے پکے ہوئے انار کے دانے تمہارے ماتحتوں پر گاڑ دیے ہوں۔"

دوست کی بہوی نے اس کی دوبارہ تعریف کی اور فٹ بال لے کر بچوں کے ساتھ ریت پر کھیلنے لگی۔ بار بار بھی شکر یہ کہہ کر ان کے کھیل میں شامل ہوئی۔

کچھ دیر کھیلنے کے بعد وہ دونوں جھک کر گیلی گرم ریت پر چت لیٹ گئیں۔

"جان سے تم کب ملی ہو.....؟" اس نے دریافت کیا۔

"اب تو ایک مدت ہو چکی ہے۔" یہ کہہ کر بار بار نے ملاقات کی ساری کہانی اسے سنادی۔

"تم خوش قسمت ہو، جان طبیعت کا بہت اچھا اور دلیر انسان ہے۔ تم سے ملنے سے پہلے یہ اکثر ہمارے گھر میرے شوہر کے پاس آیا کرتا تھا۔" اس نے بتایا۔

وہ چٹائی پر اپنے مختصر لباس میں کٹی باٹم کر رہی تھیں جب اس کا شوہر بچوں کو لے کر آ گیا۔ اس کے ساتھ جان بھی تھا۔ وہ بچوں کو لے کر اپنی بیٹی کے قریب بیٹھ گیا تو جان نے لیٹی ہوئی بار بار کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔

بار بار نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اس کے سہارے اٹھ بیٹھی تو جان ہاتھ بار بار کی کمر میں ڈال کر اسے الگ جگہ لے گیا۔

"کیا باتیں ہو رہی تھیں دونوں کے درمیان۔" جان نے شرمگوشی میں پوچھا۔

"عورتوں کی باتوں میں دلچسپی نہیں لیا کرتے۔" بار بار نے ہنس کر جواب دیا۔ "وہی اتنے قریب آگئے مگر شادی کا کچھ بتائیں۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو شادی بھی ہو ہی جائے گی۔ محبت ایک خوشگوار احساس کا نام ہے۔ ایک خوشبو ہے جو دھیرے سے بدن میں سرایت کر جاتی ہے....." جان نے اس کے تھامے ہوئے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"جان تم نے ماما سے بات کی تھی؟" بار بار نے دوبارہ پوچھا۔

"ارے یار..... مجھے اس کا تو موقع ہی نہیں ملا اور سچ پوچھو تو میں ہر بات بھول جاتا ہوں تمہارے حسن کے آگے۔" جان نے جواب دیا۔

"یہ تم مجھے بنا رہے ہو۔ باتوں کا جال پھینک کر لڑکیوں کو پھانسنے کا ہنر ہمیں خوب آتا ہے۔" بار بار نے ہنس کر کہا۔

جان نے ہنستے ہوئے بار بار کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف

نہ صرف میں بلکہ میری طرح دیگر شرکاء بھی ان منتظمین اور نتائج مرتب کرنے والوں کی ہوس کا شکار ہو گئیں۔ وہ کون تھا اور اس کا تعلق کس ملک سے تھا میں نہیں جانتی۔ مجھے تو صرف یہ فکر تھی کہ کسی طور میں یہ مقابلہ جیت جاؤں..... پھر میں یہ مقابلہ جیت گئی۔ میں مس امریکا بن چکی تھی اور میں بے حد خوش تھی کہ میں نے اپنا ٹارگٹ حاصل کر لیا ہے۔ مگر نہیں جانتی تھی کہ نادانی یا انتہائی چالاکی سے میں اپنے جسم میں ایک وجود بھی چھپا لائی ہوں..... یہی بار برابر ہے۔ جب میں مس امریکا منتخب ہوئی تو مائیکروسافٹ کمپنی نے مجھے پروجیکٹ نیجری ملازمت آفر کی۔ جو میں نے قبول کر لی۔ مقابلہ حسن سے ملنے والی خطیر رقم سے میں نے اپنی انشورنس کروالی.....“

اپریل نے اپنی داستان سنائی تو جان فوراً بولا۔
 ”یہ آپ نے بہت اچھا کیا۔ آپ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ بہت ذہین بھی ہیں۔ میں نے اپنی پہلی ملاقات میں ایسے ہی آپ کی تعریف نہیں کی تھی.....“ جان نے پانچا پھینکا۔
 ”اب بتاؤ میں بار برابر کو کیسے بتاؤں کہ اس کا باپ کون ہے جبکہ میں خود نہیں جانتی۔ میں نے تو اس وقت سے اپنی زندگی کا محور صرف اور صرف بار برابر کو بنا لیا تھا۔ اس کے لیے تو میں نے اپنی جان تک کی پروا نہیں کی۔“ جان اس کی بات سن کر مسکرایا۔

”اگر آپ اپنی جان کی پروا کرتیں تو نہ جانے کس قدر خوب صورت رہتیں جو یہ پروا نہ کرتے ہوئے بھی اس قدر سڈول اور خوب صورت ہیں۔“

”ہوں..... مگر کہاں..... اب یہی دیکھ لو..... اسے یہ اعتراض ہے کہ میں تم پر ڈورے ڈال رہی ہوں۔ تمہیں اس سے پھین رہی ہوں، وہ مجھ سے اس بات پر کتنی بار جھگڑ چکی ہے۔ اب مجھے بتاؤ اگر وہ جان ہو گئی ہے تو کیا میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ میری خواہشات مر گئی ہیں کیا۔“ وہ روہا سی ہو کر بولی۔

”ویسے ایک بات کہوں آئی.....“ جان بولا۔ ابھی اس نے اپنی بات کی ابتدا ہی کی تھی کہ وہ پھیری ہوئی شیرنی کی طرح بولی۔

”خبردار! آئی کہہ کر میری تو ہین نہ کرو..... میں تمہیں آئی دکھائی دیتی ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو پکڑا اور اسے چوم لیا۔
 بار برابر کا شک سچ ثابت ہو گیا۔ اس روز سے جان اپریل کے پوزے قبضے میں آ گیا اور بار برابر نے ایک دو بار اپنی ماں اور جان کو انتہائی قریب دیکھا۔ اس لیے وہ اپنی ماں کی مخالف ہو گئی تھی۔

ہوئے احتیاط سے کام لینا چاہیے۔“ جان نے بھی غصے سے کہا۔
 ”مجھے یہ سبق پڑ جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہی بات تمہیں ماما سے کہنا چاہیے تھی۔“ بار برابر کا پارہ تیز ہو رہا تھا۔
 ”میں ان کے ارد گرد رہتا ہوں۔ تمہیں پتا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے، تمہاری ماما نے تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں دینے سے انکار کر دیا تھا۔“ جان نے بتایا۔

”ہاں..... اس نے ایسا کرنا ہی تھا کیونکہ وہ اپنا رشتہ جو تم سے جوڑنا چاہتی تھی۔“ بار برابر نے چیخنے ہوئے کہا تو اتنی دیر میں اپریل بھی آ گئی۔

”بے وقوف لڑکی..... کیوں شور مچا رہی ہو۔“ اپریل نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔ ”پتا ہے، تمہاری آواز دوسرے فلیٹوں تک جا رہی ہے اگر کسی نے پولیس میں شکایت کر دی تو.....“ اپریل نے غصے میں کہا تو بار برابر انھوت سے بولی۔

”ہوں..... میرے جوتے کی ٹوک پر..... اچھا ہے پولیس کو اطلاع کر دیں تو میں پولیس کو بتاؤں کہ اس گھر میں کیا گل کھلائے جا رہے ہیں۔“ بار برابر کہہ کر زور سے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”دیکھا تم نے..... یہ کیسی بد تمیزی دکھا رہی ہے۔ یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ وہ ایسے ملک کی رہا تھی ہے جہاں بچوں کو بے جا دباؤ میں رکھنے پر بھی سزا کی مل جاتی ہیں اگر کسی مشرقی ملک میں ہوتی تو پتا چل جاتا۔“

”اکلوتی ہونے کا فائدہ اٹھا رہی ہے اور اسے اپنے باپ کی کمی بھی بے حد محسوس ہو رہی ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس کا باپ کہاں گیا.....“ جان نے پوچھا۔

”تمہیں پتا ہے کہ میں نے مس امریکا کا ٹائٹل جیت رکھا ہے؟“ وہ بولی۔

”ہاں مجھے بار باری نے بتایا تھا۔“ جان نے جواب دیا۔

”یہ انہی دنوں کا واقعہ ہے۔ مقابلہ حسن کے چٹاؤ کا آخری سیشن چل رہا تھا۔ اس مقابلے میں شرکت کرنے والی تمام لڑکیاں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں اور وہ منتظمین کی ہر جائز و ناجائز خواہشات کے سامنے ہچکچی جاتی تھیں۔ منتظمین اور جج صاحبان بھی موقع سے فائدہ اٹھانے میں ہر طرح کے حربے آزمائے تھے۔ آخری سیشن میں شریک لڑکیوں کو بند کروا دیا گیا۔ لے جا کر ان کی جسمانی ساخت کی پیمائش اور ان کے ہر جز کو پوری طرح ٹھونک بجا کر دیکھا جا رہا تھا۔

میں بھی بڑھتا ہوا ایسے ہی مراحل سے گزر رہی تھی۔ پھر ایسے میں

”مل گیا..... اس کا حل بھی مل گیا۔ ہمیں اپنے کھیل کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اصولوں کو توڑنا ہوگا۔“ جان نے خوشی سے چلاتے ہوئے کہا۔ ”ایسا کرنے سے لائٹ بھی بچ جائے گی اور سانپ بھی مر جائے گا۔“

”وہ کیا.....“ اپریل نے جلدی سے پوچھا۔
”لیکن اس کے لیے ہمیں انتظار کرنا ہوگا۔“ اب جان کے لہجے میں تھوڑی مایوسی تھی۔

”پھر بھی کتنا انتظار.....؟“ اپریل نے دوبارہ پوچھا۔

”یہ مرنے والے کی قوت مدافعت پر ہے۔ دو ماہ چھ ماہ یا پھر سال بھر کا انتظار..... مگر یہ طریقہ اس قدر شفاف ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی پکڑا نہیں جائے گا۔“ جان نے سمجھایا۔

”تم اگر ساتھ دو تو میں یہ بھی کرنے کو تیار ہوں لیکن اس کا کیا اعتبار ہے کہ تم بدل نہ جاؤ گے۔“ اپریل نے طے چلے رد عمل میں جواب دیا۔

”ہم آج ہی کسی وقت خرچ میں جا کر شادی کر لیتے ہیں تاکہ تمہیں بھی خوف نہ رہے.....“ جان نے پیشکش کی۔
”لیکن مجھے طریقہ وارادات تو بتاؤ۔“ اپریل نے پوچھا۔

”بہت آسان ہے۔ بار بار کونسل پالش پسند ہے۔ ہم نسل پالش میں ایک عام سائیکمیکل ملاتے ہیں تاکہ نسل پالش جلدی سے سوکھ جائے۔ اس کیمیکل کو ٹرائی فینائل فاسفیٹ کہا جاتا ہے۔ یہ کیمیکل عام طور پر پلاسٹک کی مصنوعات اور قوم بنانے والے فرنیچر میں آگ سے تحفظ کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ کیمیکل جب نسل پالش میں ایک مخصوص مقدار میں شامل کیا جاتا ہے تو یہ خواتین خاص کر لڑکیوں کے جسم میں بڑی تیزی سے جذب ہو جاتا ہے۔ یہ جہاں نسل پالش کو دیر پا بناتا ہے وہاں یہ جسمانی ہارمونز کا توازن بھی دھیرے دھیرے بگاڑ دیتا ہے پھر ایک وقت آتا ہے جب یہ کیمیکل انسانی جسم میں ڈپریشن یا شدید قسم کے نفسیاتی امراض پیدا کر دیتا ہے۔ مریض کی عادت بن جاتی ہے کہ وہ غصے میں کوئی خطرناک کام بھی سرانجام دے سکتا ہے۔ میری سوچ کے مطابق ہم بار بار کے زیر استعمال نسل پالش میں اس کی مقدار زیادہ کر دیتے ہیں۔ اتنی زیادہ کہ یہ جلد جسم میں بگاڑ پیدا کر دے۔ جب یہ کیمیکل حاوی ہو جائے گا اس کو خودکشی پر مجبور کر دیں گے۔“ جان نے واقعے کی تفصیل بتائی۔

”یہ بہت مشکل اور زیادہ وقت لینے والا عمل ہے۔ اس کے لیے کون اتنا انتظار کرے پھر اس بات کی بھی کوئی گارنٹی نہیں کہ بار بار غصے میں ہمیں ہی نکل کر ڈالے۔ وہ تو اب بھی میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ جان..... مجھے زندگی

اپریل کی محبت کا فسوں جان لگی رگ رگ میں سما چکا تھا۔ بار بار بدلتے ہوئے حالات اور دم توڑتی محبت کو دیکھ دیکھ کر ذہنی الجھاؤ کا شکار ہونے لگی تھی اور عجیب و غریب حرکات کرنے لگی تھی۔ ایک روز تو اس نے باقاعدہ سبزی کاٹنے والی چھری سے اپریل پر حملہ کر دیا۔ وہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسی لمحے جان فلیٹ پر پہنچ گیا اور اس نے اپریل کی جان چھڑائی۔

”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی۔“ بار بار غراتے ہوئے بولی تو اپریل نے جان سے کہا۔

”تم دیکھ رہے ہو جان..... یہ عقل و شعور کی تمام حدیں عبور کر چکی ہے۔ اب ہمیں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہوگا۔ ہر حال میں..... تاکہ ہم آسانی سے اپنا مستقبل سنوار سکیں۔“

”ہوں..... میں بھی یہ سوچ رکھنے لگا ہوں.....“ جان نے کہا۔

جان نے بار بار کوٹھیسٹ کر اس کے کمرے میں بند کر دیا تھا اور وہ پریشان اپریل کو نہ صرف تسلیاں دے رہا تھا بلکہ جان چھڑوانے کے منصوبے میں اس کا معاون بننے کا بھی فیصلہ کر چکا تھا۔

☆☆☆

وہ دونوں کمرے میں بیٹھے یہی بات سوچ رہے تھے کہ بار بار سے کس طرح چھٹکارا حاصل کیا جاسکتا ہے۔ وہ دونوں اپنی محبت کے اس مقام تک جا پہنچے تھے جہاں انہیں اپنے سوا سب دشمن نظر آنے لگے تھے۔ بار بار کی ذہنی حالت دیکھ کر اسے ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے بتایا کہ کسی اچانک ذہنی صدمے کے باعث یہ دماغی تناؤ کا شکار ہوئی ہے اور اس نے جو ادویات اسے دینے کا کہا تھا اس میں نیند کی ادویات زیادہ تھیں کیونکہ ان کے استعمال سے اس کی ذہنی حالت کو سکون ملتا۔

”اگر وہ تندرست ہو جاتی ہے تو یہ احتمال تو رہے گا ہی کہ وہ ہماری محبت کو کسی طور قبول نہیں کر سکے گی۔“ اپریل نے مایوسی سے کہا۔

”بہر حال ہمیں اس کا حل ڈھونڈنا ہوگا۔ پانی سر سے اونچا ہونے سے پہلے پہلے.....“ جان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
”ہوں..... لیکن جلد..... اس سے پہلے کہ وہ تندرست ہو کر دوبارہ ہماری جان کو آئے۔“ اپریل نے اس کی بات میں ہاں ملائی۔ کچھ دیر تک جان اور اپریل دونوں خاموش رہے پھر جیسے جان نے کوئی خزانہ پالیا ہو وہ جیننے کے انداز میں بولا۔

”اگر وہ تندرست ہو جاتی ہے تو یہ احتمال تو رہے گا ہی کہ وہ ہماری محبت کو کسی طور قبول نہیں کر سکے گی۔“ اپریل نے مایوسی سے کہا۔

”بہر حال ہمیں اس کا حل ڈھونڈنا ہوگا۔ پانی سر سے اونچا ہونے سے پہلے پہلے.....“ جان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
”ہوں..... لیکن جلد..... اس سے پہلے کہ وہ تندرست ہو کر دوبارہ ہماری جان کو آئے۔“ اپریل نے اس کی بات میں ہاں ملائی۔ کچھ دیر تک جان اور اپریل دونوں خاموش رہے پھر جیسے جان نے کوئی خزانہ پالیا ہو وہ جیننے کے انداز میں بولا۔

”بہر حال ہمیں اس کا حل ڈھونڈنا ہوگا۔ پانی سر سے اونچا ہونے سے پہلے پہلے.....“ جان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
”ہوں..... لیکن جلد..... اس سے پہلے کہ وہ تندرست ہو کر دوبارہ ہماری جان کو آئے۔“ اپریل نے اس کی بات میں ہاں ملائی۔ کچھ دیر تک جان اور اپریل دونوں خاموش رہے پھر جیسے جان نے کوئی خزانہ پالیا ہو وہ جیننے کے انداز میں بولا۔

”تم کتنے اچھے ہو جان..... میری سوچوں سے بھی بڑھ کر اچھے.....“ باربرانے ایک بار پھر جتایا۔ تھوڑی خاموشی کے بعد وہ پھر یوں۔

”اچھا ایک بات بتاؤ۔ تم اپریل کے پاس اب تو نہیں جاؤ گے۔ وہ بہت بری عورت ہے، کسی کو پانے کے لیے وہ بدی کی آخری حد تک بھی جاسکتی ہے۔“ باربرانے سانس لیتے ہوئے دوبارہ کہا۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ تم میڈیسن لو اور آرام سے سو جاؤ۔ میں نے ابھی جا ب پر جانے کی تیاری بھی کرنی

بہت عزیز ہے، میں مرنا نہیں چاہتی.....“ اپریل کے لہجے میں اب خاصی تشویش پائی جانے لگی تھی۔

”دیکھ لو..... اس سے ہم پر کوئی الزام بھی نہیں آئے گا۔ ہم اس کی ٹرانسپیرنٹ نیل پالش اور نیل پالش ریور میں اس کیمیکل کی مقدار کو جتنا چاہیں بڑھا سکتے ہیں تاکہ ہمیں اس کا جلد نتیجہ مل جائے۔ یہ طریقہ شفاف ہے.....“ جان نے دوبارہ زور دیا اور پھر کچھ سوچنے کے بعد اپریل بھی اس بات پر رضامند ہو گئی۔

☆☆☆

منصوبے کے مطابق دونوں نے پہلا کام یہ کیا کہ کسی کو بتائے بغیر چرچ میں جا کر شادی کرنی۔ اس بات کی خبر باربرانے کو بھی نہیں دی گئی۔ شادی گویا جان کا اس فلیٹ میں رہنے کا کھلا اجازت نامہ تھی۔ دوسرا کام جان کے ذمے تھا۔ اس نے باربرانے کے کمرے سے اس کی پسندیدہ نیل پالش کی تمام بوتلیں (شیشیاں) اٹھالیں اور ان کی جگہ نئی انہی رنگوں کی شیشیاں رکھ دیں۔ وہ چونکہ کاسمیٹک بنانے والی فیکٹری میں لیبارٹری انچارج تھا۔ اس لیے اسے یہ کیمیکل ملنے میں کوئی پریشانی بھی نہ تھی۔ باربرانے ان دنوں ویسے ہی ذہنی دباؤ کا شکار تھی۔ لہذا جان کی یہ ڈیوٹی تھی کہ وہ باربرانے کے ساتھ ساتھ رہے اور اس کو ذہنی طور پر اس بات کا یقین دلاتا رہے کہ وہ بے حد بیمار ہے اور اس کی یہ بیماری بے حد جان لیوا ہے۔ ٹرائی فینائل فاسفیٹ کی حد سے زیادہ مقدار اس کی نیل پالش اور ریور میں ملا دی گئی تھی۔ اب ہر روز صبح سویرے جان خود اپنے ہاتھوں سے باربرانے کے ہاتھوں پر پہلے نیل پالش ریور سے پرانی نیل پالش اتارتا اور پھر نئی نیل پالش لگا دیتا۔

”جان! تم کتنے اچھے ہو۔ میں ہی غلط تھی۔ تم بیماری میں میرا کتنا خیال رکھنے لگے ہو۔“ ایک روز باربرانے جان سے کہا تو جان نے فوراً اسے گلے لگا لیا اور بولا۔

”میں تم سے بے حد بیمار کرتا ہوں۔ کوئی بات نہیں زندگی میں ایسی غلطیاں تو ہوتی رہتی ہیں۔“

اس پر باربرانے کے ہرے کانچ کی آنکھوں میں پانی اتر آیا۔ ”اپریل میری ماں نہیں ہے۔ اسے مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں، اگر ایسا ہوتا تو وہ بھی اپنی جیٹی کی محبت کو چھیننے کی کوشش نہ کرتی۔ کاش ایسے میں میرا باپ زندہ ہوتا تو میں اس کے پاس چلی جاتی۔ اب تو یہ بیماری ہی میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔“

”گھبرانے کی ضرورت نہیں، میں ہوں نا..... تمہارے ساتھ.....“ جان نے اس کی ڈبڈبائی آنکھوں کا پانی صاف کرتے ہوئے کہا۔

قاریمن مستوحہ کیوں



کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے متدرج ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چاؤ دستیاب نہ ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام۔

☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

شعبہ عیاشی 0301-2454188

طاسو سٹور ڈاکسٹری بیٹلر ڈسٹری

سٹیٹن حاسوی بلڈنگ

0668-C

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

انگلیوں کے نام

- واہیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے شروع کریں
- 1۔ آئین
 - 2۔ امانت
 - 3۔ جنت
 - 4۔ شہادت
 - 5۔ فرض۔

مرسلہ۔ محمد جاوید خان، تحصیل علی پور

ہے۔" جان نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا اور اس کے کمرے سے نکل گیا۔

کمرے کے باہر اپریل آفس جانے کے لیے کھڑی تھی۔ اس نے جان کی آنکھوں میں جھانکا تو جان نے سب اچھا کی رپورٹ دی۔

"نگل رات پڑوسی باربرا کی صحت کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔" اپریل نے کہا۔
"تو....." جان نے پوچھا۔

"تو میں نے انہیں بتایا کہ اس کی طبیعت سدھرنے کے بجائے دن بدن بگڑتی جا رہی ہے۔ کئی ڈاکٹر بدل لیے، اب ہم اسے اسپتال میں داخل کروانے کا سوچ رہے ہیں۔" اپریل نے بتایا۔

"گڈ..... تم بہت ذہین ہو....." جان نے کہا۔
"ذہین نہ ہوتی تو مس امریکا کیسے بنتی....." اپریل نے ہنستے ہوئے جان کے گال پر چٹکی بھرتے ہوئے جواب دیا۔

"ناشٹا کر لیا ہے کیا....." جان نے پوچھا۔
"میں نے کر لیا ہے اور تمہارا ناشٹا پڑا ہے اگر مجھے میرے آفس پہنچانے کا وعدہ کر دو تو میں کچھ دیر اور تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں۔" اپریل نے کہا تو جان بولا۔
"ہوں..... اب یہ بوجھ بھی مجھے اٹھانا ہوگا۔"

"بہوی ہوں تمہاری..... ایک دوسرے کو بوجھ جانیں گے تو کیسے گزر ہوگی۔" اپریل نے کہا تو جان ہنس پڑا۔
"باربرا دن بھر کمزور ہو رہی ہے۔" اپریل نے کہا۔
"وہ پہلے ہی بیمار تھی۔ اوپر سے کیمیکل بدن میں متواتر جانے سے وہ تیزی کے ساتھ اپنی قوت مدافعت کھو رہی ہے، مجھے لگتا ہے ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔" جان نے ناشٹا کرتے کرتے بتایا۔

اسی شام اپریل آفس سے واپس آئی تو ابھی جان نہیں آیا تھا۔ وہ آتے ہی باربرا کے کمرے میں گئی۔ باربرا بستر پر لیٹی ہوئی چھت کو گھور رہی تھی۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ بہہ کر نکلیے بھگور رہا تھا۔ اپریل کو باربرا کی حالت پر کچھ ترس آیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کے پيالے میں اس کا چہرہ لیتے ہوئے باربرا کے ماتھے کو چوم لیا اور بولی۔

"کس قدر کمزور ہو گئی ہے میری بیٹی..... اب تو میڈیسن بھی تم پر اثر نہیں کرتی۔ لگتا ہے، یہ موڈی مرض میری بیٹی کی جان لے کر ہی رہے گا۔" چیخ..... چیخ.....

باربرا نے اپنی دیران اور بے بس آنکھوں سے اس کی

طرف دیکھا تو کچھ کہنے کے لیے اس کے ہونٹ کاٹنے لگے۔
"ہاں..... ہاں..... یولو بیٹی..... میں سن رہی ہوں۔" اپریل نے جھوٹ موٹ اپنی آنکھوں کے کولوں کو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"ماما..... میں جینا چاہتی ہوں..... مجھے بچالو....." وہ باقاعدہ رونے لگی تھی۔

"ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں مگر صحت وینا ہمارے بس میں تھوڑی ہے۔" اپریل نے اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"میں سسک سسک کر جینے سے مرنے کو زیادہ ترجیح دوں گی۔" وہ ہچکیوں میں بولی۔

"موت اور زندگی بڑے دھیرے دھیرے اپنا جال پھیلاتی ہیں، تم ہو جاؤ..... میں تمہارے کھانے کا بندوبست کر کے تمہیں جگا دوں گی۔ ہو سکتا ہے تمہیں کچھ افاقہ ہو جائے۔" اپریل یہ کہہ کر اس کے پاس سے اٹھ آئی۔
جب جان واپس آیا تو اپریل نے ساری گفتگو اسے سنا دی۔ وہ کہنے لگا۔

"کیمیکل کی زوداثری کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مریض کو اس کی بیماری کی شدت کا اس قدر احساس دلا دیا جائے کہ وہ زندہ رہنے کے بجائے موت کو ترجیح دینے لگے اور یہ کام تم جاری رکھو....."

☆☆☆

ڈاکٹر نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ مریضہ کے جسم میں موجود ہارمونز بڑی تیزی سے بگڑ رہے ہیں۔ اسے فوری طور پر اسپتال میں داخل کروا دیا جائے۔

اپریل نگلاہی بڑی محاط اور ہوشیار عورت تھی۔ اس نے فوراً آفس سے چھٹی لی اور جان کو کیکٹری ٹیلی فون کر کے بتایا۔

"ڈارلنگ، باربرا کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ڈاکٹر نے اسے فوری طور پر اسپتال لے جانے کو کہا ہے۔ میں

اسے اسپتال لے کر جا رہی ہوں، کبھی پڑھ بھی دوں آجانا۔ میں اگر جلدی آگئی تو تمہیں دوبارہ اطلاع دے دوں گی۔“

وہ اسے اسپتال لے آئی۔ وہ شدید ڈپریشن کی وجہ سے بار بار بے ہوش ہو رہی تھی۔ جب ہوش میں آئی تو رونا شروع کر دیتی تھی۔ ڈاکٹروں نے فوری طور پر اسے چیک کیا اور مختلف انواع کے ٹیسٹ لکھ دیے۔ اسپتال ہی میں بار بار کے ٹیسٹ لیے گئے اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ کسی میڈیسن کی وجہ سے اس کے جسم کے ہارمونز کا توازن بڑی تیزی سے بگڑ رہا ہے۔ اگر فوری طور پر اس عمل کو نہ روکا گیا تو مریضہ کسی وقت بھی نفسیاتی دباؤ کے تحت خودکشی کر سکتی ہے۔

رپورٹ پڑھ کر اپریل نے سکون سا محسوس کیا۔ گویا اب وہ اپنی منزل پر پہنچنے والے تھے۔ بار بار کو اسپتال میں داخل کر لیا گیا تھا اور اس کا علاج شروع ہو چکا تھا۔ ایک روز بار بار نے سخت نقاہت میں جان کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم اب فیکٹری نہیں جاتے؟ میرے پاس نیل پالش نہیں ہے۔ دیکھتے نہیں ہو، میرے ناخن کس قدر اجڑے اجڑے لگ رہے ہیں۔“

”ہوں..... میں شام کو آتے ہوئے لے آؤں گا، گھر میں تو موجود ہے.....“ جان نے تسلی دی۔

مردیہ اصولوں کے مطابق اسپتال میں کسی بیمار کی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے جان بار بار کو مطلوبہ اشیا فراہم کر کے چلا گیا تھا۔ اسپتال میں بھی بہترین میڈیسنز کی فراہمی کے باوجود بار بار کو افاقہ نہیں ہو رہا تھا اور اس کی حالت تیزی سے بگڑتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر خود اس کی حالت دیکھ کر پریشان تھے۔ پھر ایک روز ڈاکٹروں نے اسے اسپتال سے چھٹی ذمے دی تو اپریل اور جان اسے واپس گھر لے آئے۔ بار بار کا کھانا پینا چھوٹ چکا تھا اور اس کے مزاج میں شدید غصہ شامل ہو چکا تھا۔ کوئی بھی بات اس کے مزاج کے خلاف ہوتی تو وہ شور مچا دیتی۔ اس روز تو حد ہی ہو گئی تھی۔

جان اور اپریل کی چھٹی تھی۔ وہ دونوں گھر پر تھے کہ جان نے دوست کے گھر جانے کو کہا۔ اپریل نے ضد کی کہ وہ بھی اس کے ساتھ جائے گی مگر جان نے منع کر دیا۔ اسی بات پر دونوں کے درمیان ایک ہلکی سی جھڑپ بھی ہوئی تھی۔ جان اکیلا ہی چلا گیا۔ اپریل اپنے کمرے میں بیٹھی تھی کہ بار بار لڑکھرائی ہوئی اس کے کمرے میں آگئی۔ نقاہت کی وجہ سے وہ بار بار گر رہی تھی۔ پھر بھی اہمیت کر کے وہ اٹھی اور اپریل پر چبھی۔

ہوں۔ تم اس طرح میرے جان کو مجھ سے چھین لو گی؟ میں آج تمہاری وہ خوب صورتی ہی ختم کر دوں گی جس پر تمہیں اس قدر ناز ہے۔“

ابھی اپریل سمجھنے بھی نہ پائی تھی کہ وہ بھاگتے ہوئے لیکن سے چھری اٹھالائی اور اسے موقع دینے بغیر اس پر حملہ کر دیا۔ اپریل نے اس کے ہاتھ سے چھری چھیننے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں وہ زخمی بھی ہو گئی مگر اس نے چھری چھین لی اور اسے پٹینے لگی۔

”تم مریکوں نہیں جانتیں، میرے لیے مصیبت کھڑی کر رکھی ہے۔“ اپریل اسے مارتے ہوئے چبھی۔

”تمہیں بار کر مروں گی چڑیل، تم نے میری خوشیاں چھینی ہیں۔ میں تمہیں بھی خوش نہیں رہنے دوں گی.....“ یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر اس پر چبھی اور پھر اپنے جوش میں خود ہی زمین پر گر پڑی۔

”کاش میں ہی مر جاؤں.....“ وہ کراہی۔

”خدا کرے، تم مر جاؤ۔“ اپریل نے کہا۔ وہ آہستہ آہستہ زمین سے اٹھی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شام کو جب جان واپس آیا تو اس نے اپریل کو زخمی دیکھ کر پوچھا۔

اپریل نے ساری بات اس کے گوش گزار کر دی۔ وہ بھی غصے میں آ گیا اور جلدی سے بار بار کے کمرے میں گھس گیا۔ بار بار نے اسے دیکھتے ہی غرا کر کہا۔ ”آگے ہو اس حرافہ کا بدلہ لینے..... اسے دیکھ کر بہت دکھ ہو رہا ہوگا..... وہ تمہاری محبوبہ جو ہوگی۔ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے، اس کا جسم بھی مجھ سے زیادہ اچھا ہے۔ تمہیں پسند بھی بہت ہے نا..... جاؤ دفع ہو جاؤ.....“ بار بار اچھتی رہی۔

”یقیناً اب تمہیں مر ہی جانا چاہیے۔ ورنہ میں خود تمہیں موٹ کے منہ میں دھکیل دوں گا۔“ جان نے غصے سے کہا تو وہ بستر سے اٹھ کر اس کے مقابل آ کر کھڑی ہو گئی اور چبھی۔

”لو مار ڈالو مجھے..... میں خود اس زندگی سے اکتانگئی ہوں۔“ ممکن تھا کہ وہ آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ لیتی۔

جان نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔

”مٹھو تم ایسے نہیں مردگی۔“

پھر اس نے قریبی الماری سے پتل نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا اور بولا۔

”لو کر لو خودکشی..... تاکہ ہم سب کی جان چھوٹ جائے۔“

کچھ ہی دیر بعد گولی کی آواز آئی..... اپریل اور جان بھاگ کر گئے تو سیز جیوں اور کمرے کے درمیان کور پڈور میں مر گئی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کپریڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

پولیس اسٹیشن طلب کیا ہے کہ اگر تم جانے ہو تو سیدھے
 طریقے سے بتا دو۔“

”یقین کیجئے مقتولہ نے خودکشی کی ہے۔ اس کی ذہنی
 کیفیت کچھ اس طرح کی تھی کہ وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ یہ اس
 کی میڈیکل رپورٹس ہیں جو اس کی ذہنی کیفیات اور بیماری
 کی ہیں۔“ جان نے اپریل سے باربرا کی میڈیکل رپورٹس
 کی فائل لے کر اسپیکر کو پکڑتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، مگر جب تک تمہارے فکر پرنس کی
 رپورٹ نہیں آ جاتی، تم دونوں پولیس کی حراست میں رہو
 گے۔“ اسپیکر نے فائل ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

”اب کیا ہوگا؟“ اپریل نے پریشانی سے جان کے
 کان میں کھسپھسپھس کرنا۔

”کچھ نہیں کہا جاسکتا۔“ جان نے آہستگی سے جواب دیا۔
 ”گوئی تو تم نے ہی ماری تھی۔“ اپریل نے اسی لہجے
 میں کہا۔

”خاموشی بہتر ہے۔“ جان بولا۔

اگلے ہی روز فنگر پرنٹ ایگزامینر کی رپورٹ آ گئی۔
 دوسرا فنگر پرنٹ جان کی انگلیوں کے نشانات سے ملتا تھا۔
 اسپیکر نے کہا۔

”اگر تم آسانی سے قتل کا اعتراف کر لو گے، تو بہتر
 رہے گا کیس میرے سامنے روز روشن کی طرح عیاں ہو چکا
 ہے۔ یہ میری میز پر پڑی نسل پالش کی شیشی بھی ایک پختہ
 گواہی ہے تمہارے خلاف۔“ کیمیکل ایگزامینر رپورٹ کے

مطابق مارکیٹ میں ملنے والی اسی برانڈ کی نسل پالش میں
 مضبوط کیمیکل کی مقدار اتنی زیادہ نہیں جتنی اس میں شامل
 ہے۔ ڈاکٹروں کے مطابق تم نے یا دونوں نے دانستہ طور پر
 اس میں کیمیکل کی مقدار اس لیے بڑھا دی تاکہ اس کیمیکل
 سے مقتولہ کے جسمانی ہارمونز کا توازن بگڑ جائے اور وہ
 ڈپریشن یا کسی شدید نفسیاتی دباؤ کے تحت خودکشی کر لے اور
 جب مرنے والی نے خودکشی نہ کی تو تم نے اسے اشتعال دلا
 کر اسے قتل کر ڈالا۔“

اقبال بیان میں جان نے اپنا جرم قبول کرتے ہوئے
 اپریل کو بھی اپنا سہمی اور اعانت جرم کا شریک بنا دیا تو اسپیکر
 نے کہا۔ ”یقیناً تم نے انتہائی مضبوط جال بنا تھا مگر اس کی
 کچھ جگہیں ڈھیلی رہ گئی تھیں۔“

”کاش مجھے اپریل کی خطیر انٹورس کی رقم کا لالچ نہ ہوتا۔“
 جان مردہ آواز میں بولا۔ دونوں لاک اپ کی طرف بڑھ گئے۔

میں باربرا کی لاش پڑی تھی، گوئی کبھی پرگئی تھی جہاں سے لہو
 کی پتلی سی لکیر اس کے چہرے سے ہو کر زمین پر پھیل گئی جان نے
 آگے بڑھ کر اس کو چیک کیا۔

”مرچکی ہے.....“ وہ بولا۔

”تم فوراً پولیس کو اطلاع دو۔“ اپریل نے خوفزدہ
 لہجے میں کہا۔

جان نے پولیس اسٹیشن اطلاع دی تو وہاں سے
 پولیس انسپکٹر اور دو سپاہی فوراً ہی ان کے ظہیر پر پہنچ گئے۔
 ضروری کارروائی کے بعد وہ لاش لے کر چلے گئے۔

☆☆☆

لاش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ اور کیمیکل ایگزامینر
 رپورٹس موصول ہوتے ہی پولیس اسٹیشن سے جان کو ٹیلی
 فون آیا کہ دونوں پولیس اسٹیشن رپورٹ کریں۔

”باربرا کی میڈیکل رپورٹس ساتھ ضرور لے لیتا۔“
 جان نے چلتے ہوئے اپریل سے کہا۔

”ہوں..... میں پہلے ہی سوچ رہی تھی۔ جان کچھ
 ہوگا تو نہیں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ اپریل نے لرزتی
 آواز میں پوچھا۔

”ارے نہیں..... ہم ہر طرح سے محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر
 اور اسپتال کی میڈیکل رپورٹس ہمارے لیے مضبوط گواہی
 ہیں۔“ جان نے کہا۔ پھر بولا۔ ”جلدی چلو..... ہمیں جلدی
 پولیس اسٹیشن پہنچنا ہوگا۔“

☆☆☆

”تم دونوں کا پھیلایا ہوا جال یقیناً بہت مضبوط تھا مگر
 نادانستگی میں اس کی کچھ گڑبڑیں ذرا ڈھیلی رہ گئیں جس کی بنا پر
 میں تمہیں مجبوراً تقبیل میں شامل کر رہا ہوں۔“ پولیس انسپکٹر
 نے انہیں اپنے سامنے پا کر کہا۔

”دیکھو لاش کی پوسٹ مارٹم رپورٹ، کیمیکل اور
 دوسری رپورٹوں کے مطابق وقوعہ کے دن جس ہسپتال سے
 مقتولہ نے خودکشی کی ہے، اس ہسپتال کے دستے پر مقتولہ کی

انگلیوں کے نشانات کے ساتھ ساتھ کچھ اور نشانات بھی
 پائے گئے ہیں۔ لگتا ہے، جیسے مقتولہ کو آگے قتل کسی نے خود
 پکڑایا ہے۔ ٹریگر پر بھی انہی انگلیوں کے نشانات ہیں جو

ہسپتال کے دستے پر ہیں۔ قرآن بتاتے ہیں کہ کسی انتہائی عیار
 اور چالاک قاتل نے مقتولہ کو قریب سے گولی مار کر قتل کر دیا
 اور پھر اس کے ہاتھ کی انگلی ہسپتال کے ٹریگر میں پھنسا دی۔

تاکہ ایسا لگے کہ مقتولہ نے خودکشی کی ہے۔ اس پر کس کی
 انگلیوں کے نشانات ہیں؟ میں نے اسی لیے آپ دونوں کو

شیخ نظام الدین

ضیائیم بلگرامی

اللہ کی مصلحتوں کو اگر انسان سمجھنے بیٹھے تو حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں۔ اللہ تعالیٰ کس طرح ایک بچے کی پیدائش سے لے کر اس کی موت تک ایک ایک پل کی تقدیر تحریر کرنا ہے کہ اس کا کون سا وقت اور کتنا وقت کس عمل میں صرف ہوگا... اور اس کا نتیجہ کیا نکلے گا اور بعد از مرگ اس کی واپسی کے سفر میں تمام اعمال اس کا زاد سفر کس طرح ٹھہریں گے۔ اللہ کے نیک بندے اسی غور و فکر میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ وقف کرتے اور لوگوں کو سکھاتے اور واپسی کا سفر اختیار کر لیتے ہیں۔ آپ کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔

رب کائنات کا قرب حاصل کرنے والے ایک

ولی کا قصہ



کہنتو کے قریب کا گوری کے ایک گاؤں ٹکراواں میں ایک ایسا خاندان اقامت گزریں تھا جس کا شجرہ نسب سہروردیہ سلسلے کے بانی حضرت شہاب الدین سے تعلق رکھتا تھا اور اگر شہاب الدین سہروردی سے آگے نظر ڈالی جائے تو پھر یہ سلسلہ نسب حضرت ابو بکر صدیقؓ تک پہنچتا ہے۔ ان خاندان کے صدق و ایمان پر سبھی متفق تھے۔ لوگ ان کی مثالیں دیتے تھے لیکن ان میں کوئی ایسا شخص نہیں پیدا ہوا تھا جس نے اپنے علم و ہنر اور غیر معمولی کارناموں سے... سلسلوں پر گہرے اور یادگار اثرات چھوڑے ہوں۔

اپریل 2016ء

271

سپنس ڈائجسٹ

Section

اس خاندان میں 1160ھ میں ایک بچہ پیدا ہوا، والدین نے بچے کا نام نظام الدین رکھا۔ اس کی پرورش و پرورش نہایت ناز و نعم میں ہوئی۔ جب ذرا ہوش سمجھا تو اسے پڑھنے کے لیے بٹھا دیا گیا، کوری میں علمی خاندانوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ یہ اپنے وقت کے چیدترین علماء سے تعلیم حاصل کرتا رہا۔ گھر والے بہت خوش تھے کہ نظام الدین نے اپنے معاملات میں خود ہی دیکھی لینا شروع کر دی تھی۔ انہیں اپنی تعلیم کے سلسلے میں بڑی فکر رہتی تھی۔ وہ لوگوں سے یہ پوچھتے رہتے تھے کہ بڑے بڑے عالم کہاں ملیں گے اور انہیں علم حاصل کرنے کے لیے کن عالموں سے رجوع کرنا چاہیے۔

ایک دن ایک عالم کا کوری پہنچا۔ ہر طرف اس کا چرچا ہونے لگا۔ بستی کے لوگ اس سے ملنے اور ہم کلام ہونے کو باعثِ عزت سمجھتے۔ نظام الدین کو علم کی طلب تو تھی ہی، یہ بھی اس عالم کے پاس جا پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ وقت انہیں دے دیں، عالم نے پوچھا۔ ”میاں صاحبزادے! تم مجھ سے کیا پڑھو گے؟ میں آج یہاں ہوں کل کہیں اور چلا جاؤں گا اور پڑھنے پڑھانے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ استاد اور شاگرد برابر کا وقت دیں۔ جو ظاہر ہے کہ میں نہیں دے سکتا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں کس طرح پڑھا سکتا ہوں۔“

نظام الدین نے مایوسی سے کہا۔ ”حضرت! اس کا یہ مطلب ہوا کہ میں ہمیشہ تشہ ہی رہوں گا!“
عالم نے جواب دیا۔ ”ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے لیے پڑھنا بہت ضروری ہے تو تم لکھنؤ چلو، وہاں کہیں رہنے کا انتظام کر لو، پڑھا میں دیا کروں گا۔“

نظام الدین نے بڑے افسوس سے کہا۔ ”افسوس کہ میں لکھنؤ نہیں جاسکوں گا حالانکہ جی بہت چاہتا ہے جانے اور پڑھنے کو۔“
عالم نے کہا۔ ”اگر تم لکھنؤ نہیں جاسکتے تو اور کہاں جاسکتے ہو۔ علم کا مسئلہ تو ایسا ہے کہ یہ سفر کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ ماضی میں ہمارے بزرگوں نے سیکڑوں اور ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے علم حاصل کیا تھا اور تم چند میل کا سفر بھی نہیں کر سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم میں طلبِ صادق نہیں، ورنہ ایسی بات نہ کرتے۔“

نظام الدین کے دل پر ان باتوں کا بڑا اثر ہوا۔ وہ کچھ دیر کھڑے سوچتے رہے، آخر پوچھا۔ ”اس وقت علم کے گہوارے کون کون سے ہیں؟ کیا آپ اس سلسلے میں میری راہنمائی فرمائیں گے؟“

عالم نے جواب دیا۔ ”لکھنؤ اور دہلی..... مشہور سبکی دونوں ہیں ورنہ ان دو کے علاوہ بھی کئی شہر ہیں۔“
نظام الدین اس وقت تو خاموش رہے، کچھ بھی نہیں بولے مگر کئی دن تک شش و پنج میں مبتلا رہے۔ وہ کوئی اہم اور بڑا فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ گھر کے بزرگوں نے انہیں فکر میں ڈوبے دیکھا تو پوچھا۔ ”نظام الدین! آخر کس سوچ میں ہو؟ خیریت تو ہے؟“
نظام الدین نے جواب دیا۔ ”لکھنؤ سے آنے والے عالم نے مجھے یہ عجیب و غریب بات بتائی ہے کہ بائیس میں ہمارے بزرگوں نے تحصیلِ علم کے لیے سیکڑوں ہزاروں میل کے فاصلے طے کیے ہیں۔ اگر یہ بات سچ ہے تو میں کتنا بد نصیب ہوں۔ اس عظیم مقصد کے لیے چند میل کا فاصلہ بھی طے نہ کر سکا۔“

ایک بزرگ نے جواب دیا۔ ”ہاں یہ بات درست ہے کیونکہ ہزاروں میل کا سفر کرنے والے بزرگ اس نکتے سے واقف تھے کہ سفر وسیلہ مظفر ہوتا ہے لیکن جب ہمارے ذہن سے یہ بات نکل گئی، ہم کچھ بھی نہ کر سکے۔ کسی ایک جگہ لوگ پیدا ہوئے اور وہیں مرکب گئے اور ان کے بارے میں دنیا یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ پیدا بھی ہوئے تھے یا نہیں۔“

نظام الدین نے کہا۔ ”تب پھر میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ میں علم کی خاطر سفر کروں گا۔ میں لکھنؤ نہیں دہلی جاؤں گا کیونکہ اس بڑے مقصد کے لیے اتنا مختصر سفر کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔“

گھر والے سنا لے کر آگئے۔ وہ نظام الدین کو منع بھی نہیں کر سکتے تھے، پھر بھی ایک بزرگ نے کہا۔ ”لیکن اپنے اس سفر سے پہلے اس کی اوجھ بچ پر ضرور غور کر لینا۔ اس راہ میں دشواریاں بھی بہت پیش آتی ہیں۔“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”میں تو ایک بات جانتا ہوں کہ کسی بھی عظیم مقصد کی حصولِ یابی کی راہ میں مشکلات اور دشواریاں بھی عظیم ہی پیش آتی ہیں۔ میں ہر صعوبت اور ہر مشکل پر قابو پانے کا تہیہ کر چکا ہوں۔“

نظام الدین کے جواب میں بڑی استقامت تھی۔ ان کے ایک، ایک لفظ میں قوتِ ارادی کا پرتو موجود تھا۔
اس گفتگو کے کئی دن بعد نظام الدین نے اپنے گاؤں کو چھوڑ دیا۔ سیدھے لکھنؤ پہنچے۔ وہاں دہلی جانے والے ایک قافلے میں شامل ہو گئے، اس قافلے میں وہ لوگ بھی تھے جو اکثر و بیشتر سفر کرتے رہتے تھے۔ ان سے انہوں نے یہ معلوم کیا کہ دہلی میں وہ کون اوگ ہیں جن کی علیت کا حرج ہے اور جو درس و تدریس میں مرتبِ خلافت ہیں۔ ان کے اس سوال کا تقریباً ہر ایک کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ ”حضرت کلیم اللہ جہان آبادی۔“ سلسلہ چشتیہ کے بزرگ اور عالم بے بدل کلیم اللہ جہان آبادی۔“

نظام الدین نے دہلی پہنچتے پہنچتے فیصلہ کر لیا تھا کہ انہیں سلسلہ چشتیہ کے اس آستانے پر دستک دینی ہے۔ وہ کلیم اللہ کے بارے میں

معلوم نہیں کیا کچھ سوچتے رہے۔ انہیں یہ اندیشہ بھی تھا کہ شاید یہ دوران کے لیے دکھلے کیونکہ کلیم اللہ کے آستانے پر ان جیسے معلوم نہیں کتنے لوگ حاضر یاں دیتے ہوں گے اور ان میں ہر شخص اس لاکھ نہیں ہوتا ہوگا کہ کلیم اللہ کا شرف و شاکر گردی حاصل کر لے۔
نظام الدین دہلی پہنچ کر قافلے سے جدا ہو گئے اور کلیم اللہ کے آستانے کا پتہ پوچھتے ہوئے پہنچ گئے۔ رات کا وقت تھا اور آستانے میں محفل سماع گرم تھی۔ یہ در پر دستک دینا چاہتے تھے کہ شیخ کے کسی مرید نے انہیں ایسا کرنے سے منع کیا۔ نظام الدین نے پوچھا۔ ”میں شیخ سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا شیخ نے ملاقاتیوں پر کوئی پابندی عائد کر رکھی ہے؟“
مرید نے جواب دیا۔ ”اس وقت اندر محفل سماع گرم ہے اور شیخ کا یہ عام حکم ہے کہ وہ اپنی اس محفل میں کسی اجنبی یا عام شخص کو نہیں داخل ہونے دیتے۔ اس لیے اگر تم نے دستک بھی دی تو امد سے یہی جواب ملے گا کہ شیخ حاضر ہی دینا۔“
نظام الدین کا دل ٹوٹ گیا۔ مرید سے عالم یاس میں پوچھا۔ ”شیخ کو یہ کس طرح معلوم ہوتا ہے کہ آنے والا اجنبی یا کوئی عام شخص ہے؟“

مرید نے حیرت سے انہیں دیکھا اور سوال کیا۔ ”تم ہمارے شیخ کی بابت کیا کچھ جانتے ہو؟“
نظام الدین نے جواب دیا۔ ”میں نے یہ سنا ہے کہ شیخ بہت بڑھے لکھے آدمی ہیں۔“
مرید نے پوچھا۔ ”بس یا اور کچھ بھی؟“

نظام الدین نے کہا۔ ”بس، اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟“
مرید نے کہا۔ ”تب پھر اے اجنبی..... تجھ کو رات کہیں اور بسر کرنا چاہیے۔ صبح آجانا، ممکن ہے شیخ کی نظر گرم ہو جائے ورنہ میرا خیال تو یہ ہے کہ وہ تمہیں اپنے حلقہ درس میں نہیں بٹھائیں گے۔“
نظام الدین نے پوچھا۔ ”یہ تمہیں کس طرح معلوم ہوا کہ میں ان کے حلقہ درس میں بیٹھنا چاہتا ہوں؟“
مرید نے جواب دیا۔ ”تم اپنی وضع قطع اور صورت شکل سے طالب علم نظر آتے ہو اور شیخ چونکہ روشن ضمیر ہیں اس لیے وہ آنے والے کے ارادے، نیت اور خصوصیت سے اسے دیکھے بغیر ہی واقف ہو جاتے ہیں۔“
نظام الدین نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میں تمہارے شیخ کا اس وقت امتحان کیوں نہ لے لوں۔ میں دروازے پر دستک ضرور دوں گا، خواہ یہ دروازہ کھلے یا نہ کھلے۔“

مرید نے مزاحمت کی۔ ”میں دروازے پر دستک نہیں دینے دوں گا۔“
لیکن نظام الدین نے مرید کی مزاحمت سے پہلے ہی دستک دے دی۔ مرید دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیے، بولا۔ ”اجنبی! تم نے یہ بہت برا کیا۔ بہر حال تم نے جو غلطی کی؟ اس کا اعادہ نہیں ہونے دوں گا۔“
نظام الدین نے کہا۔ ”بہتر ہے، میں دستک تو دے ہی چکا ہوں اور میں اپنی طلب صادق سے واقف ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تمہارے پیرومرشد اپنی روشن ضمیری سے یہ سبب جانتے ہیں یا نہیں۔“
کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ مرید نے مڑ کر اندر کی طرف دیکھا اور جلدی جلدی کہا۔ ”میں نے بڑی کوشش کی کہ دروازے پر دستک نہ ہونے دوں لیکن یہ ضدی شخص دھوکا دے کر دستک دینے میں کامیاب ہو گیا۔“ پھر پوچھا۔ ”شیخ نے یہی کہا ہوگا کہ اس شخص کو رخصت کر دیا جائے؟“

آنے والے نے جواب دیا۔ ”نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ شیخ نے پوچھا ہے کہ دستک دینے والے کا نام کیا ہے؟“
مرید حیران و پریشان نظام الدین کی صورت دیکھنے لگا۔
نظام الدین نے جواب دیا۔ ”اپنے پیرومرشد سے عرض کرو کہ نظام الدین شرف باریا بل چاہتا ہے۔“
وہ شخص واپس چلا گیا تو مرید نے نظام الدین کا مذاق اڑایا۔ ”میں جانتا ہوں کہ اس وقت ذلت اور خواری تیرا مقدر بن چکی ہے ابھی تک میں نے تم اور تمہیں سے مخاطب کیا لیکن جب میں نے یہ سمجھ لیا کہ تو ضدی اور خود مر انسان ہے تو میں تو اور تجھے پر اتر آیا۔“
نظام الدین نے جواب دیا۔ ”تم جن لفظوں میں بھی چاہو، مجھے مخاطب کرو۔ میں بہر حال میں نظام الدین ہی رہوں گا۔ تم نہ تو میرا مرتبہ بڑھا سکتے ہو اور نہ گھٹا سکتے ہو۔ میں جو ہوں وہی رہوں گا۔“

اس دوران وہ شخص واپس آ گیا۔ بولا۔ ”اے اجنبی! تجھے پیرومرشد یا فرما رہے ہیں، وہ تجھ سے اسی وقت ملنا چاہتے ہیں۔“
نظام الدین کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ انہیں واقعی طلب کر لیا جائے گا، پوچھا۔ ”کیا واقعی؟ کیا مجھے اندر طلب کیا گیا ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ ”ہاں، تجھ کو اسی وقت بلا لیا گیا ہے۔ پیرومرشد نے فرمایا کہ جاؤ نظام الدین کو بلاؤ۔“
اب تو نظام الدین کی حالت ہی خیر ہوئی۔ وہ بوگھل قدموں سے اندر داخل ہو گئے اور اضطراب، بے چینی سے شیخ کی طرف بڑھتے

رہے۔ کچھ دیر بعد یہ شیخ کلیم اللہ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اس وقت صبح کے آس پاس جو لوگ موجود تھے، انہیں حیرت تھی کہ یہ شیخ کو آج ہو کیا گیا ہے جو ایک اجنبی کو محفلِ سماع میں بلا لیا۔
ایک ارادت مند نے پوچھا۔ ”حضرت! دخل اجنبی در مجلس سماع دستور حضور نیست“ (حضرت! اجنبی کو مجلسِ سماع میں داخل کرنا حضور کا دستور نہیں ہے)

شیخ نے جواب دیا۔ ”اے مرد عزیز! است اجنبی نیست“ (یہ شخص عزیز و آشنا ہے، اجنبی نہیں)
نظام الدین نے شیخ کو سلام کیا۔ شیخ نے سلام کا جواب دے کر دریافت فرمایا۔ ”کہو، کیونکر آنا ہوا؟“
نظام الدین نے جواب دیا۔ ”حضرت! میں تحصیلِ علم کی خاطر حاضر ہوا تھا، آپ کی نظرِ کرم کا طالب ہوں۔“
شیخ نے پوچھا۔ ”بس یا اس کے علاوہ بھی کچھ؟“
نظام الدین نے جواب دیا۔ ”میں آیا تو اسی غرض سے ہوں، اس کے علاوہ اور کیا یہاں سے مل سکتا ہے، میں نہیں جانتا۔ حضور جو کچھ دیں گے، لے لوں گا۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”تم رہتے کہاں ہو؟“
انہوں نے جواب دیا۔ ”میں آپ کے شہر میں نو وارد ہوں، میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اگر آپ نے مجھ کو اپنے حلقہٴ درس میں شامل کر لیا تو رہنے کا کوئی ٹھکانا بھی کر لوں گا۔“
شیخ نے کہا۔ ”میں نے تجھے اپنے حلقہٴ درس میں شامل کیا اور تجھے رہنے کا ٹھکانا بھی دیا، تو یہیں میرے آستانے میں رہے گا، میں تیری طلبِ صادق کی قدر کرتا ہوں۔“
حاضرینِ رفق سے اس نو وارد کو دیکھنے لگے۔ شیخ نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ نظام الدین کو اس کے رہنے کی جگہ دکھا دی جائے۔ چنانچہ نظام الدین کو ایک چھوٹا سا حجرہ دے دیا گیا۔

اب تک جو کچھ اور جس انداز میں ہوا تھا، نظام الدین کو اس پر یقین نہیں آتا تھا لیکن جب اس حجرے میں ایک رات بھی بسر کر لی تو انہیں یقین آ گیا کہ وہ اپنا گوہر مقصود پا چکے ہیں لیکن انہیں شیخ کے سریدوں کی کیفیت دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی تھی۔ سریدین میں اکثر مسکرو جید میں جتنا نظر آتے۔ نظام الدین سوچتے، ان لوگوں کی یہ حالت کیونکر ہو جاتی ہے۔ انہیں تو بس ایک ہی بات معلوم تھی، وہ یہ کہ شیخ کے آس پاس جو لوگ موجود ہیں، وہ سب ان کی طرح طالبِ علم ہیں پھر یہ وجد و جذب کی کیفیت کیوں طاری ہو جاتی ہے اور ان پر طاری ہو جاتی ہے تو پھر خود نظام الدین پر یہ کیفیت کیوں نہیں طاری ہوتی؟ سوچتے سوچتے سر میں درد ہونے لگا مگر ان سوالوں کا کوئی معقول جواب نہیں مل سکا۔

دو پہر کا وقت تھا، نظام الدین اپنے استاد سے درس لے رہے تھے۔ یکا یک ایک ہلکا سا شورا اٹھا اور لوگ زور زور سے باتیں کرنے لگے پھر یہ لوگ کھڑے ہو کر ایک طرف بھاگے۔ نظام الدین نے کسی سے پوچھا۔ ”بھائی! آخر بات کیا ہے؟ یہ لوگوں میں خاموشی پھیل ہی کیوں گئی ہوئی ہے؟“

ایک نے جواب دیا۔ ”میاں صاحبزادے! شاید تم یہاں کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔“
نظام الدین نے کہا۔ ”اگر میں یہاں کے بارے میں کچھ جانتا ہوتا تو ایسا سوال نہ کرتا۔“
اس شخص نے کہا۔ ”میاں سادہ لوح صاحب! یہاں ظاہری تعلیم بھی دی جاتی ہے اور باطنی تعلیم بھی۔ تم نے شیخ سے کہا کہ تم ان سے ظاہری اور دنیاوی علوم حاصل کرنا چاہتے ہو، اس لیے باطنی علوم کے بارے میں تمہیں کچھ بھی نہیں بتایا گیا اور تم جب جذب و کیف میں مبتلا لوگوں کو دیکھتے ہو تو حیران اور پریشان ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے لگتے ہو اور اس کا سبب جاننے کی کوشش کرتے ہو۔“
نظام الدین نے آنے والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ ”بھائی! یہ کون صاحب ہیں اور انہیں ہاتھوں ہاتھ کیوں لیا جا رہا ہے؟“

ایک سرید نے جواب دیا۔ ”ہمارے پیر و مرشد شیخ کلیم اللہ کے مرشد شیخ یحییٰ مدنی ان دنوں مدینہ میں اقامت گزیر ہیں۔ یہ آنے والا شخص شیخ مدنی کا سرید ہے اور اپنے پیر بھائی شیخ کلیم اللہ سے ملاقات کرنے آیا ہے۔ یہاں والے اس کی زیارت اور ملاقات کی خاطر بھاگ دوڑ رہے ہیں۔“

نظام الدین نے پوچھا۔ ”آنے والا اس کے سوا تو کچھ نہیں کہ ہمارے شیخ کا پیر بھائی ہے؟“
سرید نے جواب دیا۔ ”نظام الدین! افسوس کہ تم ہمارے شیخ کے مرتے اور مقام سے واقف نہیں ہو۔“
نظام الدین نے کہا۔ ”کیوں واقف نہیں، ہمارے شیخ اس عہد کے نامی گرامی بلکہ بے نظیر و بے عدیل عالم ہیں۔“
سرید نے کہا۔ ”افسوس کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے۔“ اس کے بعد سرید نے نظام الدین کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ بولا۔ ”تم

میرے ساتھ آؤ اور جو کچھ دیکھو اسے بچھنے کی کوشش کرو۔
 نظام الدین اس کے ساتھ شیخ کے حجرے کی طرف بڑھے۔ مدینے سے آیا ہوا شخص اس وقت شیخ کے حجرے میں داخل ہو رہا تھا۔
 اس کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگ بھی حجرے میں داخل ہو گئے۔ ان داخل ہونے والوں میں نظام الدین بھی شامل تھے۔
 مہمان نے اندر داخل ہوتے ہی السلام وعلیکم یا شیخ، کہہ کر شیخ کلیم اللہ کو مخاطب کیا۔
 شیخ نے وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، کہہ کر جواب دیا اور اپنے پیر بھائی پر ہوش و خرد سوز نظر ڈالی۔ آنے والا مہمان ان نظروں کی تاب نہ لاسکا اور چیخ مار کر گر گیا۔ شیخ کے مریدوں نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر یہ سب کچھ اتنی تیزی سے اور اچانک ہوا کہ مہمان زمین پر گر چکا تھا۔

نظام الدین کی حیرت اور پریشانی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا، اپنے مرید ساتھی سے پوچھا۔ ”کیا یہ شخص کچھ بیمار ہے... یہ بے ہوش کیوں ہو گیا؟“
 مرید نے بڑے افسوس سے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم اپنے شیخ کی بابت کچھ بھی نہیں جانتے تو تمہیں یہاں سے چلا جانا چاہیے اور کسی ایسے شخص کی صحبت اختیار کرنی چاہیے جو محض عالم ہو اور کچھ نہیں۔“
 نظام الدین نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”بھائی! میں جو نہیں جانتا اگر اس کی بابت کچھ جانا چاہتا ہوں تو تم مجھے شرمندہ کیوں کرنا چاہتے ہو؟“

مرید نے کہا۔ ”بھائی! تو بات ہی ایسی کر رہا ہے۔ اپنے شیخ کلیم اللہ عالم باعمل کے ساتھ ہی یکاثر روزگار صوفی بھی ہیں۔ ان کا ظاہر بھی روشن ہے اور باطن بھی روشن ہے۔ ان کی باتوں میں اثر اور نظروں میں سحر ہے۔ مدینے سے آنے والے پیر بھائی کی نظریں شیخ کی پرسوز نظروں کی محفل نہ ہو سکیں اور یہ شخص بے ہوش ہو کر گر گیا۔“

اب نظام الدین کے اندر حرکت ہی ہوئی اور کچھ مدد جزر سا پیدا ہو گیا پوچھا۔ ”شیخ میں یہ اثر کمال کیونکر پیدا ہو گیا؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”ریاضت اور مجاہدے سے، تزکیہ نفس اور چلہ مشنی سے۔“
 نظام الدین نے پوچھا۔ ”اگر میں بھی یہ بات حاصل کرنا چاہوں تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟“
 جواب ملا۔ ”نفس کشی، مجاہدہ، ریاضت!“

نظام الدین نے پوچھا۔ ”کتنے دنوں تک؟“

جواب ملا۔ ”اپنے پیر و مرشد استاد سے رجوع کرو اور پوچھو کہ ان جیسا مقام تم کتنے دنوں میں حاصل کر لو گے؟“

نظام الدین کو شرم سی آگئی، سر جھکا کر پوچھا۔ ”میں یہ باتیں تم سے اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ انہیں اپنے استاد محترم سے نہیں پوچھ سکتا۔“

مرید نے کہا۔ ”بھائی! اپنے شیخ کی مردم شناسی اور عرفان کا یہ حال ہے کہ بات ابھی تمہارے ہونٹوں تک بھی نہیں آئی کہ یہ سب کچھ سمجھ گئے دن کے پاس پست بہت اور...“

نظام الدین نے بات کاٹ دی، بولے۔ ”ہاں... میں اپنے پیر و مرشد جیسا بننا چاہتا ہوں، کیونکہ ہادی ترقیاں دیتی ہیں اور میں پائیدار اور ناقابل شکست ترقی کرنا چاہتا ہوں۔“

مرید کو ان کی کسی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ نظام الدین مریدوں کو چیرتے اور دونوں ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے شیخ کے قریب پہنچ گئے اور انہیں جی بھر کے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے دل کو ٹٹول رہے تھے اور بچھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ شیخ کی نظروں کا ان کے دل پر اثر ہوتا ہے یا نہیں؟

شیخ نے انہیں سرسری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بات ہے نظام؟ خیریت تو ہے؟“

نظام الدین کو ایک جھٹکا سا محسوس ہوا، بولے۔ ”کوئی خاص بات نہیں استاد محترم!“

شیخ نے کہا۔ ”نہیں، کوئی خاص بات ہے۔ مجھے تم پریشان نظر آ رہے ہو۔“

نظام الدین کا دل بھر آیا، بولے۔ ”استاد محترم! میں اپنی مجبوری اور بے بسی پر پریشان ہوں۔ آپ کی نظروں نے آپ کے پیر بھائی کو بے ہوش کر دیا مگر یہی نظریں مجھ پر کوئی اثر نہیں کر رہیں۔“

شیخ نے جواب دیا۔ ”نظام! یہ دنیا ہی دوسری ہے، اس کی بابت دور کے لوگ کچھ بھی نہیں جانتے۔“

نظام الدین نے پوچھا۔ ”کیا میں اس دوری کو ختم کر سکتا ہوں؟“

شیخ نے جواب دیا۔ ”کیوں نہیں، اگر تم چاہتے ہو کہ یہ دوری دور ہو جائے تو اس کے لیے تیاری کرو، اس طرح جس طرح ایک عالم علم انسان کی تیاری کرتا ہے۔“

کچھ لوگوں نے شیخ کو بتایا کہ بے ہوش ہونے والا ہے بھائی، یہ بھی ہنسی ہنسی باتیں کر رہا ہے، آپ نے اس کو ڈانٹ دیا۔ یہ کیا بات ہے کہ تو کم نظریوں کی طرح ایک چلو میں الودھا جا رہا ہے، طرف پیدا کر۔ محل اور صبر سے کام لے۔“

شیخ کا ہیر بھائی آنسو بہا رہا تھا، بولا۔ ”شیخ! جب میں مدینے سے چلا تھا تو ہیر و مرشد نے مجھ سے بطور خاص کہا تھا کہ شیخ علیم اللہ سے نظریں نہ ملانا، ورنہ نقصان اٹھا جاوے گا۔ چنانچہ آج جب غلطی سے میں نظریں ملا بیٹھا تو میں نے اپنے اندر ایک زلزلہ محسوس کیا اور پھر میں بے ہوش ہو گیا۔“

شیخ نے کہا۔ ”بہر حال اتنی قوت پیدا کرو کہ تکیوں ملا سکو۔“ پھر نظام الدین سے پوچھا۔ ”اور تم نے بھی کچھ محسوس کیا یا نہیں؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”میں نے ایسی کوئی بات نہیں محسوس کی جو دوسروں کو بتا کر حیرت زدہ کر دوں۔“

شیخ نے کہا۔ ”یہ بات بھی نہیں ہونا چاہیے۔ تم بالکل کورے ہو، اس پر کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ کچھ نقش و نگار بنائے جا سکتے ہیں۔“ پھر کچھ توقف اختیار کیا، پوچھا۔ ”علوم دو قسم کے ہوتے ہیں، ظاہری اور باطنی۔ کیا تمہیں ان دونوں سے واقف ہے؟“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”ابھی تک تو میں ظاہری علوم حاصل کرتا رہا ہوں۔“

شیخ نے کہا۔ ”لیکن اگر تم چاہو تو باطنی علوم بھی حاصل کر سکتے ہو۔“

نظام الدین نے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“

شیخ نے جواب دیا۔ ”صحت سے..... بہت جدوجہد کرنا پڑے گی۔“

نظام الدین نے جواب دیا۔ ”میں اس کے لیے تیار ہوں۔“

شیخ نے سکوت اختیار کیا، ایسا سکوت جو مہینوں قائم رہا۔

نظام الدین کو شبہ ہوا کہ شیخ بے التفاتی برت رہے ہیں، انہیں بڑا دکھ ہوا مگر شیخ سے شکایت بھی نہیں کر سکتے تھے۔ خود بھی خاموش ہو گئے اور کسی موقع کا انتظار کرنے لگے۔

ایک دن ظہر کی نماز کے بعد جب شیخ نے اٹھ کر اپنے جوتے تلاش کیے تو دیکھا نظام الدین انہیں ہاتھوں میں لیے بیویوں کھڑے ہوئے ہیں۔ پھر یہ جوتے شیخ کے قدموں میں رکھ دیے۔ شیخ نے نظام الدین کو بغور دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ ”توجہ بکسب علوم باطنی اولیٰ و احسن است (علوم باطنی حاصل کرنے کی توجہ کرنا اول و احسن ہے)“

نظام الدین نے جواب میں شعر پڑھا۔

پہر دم تو دانی حساب تو مایہ خویش
راہِ کسبِ علم و پیش راہِ خویش

اس شعر نے شیخ کی حالت غیر کر دی، وہ عجب گئے اور کہا ”نظام الدین! یہ تو نے کیا شعر پڑھ دیا؟“

نظام الدین گھبرا گئے، وہ سمجھے شاید اس شعر نے شیخ کو کسی وجہ سے آزرہ کر دیا ہے۔

شیخ نے کہا۔ ”تو پریشان نہ ہو، جب میں مدینے سے چلا تھا تو میرے ہیر و مرشد شیخ یعنی مدنی نے مجھ سے فرمایا تھا کہ ایک شخص جس کا نام نظام الدین ہوگا، تیرے پاس آئے گا۔ وہ کچھ عرصہ تجھ سے علوم ظاہری حاصل کرے گا پھر چانگ اس کی توجہ علوم باطنی کی طرف ہو جائے گی۔ جب وہ تجھ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کرے گا تو یہ شعر (مندرجہ بالا شعر) پڑھے گا۔ جب اور جو شخص یہ شعر پڑھے گا، اس کی طلب صادق ہوگی اور اس پر خصوصی توجہ دینا لازم ہو جائے گا۔“

نظام الدین بے حد خوش ہوئے مگر اس خوشی میں کوئی ایسی و سکی بات نہیں شامل ہوئی۔

شیخ کی خدمت میں ایک اور مرید آ گیا۔ یہ شخص بھی مدینہ منورہ سے آیا تھا۔ شیخ نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پوچھا۔ ”کسی کے آنے سے اتنا اداس پہلے بھی نہیں ہوا تھا، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟“

آنے والے نے شیخ کی طرف دیکھا اور شیخ مار کر بے ہوش ہو گیا۔ نظام الدین نے دوسری بار یہ مسترد دیکھا تھا۔ پوچھا۔ ”حضرت! یہ کیا ہے؟“

شیخ نے جواب دیا۔ ”نظام! یہ بھی ایک علم ہے جو تمہیں بھی تعلیم کیا جائے گا۔“

نظام الدین نے ایک سوال اور کیا۔ ”معلوم نہیں کیوں، میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ یہ آنے والا بے ہوش شخص کوئی خاص خبر لے کر آیا ہے۔ کون سی خاص خبر؟ مجھے پتا نہیں لیکن کیا شیخ کو بھی اس کا کوئی علم نہیں؟“

شیخ نے نظام الدین سے نظریں ملاتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہاں، یہ شخص مدینہ منورہ سے بڑی اندوہناک خبر لایا ہے۔ مجھ میں اتنی اہمیت نہیں کہ ان سے کہوں کہ تو جو خبر لایا ہے اسے سناوے لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ میں اپنے ہیر و مرشد کی بابت کوئی اندوہناک خبر سنوں، اس لیے میں اس سے کوئی سوال بھی نہیں کر سکا۔“

مریدوں نے بے ہوش شخص کو کوشش کرنے کے محسوس کر لیا۔ اس کے ہوش میں آنے کی تیاری سے پوچھا: "میرے نووارد مہمان! میرے پیر و مرشد کا کیا حال ہے، وہ خیریت سے تو ہیں؟" آنے والا زار و تقارر رونے لگا، اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ روتے ہوئے جواب دیا۔ "شیخ! آپ کے پیر و مرشد کا وصال ہو چکا ہے۔"

شیخ نے ایک آہ بھری اور سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ اس دن شیخ ہمیشہ سے زیادہ طویل اور افسردہ رہے۔ انہیں کچھ اچھا ہی نہ لگتا تھا۔ آخر اسی عالم میں انہوں نے نظام الدین سے کہا۔ "نظام! کئی دن کے غور و فکر کے بعد میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہیں باطنی علوم بھی سکھانے چاہئیں چنانچہ کل سے یہ کام شروع ہو جائے گا۔"

نظام الدین پر خوشی کا ایسا دورہ پڑا کہ گر گئے اور دیر تک نیم مد ہوشی کی کیفیت میں مبتلا رہے۔ حسب وعدہ نظام الدین کو درس دیا جانے لگا۔ نظام الدین نے بھی اپنا سب کچھ بھلا دیا۔ انہیں بڑی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ یہ بھی جانتا چاہتے تھے کہ شیخ کا خلیفہ کون ہوگا؟ کیونکہ مریدوں نے نظام الدین کو بتا دیا تھا کہ درویش میں مراحتب ہوتے ہیں اور یہ باقاعدہ ایک نظام ہے۔

نظام الدین کی محنت اور لگن نے شیخ کو بہت خوش کر دیا۔ ایک عرصے بعد جب نظام الدین کو ایک مقام مل گیا تو شیخ نے انہیں طلب کیا۔ نظام الدین پیر و مرشد کے روبرو ادب سے کھڑے ہو گئے۔

شیخ نے پھر سوال کیا۔ "کچھ جانتے ہو کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟"

نظام الدین نے جواب دیا۔ "پیر و مرشد خود ہی ارشاد فرمائیں، میں کیا کہہ سکتا ہوں؟"

شیخ نے پھر سوال کیا۔ "یہاں تمہیں کیا لگتا ہے؟"

نظام الدین نے جواب دیا۔ "بہت اچھا۔ میں نے یہاں بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ اس لیے جہاں آباد سے بہتر لڑائی اور

سرزمین نہیں۔"

شیخ نے پوچھا۔ "اگر میں تجھ کو یہ حکم دوں کہ تو جہاں آباد کو چھوڑ کر کسی اور سرزمین پر چلا جا تو تجھے کیا لگے گا؟"

نظام الدین نے جواب دیا۔ "پیر و مرشد کا حکم سراسر آنکھوں پر..... آپ کے حکم کی تعمیل میں جہاں کہیں بھی جاؤں گا خوش و خرم

رہوں گا۔"

شیخ نے حکم دیا۔ "جب پھر تم دکن چلے جاؤ۔ میں نے دکن کی ولایت تمہارے حوالے کی۔ دکن کے شہر اورنگ آباد میں تم قیام

کرو گے۔"

نظام الدین دم بخود پیر و مرشد کو دیکھتے رہ گئے۔

شیخ نے پوچھا۔ "میری صورت کیا دیکھتے ہو؟ کیا تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

نظام الدین نے اپنے پیر و مرشد کے قدموں میں سر رکھ دیا، کہا۔ "میں اعتراض کروں گا، یہ آپ نے کس طرح سوچ لیا؟ میں شیخ کے

حکم کی تعمیل میں کل ہی اورنگ آباد روانہ ہو جاؤں گا۔ میں تو اس لیے پیر و مرشد کی شکل دیکھ رہا تھا کہ شاید کوئی اور حکم دیا جائے۔"

شیخ نے جواب دیا۔ "نہیں، کوئی اور حکم نہیں ہے۔ تم فوراً ہی دکن چلے جاؤ۔"

نظام الدین نے پوچھا۔ "کیا ابھی؟ کیا اسی وقت؟"

شیخ نے جواب دیا۔ "ہاں ابھی..... اسی وقت!"

نظام الدین اسی وقت دکن روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

اورنگ آباد پہنچ کر نظام الدین نے رشد و ہدایت کا کام شروع کر دیا۔ خواجہ گیسو وراڑکی رشتے دار خاتون سے آپ نے شادی کر لی۔

خود کو ذکر و فکر میں مشغول کر دیا۔ آپ کا شہرہ ہوا تو آپ کے در پر لوگوں کا جوم رہنے لگا۔ آپ ابن شیر و شکر ہو گئے۔ آپ لوگوں کو ہدایتیں

بھی فرماتے اور ان کے دکھ درد میں کئی شریک ہوتے۔

چشتیہ سلسلے میں چونکہ قوالی جائز ہے اس لیے نظام الدین کو بھی اس کا بہت شوق تھا، ملک کے دور دراز محلوں کے لوگ آپ کے پاس

یاس بجانے آتے اور شاواں و فرحان واپس جاتے۔

مختار سماع برپا تھی اور نوگ مودب بیٹھے ہوئے تھے۔ جاہلی کا کلام سنا یا جا رہا تھا۔ آپ پر حالت وجد خاری تھی۔ اسی دوران ایک

مخفی محفل میں داخل ہوا اور آپ کے قریب بیٹھ گیا۔ محفل میں ایک شخص بھی ایسا نہیں تھا جو اس شخص سے واقف ہوتا۔ وہ بے باکی سے محفل

میں آیا تھا اور بدبیزاری سے آپ کے شانے سے اپنا شانہ بھرا کر بیٹھ گیا۔

قوالی زور و شور سے جاری تھی۔ اس شخص نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک دوسرے شخص سے کہا۔ ”جناب! میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ قوالی سے ہمیں کیا فائدہ پہنچتا ہے۔ کیا اس طرح ہمیں ابوولعب میں نہیں جلا کر دیا گیا؟“

حافظ نے کوئی جواب نہیں دیا، خاموش بیٹھا رہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پھر دوسرا نظام الدین پاس ہی بیٹھے ہیں اور وہ سماع کے دوران بات چیت پسند نہیں کرتے۔

اجنبی نے جواب نہ پا کر پھر چھیڑ چھاڑ کی، بولا۔ ”قوالی کے جواز میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ بیجن کی متبادل ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان کے بعض صوفیاء اور خاص کر خواجہ معین الدین چشتی نے برصغیر کے ہندوؤں میں جب یہ دیکھا کہ وہ بیجن سے بہت زیادہ خوش ہوتے ہیں اور ان کے دل دماغ پر بیجن اور بیجن گانے والے کی خوش الحانی کا خاص اثر ہوتا ہے تو اس کی جگہ قوالی کو رواج کیا گیا اور جب قوالی حقایق یا معرفت کا کلام اپنے مخصوص انداز اور آواز میں سناتے ہیں تو سماع پر اس کا خاص اثر ہوتا ہے لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہ غلط ہے کیونکہ قوالی کے رواج کا محض ہندوستان سے ہی تعلق نہیں، یہ ایران اور عراق عرب میں بھی رواج پا چکا ہے۔“

کسی نے اس اجنبی کی بات کا پھر کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر وہ عاجز ہو گیا، بولا۔ ”کیا تم سب گولے ہو گئے ہو، میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے..... یا پھر تمہاری خاموشی کا یہ مطلب لوں کہ تم لوگ میری بات کی صداقت تسلیم کر چکے ہو۔“

نظام الدین کو اس شخص کی باتیں اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ آپ نے فرمایا۔ ”اے شخص! یہ محفل سماع ہے۔ تو خاموش کیوں نہیں رہتا؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”مگر آپ کے پاس میری باتوں کا کوئی جواب ہے تو مرحمت فرمادیں، میں خاموش ہو جاؤں گا۔“

نظام الدین نے کہا۔ ”میرے پاس تیرے ہر سوال اور ہر اعتراض کا جواب ہے لیکن یہ وقت سوالوں اور اعتراضوں کے جواب کا نہیں ہے۔ پھر کسی وقت آجانا، میں تمہیں مطمئن کر دوں گا۔“ پھر پوچھا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”عبدالغنی!“

آپ نے فرمایا۔ ”تو غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ تیرا نام عبدالغنی نہیں ہے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”پھر کیا ہے میرا نام؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”نام تیرا ہے تو تو ہی بتائے گا مجھے!“

اس شخص نے کہا۔ ”میرا نام جو تھا، بتا دیا، میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں کب یہ کہہ رہا ہوں کہ جھوٹ بول۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ مجھ سے باتیں کر کے تو اپنی ذمے داریوں کو پورا کر، ورنہ خراج خواہ کی لٹ ترانیاں قبول ہیں۔“

وہ شخص جریز ہو کر چلا گیا، آپ نے حاضرین سے پوچھا۔ ”اس اجنبی کو اس محفل میں کون لایا تھا؟“

کئی آدائیں بلند ہوئیں۔ ”کوئی بھی نہیں، یہ شخص اپنے طور پر آیا تھا۔“

کافی دنوں بعد وہی شخص دوبارہ آ گیا لیکن اس دن قوالی نہیں ہو رہی تھی، آپ نے اس سے پوچھا۔ ”تو نے اس روز اپنا کیا نام بتایا تھا.....“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”ہاں عبدالغنی بتایا تھا، کیوں کیا آپ کو میرے نام پر کسی قسم کا اعتراض ہے؟“

آپ نے فرمایا۔ ”مجھے اعتراض کا کوئی حق نہیں لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ فقیروں سے جھوٹ بولنا اچھی بات نہیں، تیرا نام عبدالغنی ہرگز نہیں ہو سکتا، کچھ اور ہے۔“

اس شخص نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”آپ نے بجا فرمایا۔ واقعی میرا نام عبدالغنی نہیں، عبداللہ ہے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”جہاں تک میں جانتا ہوں تیرا یہ نام بھی نہیں، تو مسلسل جھوٹ بولے جا رہے۔“

اس شخص نے کہا۔ ”حضرت! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، اب میں تو آپ سے بات کر نہیں سکتا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”نہیں، اس طرح نہیں سوچتے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس دن جو باتیں تو کر رہا تھا انہیں ایک دن میرے سامنے بھی بیان کر دے کہ میں اس کا مدلل جواب دے سکوں۔“

اس شخص نے کہا۔ ”حضرت! میں نے کہہ جو دیا، اب میں یہاں ایک بات بھی نہیں کروں گا کیونکہ میرے دل دماغ میرے اس خیال کو کھنڈ بیل میں ڈال رہے ہیں۔ اب میں کس منہ سے آپ سے بات کروں گا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تیرے سوالوں کے جواب میں دوں گا تا کہ تو مطمئن ہو جائے۔“

اس شخص نے جواب دیا۔ ”میں تو اسی دن مطمئن ہو گیا تھا، آج اس لیے آیا ہوں کہ اس دن کی گستاخی کی آپ سے معافی مانگ لوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”میں نے تجھے معاف کر دیا۔ اب تو میرا چچا چھوڑ دے۔“
اس شخص نے کہا۔ ”حضرت! یوں کام نہیں چلے گا۔“

آپ نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میری باتیں غور سے سن، تو نے پہلی بار اپنا نام عبدالغنی بتایا تھا مگر اس کے بعد تو عبداللہ ہو گیا۔
افسوس کہ تو نے جھوٹ سے تو یہ نہیں کی۔ تیرا نام نہ تو عبدالغنی ہے اور نہ عبداللہ۔ تیرا نام تو عبدالغنی ہے، فقیروں سے کیا پردہ۔“
وہ شخص شرمندہ ہو کر آپ کے قدموں میں گر گیا اور اپنے جھوٹ کی معافی مانگنے لگا۔
آپ نے فرمایا۔ ”جا، میں نے تو تجھ کو معاف کر دیا مگر آئندہ تو جھوٹ نہیں بولے گا۔ میری ایک بات یاد رکھنا، جس چیز کے بارے
میں تجھے علم حاصل نہ ہو، اس پر زبان نہ کھولنا۔ جن لوگوں نے تصوف میں اپنی زندگیاں گزار دیں، اس بارے میں ان کا علم زیادہ ہوگا یا وہ
جنہیں اس کی اجہد کا بھی علم نہیں۔“
وہ شخص شرمندگی اور ندامت سے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔ آپ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور تسلیاں دیں۔ تب کہیں عبدالغنی کے
ہوش و حواس قابو میں آئے۔

☆☆☆

ان دنوں دہلی میں بڑی انفراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ امراء اور سردار آپس ہی میں جوڑ توڑ کر رہے تھے۔ ان حالات میں ایک تورانی
امیر قمر الدین علی خان کو دکن کی تعمیر کا خیال آیا۔ یہ امیر دکن میں ایک طاقت ور حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس سلسلے میں فقراء کی دعائیں
بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ وہ نظام الدین کے پیر و مرشد کلیم اللہ جہان آبادی کی خدمت میں گیا اور مدعا بیان کیا، بولا۔ ”حضرت!
دہلی اور اس کے مضافات میں جو انتشار اور بد امنی ہے اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حالات ابھی اور زیادہ خراب ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں
مظاہرہ سلطنت کی پوسیدہ دیواروں کے مقابل دکن میں ایک مضبوط حصار کھڑا کر دیا جائے جہاں ہندوستان کے مسلمانوں کو پناہ مل جائے اور
یہاں صورت میں ممکن ہے کہ وہاں ایک اسلامی حکومت قائم کی جائے۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”پھر یہ حکومت کس طرح قائم کی جاسکتی ہے؟“
قمر الدین علی خان نے جواب دیا۔ ”میں نے انسانوں کی فوج تو تیار کر لی ہے، آپ کے پاس دعاؤں کا لٹکرا لینے آیا ہوں۔ اگر
آپ کی دعائیں اور میری فوج مل کر دکن پر حملہ آور ہوں گی تو میری فوج یقینی ہو جائے گی۔“
شیخ سوچ میں پڑ گئے، وہ سنجیدگی سے کچھ سوچنے لگے۔ قمر الدین علی خان کو شبہ ہوا کہ شاید انہیں ٹال دیا جائے گا۔ فوراً شیخ کے
دلوں ہاتھ فرط عقیدت سے پکڑ لیے اور عرض کیا۔ ”حضرت! میں جو کچھ چاہتا ہوں، اس سے مسلمانان ہند کی فلاح و بہبود متصور ہے۔ امید
ہے آپ اس عاجز کو یاری نہیں کریں گے۔“

شیخ نے فرمایا۔ ”دکن کی ولایت تو نظام الدین کے حوالے کی جاسکتی ہے، وہی کچھ کر سکتا ہے۔“
قمر الدین علی خان نے کہا۔ ”وہ بھی آپ ہی کے ایما اور سفارش پر کچھ کریں گے۔ میں تو آپ کے پاس سے خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا۔
کچھ نہ کچھ لے کر ہی جاؤں گا۔“

شیخ نے فرمایا۔ ”میں نظام الدین سے تیری سفارش کروں گا، کام وہی کرے گا۔“

قمر الدین علی خان نے جواب دیا۔ ”آپ جو مناسب سمجھیں کریں، میں نہیں جانتا۔“
شیخ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا۔ ”ایک ٹھیکری تو دینا۔“

شیخ کو ٹھیکری دے دی، آپ نے اس پر سیاہ روشنائی سے لکھ دیا۔ ”نظام الدین! کتنا آ رہا ہے ہڈی ڈال دو۔“
قمر الدین علی خان نے اپنی فوج اور سفارش کے ساتھ دکن پر چڑھائی کر دی۔ اس عالم میں اورنگ آباد پہنچے اور نظام الدین کی
خدمت میں حاضری دی۔ یہ صبح کا وقت تھا۔ شیخ نظام الدین کے در پر ایک خادم نے قمر الدین علی خان کو روک لیا اور پوچھا۔ ”آپ کا ان
سے کیا کام ہے؟“
قمر الدین علی خان نے جواب دیا۔ ”میں دہلی کے شیخ کلیم اللہ کے پاس سے آ رہا ہوں۔ میں تمہارے شیخ کے نام ایک سفارشی ٹھیکری
لے کر آیا ہوں۔“

خادم نے کہا۔ ”اس وقت پیر و مرشد کھانا تناول فرما رہے ہیں، آپ کو کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔“

قمر الدین علی خان نے جواب دیا۔ ”میں انتظار کر لوں گا مگر تم یہ خیر اندر تو پہنچا دو۔“
خادم اندر چلا گیا۔ اس وقت تک آپ نے چند لقمے ہی کھائے تھے، خادم نے کہا۔ ”حضرت! ایک شخص حضرت کلیم اللہ کی سفارشی
ٹھیکری لے کر آیا ہے اور باریابی کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہے۔“
آپ نے فوراً حکم دیا۔ ”اسے فوراً اندر لاؤ۔ اس کو دروازے پر روکا ہی کیوں۔ فوراً اندر بلا لو۔“

www.Paksociety.com
 خادم نے اسی وقت قمر الدین علی خان کو نظام الدین کے روبرو پہنچا دیا۔ شیخ نظام نے پوچھا۔ ”کو کیسے آتا ہوا؟“
 قمر الدین علی خان نے ٹھیکری ان کی طرف بڑھادی۔ شیخ نظام نے ٹھیکری کو جوم کراکھوں سے لگایا اور خوشی سے پوچھا۔ ”ہاں تو تم
 میرے پیر و مرشد کے پاس سے آرہے ہو؟“

قمر الدین علی خان نے جواب دیا۔ ”ہاں، وہیں سے آ رہا ہوں۔“
 شیخ نظام نے دسترخوان پر سے سات روٹیاں لے کر اس پر ایک ہڈی رکھ دی اور قمر الدین علی خان کے آکر رکھتے ہوئے کہا۔ ”پہلے
 کھانا کھا لو، اس کے بعد بات کروں گا۔“

قمر الدین علی خان نے شکم سیر ہو کر کھانا کھایا اور چپ چاپ مؤدب بیٹھ گئے۔
 شیخ نظام نے پوچھا۔ ”اور کچھ یا بس؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”بس۔ اب حاجت نہیں رہی۔“
 شیخ نظام نے پوچھا۔ ”ہاں تو اب اپنا مطلب بیان کرو۔“

انہوں نے کہا۔ ”حضرت، اہندوستان میں ایک افراتفری مچی ہوئی ہے۔ مظیلہ سلطنت رو بہ زوال ہے۔ میں چاہتا ہوں دکن میں
 ایک مضبوط اسلامی سلطنت قائم کروں۔ فوج میرے پاس ہے دعاؤں کی ضرورت ہے جو آپ سے ملے گی۔ پیر و مرشد شیخ کلیم اللہ نے یہ
 کام آپ کے پیر و مرشد کو دیا ہے۔ نظر کرم کا امیدوار ہوں، بس اسی لیے حاضری دی ہے۔“

شیخ نظام نے اپنے زرد پیراہن کا ایک حصہ پھاڑ کر قمر الدین علی خان کے سر پر باندھ دیا اور کہا۔ ”آج سے تو نظام ہے، اللہ کا نام
 لے کر اپنا کام شروع کر دے۔“

قمر الدین وہاں سے خوشی خوشی اٹھ کر اپنی فوج میں گئے اور دکن پر لشکر کشی شروع کر دی۔ گھمسان کا دن پڑا اور قمر الدین نے شیخ پائی
 اور انہوں نے نظام الملک آصف جاہ کا لقب اختیار کیا اور شاہی لباس میں زور تک کی دستار کو اپنا طرہ امتیاز بنالیا۔

کچھ عرصے بعد مبارز خان نے آصف جاہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ آصف جاہ نے پریشانی میں ایک بار پھر شیخ نظام سے رجوع کیا
 اور پورا واقعہ بتا کے درخواست کی۔ ”حضرت! میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں، مسلمانوں کے لیے کر رہا ہوں لیکن افسوس کہ مسلمان ہی رکاوٹ
 بن رہے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟“

آپ کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے پھر فرمایا۔ ”تم مبارز خان کا مقابلہ کرو۔ وہ ناکام رہے گا، کامیابی تمہاری قسمت میں لکھی
 گئی ہے۔“

آصف جاہ نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں چاہتا ہوں مجھے کوئی ایسی بین علامت شیخ مل جائے جس سے میں مطمئن ہو جاؤں اور
 پریشان خاطری دور ہو جائے۔“

شیخ نظام کچھ دیر کے لیے مزالتیے میں چلے گئے پھر فرمایا۔ ”نظام اکل جھرات ہے، تم اپنے ڈیرے پر غور کرنا۔ ایک صندلی پنچہ
 ظاہر ہوگا، یہاں بات کی علامت ہے کہ شیخ تمہاری ہے۔“

آصف جاہ اپنی فوج میں واپس چلا گیا، وہ کسی حد تک مطمئن ہو چکا تھا۔ دوسرے دن جھرات تھی۔ آصف جاہ اپنے خیمے میں جم کر
 بیٹھ گیا، اس کی نظریں خیمے کی دیواروں پر جمی ہوئی تھیں۔ دوپہر تک اسی صندلی پنچے کی جستجو میں رہا۔ آخر ظہر کے وقت یہ پنچہ خیمے کی دیوار پر
 سائے کی طرح نمودار ہوا۔ آصف جاہ مارے خوشی کے سجدے میں گر گیا۔ جو لوگ اس وقت خیمے میں تھے وہ آصف جاہ کی اس حرکت سے
 پریشان ہو رہے تھے۔ ایک نے پوچھا۔ ”حضرت! یہ سجدہ کس خوشی میں ہو رہا ہے؟“

آصف جاہ نے جواب دیا۔ ”کیا تم لوگ خیمے کی اس دیوار پر کچھ دیکھ رہے ہو؟“

اب سبھی اس پنچے کی طرف دیکھنے لگے اور سبھی نے متفقہ آواز میں کہا۔ ”ہاں، ہم سب دیوار پر ایک پنچے کا سایہ سا دیکھ رہے ہیں مگر یہ
 پنچہ ہے کس کا؟“

آصف جاہ نے جواب دیا۔ ”یہ میری شیخ کا پنچہ ہے، میری کامیابی کی علامت ہے۔“

آصف جاہ کی باتیں کسی پاگل کی بڑلگ رہی تھیں مگر وہ بے حد خوش تھا۔ اس کے بعد آصف جاہ اور مبارز خان کی فوجیں ٹکرائیں،
 لاشیں گرنے لگیں، خون برسنے لگا، زخموں کی چیخ و پکار نے میدان کارزار کو عرصہ حشر بنا دیا۔ شام تک مبارز خان کی فوجیں پسپا ہو کر راہ فرار
 اختیار کر رہی تھیں اور آصف جاہ کی سپاہ ان کا پیچھا کر رہی تھیں۔ جب شیخ مکمل ہو گئی تو نظام الملک آصف جاہ نے شیخ کے دربار میں حاضری
 دی اور ان کا بے حد شکر سادا کیا۔

بجز آصف جاہ دکن کے نظم و نسق میں مشغول ہو گیا۔ کافی عرصے بعد وہ اس حال میں شیخ کی خدمت میں پہنچا کہ گاڑیوں پر روپے
 لدائے ہوئے تھے اور مولیشیوں کی پشت پر کبڑے کے تھان رکھے تھے۔ آصف جاہ نے انہیں شیخ نظام کی بارگاہ کے باہر کھڑا کر دیا اور خود

اندر شیخ کی خدمت میں پہنچا۔

شیخ نظام نے مسکرا کر اس دنیا دار کو دیکھا اور پوچھا۔ ”کیا بات ہے..... کوئی اور حاجت؟“

آصف جاہ نے جواب دیا۔ ”حضرت! آج میں آپ سے یہ اجازت لینے آیا ہوں کہ اس جگہ جہاں آپ سکونت پذیر ہیں، آپ کے لیے ایک شاندار محل تعمیر کرا دوں۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”اگر تم محل کی تعمیر کا کام آج ہی سے شروع کرا دو تو اس میں کتنا وقت صرف ہوگا؟“

آصف جاہ نے جواب دیا۔ ”تقریباً دو سال مگر آپ کو اس کی کیا فکر؟“

شیخ نے پوچھا۔ ”اور اس میں کتنا روپیہ صرف ہوگا؟“

آصف جاہ نے جواب دیا۔ ”کچھ پتا نہیں مگر میں نے تو یہ تمہیں کر لیا ہے کہ جتنا بھی روپیہ صرف ہوگا میں خرچ کروں گا اور حضرت کی شایان شان آستانہ تعمیر کرا دوں گا۔“

شیخ نے فرمایا۔ ”آصف جاہ! اگر تو چاہتا ہے کہ میں خوش ہو جاؤں تو وہ سارا روپیہ میری خانقاہ کے باہر اس کے چہترے پر ڈھیر کر دے، میں اس سے خوش ہو جاؤں گا۔“

نظام الملک نے باہر نکل کر گاڑیوں پر سے روپیہ اتار کر چہترے پر ڈھیر کرا دیا۔ سورج کی روشنی میں روپوں کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہونے لگیں۔ آصف جاہ اندر گیا اور شیخ کو مطلع کیا۔ ”حضرت! آپ کے حکم کے بموجب روپے کا ڈھیر چہترے پر لگا دیا گیا ہے، ایک نظر ملاحظہ بھی فرمائیں۔“

شیخ نظام اپنی جگہ سے اٹھے اور خانقاہ کے باہر تشریف لے گئے۔ وہاں چہترے پر بہت سارا روپیہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور مریدوں کو حکم دیا۔ ”جاؤ اور بازاروں اور مغل کوچوں میں جا کر یہ اعلان کر دو کہ شیخ نظام فقرا اور مساکین کو کچھ دینا چاہتا ہے، وہ میری خانقاہ کے در پر آ جائیں اور اپنا حصہ لے جائیں۔“

مریدوں نے شیخ کا یہ پیغام سنی اور بازار بازار پہنچا دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے فقراء اور مساکین کا جم غفیر خانقاہ کے در پر اکٹھا ہو گیا۔ شیخ نے سارے روپے اسی وقت تقسیم کرنا شروع کر دیے، آصف جاہ اس منظر کو بڑی دلچسپی اور عقیدت سے دیکھتا رہا۔ جب سارا روپیہ تقسیم ہو گیا تو پوچھا۔ ”حضرت! یہ آپ نے کیا کیا؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں نے یہ جو کچھ کیا آپ کی نظروں کے سامنے کیا، پھر یہ سوال کیا؟“

آصف جاہ نے کہا۔ ”میری خواہش تھی کہ میں آپ کے لیے ایک شاندار محل تعمیر کراؤں مگر آپ نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ پتا نہیں کیوں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”تو اتنی ساری رقم کو دو سال تک خرچ کرتا رہتا اور پھر کہیں ایک محل تعمیر کراتا لیکن تو نے دیکھا میں نے ذرا سی دیر میں کئی شاندار محل تعمیر کرا ڈالے۔ بابا! ہم رویش لوگ اپنی کٹیوں ہی میں اچھے لگتے ہیں، محل تو نواہوں اور بادشاہوں کے لیے ہوتے ہیں۔“

آصف جاہ کا دل بھرا آیا، وہ رونے لگا۔ آہستہ سے کہا۔ ”قربان جائیے اس سادگی اور سخاوت کے..... حرص اور طمع کو آپ نے زیر کر کے پوری دنیا کو اپنا مطیع و مشقا کر لیا ہے، سبحان اللہ۔“

اس کے بعد آصف جاہ خاناندان میں یہ دستور ہو گیا کہ جب خانقاہ میں عرس ہوتا تو خانقاہ کی طرف سے حکمران نواب کو جو تبرک بھیجی جاتی، اس میں سات روٹیاں اور ان پر ایک ہڈی رکھی ہوتی۔ یہ دونوں چیزیں ایک زرد رنگ کے کپڑے میں رکھ کر باندھ دی جاتیں۔ اس کے بعد جو حکمران نواب آپ کی خانقاہ میں آتا تو اس کے سر پر زرد رنگ کا کپڑا باندھا ہوتا۔

☆☆☆

آپ کے مریدوں میں ایک صاحب تھے سعید بیگ۔ آپ سعید بیگ پر بے حد مہربان تھے اور بڑی محبت کرتے تھے۔ یہ صاحب ہر روز بڑی پابندی سے آیا کرتے تھے لیکن پھر کچھ ایسا ہوا کہ سعید بیگ غائب رہنے لگے۔

جب سعید بیگ کی غیر حاضری کو ایک ہفتہ گزر گیا تو شیخ نے دوسرے مریدوں سے پوچھا۔ ”لوگو! کیا بات ہے؟ یہ سعید بیگ کہاں غائب ہو گیا، کچھ اس کا بھی کسی کو پتا ہے؟“

کئی مریدوں نے ایک ہی جواب دیا۔ ”سعید بیگ معلوم نہیں کس مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ اگر شیخ کا حکم ہو تو اس کے گھر جا کر اس کی خیر خیر لے آئیں!“

آپ نے فرمایا۔ ”نہیں، میرا خیال ہے تم میں اس وقت بھی کوئی ایسا شخص موجود ہے جو سعید بیگ کی پریشانیوں سے واقف ہے۔“ ایک مرتب نے عرض کیا۔ ”میرا مرشد بجا فرماتے ہیں۔ میں سعید بیگ کی پریشانیوں سے واقف ہوں اگر حکم ہو تو بیان کر دوں۔“

شیخ نے حکم دیا۔ ”بیان کرنا کہ اس کا علاج کیا جائے۔“

مرید نے عرض کیا۔ "پیر دہرشد! سعید بیگ جس محلے میں رہتے ہیں، اس کے متصل ایک دوسرے محلے میں ایک جوگن رہتی ہے۔ یہ نہایت حسین مگر سنگ دل عورت ہے۔ سعید بیگ نے اس کو معلوم نہیں کہاں دیکھا تھا کہ دل دے بیٹھے۔ کئی بار اس کے در پر حاضری بھی دی اور جوگن سے ہم کلام ہونے کی کوشش کی مگر وہ اتنی سخت دل اور بے نیاز ہے کہ سعید بیگ پر کوئی توجہ ہی نہیں دیتی۔ اس کی بے التفاتی اور بے نیازی سعید بیگ کے لیے جان لیوا ہو رہی ہے۔ شاید اسی لیے سعید بیگ یہاں بھی نہیں آ رہے۔"

شیخ نے اسی مرید کو حکم دیا۔ "اچھا اب تو سعید بیگ کے گھر چلا جا اور اس کو بتا دے کہ میں نے اس کو طلب کیا ہے۔"

مرید نے پوچھا۔ "اسی وقت یا کسی بھی وقت؟"

آپ نے جواب دیا۔ "اسی وقت کیونکہ اس نازک وقت میں فوری دستگیری درکار ہے۔"

مرید بھاگا بھاگا سعید بیگ کے گھر پہنچا اور یہ آواز بلند اعلان کیا۔ "سعید بیگ! تم اسی وقت میرے ساتھ شیخ کے پاس چلو، وہ تمہیں یاد فرما رہے ہیں۔"

سعید بیگ نے پوچھا۔ "مجھ سے شیخ کا کوئی خاص کام؟"

مرید نے جواب دیا۔ "شیخ کو تیرے معاشرے کا علم ہو چکا ہے، شاید وہ اس سلسلے میں تیری مدد کریں۔"

سعید بیگ اسی وقت مرید کے ساتھ ہولیا۔ شیخ اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ یہ جیسے ہی شیخ کے سامنے پہنچے، شیخ نے پوچھا۔ "ارے سعید بیگ! تیرا کیا حال ہے؟ میں تیری بابت کیا سن رہا ہوں؟"

سعید بیگ کا دل بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو آگئے، جواب دیا۔ "حضور! ہنگام دستگیری وقت غنایت است" (حضور! یہ مدد کا وقت ہے، کچھ وقت غنایت ہوا ہے)

آپ نے پوچھا۔ "اس جوگن میں تجھ کو کیا نظر آیا؟"

سعید بیگ نے جواب دیا۔ "ہا نہیں کیا نظر آیا۔ میں تو کہیں کا بھی نہیں زد گیا۔ میرے دل دماغ پر اس کا قبضہ ہے۔ سوتے جاگتے اسی کا خیال اور اسی کا تصور خاری رہتا ہے۔"

شیخ نے پوچھا۔ "اور اس کا کیا حال ہے؟"

سعید بیگ نے جواب دیا۔ "جو میرا حال ہے، وہ اس کا نہیں ہے۔ اگر میں اس کے پاس چلا جاؤں تو شاید وہ مجھ پر نظر ڈالنا بھی گوارا نہ کرے۔ وہ میری طرف نظر اٹھا کر دیکھتی بھی نہیں۔"

شیخ نے پوچھا۔ "تو کو یا یہ ایک طرف عشق ہے؟"

سعید بیگ نے جواب دیا۔ "جی پیر دہرشد! یہ ایک طرف عشق ہے۔"

شیخ نے پوچھا۔ "کیا ایسا ممکن نہیں ہے کہ تم اس کے عشق سے ہار آ جاؤ؟"

سعید بیگ نے رد و رد کر عرض کیا۔ "جو اس کے عشق میں مڑے اور دل کو جو لذت اور سرور حاصل ہو رہا ہے، میں اس سے دستبردار ہونے کے بجائے موت سے ہم آغوش ہو جانا بخوشی گوارا کر لوں گا۔"

شیخ نے کہا۔ "بھلا یہ کیا بات ہوئی؟ تمہیں ایسی بات نہیں کرنا چاہیے۔"

سعید بیگ کے زخم خوردہ دل پر اور چوٹ لگی، بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "حضرت! میرے حق میں دعا کیجئے کہ مجھے موت آ جائے۔ میں اپنی زندگی سے ذرا بھی خوش نہیں۔ ناکام اور نامراد وہ کر زندگی گزارنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

شیخ نے فرمایا۔ "زندگی خدا کا عطیہ ہے، اس کو ختم کرنے کی خواہش کفرانِ نعمت ہے۔ اس سلسلے میں میں تیری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

سعید بیگ نے مایوسی سے کہا۔ "حضرت! میں تو آپ کے پاس استعانت کی آرزو لے کر حاضر ہوا تھا اور آپ ہی مجھے مایوس کر دینا چاہتے ہیں۔"

شیخ نے جواب دیا۔ "میں تیری کیا مدد کر سکتا ہوں، خدا سے مدد کی دعا کر، ضرور کامیاب ہو جائے گا۔"

سعید بیگ نے کہا۔ "لیکن میرا خیال یہ تھا کہ اگر آپ میرے حق میں دعا فرمادیں گے تو میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔"

شیخ نے پوچھا۔ "مگر وہ جوگن کہتی کیا ہے؟"

سعید بیگ نے جواب دیا۔ "وہ کہتی تو کچھ بھی نہیں، وہ نہ تو میری طرف دیکھتی ہے اور نہ ہی مجھ سے بات کرتی ہے، حالانکہ دوسرے لوگ اس کی چاہت میں آتے ہیں، ان سے باتیں بھی کرتی ہے اور ان کی طرف دیکھتی بھی ہے۔"

شیخ نے غلافِ معمول حکم دیا۔ "اچھا اب تو جا سکتا ہے، پھر کسی دن آ جانا۔"

اس کے بعد سعید بیگ چلا گیا۔ حاضرین پر سنانا طاری ہو چکا تھا۔ شیخ نے مریدوں سے کہا۔ "میں تو لوگوں کو عشقِ حقیقی کی

طرف دعوت دیتا ہوں اور سعید بیگ یہ چاہتا ہے کہ میں عشق مجازی میں اس کی مدد کروں، بھلا یہ کیونکر..... زمانہ کیا کہے گا، دنیا کیا کہے گی۔“

جب چار مرید اکٹھا ہوئے اور شیخ نظام اپنے حجرے میں چلے گئے تو ایک نے دوسرے مریدوں سے سرگوشی میں کہا۔ ”پیر و مرشد نے سعید بیگ کو مایوس کر کے اس کا دل توڑ دیا، اس پر رحم آتا ہے۔ سوچو، اس کی کس طرح مدد کی جاسکتی ہے۔“

ایک دوسرے مرید نے جواب دیا۔ ”پیر و مرشد کو بھلا پھسلا کر اس جوگن کے گھر لے جایا جائے۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو گئے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ سعید بیگ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو۔“

تیسرا مرید بولا۔ ”لیکن پیر و مرشد کو وہاں تک کس طرح لے جایا جائے؟“

جس نے یہ مشورہ دیا تھا، بولا۔ ”میرا دماغ اپنا کام کر رہا ہے، شاید میں پیر و مرشد کو وہاں تک لے جانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔“

کئی مریدوں نے فرط خوشی میں نعرہ لگایا۔ ”پیر و مرشد زندہ باد۔“

کئی دن بعد ایک مرید شیخ نظام کے تھلیہ میں گیا اور درود کر عرض کیا۔ ”حضرت! اب تو سعید بیگ کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ خدا کے لیے اس کے لیے کچھ کیجیے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں اس کے حق میں مستحکم دعا کرتا رہتا ہوں۔“

مرید نے درخواست کی۔ ”اگر مرشد جوگن کے گھر تک تشریف لے چلیں تو یہ بڑا کارنامہ ہوگا اور میرا دل کہتا ہے کہ سعید بیگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔“

آپ نے پوچھا۔ ”کیا سعید بیگ نے یہ خواہش کی ہے؟“

مرید نے جواب دیا۔ ”نہیں یہ ہماری خواہش ہے، ہم سب کی خواہش ہے۔“

آپ کچھ سوچنے لگے، پھر فرمایا۔ ”سعید بیگ بھی آخر کیا کرے، عشق تو آخر عشق ہے اور عشق ایک ایسی آگ ہے جس میں بہت کچھ جل جاتا ہے۔ میں سعید بیگ کی ضرورت دیکھ کر ہوں گا۔“

شیخ کے اس جواب نے مریدوں میں خوشی کی لہر دوڑادی، ان سب نے موقع غنیمت جانا اور اسی وقت شیخ کو تیار کرنا کر جوگن کے پاس چلے۔ راستے میں کہا۔ ”بھائی! میری سمجھ میں یہ بات تو آئی نہیں کہ ایک تیسرے درجے کی عورت نے آخر وہ کونسا جاؤ کر دیا ہے کہ سعید بیگ ہمیں کا بھی نہیں رہ گیا۔“

ایک مرید نے عرض کیا۔ ”حضرت! میں تو اس کو اسی حال میں دیکھنا چاہتا ہوں کیونکہ اس عشق کے طفیل اس میں جو جذب و کیف پیدا ہو گیا ہے، وہ بہت کام کی چیز ہے۔“

شیخ نے کہا۔ ”ابھی تک میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ سعید بیگ نے اس تیسرے درجے کی عورت سے عشق کیوں کیا؟“

ایک مرید نے جواب دیا۔ ”حضرت! یہ وقت میرے خیال میں کیوں اور کیا کا نہیں ہے۔“

شیخ خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد لوگ جوگن کے در پر پہنچ گئے۔ اندر جوگن کو جب یہ خبر ہوئی تو وہ دیوانہ دار بانہر آگئی اور شیخ کے قدموں کو بوسہ دیا۔

شیخ نے اس حسین عورت کو بڑے غور سے دیکھا اور دل ہی دل میں اس کے حسن کا اعتراف کر لیا پھر جوگن سے پوچھا۔ ”اے عورت! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تجھ میں یہ گھمنڈ کیوں ہے اور کیا تو غرور اور گھمنڈ کے انجام سے بھی واقف ہے؟“

جوگن نے جواب دیا۔ ”حضرت! بات یہ ہے کہ اس زمین پر جو بھی آیا، بالآخر زمین کے اندر چلا گیا۔ مجھے اپنی کسی چیز پر بھی کوئی غرور نہیں۔ میں اپنے اور اپنے حسن کے فانی ہونے کا اقرار کرتی ہوں۔“

شیخ نے پوچھا۔ ”کیا تو میرے مرید سعید بیگ سے واقف ہے؟“

جوگن نے جواب دیا۔ ”جانتی نہیں ہوں یا نہیں۔ اگر وہ صاحب میرے سامنے لائے جائیں تو شاید میں کوئی جواب دے سکوں۔“

کسی مرید نے کہا۔ ”جوگن! تو نے پیر و مرشد کو بھلا یا نہیں، یہ کھڑے کھڑے باتیں کرنے کا سبب؟“

جوگن گھبرا گئی، بولی۔ ”معاف کیجیے گا، یہ بات میرے ذہن سے نکل گئی تھی۔“ اس کے بعد وہ شیخ کو اندر لے گئی اور بڑے احترام سے بیٹھا کر خود سامنے کھڑی ہو گئی۔

مریدوں کا خیال تھا پیر و مرشد سعید بیگ کی ہمت کچھ اور باتیں بھی کریں گے مگر آپ نے پھر کوئی بات نہیں کی اور کچھ دیر بعد یوں ہی واپس چلے آئے۔ آپ کے اس طرز عمل سے دوسروں کو بڑی مایوسی ہوئی۔

دوسرے دن سعید بیگ نے شیخ کی خدمت میں حاضری دی، آپ نے سعید بیگ کو حکم دیا۔ ”سعید بیگ! اپنی جوگن سے آج ضرور

مل لیتا، اس نے تمہیں بلا لیا ہے۔“
سعید بیگ نے شیخ سے تو کچھ بھی نہیں پوچھا، مریدوں سے ضرور سوال کیا۔ ”کیا پیر و مرشد نے جو گن سے کسی قسم کا وعدہ لے لیا ہے؟“

ایک مرید نے جواب دیا۔ ”میں تو جو گن کے پاس ہی موجود رہا۔ میرا خیال ہے وہاں تو ایسی کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ جو گن نے شیخ سے کب یہ کہہ دیا تھا کہ سعید بیگ کو اس کے پاس بھیج دیا جائے۔“
سعید بیگ نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ”اگر میں شیخ کے حکم کے بموجب وہاں چلا بھی جاؤں تو پتا نہیں وہ جو گن مجھ سے کیا سلوک کرے اور یہ کہ مجھ سے بات بھی کرے یا فوراً ہی نکال باہر کرے۔“

ایک دوسرے مرید نے کہا۔ ”جب پیر و مرشد نے وہاں جانے کا حکم دے ہی دیا ہے تو تمہیں ضرور جانا چاہیے۔“
سعید بیگ اسی وقت جو گن کے پاس روانہ ہو گئے۔ جب یہ جو گن کے گھر پہنچے تو وہ دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ سعید بیگ کو دیکھتے ہی بولی۔ ”میں بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہی تھی، دیر کہاں کر دی؟“

سعید بیگ نے ایسا محسوس کیا گویا جو گن سے ان کی بڑی بے تکلفی ہے اور وہ سالوں سے ملتے جلتے چلے آ رہے ہیں۔ سعید بیگ نے جواب دیا۔ ”میں پیر و مرشد کے پاس گیا ہوا تھا اور وہیں سے تمہارے پاس آ رہا ہوں۔“
جو گن نے کہا۔ ”تب پھر مجھے بھی اپنے پیر و مرشد کے پاس لے چلو۔“

سعید بیگ نے پوچھا۔ ”کب؟“
جو گن نے جواب دیا۔ ”ابھی۔“
سعید بیگ جو گن کو لے کر پیر و مرشد کے پاس چلے گئے۔ شیخ نظام نے ان دونوں کو اپنے سامنے دیکھ کر مسکرا کر پوچھا۔ ”کہو، کیسے آنا ہوا؟“

جو گن نے عرض کیا۔ ”حضرت! مجھ کو بیعت کر لیجیے اور یہ کہ میں اس شخص سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ آپ میری اس مشکل کو آسان کر دیں۔“
شیخ نے اسی وقت جو گن کو بیعت کر لیا اور سعید بیگ سے اس کا نکاح پڑھا دیا۔ یہ سب کچھ آٹا ٹاٹا اور اچانک ہوا تھا، کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔

آپ نے سعید بیگ سے پوچھا۔ ”سعید بیگ! تجھ کو تیرا گوہر مقصود مل گیا لیکن اب میرے پاس آنا جانا نہ چھوڑ دینا۔“ پھر جو گن سے کہا۔ ”اور تو بھی اس نیک اور شریف مرد کی مطیع فرماں بردار رہے گی۔ اس کا بڑا خیال رکھنا۔“
جو گن نے جواب دیا۔ ”میں تو انہیں نعمت سمجھ کر قبول کر رہی ہوں، پھر کفران نعمت کا ارتکاب کیوں کروں گی۔“
سعید بیگ جو گن کو لے کر اپنے گھر چلے گئے۔ شیخ کے مریدوں کو بڑی حیرت تھی لیکن اس سلاط سے خوشی بھی بے حد ہوئی تھی۔
آپ نے ایک عرصے تک لوگوں کی خدمت کی، آپ نے جو انگوٹھی پہن رکھی تھی، اس کے ٹکس پر کندہ تھا۔
ذکر مولیٰ از ہمنادولی

آپ مصنف بھی تھے اور آپ کی کتاب نظام القلوب نے بڑی شہرت حاصل کی۔ آپ کی خوراک بہت معمولی تھی۔ جو لباس پہنتے تھے، وہ معمولی اور بیوند لگا ہوا ہوتا تھا۔ آپ کے پاس جو کچھ بھی آتا، آپ اسے دوسروں میں تقسیم فرما دیتے۔
آپ عشق کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ بار بار فرمایا۔ ”اے عزیز! کمال عشق چاہیے تاکہ تو اس مقام تک پہنچ جائے جس سے اونچا کوئی اور مقام نہیں۔ یہ عاشقوں کا مقام ہے اور کمال عشق کے بغیر یہ مقام نہیں حاصل ہوتا۔“
آپ یہ بھی فرماتے تھے۔ ”عبادت کے لیے خلوص ضروری ہے اور خاص کر وہ لوگ جو مبتدی ہوں، انہیں اس کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔“

آپ کے پانچ لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ بیاسی سال تک اس عالم رنگ بو کو اپنے فیوض سے نوازتے رہے۔ آخر 12 ذیقعد 1242ھ کو بعد نماز عشاء آفتاب غروب ہو گیا۔

انالله وانالیه راجعون



پانچ بارشادی	آفتاب صابری	پانچ خوش	عید سائیں علی	پانچ بارشادی	پانچ بارشادی
سورب احمد خاں	محمد قاسم فریختہ	مسلمہ تاجدار اسک	شمسہ سراج عقیق	نظام الدین احمد	



بہر و پیا

ابراہیم جمالی

افسان لاکھ بھیس بدلے... رہتا تو انسان ہی ہے۔ یہ اور بات کہ اس کا ضمیر اسے کب کب سناچے میں ڈھلنے پر آمادہ کرتا ہے... رنگ بدلنی دنیا میں وہ بھول گیا تھا کہ فطرت کا یہی کمال ہے کہ ایک رنگ کو دوسرے سے الگ کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

پیشکش کرتے والے ایک بہر و پیا کا اصل روپ

یہ اس زمانے کی باتیں ہیں جب شیخ صاحب صرف ”مٹی ڈھونڈنے والے“ تھے یعنی لمبا اٹھانے کا کام کرتے تھے۔ مکتبیس تیس گدھے، اسی ہی بوریوں، کام کرنے والے ایک دو مزدور اور پانچ چوچہ کدالیں اور بیچے..... شیخوں کی یہی کل مایا تھی۔ کسی کو لمبا اٹھوانا ہوتا تو وہ شیخوں کو بلوا لیتا۔ یہی ان کا روزگار تھا۔ انہوں نے کمیٹی کے وارنڈے سے بھی بہتر تعلقات بنائے ہوئے تھے۔ وہ انہیں ذرا سہولت سے لمبا اٹھانے دیتے تھے۔ پھر وہ سنگ و خشت کے ضرورت مند گاہک کو حلاش کر کے اس کے ہاں ڈال آتے تھے۔ ایک جگہ سے لمبا اٹھا کر دوسری جگہ پہنچانے سے انہیں

فقیر سے بہر و پیا کا پٹا ملتی، بڑی حویلی والے شیخ صاحب کے بیٹے کا لنگوٹیا یا تھا۔ بچپن ہی سے ان کا یارانہ چلا آ رہا تھا۔ بچپن میں وہ دونوں کچھ عرصے تک مسجد میں بھی ساتھ پڑھتے رہے۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب شیخوں میں بھی مسجد اور تکیوں کی تکریم پائی جاتی تھی۔ ان کی نظر میں مولوی اور درویشوں کی عزت ہوتی تھی۔ اس وقت وہ خود چنگیری میں روٹی رکھ کر اور اسے اپنی چوڑی کے شملے سے ڈھانپ کر مسجد کے مولوی کے لیے کھانا لے جاتے تھے۔ جب انہیں بخاریا کراہین دروہوتا تو تکیے کے سامنے سے دم کرانے جاتے.....

کہہ سکتی کہ ان کے دن پھر گئے تھے۔ دولت ہاتھ آتے ہی انہوں نے بڑی حوصلی خریدی۔ اس کے ساتھ ہی کپڑے کا کارخانہ بھی لگا لیا۔ پھر انہوں نے فوراً اپنے بیٹے کو مسجد سے اٹھا کر انگریزی اسکول میں داخل کر دیا۔ لیکن بچپن کی محبت اور دوستی اتنی گہری تھی کہ شیخ صاحب کے بیٹے کو جب بھی فرصت ملتی، وہ سیدھا فقیرے بہرو پیے کے گھر جا پہنچتا۔ بہرو پیہا گئی کئی دن گھر سے باہر رہتا تھا۔ اس کا کام ہی ایسا تھا۔ دونوں دوست اس کی بھینس بدلنے والی چیزوں سے کھیلتے رہتے۔

بہرو پیے کی کوشٹری کسی عجیب خانے سے کم نہ تھی۔ دیواروں پر مختلف قسم کے بے شمار لباس لٹکے ہوئے تھے۔ ان میں سادھو سنتوں کے گہرے رنگ کے لباس سے عالم فاضل کے چوغے اور پگڑیاں تک تھیں۔ ریلوے گارڈ کی وردی سے لے کر پولیس افسروں تک کے ڈریس موجود تھے۔ یعنی بھینس بدلنے کے تمام لوازمات وہاں دیکھے جاسکتے تھے۔

شیخ صاحب کا بیٹا اس کوشٹری میں کھینچتے ہی گویا بے خود سا ہو جاتا۔ کبھی وہ سفید ڈاڑھی لگا کر یوٹو حاکم جاتا اور کبھی لمبے پراندے والی دگ لگا کر کسی عورت کی طرح مکھن لگتا۔ کبھی وہ اور ملنگی جو رسا ہی بن کر کھیلتے رہتے۔

”اگر تمہیں بھینس بدلنے کا فن سیکھنا ہے تو پہلے کسی ماہر فن کو استاد بناؤ۔“ ملنگی ہنستے ہوئے اس سے کہتا۔ ”کسی اور کو استاد نہیں بناتے تو ہمارے ہی مکھن چھو لو۔ پھر تمہارا باپ بھی تمہیں پہچان جائے تو استاد نہ کہنا۔“

”جہل اونے بڑیو لے۔“ شیخ کا بیٹا بھی ہنستے ہوئے جواب دیتا۔ ”پہلے تم اپنے باپ سے تو کچھ سیکھ لو پھر دوسروں کا گرو بننے کا سوچنا۔“

☆☆☆

جب ملنگی کا بہرو پیہا باپ کئی دنوں کے بعد گھر لوٹا تو اس نے بیٹے کا قد کاٹھ دیکھ کر فیصلہ کیا کہ اب اسے باپ دادا کا ہنر سکھانے کا وقت آ گیا ہے۔ پھر وہ جاتے ہوئے اپنے بیٹے کو بھی ساتھ لے گیا۔

باپ بیٹا کئی دنوں تک گاؤں گاؤں اور شہر شہر پھرتے رہے۔ اس دوران میں ملنگی اپنے باپ دادا کا کسب حاصل کرتا رہا۔ ساتھ ہی باپ اسے موقع بھی دیتا رہا کہ وہ لوگوں کو اپنے ہنر کے جوہر دکھاتا رہے۔ طویل عرصے تک جہاں نور دی کرنے کے بعد وہ واپس لوٹے تو باپ نے بیٹے کی بیٹھکتے ہوئے کہا۔

”چل بیٹا، تیار ہو جا۔ اب تیری زندگی کا سب سے

اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ قدرے بہتر انداز سے گزارا ہوتا ہو سکے، لیکن وہ دن بھر مٹی میں مٹی بن کر رہتے تھے۔ منہ، سر، ڈاڑھی، کپڑے اور جوتے خاک سے اٹ جاتے تھے۔ ان دنوں میں انہیں اپنی شکل بھی مٹی معلوم ہوتی تھی۔ لوگ انہیں ”شیخ ملبا“ اور ”شیخ مٹی والے“ کہہ کر پکارتے۔ انہی دنوں میں انہوں نے اپنے بیٹے کو پڑھنے کے لیے مسجد میں بٹھایا تھا اور مولوی صاحب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گزارش کی تھی۔

”بزرگوا میں تو اس لڑکے کی دنیا سنوارنے کے قابل نہیں۔ آپ مہربانی فرما کر اسے رب کے راستے پر لا کر اس کا دین ہی سنوار دیں۔“

فقیرے بہرو پیے نے بھی انہی دنوں میں اپنے بیٹے کو مسجد میں بٹھایا تھا۔ اس طرح بہرو پیے کا بیٹا شیخ کے بیٹے کا دوست بن گیا۔ مولوی صاحب پڑھانے کے دوران کبھی کسی ضرورت کے تحت اٹھ کر مسجد سے باہر جاتے تو بہرو پیے کا بیٹا ملنگی فوراً اٹھ کر ان کی گدی پر بیٹھ جاتا۔

مسجد میں داخل ہوتے ہی ایک طرف چپوترہ بنا ہوا تھا۔ مولوی صاحب اس چپوترے پر گدی بچھا کر بیٹھتے تھے۔ جوتوں والی جگہ پر ایک حذر رکھا رہتا، جس کی لمبی ٹاڑ مولوی صاحب کے زانوں پر دھری رہتی۔ وہ وقفے وقفے سے اسے اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیتے۔

مولوی صاحب کے مسجد سے باہر جاتے ہی حقے کی ٹاڑ ملنگی کی بغل میں چلی جاتی۔ وہ دائیں ہاتھ میں کتاب تھام کر اور بائیں ہاتھ سے مولوی صاحب کی چھتری لہرا کر بھاری آواز میں کہتا۔

”سنو ادائے شیطانو! اگر تم لوگوں نے اپنا سبق یاد کر کے نہیں سنایا تو میں تمہیں مرغا بنا دوں گا..... اور تو سن ادائے شیخ کے سپوت! اگر تو نے سبق نہیں سنایا تو میں نے تیرے باپ کا نکاح توڑ کے تیری ماں سے خود ہی نکاح پڑھا لیتا ہے۔ ساتھ حکم شرع شریف کے۔“

اس کی اس نفالی پر بیچے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ شیخ ملبا کا بیٹا اس سے چھتری چھین کر اس کے پیچھے لپکتا اور پھر خود بھی ہنستے ہنستے گر جاتا۔ پھر اچانک ملبا شیخ کے دن پھر گئے۔

کہتے ہیں کہ ایک جگہ سے ملبا اٹھاتے ہوئے کھراکی کے دوران انہیں خاصے قیمتی زیور ہاتھ لگ گئے تھے۔ کوئی کہتا کہ انہیں زیر زمین طلائی اشرفیوں سے بھری ہوئی دنگل مل گئی تھی۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ ان کی لائٹری کل گئی تھی..... پھر حال جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ یہ حقیقت اپنی

پہنائے ہوئے ہیں..... لیکن افسوس کہ اسے کسی چیز کا ہوش نہیں ہے۔ عشق کا مارا لگتا ہے۔“

کسی نے اس نوجوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
”تمہاری واسکٹ بہت سوہنی ہے۔ یہ ہمیں دے دو۔“

”سوہنی“ لفظ سنتے ہی نوجوان نہال ہو گیا۔.... وہ بے خودی کے عالم میں بولا۔ ”سوہنی کے نام پر میری جان بھی قربان..... یہ لو۔“

پھر اس نے بلیڈ سے زری والی واسکٹ کا کلز اکاٹ کر اچھال دیا۔

”تمہاری جوتی بہت سوہنی ہے۔“ کسی نے ہانک لگائی۔

اس نے دونوں بیروں سے جوتیاں اتار کر اپنی آنکھوں سے لگا لیں اور بولا۔ ”اگر یہ سوہنی ہیں تو انہیں بیروں میں نہیں پہن سکتا..... میں سوہنی کی ایسی جگہ نہیں کر سکتا۔“

یہ کہہ کر وہ زار و تظار رونے لگا۔ پھر وہ جوتی کو اٹھا کر سوہنی کہنے والے کی طرف لپکا اور اسے جوتیاں تمہا کر ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

وہ شہر کی گلیوں اور بازاروں میں بھٹکتا رہا۔ اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں لیکن اسے گویا کسی کی پروا نہیں تھی۔ وہ کہیں بیٹھ جاتا تو بیٹھا ہی رہتا۔ رونے لگتا تو روتا ہی چلا جاتا۔ اس کی صورت، اس کی جوانی اور اس کے حال کو دیکھ کر لوگ ایک دوسرے سے کہنے لگے۔

”یارو، جس کا ایسا گبرو نوجوان بیٹا سو دابی ہو جائے، اس ماں کا کیا حال ہوگا؟“

کسی نے کہا۔ ”اگر اس کی سوہنی اسے اس حال میں دیکھ لے تو شاید ہیر کی طرح کچھ کھا کر جان دے دے گی۔“

وہ دیوانہ مستانہ سب باتوں سے بے نیاز ایک ہنستے تنک شہر کی گلیوں میں خاک اڑاتا رہا۔ لوگوں کے دلوں میں اس کے لیے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی لیکن کوئی یہ نہیں جان سکا تھا کہ وہ عشق گزیہ نوجوان آیا کہاں سے ہے۔

☆☆☆

وہ دیوانہ اچانک کہیں غائب ہو گیا اور شہر میں ایک نیا چاند چڑھ آیا۔

سفید دو دھیا لباس میں بیویس ایک خوب صورت نرس گھر گھر جا کر عورتوں سے ملنے لگی۔ اگر وہ گندی رنگت کی نہ ہوتی تو اسے خامس ولایتی سمجھا جاتا۔ اس کے ناک نقش بھی اسے ویسی ثابت کرتے تھے۔ البتہ اس کی گفتگو سے یہ اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ وہ کسی ولایتی اسپتال میں ٹریٹنگ لیتی

اہم وقت آ گیا ہے۔ جو کسب تم نے محنت سے سیکھا ہے، وہ اپنے شہر کے لوگوں کو بھی دکھاتا کہ لوگ تمہارے باپ دادا کو یاد رکھیں۔ یاد رکھنا بیٹے! یہ روپ بہر روپ سب مالک کی لیلیا ہے لیکن جس نے اپنے ہنر اور کسب کی داد اپنے شہر، اپنی جنم بھومی سے حاصل نہیں کی، اس کا فن اور کسب....

بیکار ہے۔ جس کلاکار کے فن کا لطف اس کے اپنے لوگوں نے اٹھایا ہے، اس کے کمال فن کو دنیا نے بھی سراہا ہے اور اس کے سر پر عزت اور شہرت کا تاج رکھا ہے۔ جنگل میں مورنا چا کس نے دیکھا..... چل بیٹا! اپنے شہر والوں کو اپنا فن دکھا دے۔ تم پروسیوں کو تو خوش کرتے آئے ہو۔ اب ذرا اپنوں کو بھی راضی کر لو۔“

ملنگی اپنا کسب دکھانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس دوران میں شیخ کے بیٹے سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ پرانا یار ملا تو وہ پینول کی طرح کھل اٹھا۔

”یار، ویس ویس گھوم کر آئے ہو۔“ شیخ کے بیٹے نے کہا۔ ”ہمارے لیے کیا تمہہ لائے ہو؟“

”شیخ جی! افتکار کے پاس اس کے فن سے بڑھ کر اور کیا تمہہ ہو سکتا ہے۔ بیچ میں آج کی رات ہے۔ کل چاند چڑھے گا اور پورا جگہ دیکھے گا۔“ پھر وہ اس کے گال پر ہلکی سی چنگلی لیتے ہوئے بولا۔ ”اور ہاں، شیخ جی! اگر آپ کو میرا شاگرد بننا ہے تو لٹو دکھاؤ اور پکڑی دو پٹا تیار رکھنا۔“

”بس اوئے، بڑا آیا استاد!“ شیخ کے بیٹے نے کہا۔ ”تم تین چار سال میں ایسا کیا سیکھ آئے ہو جو ہمیں استاد بننے کا شوق چرا رہا ہے۔ ارے بے وقوف! ہم انگریزی اسکول سے پڑھے ہوئے ہیں اور والدین کی انکوئی اولاد ہیں۔ ارے ہم نے اپنے جیسا اپنے باپ کے گھر میں پیدا ہونے نہیں دیا۔ تم کس کیفیت کی مولیٰ ہو۔ اونہ..... بڑا آیا ہمارا استاد بننے۔ بھلا دکھاؤ تو سہی، کیا کارنگری ہے تمہارے اندر، کون سے گن ہیں تیری نکلا میں، کیسے موتی ہیں تمہارے پلے؟“

☆☆☆

انگلے دن شہر کے لوگوں نے دیکھا کہ ایک خوب رو نوجوان بے خودی کے عالم میں گلی گلی بھٹک رہا ہے۔ بہترین لباس میں لمبوس دراز قد اور وجیہہ نوجوان عشق کی چوٹ کھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کبھی وہ بے خیالی کے عالم میں بڑبڑانے لگتا اور کبھی دیوانوں کی طرح ہنسنے لگتا۔

”مان تاپ کا لاڈلا معلوم ہوتا ہے۔“ لوگ اس نوجوان کے بارے میں تبصرہ کرنے لگے۔

انہوں نے اسے بہترین پوشاک اور قیمتی جوتے

تصویریں صفحہ اول پر چھاپیں۔ درمیان میں فقیرے بہرہ دے کے بیٹے ملنگی کی پورے قد سے ایک تصویر چھاپی گئی تھی۔ کمپنیشن میں لکھا تھا۔
”ملنگی..... فن بہرہ دے کا فنکار!“

”ایسے فنکار ہمارے اپنے دیس میں تو کیا دوسرے ملکوں میں بھی کم ہی پائے جاتے ہیں۔“

دوسرے اخباروں نے بھی بہرہ دے کے فن پر مضامین شائع کیے۔ انہوں نے نامور بہرہ دے کے فن سے ملنگی کی صلاحیت کا موازنہ کیا تھا اور ملنگی کو سب سے بڑا کلاکار قرار دیا تھا۔

پورے شہر میں ملنگی کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ جہاں دیکھیے، لوگ اس کی باتیں کرتے نظر آتے تھے۔ اس کے باپ کو مبارکبادیاں وصول کرنے سے فرصت نہیں تھی۔ پھولوں کے ہار ایک طرف، لوگوں نے باپ بیٹے کو نوٹوں کے ہاروں سے لاد دیا تھا۔

ملنگی اپنے گلے میں نوٹوں کے ہار ڈالے اور اخبارات کے پرچے ہاتھ میں اٹھائے اپنے یار شیخ صاحب کے بیٹے سے ملے چل دیا۔ دونوں دوست ملے تو ملنگی نے کہا۔

”اب لے آؤ پگڑی اور دوپٹا..... لڈوؤں کے قتال کے ساتھ۔ آج ہم تمہیں اپنا شاگرد بنا لیں گے۔“

”اتنا تیز مت چلو دوست!“ شیخ صاحب کے بیٹے نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میدان میں اڑنے والی دھول کو بیٹھ جانے دو۔ ممکن ہے دھول کے بیٹھے ہی میدان کی دوسری طرف سے کوئی تم سے لمبی بڑا پہلوان اور فنکار نمودار ہو جائے۔“

”پہلوان تو بے شک کئی سامنے آسکتے ہیں شیخ جی! لیکن بہرہ دے کا فنکار ہم سے بڑھ کر نہ ہوگا۔ یہ ہم دعوے سے کہتے ہیں۔“ ملنگی نے یقین سے کہا۔

شیخ جی پھر ہنس دیا۔ ”بڑی باتیں مت کرو پیارے! یہاں ایک سے بڑھ کر ایک فنکار پڑا ہوا ہے۔“

ملنگی نے کہا۔ ”جب تک مجھ سے بھی بڑا فنکار سامنے نہیں آئے گا میں کیسے مان سکتا ہوں۔“

بہر حال اس شہر میں ہمیشہ باصلاحیت انسان سامنے آتے رہے ہیں۔ مداری کی بیماری کی طرح اس میں سے نت نئی اور حیران کن ”چیزیں“ نکلتی رہی ہیں۔

ملنگی کے بہرہ دے کے قہے شہر میں گردش کر رہے تھے کہ ایکشن کا غلط اٹھ کھڑا ہوا۔ ہر طرف گہما گہما ہی اور رونق پیدا ہو گئی۔ قد آدم پوسٹروں سے دیواریں سج گئیں۔ جگہ جگہ

رہی ہے۔ دو تہجرتی شکستہ جس طرف سے بھی نکلتی، لوگوں کی نگاہیں دور تک اس کا تعاقب کرتیں۔ اس کے بیگ میں بخار کی گولیاں، کھانسی کا شربت، مرہم اور پٹیاں موجود تھیں۔ آدھی بیماری تو اسے دیکھتے ہی دور ہو جاتی تھی، جب وہ پیار سے کہتی۔

”دیکھو دیری ناہیں لگتا۔ تم ابھی اچھا ہوتا۔“ ایسے میں روگیوں کو اپنا روگ دور ہوتا محسوس ہوتا۔ کوئی بزرگ خاتون اسے دعا دیتی۔ ”اللہ تمہیں خوش رکھے۔ سر کا سائیں سلامت رہے۔“

یہ سن کر وہ ہنستے ہنستے دہری ہو جاتی اور پوچھتی۔ ”اماں! سر کا سائیں کیا ہوتا ہے؟“

جب اسے اس بات کا مطلب بتایا جاتا تو وہ شرماتے ہوئے بتاتی کہ ابھی اس کا بیاہ نہیں ہوا۔ عورتیں کھی کھی کر کے ہنسنے لگتیں۔

دو چار دنوں میں وہ ”مس صاحبہ“ ہر گھر کی سنبلی بن گئی اور اس کا انتظار کیا جانے لگا۔

☆☆☆

شہر میں خوب صورت اور منسار نرس کا جہ چہ ہونے لگا۔ ایسے میں شہر کے نئے کوتوال آگے۔ انہوں نے آتے ہی شہر کی تمام چھابڑیاں اشوا دیں۔ ٹھیلے اور تھڑے ہوا دے اور جگہ جگہ موجود گندگی کے ڈھیر صاف کر دیے۔ شہر بھر کی ایسی صفائی ستھرائی ہو گئی کہ لوگ حیران رہ گئے۔ شہر کے لوگوں کے دلوں میں ان کا رعب بھی بیٹھ گیا تھا۔ اونچے لمبے قد پروردی انہیں بارعب بتاتی تھی۔ ایک دن وہ بازار سے گزرتے ہوئے رک گئے اور لوگوں سے مخاطب ہوئے۔

”یہ رکا دٹ سے پاک کھلی سڑکیں آپ ہی کے فائدے کے لیے ہیں۔ ناجائز تہا دزات سے آپ کی آمدورفت میں غلغل پڑتا ہے۔ گندگی سے آپ کی صحت خراب ہو سکتی ہے۔ آپ لوگ بھی اس بات کا خیال رکھیں اور جگہ جگہ کچرا نہ پھینکیں۔ اس سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، کھینوں اور چھجروں کا عذاب بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔“

اس کے علاوہ چوراہوں، نو سر بازوں اور جیب کتروں سے بھی شہر کو پاک کر دیا۔ مطلب یہ کہ جب سے یہ نئے افسر شہر میں آئے تھے ہر طرف امن و امان قائم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

شہر کے با تصویر ہفت روزہ نے ”عشق گزیدہ“ اور ”فرض شناس کوتوال“ کی

READING
Section

میں تو شاعر ہوں سو ہوں آوارہ
اب کیوں اپنے گھر نہیں جاتے

اک جنوں حیز کی داستان... اک درد آشنا کا قصہ

محبت اس سے ہے

نواب مسٹر رنگ حسن کے تراخی

مشرقی لہجے، دکھ اور ادا چھوٹے اسلوب کے مالک

نوجوان نسل کے نمایندہ شاعر و صحیفہ نگار کا شعری مجموعہ مشرق نام پر آ گیا ہے

اپنی کاپی آج ہی حاصل کرنے کے لیے رابطہ کیجئے

سائبر پبلکیشنز

0333 2267532

(اتارہ)

پتہ: سائبر پبلکیشنز

کراچی: حیدر پورہ

024 32770057

0213 2 00057



READING
Section

تھے کہ گندانا لا شہر کے حسن کو برباد کر رہا ہے۔ لہذا اسے پاٹ کر اس کی جگہ گرین بیلٹ تیار کی جائے۔ شہر کا گندانا پانی کسی دوسری طرف نکالا جائے۔

ظاہر ہے اس طرح شہر کے حسن کو چار چاند لگ جاتے اور لوگوں کو کھیلوں اور چھتروں کے علاوہ تعفن سے بھی نجات مل جاتی۔ لیکن شیخ صاحب اپنا یومیہ ہزاروں روپے کا نقصان کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ اس لیے وہ کسی کی بات نہیں سنتے تھے اور سب کو ان کی بات سنتی پڑتی تھی کیونکہ وہ شہر کی کمیٹی کے پردھان تھے اور ان کی مرضی کے خلاف گندانا تو ایک طرف، کمیٹی کا کوڑا اٹھانے والے گدھے کا رخ بھی نہیں موڑا جاسکتا تھا۔

ان انتخابات میں شیخ صاحب بھی کمیٹی ممبر کے امیدوار تھے۔ اگر وہ ممبر منتخب ہو جاتے تو ان کا پردھان بننا مشکل نہ تھا۔

لوگوں کا خیال تھا کہ ”ملبا شیخ“ کو ممبر بنانا گندے نالے کی عمر کو طول دینے کے مترادف ہے۔ بولنے اور لکھنے والے ملبا شیخ اور گندے نالے کے حوالے سے طرح طرح کی کہانیاں سامنے لے آئے۔ جلسے اور جلوسوں میں وہ کہانیاں بیان کر کے لوگوں کو ہنسیا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ پورا شہر اس بات پر متفق ہو گیا کہ گندانا لا اور ملبا شیخ دو مختلف چیزیں ہیں بلکہ ان دونوں سے ایک ساتھ ہی جان چھڑانی پڑے گی۔

اس قسم کی باتیں تو کی جاز ہی تھیں اور محض باتیں کرنا خاصا آسان بھی ہوتا ہے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ شیخ صاحب کی راہ میں حائل ہولے والا کوئی نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس شہر کی کسی ماں نے ایسا سورا پھیرا ہی نہیں کیا جو آگے بڑھ کر ممبری کے لیے شیخ صاحب سے ٹکر لے اور ان کی جگہ خود شہر کا پردھان بن جائے۔

آخر کار اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لیے شہر کے لوگوں نے ایک جلسہ منعقد کیا۔ اس میں شہر کے تمام لوگوں کو شریک ہونے کی دعوت دی گئی۔ طے شدہ وقت پر شہر کے خاصے لوگ وہاں پہنچ گئے تو ایک شخص ڈانس پر آکر ان سے مخاطب ہوا۔

”بھائیو اور دوستو! اس گندے نالے کی سیاہ کچھڑ اور بدبودار پانی ہمارے شہر کے لیے کلک کا ٹیکا ہے۔ جب تک بیماری کی یہ نہر ہمارے شہر کے درمیان بہتی رہے گی۔ تب تک طیریا، بدبو، پھوڑے جیسے روگ پر بھگتی کھیلوں اور چھتروں سے ہماری جان نہیں چھوٹے گی اور جب تک بڑی حویلی والے شیخ صاحب میونسپل کمیٹی کے چیئرمین رہیں گے،

جلسے ہونے لگے، جلوس نکلنے لگے اور اگلے لوگوں کی مصروفیات نکل آئیں۔ وہ بھی کچھ عرصے کے لیے برسر روزگار ہو گئے۔ انہیں رقم فراہم کی گئی کہ وہ اس بات کا خیال رکھیں کہ جو ان کے پوسٹر اور بینرز تارنے کی کوشش کرے اسے سبتی سکھائیں تاکہ دوبارہ کوئی ایسی حرکت نہ کرے۔ ان کا دوسرا کام یہ تھا کہ وہ اپنے امیدوار کے جلسوں میں نعرے لگائیں اور خوب شور مچائیں۔

دراصل اس شہر میں ایکشن کے پوسٹر وغیرہ لگانے کے ساتھ ہی یہ انتظام کرنا بھی لازمی ہوتا ہے کہ مخالفین انہیں پھاڑ اور اتار نہ دیں۔ عام طور پر ایسا ہوتا تھا کہ ایک پارٹی کے کارکن دیواروں پر اپنے امیدوار کے پوسٹر لگاتے جاتے اور ان کے پیچھے مخالف پارٹی کے لفٹے انہیں پھاڑ کر لیر لیر کر دیتے۔ شہر میں ہر امیدوار کے کارکن گویا چوکیداری کرتے پھرتے تھے۔

اس شہر کی ایک روایت یہ بھی رہی ہے کہ جہاں ایکشن کے دوران خوب شور مچا اور رونق ہوتی تھی وہیں کوئی نہ کوئی مثبت مسئلہ بھی اٹھایا جاتا تھا پھر اس مسئلے پر لوگ بڑھ چڑھ کر بولتے تھے۔ لیکن اس وقت سب سے زیادہ بڑھ چڑھ کر پڑی حویلی کے شیخ صاحب کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں۔ جب سے شیخ صاحب کے ہاتھ دولت لگی تھی، اسی وقت سے عام آدمی اور ان کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا تھا۔ نہ تو عام لوگ انہیں اپنا سمجھتے تھے اور نہ ہی شیخ صاحب انہیں انسان گردانتے تھے۔

جب سے شیخ صاحب شہر کے درمیان میں سے نکلنے والے گندے پانی کے نالے کے حق میں اڑ کر کھڑے ہو گئے تھے؟ اسی وقت سے شہر کے لوگ ان کے مخالف ہو گئے تھے۔ لوگوں کا مطالبہ تھا کہ گندے نالے کو شہر کے درمیان میں سے ہٹایا جائے۔ اس کا رخ بدلا جائے، زیر زمین کوئی انتظام کیا جائے اور اسے ہر صورت میں پاٹ دیا جائے۔ جبکہ شیخ صاحب اس کے سخت مخالف تھے۔

دراصل اسی گندے نالے کے پانی سے شیخ صاحب کی زمینیں سیراب ہوتی تھیں۔ وہ گندانا لا طویل عرصے سے اسی جگہ موجود تھا۔ شہر سے باہر، نالے کے قریب واضح زمین شیخ صاحب نے منہ مانگے دام ادا کر کے خریدی تھی۔ اس کی واحد وجہ یہی تھی کہ نالے کے پانی سے سبزیاں کثرت سے اور بہتر بن پیدا ہوتی تھیں۔ اس سے شیخ صاحب کو خاصی آمدنی ہوتی تھی۔

لوگوں کا مطالبہ شدت اختیار کرتا چلا گیا۔ وہ چاہتے

جس کا بیٹا پہلی مرتبہ میر اور میری سہیلی کا چہرہ میں نہ بن گیا۔

☆☆☆

اب لوگ اس بات کے ہنسنے لگے کہ کب کبھی کے مزدور کہہ لیں، بیٹے اور نوکریاں لے کر آتے ہیں اور نالے کو پانے کا کام شروع ہوتا ہے۔

سچ صاحب کا بیٹا ایکشن کے دوران باپ کا گھر چھوڑ کر اپنے نسز مال میں رہنے لگا تھا۔ لوگ کہنے لگے تھے کہ یہ گندا نالا باپ بیٹے کے درمیان ایک علیحدگی کی طرح جائل ہو گیا ہے۔ جو علیحدگی کی طرح کبھی پانا نہیں جاسکے گا۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال تھا کہ لاکھ اختلافات سہی، فریب اور سگے رشتوں میں ہمیشہ کے لیے دوریاں قائم نہیں رہ سکتیں اور یہ بات مناسب بھی نہیں ہے۔

کچھ ہی عرصے کے بعد لوگوں نے سنا کہ سچ صاحب کا بیٹا میری سہیلی کا چہرہ میں بننے ہی دوبارہ بیوی کو لے کر باپ کی حویلی میں آ گیا تھا لیکن لوگ اس بات کا انتظار ہی کرتے رہے کہ کبھی کی جانب سے نالا پانے کا کام کب شروع کیا جاتا ہے۔

سب سے زیادہ لگرا اس کے یار ملنگی کو تھی۔ وہ سینہ ٹھونک کر لوگوں سے کہتا رہا تھا۔ "میرا یار بڑے سچ صاحب کے تمام گناہ و حدودے گا۔ باپ نے شہر سے جو دغا بازی کی ہے، ان کا بیٹا اس کی تلافی کر دے گا۔ وہ نالے کو بند کر کے شہر کو شیشے کی طرح صاف کر دے گا۔ میرا یار بڑا جی دار اور وعدے کا پکا آدمی ہے۔ دیکھنا، اس نے جو کہا ہے، وہ کر دکھائے گا۔"

لیکن لوگوں کا انتظار طویل ہوتا چلا گیا۔ گندا نالا اپنی تمام غلاحت اور بدبو کے ساتھ موجود رہا۔ ملنگی کا جوش اور جذبہ بھی ماند پڑنے لگا۔ آخر کار وہ ایک دن سچ صاحب کے بیٹے سے ملنے گیا۔ چڑا سی نے چک اٹھا کر اسے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ سچ صاحب کا بیٹا بڑی شان سے پردھان کی کرسی پر براہمان تھا۔ لیکن آج ملنگی نے جیسے ہوئے اپنی بات شروع نہیں کی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہی سنجیدگی سے بولا۔ "سچ جی! آپ سب سے پہلے مجھے یہ بتائیں کہ نالا پانے کا وعدہ اب تک کیوں پورا نہیں ہوا؟"

سچ صاحب کا بیٹا اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔ کان سے پکڑ کر اسے کھڑا کیا اور اس کی ٹھوڑی کو انگوٹھے سے ٹھوکا دے کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔

"اوائے فقیرے بھانڈ کی اولاد! دیکھا اصل بہرہ پیا؟"

اس نالے کو پانے کا ہرجمن ناکام رہے گا۔ بس یوں بکھے کہ شیخ صاحب اور گندا نالا ساتھ ہی رہیں گے اور ساتھ ہی جائیں گے۔ ہے کوئی ایسا شخص جو شیخ صاحب سے ٹکر لے؟ پھر وہ کامیاب ہو پانا کامیاب..... لیکن ایک بار شیخ صاحب کو یہ معلوم ضرور ہو جانا چاہیے کہ شہر کی پیشانی پر اس کا لک کے دھبے کو دھونے والے بہا اور لوگ بھی اس شہر میں بستے ہیں۔"

مقررہ بیٹھ گیا تو ہر طرف قبرستان جیسی خاموشی چھا گئی۔ ایسا مظلوم ہوتا تھا جیسے کسی میں بولنے کی سکت ہی نہیں رہی۔ حاضرین کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ سب ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔ اچانک ساکت لوگوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ ایک نوجوان کو راستہ دینے کے لیے ایک طرف ہونے لگے۔ شیخ صاحب کا بیٹا آگے بڑھا اور اسٹیج پر آ کر بولنے لگا۔

"میرے بزرگو اور بھائیو! میں کوئی لمبی چوڑی تقریر نہیں کروں گا، نہ ہی مجھے تقریر کرنا آتی ہے۔ میں سیدھا سا وہ اور کام کرنے والا بندہ ہوں، میں خود ایک عرصے سے اس گندے نالے کے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ لیکن اس سے نجات کی مجھے کوئی راہ نہیں سوچی۔ آج آپ لوگوں کی باتوں نے مجھے بھی راہ سجائی ہے۔ میں زیادہ باتیں کرنے کے بجائے صرف اتنا کہوں گا کہ شیخ صاحب میرے والد ہیں۔ انہوں نے مجھے پالا پوسا اور تعلیم دلوائی ہے۔ ایک اچھے گھرانے میں میری شادی کرائی ہے..... لیکن اس کے ساتھ ہی یہ شہر بھی میرا کچھ لگتا ہے۔ میرا اس سے بھی ایک تعلق ہے۔ جس طرح میرے والدین کی خدمت مجھ پر فرض ہے اسی طرح یہ شہر بھی مجھ پر کچھ حق رکھتا ہے۔ میں اس کی فضاؤں میں سانس لیتا ہوں۔ اس کا اناج کھا کر اور پانی پی کر پلا بڑھا ہوں۔ اسی شہر کی گلیوں اور میدانوں میں کھیل کود کر بڑا ہوا ہوں..... اس کا بھی مجھ پر حق ہے۔ میں اپنے خوب صورت شہر، اپنی جنم بھومی کی پیشانی سے کالک کا یہ داغ و حدودوں کا اور اس کے سینے سے گندگی کے اس ناسور کو شتم کر کے ہی دم لوں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے اپنے سگے باپ سے بھی کیوں نہ ٹکر لینی پڑ جائے۔ میں ایک اصولی مؤقف اور اپنے شہر کی بھلائی کے لیے یہ کر گزروں گا۔"

شیخ صاحب کے بیٹے کی باتیں سن کر شہر کے لوگ بہت خوش ہوئے۔ وہ اسے کندھے پر اٹھا کر شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر نعرے لگانے لگے۔

"ملنگی! مردہ باد۔ ان کا بیٹا زندہ باد۔"

یہ نعرے اس وقت تک گونجتے رہے جب تک ملنگی کی

انجانا آشنا

ناہید سلطان اختر

جذبہ عشق... کہیں گل و گلزار کی صورت پھلتا پھولتا ہے اور کہیں چنگاری بن کر دھیرے دھیرے دلوں کو گرماتا ہے مگر جب... مخالف ہوا چل جائے تو سب کچھ جلا کر راکھ کر دیتا ہے اور اس راکھ میں حسرتیں، ناکامیاں اور... ادھورے خواب تمام عمر کی بے چینی، اپنے مطلوب کی خوشیوں سے بھرپور زندگی کو بھی دکھوں سے بھر دیتی ہے۔ ہاں ایسا تب ہی ہوتا ہے جب کوئی وعدہ کرے اور بھول جائے... کسی کے دل میں زبردستی اترے اور پھر رستہ بدل جائے... خوشیوں کا سودا کرے اور غموں کے تحفے دے جائے... ساتھ ساتھ چلنے کا عہد کرے اور قدم قدم پر مکرو فریب سے سمت بدل جائے۔ ایسے میں بھلا کس طرح یہ ادراک ہو سکتا ہے کہ یہ انجام کیوں ہوا اور یہ آشنائی... بے اعتنائی میں کیونکر بدل گئی... شاید مقدر کی بساط پر ایسی ہی چالیں چلی جاتی ہیں جن کا کسی کو وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ یہ اور بات کہ کسی کے دامن میں کامیابی کے پھول کھلتے ہیں اور کوئی شکستگی کی دھول میں کہیں گم ہو جاتا ہے... اس کے باوجود... قدرت کا تعاقب موت تک جاری رہتا ہے اور مکافات کا جال کہیں نہ کہیں خطا کار کو قید کر لیتا ہے۔

تلی سمجھ کر محبت سے گھیلنے والے ایک عاقبت نا اندیش

عاشق کی داستان لہو

”اس وقت ا“
”تم نے کہا تھا نا..... آؤ۔“ وہ گھٹی گھٹی آواز میں بول رہی تھی۔

ہاں..... کہا تو تھا اس نے مگر اب جب وہ آگئی تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔

”تمہارے گھر والے؟“ اس نے دبی دبی آواز میں پوچھا۔

”سور ہے ہیں۔“

”تم آئیں کیسے؟“

”دیوار کو دو کر۔“ اس نے بتایا پھر بولی۔ ”تم نے کہا تھا نا عاقب..... آؤ..... میں آگئی۔“ اس کے لہجے میں اتراہٹ تھی۔

وہ اس کے بہت قریب آگئی تھی..... اتنی کہ وہ اس کی گرم سانسوں اپنے وجود پر محسوس کر سکتا تھا۔

”عاقب!“ اس کی آواز میں ڈر تھا، تشویش تھی، اندیشے تھے..... مگر فیصلہ کن کیفیت بھی تھی۔ ”میں صرف تم

سے شادی کروں گی عاقب۔“

سر سے پاؤں تک لحاف تانے وہ جسم میں اترتی سردی کو ماہ نور کے تصور سے گرمانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے دروازے کا دستہ آہستگی سے گھمانے اور پھر دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ اس کا خیال تھا شاید بھابی ہوں۔ گھر میں اس کی موجودگی کا اطمینان کرنے کو وہ اکثر یونہی چھاپا مارا کرتی تھیں۔

”آج سردی بہت ہے بھابی۔“ وہ لحاف کے اندر

ہی سے بولا۔

دروازہ آہستگی سے بند ہو گیا مگر قدموں کی چاپ کمرے سے باہر جانے کے بجائے نزدیک ہوتی سنائی دی اور پھر دبی دبی آواز آئی۔ ”میں ہوں۔“

لحاف منہ پر سے ہٹاتا وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں پھیلی تاریکی کے باوجود وہ اسے اس کی آواز سے پہچان سکتا تھا۔

”تم!“ وہ بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہاں! وہ آہستہ سے بولی۔“

Downloaded From

Paksociety.com

Section



کمرے میں وہ تھا، ماہ نور، تاریکی اور.....
صبح کو پھٹنے سے پہلے وہ گھر کی زیریں منزل پر راحمہ
کے دروازے پر کھڑا دروازے کو اپنی انگشت شہادت کی انگلی
پورے سے آہستہ سے کھٹکھٹا رہا تھا۔ راحمہ کی نیند بڑی چوکنی تھی۔
"کون؟" راحمہ نے پوچھا۔

"میں ہوں بھابی۔"
راحمہ نے دروازہ کھول دیا۔ "خیریت تو ہے؟"
"وہ..... بھابی..... وہ....." زبان اس کا ساتھ دے
رہی تھی نہ الفاظ! "بھابی..... وہ....."

"بول بھی چکو عاقب..... مجھے وحشت ہو رہی ہے۔"
"وہ..... ماہ نور..... رات وہ..... ہماری طرف آگئی تھی۔"
"ماہ!" راحمہ کا منہ کھلا اور اس کا ہاتھ میکا ٹکی طور پر
منہ تک گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے عاقب کو دیکھتے ہوئے
اس نے پوچھا۔ "پھر گئی کسے؟"
"گئی نہیں..... اوپر کمرے میں ہے۔"

"اوه میرے خدا!" راحمہ کو جیسے چکر ہی تو آنے لگا
تھا۔ "رات بھر تمہارے کمرے میں رہی؟" اس نے دہی
دہی آواز میں پوچھا۔
عاقب کا سر جھک گیا۔

بھابی نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا اور اس کی
نظریں فرش سے جا لگیں وہ مجرم کی طرح سر جھکانے کھڑا
تھا..... جرم تو سر زد ہو چکا تھا..... بلکہ گناہ!
یگانہ راحمہ کا سینہ لگی اور اس کے دانت بجنے لگے۔
"صبح..... ہونے..... وانی ہے..... اسے..... جلدی.....
واپس..... بھیجو۔" راحمہ نے مسلسل بچتے دانتوں کی
کھٹکھٹ میں کہا۔

"وہ واپس جانے کو تیار نہیں۔" عاقب نے کہا۔
اپنے لرزتے وجود کے ساتھ راحمہ نے گھر کے لاؤنج
سے اوپر جاتے زینے کا رخ کیا۔ جس کھیل کا وہ اتنے دنوں
سے خود بھی ایک اہم کردار بنی رہی تھی اس کے اس منظر نے
حقیقی زندگی میں اس کے چپکے چھڑا دیے تھے۔ اس کے گمان
میں بھی نہ تھا کہ یوں ہوگا۔

☆☆☆

دونوں گھر حقیقی طرف سے تقریباً چھ فٹ بلند ایک
حصہ تھے کہ دیوار سے ملے ہوئے تھے۔ یہ دیوار عاقب کے
والد محمد عارف نے جنہیں اب مرحوم و مغفور ہوئے بھی سات
آٹھ برس بیت چکے تھے اپنی عملی زندگی کے ابتدائی برسوں

میں سرکاری نرخ پر خریدے جانے والے پانچ سو مربع گز
کے پلاٹ کی احاطہ دیوار تعمیر کراتے ہوئے کھڑی کرائی
تھی۔ اچھا وقت تھا جو انہیں یہ پلاٹ مل گیا تھا ورنہ چند
برسوں بعد تو وہ اس علاقے میں پانچ سو مربع گز تو کجا اتنی گز کا
پلاٹ خریدنے کی بھی نہ سوچ پاتے۔ زمین کی قیمتیں نہایت
تیزی سے بڑھی تھیں۔ بھلا ہو بینک کی نوکری کا جس نے
انہیں قرضہ لے کر اس پلاٹ پر مکان تعمیر کروانے کا حوصلہ
بھی دیا۔

محمد عارف اپنے دور طالب علمی میں رہے تو تھے
محاشیات کے طالب علم اور حصول تعلیم کے بعد بننے پینے اور
پینے کا مگر طبعا وہ نہایت آرٹسٹک آدمی تھے۔ سو مکان تعمیر
کرواتے ہوئے انہوں نے اس بات کا پورا خیال رکھا کہ
ان کا تعمیر کرایا ہوا مکان فقط دیوار کا ڈھانچا نہ دکھائی
دے بلکہ اس میں زندگی بھی متحرک ہو۔ یہی خواہوں کا مشورہ
تھا کہ وہ اپنے مکان کی تعمیر میں زیادہ سے زیادہ مکانیت کا
عنصر نہ نظر رکھیں مگر محمد عارف نے سنی سب کی کیا وہ جوان کا
تجی چاہا۔ انہوں نے گھر کی تعمیر میں وسعت مکانیت سے
زیادہ دلکشی کو مقدم رکھا۔ کمرے بڑے نہ بنائے لیکن
عمارت کے تین اطراف کشادہ لان اور کھاریوں کا اہتمام
کیا۔ گھر میں کارپورج ضروری نہ ہوتا تو وہ چوٹی کی جانب بھی
پھول اور سبزہ بچھوا دیتے۔ گھر کے ہر کمرے میں انہوں نے
بڑی بڑی کھڑکیاں رکھوائیں جن سے سبزہ دکھائی دیتا اور
رنگ برنگ موٹی پھول اپنی چھیب دکھاتے۔ عارف صاحب
کے گھر جو آتا ان کے مکان کی تعمیر و بناوٹ اور گھر کے ہر
حصے سے سبزہ دکھائی دینے کی تعریف کیے بنانا رہتا۔

محمد عارف نہ تو جدی پشتی امیر آدمی تھے نہ ہی کوئی
اعلیٰ منصب دار۔ اچھی شہرت کے حامل ایک مالیاتی ادارے
میں گریڈ ون افسر تھے۔ کچھ اپنی جج پونجی اور کچھ ادارے
سے قرض لے کر انہوں نے بچوں کے لیے اپنی حیثیت سے
بڑھ کر ٹھکانا بنوایا تھا۔ کوئی اچھا وقت تھا کہ انہوں نے
پلاٹ خرید کر ڈال دیا تھا ورنہ بعد میں تو وہ اتنا بڑا پلاٹ
خریدنے اور اس پر اپنے بچوں کے لیے اتنا عمدہ مکان تعمیر
کرنے کی ہمت ہی نہ کر پاتے۔ ان کے تین بیٹے تھے
عاقب، عاطف اور عاقب۔ تینوں کے لیے ان کی آنکھوں
میں سنہری خواب بچے تھے۔

محمد عارف کا اپنا بچپن، نوجوانی اور پھر عملی زندگی کے
دو عشرے بہت معمولی مکانوں میں گزرے تھے۔ بچپن اور

بچے ہمارے عہد کے

یہ کہانی کسی انسان کے بچے کی نہیں ہے۔ بلکہ ایک بھیڑ کے بچے کی ہے اور بھیڑ کا یہ بچہ آج کے عہد کا ہے۔ جنگل میں بھیڑ کا ایک بچہ نالے سے پانی پی رہا تھا کہ ایک شیر کا ادھر سے گزر ہوا۔ بھیڑ کے بچے کو دیکھ کر شیر کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کیونکہ وہ کئی دن سے بھوکا تھا وہ آہستہ آہستہ بھیڑ کے بچے کی طرف بڑھنے لگا۔ بچے نے شیر کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ لیا۔ اس نے شیر سے کہا۔ ”آپ بے شک مجھے کھا جائیں۔ کیونکہ میں اپنی زندگی سے تنگ آچکا ہوں۔“

”زندگی سے تنگ کیوں آگئے ہو۔۔۔؟“
شیر نے فکرمند لہجے میں کہا۔

”جناب میری ماں اتنی ہی ظالم ہے۔ جتنی موٹی تازی ہے۔ وہ ہر وقت مجھے مارتی رہتی ہے اور وقت بے وقت مجھے حکم دیتی رہتی ہے، اب یہی دیکھ لیں کہ یہ وقت میرے ناشتے کا ہے اور اس نے مجھے یہ حکم دے کر بھیجا ہے کہ جاؤ دیکھ کر آؤ۔ نالے میں پانی ہے یا نہیں۔“ بھیڑ کے بچے نے کن اگھیلوں سے شیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”کیا تم فوراً جا کر اسے بھیج سکتے ہو۔ لیکن میرا نہ بتانا اور یہ بھی کہنا کہ نالے میں پانی بہت ہے۔“ شیر نے کہا۔

”کیوں نہیں؟ ابھی بھیجتا ہوں۔ اس طرح اس ظالم سے میرا چھٹکارا ہو جائے گا۔“
بھیڑ کا بچہ یہ کہہ کر چلا گیا۔ شام تک نہ تو اس کی ماں آئی اور نہ وہ خود۔

انتخاب۔ ریاض بیٹ، حسن ابدال

ثاقب کا اپنے ایک دوست کی بیٹی راحمہ سے بچنے عاطف کا اپنے چھوٹے بھائی کی بیٹی رخشندہ سے اور عاقب کا اپنی بہن کی بیٹی نسرین سے۔ یہ بھی خدا کا بندوبست ہی تھا۔ ایک ثاقب تو ضرور اپنے بیروں پر کھڑا تھا باقی دونوں تو ابھی پڑھ ہی رہے تھے۔

ثاقب نے لی کام کیا تھا۔ اس کا نتیجہ نکلتے ہی محمد عارف نے اسے بھاگ دوڑ کر کے ایک بینک میں بھرتی کروا دیا تھا۔ وہ جانتے تھے ملازمتیں آسانی سے نہیں ملتیں۔ لہذا موقع ملتے ہی بچوں کو ان کے بیروں پر کھڑا

نو جوانی ساٹھ مربع گز پرو کروں کے ایک مکان میں جہاں آٹھ نفوس کا بڑی مشکل سے گزارہ ہوا کرتا تھا۔ اپنے دوستوں کو وہ بھی گھر کے اندر بلا کو نہیں بٹھا سکے۔ گھر کے باہر کھڑے کھڑے ہی بات چیت ہوتی اور وہیں سے رخصت کر دیتے۔ بہت ہوا تو کالج کے گلاس میں پانی۔ شادی کے بعد وہ دو ڈھائی برس تو گھر والوں کے ساتھ اسی مکان میں رہے لیکن جب گزارہ بہت مشکل ہو گیا تو پھر وہ بیوی اور بچے کے ساتھ کرائے کے مکان میں شفٹ ہو گئے۔ کرائے کے مکان میں کوئی اٹھارہ برس رہے، اسی دوران پلاٹ کی خریداری عمل میں آئی اور پلاٹ کا قبضہ ملتے ہی انہوں نے محکمے سے قرض لینے کی درخواست دے دی اور اپنی جمع پونجی سے مکان کی تعمیر کا آغاز کر دیا۔ ایک آرام دہ اور باعزت گھرانہ کی دیرینہ خواہش تھی۔ خود انہیں تو اپنے باپ کی طرف سے اچھا گھر نہیں مل سکا تھا لیکن اپنی آرزوئے دیرینہ کی تکمیل کی خاطر وہ کرنے کے لیے انہوں نے اپنے بچوں کے لیے ایک عمدہ مکان بنوا دیا تھا۔ جو دیکھنے میں بھلا اور رہنے میں آرام دہ اور پرسکون تھا۔ مکان کی زیریں منزل پر ڈرائنگ، ڈائننگ، ٹی وی لائونج تھا۔ مچن اور تین بیڈرومز مع انچھڈ باتھ۔ مکان کی بالائی منزل پر انہوں نے ایک کرا مچ انچھڈ باتھ تعمیر کرایا تھا، بطور خاص اپنے لیے۔ اس کمرے میں انہوں نے چار اطراف کھڑکیاں کھلوائی تھیں۔ ان کھڑکیوں سے وہ دور تک نظارہ کر سکتے تھے۔ ان کی اہلیہ کو زیریں منزل پر رہنا زیادہ پسند تھا۔ سب کچھ نیچے ہی تو تھا۔ لائونج، مچن، بچوں کے کمرے، کارپورج، لان مگر مشکل یہ تھی کہ نیچے تینوں بیڈرومز پر تینوں بیٹوں نے قبضہ جمالیا تھا۔ انہیں مجبوراً اوپر ہی آنا پڑتا کہ سیاں جو اوپر رہتے تھے، اس مکان میں شفٹ ہونے کے بعد وہ برس بھر ہی جی پائیں۔ ایک روز تیز بخار چڑھا جو پیش کے ڈاکٹر کی دوا سے ٹھیک ہی نہ ہو کر دیا۔ پانچویں چھٹے دن اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ اسپتال جا کر دو دن اور زندہ رہیں۔ ناک، منہ سے خون جاری ہو گیا۔ تجھیں جاری تھی کہ چل بسیں۔ گھرویران ہو گیا۔ اہلیہ کی موت محمد عارف کے لیے صدمہ تو تھی ہی وہ تنہا بھی رہ گئے۔ بیٹوں سے ہر بات تو نہیں کہی جاسکتی تھی۔ دل کا روگ محمد عارف کا خاندانی روگ تھا۔ ایک روز دورہ قلب سے دوچار ہوئے اور جاہز نہ ہو سکے۔ گھر اور بھی ویران ہو گیا لیکن جانے سے پہلے وہ تینوں بیٹوں کے رشتے طے کر گئے تھے، بڑے بیٹے

کر گئے تھے۔ لڑکی والوں کو معلوم تھا لڑکا خود مختار ہے، باصلاحیت ہے۔ آگے بڑھنے کی وجہ رکھتا ہے۔ گھر میں ساس بھی نہ ننگ گھر جانے والی کا اپنا ہی راج ہوتا تھا۔ سو جیسے ہی ثاقب نے شادی کا ارادہ کیا لڑکی والوں نے تپاری پکڑ لی۔ ثاقب سے کہہ دیا تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں جو ہماری بیٹی کے مقدر میں ہوگا وہ اسے تمہارے گھر جانے کے بعد مل جائے گا۔ لڑکی والوں کی تو داہ واہ ہو گئی۔ ثاقب نے طلائی زیورات کا ایک سیٹ خریدا۔ بارہ تیرہ ریشمی لباس۔ دلہن کے لیے دو جوڑے جوتے اور ایک پینٹ بیگ۔ اور ساتھ ہی ایک وٹنی بکس۔ معمولی خرچے پر دلہن گھر آ گئی۔ ولیمہ کی دعوت البتہ کافی خرچہ کرائی۔ بہر حال گھر میں عورت کی آواز اور اس کی ہنسی کے ساتھ چوڑیوں کی جھنگار سنائی دینے لگی۔ ثاقب کے کمرے میں بہار سی آ گئی۔ گھر میں زندگی کا احساس ہوتا۔ ثاقب کی دلہن عاطف کا بھی اتنا ہی خیال رکھتی جتنا عاقب کا۔ عاطف کو ٹیوشن سے جو آمدن ہوتی اس کا ایک حصہ وہ بھائی کو بھی دے دیتا۔ شروع میں تو وہ بہت حیران ہوئی لیکن پھر اس کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ پیسے وہ اسے گھر کے اخراجات میں اپنا حصہ ڈالنے کے لیے دیا کرتا تھا۔ ثاقب کی دلہن راحمہ کے آجانے سے گھر، گھر لگنے لگا تھا۔ گھر بیو کام کارج میں راحمہ کا ہاتھ بٹانے کے لیے ثاقب نے ایک ملازمہ رکھ دی تھی جو صبح آٹھ ساڑھے آٹھ بجے آتی اور سہ پہر کو تین چار بجے کے لگ بھگ واپس چلی جاتی۔ راحمہ کے آنے سے ثاقب ہی نہیں عاطف اور عاقب بھی گھر میں ایک خوشگوار تبدیلی محسوس کر رہے تھے۔ گھر کی بالائی منزل پر واقع کمرہ بند کر دیا گیا تھا۔ گھر میں چار افراد تھے۔ سب کی اپنی اپنی خواب گاہ تھی۔ بالائی منزل پر واقع کمرہ اب جھاڑ پونچھ کے لیے ہی کھولا جاتا۔ راحمہ بھی بہت خوش تھی۔ تین مردوں والے گھر میں اسے اپنا وجود انتہائی اہم محسوس ہوتا۔ ثاقب کی تو وہ خیر شریک زندگی ہی تھی۔ عاطف اور عاقب بھی گھر میں ہوتے تو اس کے آس پاس ہی منڈلاتے رہتے۔

☆☆☆

شادی کے دوسرے برس بیٹے کی پیدائش نے نہ صرف ثاقب اور راحمہ کے رشتے کو نئے معنی دیے بلکہ گھر میں بھی نئے رنگ بکھیر دیے۔ عاطف اور عاقب ننھے ہاشم کو گود میں اٹھائے پھرتے۔ راحمہ بچے کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں دن بھر مصروف رہتی۔ ثاقب دفتر سے گھر آنے کے بعد

کر دینا چاہیے۔ ثاقب وہیں تھا۔ اسکول سے کالج تک اس نے ہمیشہ اچھی تعلیمی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ بی کام میں فرسٹ ڈویژن لی تھی۔ عمر تقریباً بیس برس کے لگ بھگ۔ محمد عارف کے ایک کولیگ کے قریبی رشتے دار ایک معروف بینک میں اے وی بی لگے ہوئے تھے، ان سے کہہ سن کر محمد عارف نے ثاقب کو نوکری پر لگوا دیا۔ ارادہ تھا کہ جلد ہی اس کی شادی بھی کرویں گے۔ گھر میں ویسے بھی ایک خاتون کی اشد ضرورت محسوس ہوتی تھی مگر ان کی زندگی نے وفات کی۔

باپ کی موت کے وقت عاطف انجینئرنگ یونیورسٹی میں سال اول کا طالب علم تھا اور عاقب اسکول میں نویں جماعت میں زیر تعلیم..... چھوٹا ہونے کی وجہ سے عاقب دونوں بھائیوں کا لاڈلا تھا۔ البتہ ثاقب اور عاطف میں وہ ذہنی ہم آہنگی اور پیار نہیں تھا جو بھائی ہونے کے ناتے ان میں آپس میں ہونا چاہیے تھا۔ ثاقب مزاجاً قدرے خود غرض جبکہ عاطف جیسے کو تیسرا۔ مزاج کا یہی اختلاف ان کی ووری کا سبب تھا۔ دونوں کی بالکل نہ ہوتی۔ باپ کی موت بھی انہیں ایک دوسرے کے قریب نہ کر سکی تاہم عاقب سے دونوں ہی محبت کرتے تھے۔ باپ کی موت کے بعد عاقب سے دونوں ہی پوری شفقت کا رویہ رکھتے۔ اس کی کوئی خواہش کوئی فرمائش روند کی جاتی۔ عاطف کو ثاقب پانچ روپے دینے کا بھی روادار نہ تھا جبکہ عاقب کے لیے اس کے پاس اس کی کسی ضرورت کے معاملے میں انکار کی گنجائش نہ تھی۔ باپ کی موت کے بعد عاطف کو خود قبیل ہونے کے لیے ٹیوشن کا سہارا لینا پڑا۔ یونیورسٹی سے چھٹی کے بعد وہ تین چار گھروں میں بچوں کو ٹیوشن دینے جاتا اور یوں اسے اپنی ضرورتوں کے لیے ثاقب کا دست نگر نہیں بننا پڑا تھا بلکہ بچوں کو پڑھانے سے اسے اتنی آمدن ہو جاتی کہ وہ عاقب کو بھی کچھ دینے دلانے کے لائق ہو گیا تھا۔

گھر میں ایک خاتون کی کمی کا احساس تو عارف صاحب کی زندگی کے آخری برسوں سے کیا جا رہا تھا۔ وہ گئے تو یہ احساس دو چند ہو گیا۔ اس پر طرہ ثاقب اور عاطف کے درمیان اختلاف مزاج.... کوئی ناگزیر بات ہوتی تو عاقب ان دونوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنا۔ کبھی وہ ثاقب کو پیغام رسائی کرتا کبھی عاطف کو ثاقب کا سدبہ پہنچاتا۔ عاقب کو اپنی اس اہمیت کا بخوبی احساس تھا۔

ثاقب اپنے بیروں پر تو کھڑا ہی تھا۔ گھر میں عورت کی کمی کا غلام بننے کے لیے اس نے شادی کا ارادہ کر لیا، لڑکی

سے کرنی چاہیے اور یہ تو ڈیڑی کا فیصلہ ہے..... میں اس فیصلے کا احترام کروں گا..... آخر بھائی نے بھی تو آپ سے اسی لیے شادی کی کہ ڈیڑی کا فیصلہ تھا۔ ورنہ بھائی کی پرستاشی تو آپ جانتی ہی ہیں کتنی ڈینگ تھی بلکہ ہے۔“

راحہ اس کا منہ دیکھنے لگی۔ کیا وہ اسے یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس کے بھائی کے جوڑی نہ تھی اور اگر اس کے مرحوم باپ کا انتخاب نہ ہوتی تو اس کے بھائی کو اس سے اچھی لڑکی مل سکتی تھی۔

عاطف کی شادی کے لیے ثاقب کو بڑا بھائی ہونے کے ناطے چچا سے صرف یہ کہنے کی ضرورت پڑی کہ وہ عاطف کے لیے باپ کے طے کردہ رشتے کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہتا ہے۔ وہ تو جیسے تیار ہی بیٹھے تھے عاطف کے مشورے سے شادی کی تاریخ طے ہو گئی اور اگلی بار جب وہ چھٹی پر گھر آیا تو رخصتہ اس کی شریک حیات بن کر اس گھر میں آئی۔

گھر میں اب ایک نہیں دو عورتیں تھیں۔ گھر کی رونق میں مزید اضافہ ہو گیا۔ راحہ کو اس کی شادی پر ملنے والے چیز کا سامان ہی بہت تھا اب جو رخصتہ کا جینز آیا تو چیزیں رکھنے کے لیے جگہ کم پڑنے لگی۔ عاقب نے اپنا کمر اخالی کیا اور گھر کی بالائی منزل پر واقع کمرے میں شفٹ ہو گیا۔

عاطف شادی کے بعد ایک دو مرتبہ چھٹی پر گھر آیا پھر اس نے ابو ظہبی میں ہی ایک اسٹوڈیو قلیٹ کرائے پر لے لیا۔ اسے چھٹی ملتی تو وہ خود پاکستان آنے کے بجائے رخصتہ کو ابو ظہبی بلا لیتا۔ دونوں نکل پر ایسی کے ساتھ گھر میں رہتے۔ نہ رخصتہ کو گھر میں اور لوگوں کی موجودگی کے خیال سے حجاب ہوتا نہ عاطف کو محتاط رہنا پڑتا۔ جب جی چاہتا دولوں کھانے پینے اور گھومنے پھرنے کے لیے باہر نکل جاتے۔ جتنی دیر چاہتے بسی تان کر سوئے رہتے۔ نہ کسی کے کچھ کہنے سننے کی فکر نہ کسی کے اعتراض کا خدشہ۔ روز و شب ان کے اپنے ہوتے زندگی اپنی ہوتی۔ رخصتہ تو راحہ سے بھی بڑھ کر قسمت کی دھنی نکلی۔ اس کا ایک پاؤں پاکستان میں تو دوسرا ابو ظہبی میں ہوتا بھی جب عاطف کو وطن اور عزیز واقارب کی یاد ستانے لگتی تو وہ خود بھی چند دنوں کو پاکستان آ جاتا اور رخصتہ کو ساتھ لے کر یا اسے واپس چھوڑ کر ابو ظہبی چلا جاتا۔ آمدن اور مراعات ملازمت کے اعتبار سے وہ بڑے بھائی سے کہیں زیادہ خوش حال تھا۔ راحہ جو اپنے مقدر پر نازاں رہا کرتی تھی اب رخصتہ کی خوش قسمتی پر رشک کرتی۔ دسی چیزوں کو تو وہ اب کم ہی لائق اعتنا سمجھتی

عاشر سے کہنے کے لیے اپنی باری کا منکر رہتا۔ عاطف اسے گود سے اتارتا تو عاقب اٹھا لیتا۔ عاقب اتارتا تو عاطف۔ عاشر کے دم سے ثاقب اور عاطف کے درمیان رابطے کا فقدان بھی قدرے کم ہو گیا تھا۔ عاشر کے بھانے وہ ایک دوسرے سے ہمسکام ہونے لگے تھے۔ گھر کا ماحول خاصا بہتر ہو گیا تھا۔

انجینئرنگ یونیورسٹی میں اپنے آخری سیمسٹر کے دوران ہی عاطف نے ملازمت کے لیے کوشش شروع کر دی۔ تعلیم مکمل ہوتے ہی اسے ایک آئل ریفائنری میں ملازمت مل گئی۔ برس بھر وہاں کام کیا پھر ابو ظہبی میں زیادہ بہتر ملازمت مل جانے پر بیرون ملک چلا گیا۔ بیرون ملک ملازمت دلکش مراعات کا میسج تھی۔ عمدہ مشاہرہ، مفت رہائش اور طبی سہولیات، جتنے دن کام اتنے دن چھٹی مع تنخواہ اور چھٹی وطن میں گزارنے کے لیے مفت فضائی آمد و رفت ٹکٹ۔ ثاقب اور عاطف کے درمیان فاصلہ مزید سمٹ گیا۔ ان کے باہمی تعلقات میں سرد مہری کی جگہ گرمجوشی آ گئی تھی۔ عاطف چھٹی پر ابو ظہبی سے پاکستان آتا تو بھائیوں، بھانجے اور بیٹے کے لیے بہت سے تحائف اور سوغاتیں لے کر آتا۔ گھر میں عاطف کی اہمیت خاصی بڑھ گئی تھی۔ راحہ کا جی چاہتا عاطف کی شادی اپنے ہی خاندان کی کسی لڑکی سے کروا دے مگر مشکل یہ تھی کہ مرحوم سرجن کی وجہ سے وہ اس گھر میں راج کر رہی تھی، عاطف کا رشتہ اپنی زندگی ہی میں طے کر گئے تھے اور خود عاطف ہی نہیں ثاقب کو بھی مرحوم باپ کے فیصلوں کا پورا احترام تھا۔ عاقب تو ابھی زیر تعلیم تھا اس کی شادی کا معاملہ ہنوز دلی دوراست والا معاملہ تھا تاہم عاطف اب خود کفیل تھا اس کی شادی میں کوئی قباحت نہ تھی۔ عاطف کو ٹٹولنے کے لیے راحہ نے اپنے ہی خاندان کی ایک دہلڑکیوں کا دبی زبان سے تذکرہ کیا مگر اس نے کوئی دلچسپی نہ لی بلکہ اس سلسلے میں مصلحتاً بھی گول مول بات کرنے کے بجائے اس پر واضح کر دیا کہ شادی کے لیے وہ اپنی چچازاد رخصتہ کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس لیے نہیں کہ اسے رخصتہ پسند تھی یا وہ اس سے محبت کرتا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ اس کے مرحوم باپ کا انتخاب تھی۔

”تمہیں رخصتہ سے اچھی لڑکی مل سکتی ہے عاطف۔“
راحہ نے اسے اکسانے کی کوشش کی۔

”اور بھائی..... اچھی کا کیا ہے..... ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی موجود ہے مگر شادی بندے کو بڑوں کی مرضی

اہل و عیال کو مستحقاً ابو ظہبی میں رکھا ہوا تھا۔ جس گھر میں انصار حسین کی فیملی کرایہ دار تھی اس کا ایک حصہ خالی ہوا تو عاطف نے اسٹوڈیو یوٹیلیٹی چھوڑ کر انصار حسین کے گھر میں خالی ہونے والا حصہ کرائے پر لے لیا اور رخصتہ کو مستقل طور پر ابو ظہبی بلا لیا۔ انصار حسین اور عاطف ایک ساتھ چھٹی پر آتے، اپنی اپنی فیملی کے ساتھ چھٹی گزارتے اور چھٹی گزار کر ایک ساتھ فیلڈ پر واپس چلے جاتے۔ عاطف کے جانے کے بعد رخصتہ اطمینان سے انصار حسین کی بیوی بچوں کے ساتھ رہتی۔ اس نئے بندوبست سے اسے بار بار پاکستان سے ابو ظہبی آنے جانے کی ضرورت نہ رہی۔ رخصتہ کے ابو ظہبی چلے جانے کے بعد عاطف اور راحمہ کی اور ذرا وہ بے تکلفی ہو گئی تھی۔

سعودی عرب جانے کے دس ماہ بعد ثاقب نے راحمہ اور عاشر کو عمرہ کرنے کے لیے دو ہفتوں کو سعودی عرب بلا لیا اور اس دوران میں ان کا قیام ہوٹل میں رکھا۔ انہیں اپنے ساتھ ٹھہرانے کی سہولت نہ تھی اسے۔

راحمہ اور عاشر کے سعودی عرب جانے کے بعد ثاقب کو گھر میں اکیلا ہی رہنا پڑا۔ وہ بی کام کر چکا تھا اور ثاقب نے وطن سے دور ہونے کے باوجود اسے اپنے جاننے والوں سے کہہ سن کر اسی بینک میں ملازم کر دیا تھا جہاں وہ خود بھی سعودی عرب جانے سے قبل ملازم رہا تھا۔

راحمہ اور عاشر کے سعودی عرب جانے کے بعد ثاقب کے لیے تنہا گھر میں رہنا مشکل ہو گیا۔ والدین کی آخری اولاد اور عمری ہی میں ماں کی محبت سے محرومی کے بعد باپ اور بڑے بھائیوں کا لاڈلا ہونے کے ناتے اس کا زندگی کی سختیوں اور تنگی سے سابقہ نہ ہونے کے برابر رہا تھا۔

ثاقب اور عاطف تو اس کی اوائل عمر میں اسے پیار سے اپنی ”بہنا“ کہا کرتے تھے۔ وہ شرمیلا اور ڈرپوک قسم کا تھا۔ گھر سے بلا ضرورت کم ہی باہر نکلتا۔ عاطف کی شادی کے بعد گھر میں سامان کے لیے جگہ تنگ ہو جانے پر وہ گھر کی بالائی منزل پر واقع اکلوتے کمرے میں شفٹ ہو تو گیا تھا مگر

شام ہوتے ہی وہ اس کمرے کی کھڑکیاں دروازے بند کر لیتا۔ رات کو سونے سے قبل بالحدہ غسل خانہ میں اور بیڈ کے نیچے جھانک کر کمرے میں کسی اور کے نہ ہونے کا پورا اطمینان کرنے کے بعد ہی بستر پر جاتا۔ اسے چور، ڈاکو، جن، بیوت، کتا، بلی سب سے خوف آتا تھا اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ماں کے انتقال کے بعد باپ اور بھائیوں نے اسے ”پیمپڑ“ بنا کر رکھا تھا۔ راحمہ تو اسے کبھی بھی لاڈ سے

تھی۔ اس کے کپڑے، جوتے، ہینڈ بیگ، کاسٹیکس سب غیر ملکی ہوتا۔ جو پر فیوز وہ استعمال کرتی ان سے گھر مہکتا رہتا اور گھر میں رخصتہ کی موجودگی کا احساس حاوی رہتا۔ رخصتہ ابو ظہبی جاتی تو راحمہ کے لیے بھی تحائف لے کر آتی جنہیں راحمہ بہت دیکھ دیکھ کر استعمال کرتی۔ اس کا جی چاہتا ثاقب بھی کہیں باہر چلا جائے۔ اسے اور عاشر کو اپنے پاس بلائے اور وہ بھی رخصتہ کی طرح غیر ملکی چیزیں استعمال کرے اور اترائے۔ وہ اکثر ثاقب کو بھی باہر جانے کی ترغیب دینے کی کوشش کرتی مگر ثاقب اندھا دھند چھلانگ لگانے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ اپنے دہس میں بھی بہت سوں سے بہتر زندگی گزار رہا تھا۔ قسمت میں اگر پردیس کی روزی نکلی تھی تو وہ بھی مل جاتی تھی۔ کوشش کر لینے میں حرج نہیں تھا مگر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا تھا۔

مستقبل کے لیے عاطف نے شہر کے ایک پوش رہائشی علاقے میں ایک لٹوری اپارٹمنٹ یک کرایا۔ باپ کا گھرانہ تینوں بھائیوں ہی کے لیے تھا مگر آج نہیں توکل ان سب کو اپنے بال بچوں کے لیے علیحدہ علیحدہ گھر کی ضرورت لازم تھی۔ بی زمانہ شادی کے بعد اولاد اپنے والدین کے ساتھ رہنا پسند نہیں کرتی وہ تو پھر بھائی تھے۔ فطرتی اسی میں تھی کہ علیحدہ گھر بسانے کی وارغ نکل ڈال دی جاتی سو اسی خیال کے تحت عاطف نے اپارٹمنٹ یک کرایا تھا۔ آج وہ اور رخصتہ دو تھے کل دو سے تین پھر چار بھی ہونے والے تھے انشا اللہ۔

راحمہ کی دغا بکس رنگ لائیں۔ ثاقب کو سعودی عرب کی ایک مصروف کمپنی میں اکاؤنٹنٹ کی جانب مل گئی۔ پرنکشن مشاہرہ کے ساتھ کچھ اور مراعات بھی پہنچنے کا حصہ تھیں۔ راحمہ کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ وہ خوش تھی کہ رخصتہ کی طرح اب وہ بھی اپنے شوہر کے پاس سعودی عرب آ جاسکے گی بلکہ خدا نے چاہا تو عمرہ اور حج کی سعادت بھی حاصل کرے گی۔ کیا عجب کہ ثاقب جو ابھی تو کمپنی کی فراہم کردہ شیئرڈ اکاموڈیشن میں رہائش اختیار کرنے جا رہا تھا آنے والے دنوں میں فیملی کو بھی اپنے ساتھ رکھ سکے۔

ثاقب کے سعودی عرب جانے کے بعد گھر میں ثاقب واحد مرد رہ گیا۔ راحمہ کی اس سے گاڑھی چھتے لگی۔ رخصتہ تو کبھی پاکستان میں ہوتی کبھی ابو ظہبی میں ہوتی۔ ثاقب سے بطور دیور اس کی وہ نہیں بن سکی تھی جو عاطف کی اسی رشتہ میں راحمہ سے تھی۔

☆☆☆

ابو ظہبی میں عاطف کے سینئرز میں انصار حسین نے

READING
Section

راست سنی راحمہ نے نسرین کے ذکر پر آہستگی سے پہلو بدلا۔ عاطف کے حراج کی وجہ سے وہ رخشندہ کا اپنی وپورانی بننا تو جبراً قہراً برداشت کر گئی تھی نسرین کو وہ کسی قیمت پر اس گھر میں قبول کرنے کو تیار نہیں تھی جہاں اس کی حکمرانی تھی۔ ثاقب سے شادی کے بعد وہ اپنے تمام سسرالی گھرانوں میں آ جا کر دیکھ چکی تھی کہ سب کے سب نچلے متوسط طبقے کے لوگ تھے۔ ایک اس کے سسر اور ان کے تینوں بیٹے ہی تھے جو پڑھ لکھ کر اتنے خوشحال اور مستحکم ہو گئے تھے ورنہ باقی سب تو معمولی پڑھے لکھے اور چھوٹی چھوٹی ملازمتوں یا کاروبار سے وابستہ تھے۔ رخشندہ ایف اے تھی اور اسی پر اترا تھی۔ نسرین میٹرک آفیس گروپ میں کر کے گھر بیٹھ گئی تھی۔ ہانڈی روٹی کر کے دوپہر کو سلائی کڑھائی کے اسکول چلی جاتی اور اسی پر اس کی جاہل اماں جان یوں فاجر ہو تیں جیسے صاحبزادی سلائی کڑھائی میں پی ایچ ڈی کر رہی تھی۔ عاقب کو نسرین اور اس کے گھر والوں سے نفرت کرنے کے لیے راحمہ گاہ بگاہ ہے اس کے سامنے ان کی برائیاں کرتی راتی یا بھانے بھانے سے ان کا مذاق اڑانے کی کوشش کرتی۔ بھی آسے نسرین کی شین قاف پر اعتراض ہوتا بھی اس کی ڈریسنگ میں کیڑے نکالتی۔

”منایا بیچ پوچھو تو نسرین اور اس کے گھر والے کہیں سے بھی تمہارے جوڑے نہیں۔“ وہ عاقب سے کہتی۔

”کیا بتاؤ گے تم اپنے بینک کے ساتھیوں کو کہ تمہارے سسر ویلڈنگ کا کام کرتے ہیں۔“ وہ اسے احساس کسٹری میں جتلا کرنے کی کوشش کرتی۔

”اور وہ تمہارا ہونے والا ہم زلف..... گوالا لگتا ہے شکل اور جسم کے بھدے پن سے۔“

عاقب کا چہرہ شرم سے تھمنا لگتا۔

”انکل کو چاہیے تھا جوڑ دیکھ کر فیصلہ کرتے۔“ راحمہ کن انکیوں سے اس کے تاثرات دیکھتے ہوئے کہتی۔

”بس بھالی ڈیڈی نے یہ سوچا ہوگا کہ اپنے ہیں۔“ عاقب کہتا۔

”ارے بھی اپنے ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ مٹل میں ٹاٹ کا بیوند لگا دیا جائے۔“ راحمہ رکا لگاتی۔

عاقب شرمندہ سا ہو جاتا۔

”بس ایک تمہارے بڑے بھائی کے لیے انکل اچھا فیصلہ کر گئے۔ ورنہ رخشندہ کون سی کوئی دووہ کی دھلی آئی تھی..... سب کچھ ہمارے گھر آ کر ہی سیکھا۔ ہائی ہیل پر نکلنا نکلنا کر چلتی تھی۔ اسے میک اپ کرنا میں نے سکھایا۔ اب

”منایا“ کہا کرتی تھی۔ دوران تعلیم اور ملازمت کے بعد بھی عاقب کا معمول رہا تھا، گھر سے سیدھا وہاں جاتا جہاں جانا ہوتا اور وہاں سے سیدھا گھر واپس آتا۔ اپنی عمر کے عام نوجوانوں کی طرح اسے بلا ضرورت باہر گھومنے پھرنے کی ذرا عادت نہیں تھی۔ مزا جا وہ بڑے بھائیوں کا آمیزہ تھا۔ ثاقب کی طرح خود بین اور خود غرض اور عاطف کی طرح ذہین اور متکبر۔

راحمہ اور عاشر کے سعودی عرب جانے کے بعد عاقب کے دفتر سے سیدھا گھر واپس آنے کے معمول میں تو تبدیلی نہ آئی تاہم اکیلے گھر میں اسے وحشت سی ہوتی راحمہ جانے سے قبل اس کے لیے بہت سا کھانا پکا کر فریج میں رکھ گئی تھی۔ گھر واپس آنے کے بعد وہ حسب خواہش چائے یا کھانے سے فارغ ہو کر اوپر اپنے کمرے میں آ جاتا۔ اکثر کیفیاں، دروازے بند کرتا اور بستر پر پڑ جاتا۔ اس کی نیند تو س گھنٹے سے کسی صورت کم نہ ہوتی۔ صبح اٹھتا تو نہایت تازہ دم ہوتا۔

سعودی عرب جانے کے بعد راحمہ اس سے روزانہ فون پر بات کرتی۔ عاشر سے بھی اس کی بات کراتی۔ ثاقب بھی اس کا حال چال پوچھتا اور اسے اطمینان دلاتا کہ وہ پریشان نہ ہو۔ راحمہ اور عاشر جلد ہی پھر اس کے ساتھ ہوں گے۔

”بھائی! مجھے اکیلے گھر میں ڈر لگتا ہے۔“ راحمہ کو سعودی عرب گئے دوسرا یا تیسرا دن تھا جب عاقب نے ثاقب سے یہ بات کہی۔

ثاقب ہنس دیا پھر بولا۔ ”یار! چھ فٹ کے جوان آدمی ہو کر ڈرتے ہو۔“

”گھر جو اکیلا ہے۔“ عاقب نے جھینپ کر کہا۔

”گھر اکیلا نہیں..... گھر میں تو تم ہو..... اصل میں تم اکیلے ہو۔“ ثاقب بولا۔

”ہاں..... یہی سمجھ لیں۔“

”فکرمٹ کرو..... کچھ عرصے کی بات اور ہے..... ہم تمہیں دوکیلا بھی کر دیں گے۔“ ثاقب کے لہجے میں شوخی آمیز معنی خیزی تھی۔ ”بھائی کی جان بہادر بنو..... شادی کے بعد بھی اگر تم یونہی ڈرتے رہے تو نسرین کیا سوچے گی..... مرد بنو یا مرد۔“

عاقب کو شرم سی آگئی۔ واقعی وہ بہت ڈر پوک تھا، اسے مرد کی طرح بڑ بننے کی ضرورت تھی۔

”نسرین کے کمرے میں ثاقب کے پہلو میں بیٹھی اور اوپیکر آن ہونے کے باعث دونوں بھائیوں کی گفتگو براہ

تھی۔ راحمہ اور رخشندہ سے بھی ان کی اہلیہ کی علیک سلیک تھی۔ جاوید صاحب کا گھرانہ مذہبی گھرانہ تھا۔ جاوید صاحب اور ان کے بوڑھے والد اپنی شیخی کے باوجود باجماعت نماز کی ادائیگی کے لیے باقاعدگی سے محلہ کی مسجد آتے جاتے دکھائی دیتے۔ جاوید صاحب لا ولد تھے۔ ان کے دو بھائی اور ایک بہن مانسہرہ ہی میں مقیم تھے۔ تاہم جاوید صاحب کے ہاں ان کا اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ عارف صاحب مرحوم جاوید اختر زمان کے گھرانے کو اچھا پڑوسی کہا کرتے تھے۔ دونوں گھر بچھوڑے پر ایک مشترکہ دیوار سے ملے ہونے کے باوجود جاوید اختر کے گھر سے کبھی اونچی آواز نہ سنائی دیتی۔ آس پاس کے دیگر گھروں کی چھتوں پر تو بعض پر اکثر ویسٹر اور بعض پر گرمیوں کی شاموں میں خواتین اور لڑکیاں ہوا خوری کے لیے چٹائی دکھائی دیتی تھیں لیکن جاوید اختر کے مکان کی چھت پر کبھی کوئی خاتون دکھائی نہ دیتی۔ مہمان بھی آتے تو گھر کے اندر ہی رہتے یا گھر کے لان میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے۔ ان کی چھت پر ایک نوجوان لڑکی کا دکھائی دینا اور وہ بھی چھت سے اسی کو دیکھتے ہوئے عاقب کے لیے اچھنبھے والی بات تھی اور اس پر مستزاد اس کے ہڑ بڑانے پر لڑکی کا مسکرا دینا۔ وہ موسیقی سے لطف اندوز ہونا بھول کر اپنے کمرے میں گھس گیا۔ شام سے رات تک اور رات کو سونے سے پہلے تک اسے اسی لڑکی کے خیال نے گھیرے رکھا۔ رات میں جتنی دفعہ آنکھ کھلی، کر دٹ بدلی اسی کا خیال آیا۔ صبح جاگا تو پھر وہیں اسی طرف گیا۔

یہ تکم صاحبہ ہی کو سبق پڑھاتی ہیں..... برانڈ سے کم بات ہی نہیں کرتی..... ہماری ٹیلی میں دیکھو کیسے سلجھے ہوئے نقیس لوگ ہیں..... ایک سے بڑھ کر ایک..... اسی لیے لڑکیوں کے پڑھتے پڑھتے ہی ان کے رشتے طے ہو جاتے ہیں..... بڑی آپا کی بیٹی ماہم کے لیے انجینئر کا رشتہ آیا ہوا تھا مگر وہ کہتی ہیں جانے بوجھے لوگوں میں رشتہ دیں گی..... بھائی کی چھوٹی بیٹی فائزہ تو اتنی پیاری لڑکی ہے کہ میرا عاشر اگر بڑا ہوتا تو میں اسے کسی اور گھر نہ جانے دیتی۔“

عاقب نہایت سعادت مندی سے سنے جاتا۔ اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا تھا کہ راحمہ کا خاندان نہایت مہذب، تعلیم یافتہ اور معاشی و معاشرتی ہر اعتبار سے ایک مستحکم خاندان تھا۔ راحمہ کے خاندان کی لڑکیاں خوبو، تعلیم یافتہ، اسمارٹ اور روشن خیال تھیں اور اچھے اچھے گھرانوں میں بیاہی جا رہی تھیں۔ عاقب اس کے خاندان والوں سے مل کر ہمیشہ متاثر و مرعوب ہوتا۔ راحمہ کی خواہش تھی کہ عاقب کی شادی نسرین سے نہیں اس کے اپنے خاندان کی کسی لڑکی سے ہوتا کہ ایک گھر میں اسی کے خاندان کی دو بہویں ہونے کی وجہ سے رخشندہ کے مقابلے میں اس کا پلڑا بھاری ہو جائے۔

☆☆☆

تنہائی بہت بڑا دکھ ہے۔ راحمہ کو سعودی عرب گئے دوسرا چھتہ شروع ہو چکا تھا۔ نئے کے اختتام پر اس کی وطن واپسی تھی۔ عاقب اس روز بھی دفتر سے گھر واپس آنے کے بعد حسب معمول پیٹ پوجا کر کے اوپر آ گیا تھا۔ موبائل فون سے لگا ایئر فون کا نون میں اڑ سے وہ موسیقی سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ نظر غیر شعوری طور پر گھر کے بچھوڑے مکان کی چھت کی جانب اٹھی جہاں ایک نوجوان لڑکی کھڑی اسی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ہڑ بڑا گیا۔ لڑکی مسکرا دی۔ اس کا چونکنا چھینی تھا۔

گھر کے بچھوڑے اس مکان میں جاوید اختر زمان رہا کرتے تھے۔ مانسہرہ سے تعلق تھا۔ کاروباری آدمی تھے۔ نہایت چھوٹی سی ٹیکسی تھی جاوید اختر زمان، ان کی اہلیہ اور جاوید صاحب کے معمر والد۔ جاوید صاحب کا برقی آلات کا کاروبار تھا۔ شہر کے وسط میں مصروف کاروباری مرکز میں ان کا شوروم تھا۔ خوشحال آدمی تھے۔ ان کے گھر میں مہمانوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ بعض کئی کئی دن ان کے ہاں قیام بھی کرتے۔ عاقب اور دونوں بڑے بھائیوں کی بناوید اختر، ان کی اہلیہ اور والد سے رسمی سلام دعا رہا کرتی

دفتر میں فرقان علی سے عاقب کی خاصی بے تکلفی تھی۔ فرقان عمر میں اس سے بڑا اور عہدے میں سینئر تھا مگر ثاقب سے دوستی رکھنے کے باعث عاقب کے ساتھ اس کا رویہ دوستانہ بلکہ برادرانہ تھا۔ عاقب نے پڑوس کی چھت پر لڑکی کے مسکرانے کا تذکرہ اس سے کیا تو وہ ہنس کر بولا۔ ”خوش قسمت ہو بیٹے کہ لڑکی تمہیں دیکھ کر مسکرائی۔ ہمیں دیکھ کر تو آج تک کوئی لڑکی روئی بھی نہیں۔“

”آپ کو مذاق سوچ رہا ہے فرقان بھائی۔ مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔“ عاقب بولا۔

موسم بہار کے رنگ یا کتھن کے رنگ
بہار کے دل فریب و خوشنما رنگوں سے سجا اپریل 2016 کا سالگرہ ہمیں

پاکستان

کراچی

نگہت سیما کا خوب صورت ناول اختتامی پڑاؤ کے ساتھ

انجم انصار، ڈائمن بلال و نیاب جیلانی کے قسط دار مسور کن سلسلے

کھونے کھونے لمحے..... تابندہ نعیم کی بھرپور کاوش کا خوب صورت اختتام

رضوانہ پرنس، ثمینہ عظمت علی کی خوب صورت کہانیاں خاص آپ کی نذر

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور محترمہ اختر شجاعت کی ایمان افروز حکایتیں

وہ آئے بزم میں

شیریں حیدر کی شیریں بیاباں

عظمیٰ آفاق سعید کی کتاب کی رونمائی کی پُر لطف تقریب کا احوال

اسی کے علاوہ

نگہت اعظمی، شیریں حیدر، میمونہ صدف، ہاجرہ ریحان،

عقیلہ حق، ریحانہ زیدی و دیگر مایہ ناز لکھاریوں کی حسین تحریریں.....

اس کے ہمراہ جدید تقریب کی معلومات و دیگر خوش بیاباں لیے مستقل سلسلے آپ کی خوش ذوقی کی نذر

کہ عاطف اور عاقب کو ان کا حصہ دے کر مکان صرف ہمارا ہو جائے..... پھر بے شک دونوں ہمارے ساتھ بھی رہیں یہ کھٹکا نہیں ہوگا کہ مکان میں حصے دار ہیں۔“

”بات تو بہت اچھی ہے۔“ راحمہ نے گرجوٹی سے تائید کی۔ ”مگر کیا وہ دونوں راضی ہو جائیں گے؟“

”پیسے ملے گا تو کیوں راضی نہ ہوں گے..... اپنا حصہ لیں اور الگ گھر بنا لیں..... سوچ رہا ہوں چھٹی پر پاکستان آؤں تو عاقب کی شادی بھی کر دی جائے..... سر پر بیوی بیٹوں کی ذمہ داری پڑے تو پھر انسان اپنا گھر بنانے کی بھی سوچتا ہے۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ مگر.....“ راحمہ بولتے بولتے رک گئی۔

”مگر؟“ ثاقب نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”عاقب سے نسرین کا کوئی جوڑ نہیں۔“ راحمہ نے دہلی زبان سے کہا۔

”جوڑ ہو یا نہ ہو اپنے گھر کی لڑکی تو ہے..... باہر دالیاں تو آ کر گنتی کا تاج بچاتی ہیں۔“

”میں نے آپ کو کتنا سچا یا بھلا!“ راحمہ نے ثاقب کو ہنسی نگا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ثاقب لاجواب ہو کر اس کا منہ دیکھنے لگا پھر جھینپ کر بولا۔

”تمہاری بابت اور ہے۔“

”جی نہیں..... یہ کیسے اچھی بری لڑکیاں اپنے خاندان میں بھی ہو سکتی ہیں، غیر خاندان میں بھی..... ساری بات ماؤں کی تربیت کی ہوتی ہے..... ہمارے خاندان میں مائیں اپنی بیٹیوں کی تربیت اور گرومنگ کا پورا خیال رکھتی ہیں۔“ راحمہ کے لہجے میں فخر و عونت کا احساس تھا۔

”پہچھو بھی اچھی ماں ہیں۔“ ثاقب بولا۔

”مگر تعلیم یافتہ ہونے سے بہت فرق پڑتا ہے..... ایک تعلیم یافتہ ماں کی بیٹی کی اپروچ ہی اور ہوتی ہے..... برا مت مانے گا..... نسرین کو آپ کی پھپھو نے گھر داری ضرور سکھائی ہے مگر اس کے پہننے اور ہنسنے اور بات چیت کرنے سے گنوار پن جھلکتا ہے۔“

ثاقب کچھ شرمندہ سا ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اس کے خاندان کی عورتیں کیا مرد بھی اکثر تعلیم سے بے بہرہ تھے۔ قریبی خاندانی رشتوں میں بس ایک اس کے والد ہی تھے جو تعلیم سے اپنی رغبت کے باعث خود بھی لکھ پڑھ گئے تھے اور تینوں بیٹیوں کو بھی حصول تعلیم کی جانب راغب رکھا تھا۔ ثاقب کے اپنے خاندان کے برعکس راحمہ کا خاندان

”ایسا ہی ہوتا ہے جیسے..... اسکی وارداتوں میں نیند اڑی جاتی ہے۔“

”پلیز! مجھے مشورہ دیں۔“

”کیسا مشورہ؟“

”گھر میں اکیلا ہوں میں..... کیا بھابی کے آنے تک نیچے شفٹ کر جاؤں؟“

”نیچے شفٹ کرنے سے کیا ہوگا؟“

”وہ چھت پر آئی بھی تو میں اسے دکھائی نہیں دوں گا۔“

”بہاؤر بنو یا اکیلا لڑکیوں کی طرح منہ بسور رہے ہو..... اب نظر آئے چھت پر تو اس سے فون نمبر مانگ لیتا..... بھابی کے آنے تک فون پر گپ شپ کرتے رہنا وقت اچھا گزر جائے گا۔“

”جو تے بھی پڑیں گے۔“

”کس سے؟“

”بھالی سے، ثاقب بھالی سے، عاطف بھالی سے اور اگر پھپھو کے گھر میں خبر ہوگئی تو ان سے بھی..... نسرین جس سے میری بات ملے ہے انہی کی تو بیٹی ہے۔“

”چھوڑ دیا لوگ شادی کے بعد دوسری لڑکیوں سے فلرٹ کرتے ہیں تم بات ملے ہونے کے خیال سے گھبرا رہے ہو۔“

”آپ بڑے تیز ہیں یا فرقان بھالی۔“

”اگر تم لو نہیں ہوتو لڑکی چھٹا کر دکھاؤ۔“ فرقان مسکرایا۔

”چیلنج کر رہے ہیں؟“

”یہی سمجھ لو۔“

”اوکے۔“

☆☆☆

راحمہ اور عاشر کی وطن واپسی کا دقت نزدیک آ رہا تھا۔ راحمہ اداس تھی، ثاقب کو چھوڑ کر جانے کو جی نہ چاہ رہا تھا اس کا۔

”میں آپ کو پہلے سے بھی زیادہ مس کر دوں گی۔“

راحمہ نے ثاقب سے کہا۔

”مجھ سے پوچھو..... تمہارے ساتھ تو وہاں عاشر ہوگا عاقب ہوگا..... میں یہاں اکیلا ہوں گا۔“

”ہمیں اپنے ساتھ ہی رہنے کو کیوں نہیں بلا لیتے؟“

راحمہ نے کہا۔

”دن تو بہت چاہتا ہے مگر..... وہاں بھی تو گھر ہے۔ اسے بھی لڑکیاں نہیں چھوڑا جاسکتا..... جس کا قبضہ وہی مالک ہے..... میں تو سوچتا ہوں اتنی رقم اکٹھی کر لوں کسی طرح

پڑھے لکھے لوگوں کا خاندان تھا۔ اس خاندان کے مرد ہی نہیں عورتیں بھی تعلیم یافتہ، مہذب اور روشن خیال تھیں۔

”نسرین تمہاری صحبت میں رہے گی تو بدل جائے گی۔“ ثاقب مسکرایا۔

”کیوں میرا کام یہی رہ گیا ہے کہ آپ کے خاندان کی جاہل لڑکیوں کو بدلتی رہوں۔ ایک وہ رخشندہ بیگم ہیں۔ شادی ہو کر ہمارے گھر آئیں تو ہائی ہیل سینڈلز پہنتیں تو ٹنگڑا کر چلتی تھیں۔ میک اپ انہیں کرنا نہ آتا تھا۔ بلش آن لگانے کی تمیز نہیں تھی۔ پورا چہرہ سرخ کر کے پیر بہوتی بن جاتی۔ پرفیوم کو پفیوم کہتی تھی آج بیگم صاحبہ کے خڑے ہی نہیں ملتے..... مجھے دیکھو دیکھو کرسب کچھ سیکھا اور اب جب کبھی آتی ہے تو مجھ ہی کو ٹپس بتاتی ہے..... ہماری بی بی ہم ہی سے میاؤن..... آپ کے ڈیڑی گورشتے طے کرتے ہوئے دیکھتے تو لینا چاہیے تھا کہ کہاں رشتے کر رہے ہیں۔“

”دور رشتے طے نہ کرتے تو تم مجھے کہاں سے ملتیں۔“ ثاقب نے راحمہ کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”قسمت میں ہوتا تو مل ہی جاتی۔“ راحمہ نے توقف کیا پھر بولی۔ ”عاطف اور رخشندہ کا بھی جوڑ تو نہیں تھا مگر پھر کچھ گوارا لیکن..... عاقب اور نسرین کا تو کوئی جوڑ ہی نہیں..... ابھی اتنی موٹی اور بے تکی ہے شادی کے بعد تو اور پھیل جائے گی۔“

”بھئی اب جو بھی ہو..... ڈیڑی کا فیصلہ تھا اور ان کے فیصلے کا احترام ضروری ہے۔“

”چاہے لڑکے کی زندگی برباد ہو جائے؟“ راحمہ نے دائیں ابرو چڑھا کر ثاقب کو دیکھا۔

”انشا اللہ ایسا نہیں ہوگا..... نسرین جس ماحول میں رہے گی آہستہ آہستہ اس میں ڈھل جائے گی۔“

”میں تو کہتی ہوں اب بھی موقع ہے..... سوچ لیں..... نسرین کو آپ کے خاندان میں اسی کی طرح کا کوئی رشتہ مل جائے گا..... عاقب کے لیے اس کے جوڑ کی لڑکی دیکھیں..... عاقب وینڈسم ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ بینک میں ملازم ہے۔ اس کا ایک اسٹیشن ہے خود اپنی وجہ سے بھی اور آپ دونوں بڑے بھائیوں کی وجہ سے بھی..... اس کی شادی کسی اچھے خاندان کی خوش شکل، تعلیم یافتہ اور روشن خیال لڑکی سے ہونی چاہیے۔“

”نسرین راحمہ..... ڈیڑی جو فیصلہ کر گئے، کر گئے..... ہم کون ہوتے ہیں اس فیصلے میں رخنہ ڈالنے یا اسے تبدیل کرنے والے؟“ ثاقب نے دونوں لہجے میں کہا۔

”نسرین راحمہ..... ڈیڑی جو فیصلہ کر گئے، کر گئے..... ہم کون ہوتے ہیں اس فیصلے میں رخنہ ڈالنے یا اسے تبدیل کرنے والے؟“ ثاقب نے دونوں لہجے میں کہا۔

”نسرین راحمہ..... ڈیڑی جو فیصلہ کر گئے، کر گئے..... ہم کون ہوتے ہیں اس فیصلے میں رخنہ ڈالنے یا اسے تبدیل کرنے والے؟“ ثاقب نے دونوں لہجے میں کہا۔

”نسرین راحمہ..... ڈیڑی جو فیصلہ کر گئے، کر گئے..... ہم کون ہوتے ہیں اس فیصلے میں رخنہ ڈالنے یا اسے تبدیل کرنے والے؟“ ثاقب نے دونوں لہجے میں کہا۔

”نسرین راحمہ..... ڈیڑی جو فیصلہ کر گئے، کر گئے..... ہم کون ہوتے ہیں اس فیصلے میں رخنہ ڈالنے یا اسے تبدیل کرنے والے؟“ ثاقب نے دونوں لہجے میں کہا۔

”نسرین راحمہ..... ڈیڑی جو فیصلہ کر گئے، کر گئے..... ہم کون ہوتے ہیں اس فیصلے میں رخنہ ڈالنے یا اسے تبدیل کرنے والے؟“ ثاقب نے دونوں لہجے میں کہا۔

”میرا نہیں..... ڈیڑی کا..... اور ڈیڑی کا ہر فیصلہ ان کی زندگی میں بھی پتھر کی لکیر ہوا کرتا تھا..... ان کی موت کے بعد بھی پتھر کی لکیر ہی رہے گا..... اور ہاں دیکھو مجھ سے تو تم نے یہ بات کہہ دی..... عاطف، رخشندہ اور خاندان کے کسی اور فرد خاص طور پر عاقب کے سامنے یہ بات اپنے منہ سے نہ نکالنا درنہ ہماری نیت پر بھی شک کیا جائے گا اور ہمیں مرے ہوئے باپ کے فیصلے سے روگردانی کا مجرم بھی ٹھہرایا جائے گا..... انسان کی زندگی میں ساری اہمیت زبان ہی کی ہوتی ہے..... پچھو بے چاری کب سے انتظار میں بیٹھی ہیں..... بس اب دیر نہیں کرنی..... چھٹی پر گھر آیا تو یہ کام منٹا کر ہی واپس آؤں گا..... تم بھی پچھو کے کان میں یہ بات ڈال دینا..... میں بھی یہاں سے فون کر کے کہہ دوں گا..... ہماری امانت ہمیں سونپنے کی تیاری کریں۔“

راحمہ پہلو بدل کر رہ گئی۔ ثاقب سے اتنی مغز ماری بے کار ثابت ہوئی تھی۔ عاقب کے لیے اپنے ہی خاندان کی کسی لڑکی کو بیاہ کر لانے کی خواہش ثاقب سے ہونے والی اس گفتگو کے بعد حسرت کا روپ دھار گئی۔

☆☆☆

برسوں کا فاصلہ گویا دونوں میں طے ہو گیا تھا۔ پڑوس کے مکان کی چھت پر نظر آنے والی اس لڑکی سے عاقب کی لائن مل چکی تھی۔ دونوں کورات کا بے چینی سے انتظار رہتا۔

رات ہوتے ہی وہ موبائل فون پر راز و نیاز میں مشغول ہو جاتے اور رات بھر یہ آنکھ بھولی چلتی رہتی۔

اس کا نام یاد نور تھا۔ جاوید اختر زمان کی بیوی کی سگی چھوٹی بہن کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ ایک ٹریڈنگ ہاؤس میں

مر گیا تھا۔ اس وقت وہ صرف ڈھائی سال کی تھی اور والدین کی اکلوتی تھی۔ باپ کی موت کے بعد اس کی ماں نے

دوسری شادی نہیں کی تھی۔ بھائی کے گھر میں رہتے ہوئے بڑی تنگ دستی کی زندگی بسر کی اور بیٹی ماہ نور کو پالا پوسا۔ ماہ نور

اسکول کے آخری سال میں تھی کہ ماں بیمار پڑ گئی۔ کینسر تشخیص ہوا۔ بھائی علاج کے لیے لاہور بھی لے گیا مگر پتا چلا کینسر

بہت پھیل چکا تھا۔ چند ہی ماہ بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ ماں کے انتقال کے بعد ماہ نور کو اس کی خالہ اور خالو اپنے ساتھ

کراچی لے آئے۔ دونوں لاؤڈ تھے۔ ماہ نور کو انہوں نے اپنی بیٹی بنا لیا اس کی خالہ اس کے آجانے سے بہت خوش

تھی۔ ماہ نور میٹرک پاس کر چکی تھی۔ کراچی لے آنے کے بعد خالہ اور خالو اسے اپنے ہی علاقے کے ایک کالج میں

بعد خالہ اور خالو اسے اپنے ہی علاقے کے ایک کالج میں

دراصل کروانے کے لیے کاجوں میں داخلے ہلنے کے منتظر تھے لیکن اس بات سے بے خبر کہ جس بیگم کو وہ بیٹا بنا کر اپنے گھر لائے تھے وہ تو پڑوس کے رہائشی نوجوان سے چند ہی دن میں بہت پیٹنگیں بڑھا کر ان کی سوچ سے بھی آگے کا فیصلہ کر چکی تھی۔

”مجھے نہ کاج میں داخلے سے وہ پھپھی ہے نہ کہیں اور..... مجھے بس تم سے شادی کرنی ہے عاقب۔“ اس نے عاقب سے کہہ دیا تھا۔

ابھی تک دونوں میں فون پر ہی راز و نیاز چل رہے تھے۔ چھت پر دور دور سے ایک دوسرے کا ویدار بھی کر لیتے۔ اوجھر اوجھر دیکھ کر یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ آس پاس انہیں کوئی اور نہیں دیکھ رہا تھا کبھی کبھار ہلکی سی اشارہ بازی بھی ہو جاتی۔ رہیں باتیں تو وہ رات بھر دونوں ہی دل کھول کر کرتے تھے۔ فون پر پیکیج کی سہولت نے دونوں ہی کا کام آسان کر رکھا تھا۔ سچی ویسے بھی دونوں میں سے کسی کو نہیں تھی۔ عاقب خود کفیل تھا۔ ماہ نور کو خالہ اور خالو کے گھر میں ہر قسم کی فراغت میسر تھی۔ جنک فوڈ خریدنے کے بہانے قریبی مارکیٹ جاتی اور وہاں سے موبائل فون کارڈ بھی خرید لاتی۔ ویسے تو عاقب نے بھی کہہ رکھا تھا بیٹلس ختم ہو جائے تو وہ اس کے فون پر لوڈ کر سکتا ہے مگر کیا ضرورت تھی اسے۔ خوشحال خالہ اور خالو کی زیر سرپرستی آکر عاقب کا احسان لینے کی..... جتنے عیش و عشرت میں وہ آج کل بھی اس کا تو اس نے اپنی ماں کی زندگی میں ماموں کے گھر میں بھی خواب میں نہیں سوچا تھا۔ خالہ اور خالو نے اسے ماں کی پہلی جمعرات کے بعد ماموں کے گھر سے اپنے ساتھ کراچی لاتے ہوئے انہیں زبان دی تھی کہ وہ ماہ نور کو اپنی بیٹی بنا کر رکھیں گے۔ وہ واقعی ایسا ہی کر رہے تھے۔ بیوی کی خوشنودی کی خاطر جاوید صاحب ماہ نور کو اپنے گھر میں بہت اہمیت دیتے اور جب باہر سے گھر آتے تو ماہ نور کو نہ دیکھنے پر ان کا اپنی اہلیہ سے پہلا سوال یہی ہوتا۔ ”ماہ نور بیٹی کہاں ہے؟“

ماہ نور کو خالہ کے گھر میں علیحدہ کمرہ علیحدہ ٹی وی، کیبل اور موبائل فون کی سہولت میسر تھی۔ خالہ نے اسے بہت سے نئے کپڑے بھی بنا دیے تھے۔ وہ جب بازار جاتی اس کا ساتھ جانا لازم ہوتا اور وہ اسے کوئی نہ کوئی نئی چیز ضرور خرید دیتیں۔ گھر میں کھانے پینے کی چیزوں کی فراوانی تھی۔ فریج ہر وقت بھرا رہتا۔ خالو جو پھل اور میٹھا کھانے کے انتہائی شوقین تھے اتنے پھل اور میٹھی اشیاء خرید لاتے کہ گھر میں پھل انور کی آرزو پر ان کی خاطر تواضع کے لیے باہر سے کچھ

منگوانے کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ گھر کا کام کاج کرنے کے لیے گھر میں گاؤں سے آئی ہوئی ایک کل وقتی ملازمہ تھی اور دوسرا کراچی ہی کا ایک آدمی جو بوقت ضرورت ڈرائیوری بھی کرتا۔ خالہ نے ماہ نور کو گھر میں ہر وقت بہنے کے لیے سونے کے دو کنکن، لاکٹ، بالیاں اور دو انگوٹھیاں بھی بنوادی تھیں۔ ماہ نور کے گمان میں بھی نہ تھا کہ ماں کے بعد اسے اتنی چاہنے والی خالہ کی سرپرستی میسر آجائے گی۔ سچ تو یہ تھا کہ اس کے آجانے سے خالہ اور خالو کو بھی یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے برسوں بعد ہی سہی وہ اچانک صاحب اولاد ہو گئے تھے۔

☆☆☆

راحہ کو وطن واپسی پر عاقب کی چوری پکڑنے میں زیادہ دن نہیں گئے۔ ایک روز نیچے سے چھت پر آتے ہوئے اس نے ماہ نور کو اپنی چھت پر کھڑے اور اسے اور عاقب کو اشارے بازی کرتے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ ماہ نور گھبرا کر منظر سے ہٹ گئی عاقب جینپ کرکان کھجانے لگا۔

”یہ کیا ہو رہا تھا؟“ راحہ نے عاقب کو گھورا۔
”کچھ نہیں بھابی..... کچھ بھی تو نہیں۔“ عاقب نے مسکرانے کی کوشش کی۔

راحہ نے اس کا کان اپنے ہاتھ میں دبوچ لیا اور بولی۔ ”میں نے دیکھ لیا ہے بچو۔“

”وہ..... بھابی..... پلیز..... کسی اور کو مت بتائیے گا۔“ عاقب نے خوشامد اندہ لہجے میں کہا۔

”چلو نہیں بتاؤں گی کسی اور کو..... مگر یہ بتاؤ کب سے ہے یہ چکر اور یہ لڑکی ہے کون؟“

”تھوڑے دنوں سے..... جاوید صاحب کی بیگم کی بھانجی ہے۔“ عاقب نے اس کے دونوں سوالوں کا جواب دیا۔

”آئی ہوئی ہے؟“

”اب یہیں رہتی ہے..... ان لوگوں کے پاس..... آپ کے سعودی عرب جانے سے کچھ دن پہلے آئی تھی اپنی اسی کے انتقال کے بعد۔“

”اچھا اچھا..... سعودیہ جانے سے پہلے میں نے برابر والی سے سنا تو تھا کہ جاوید صاحب کی بیگم کی بہن کا انتقال ہو گیا ہے۔ تعزیت کے لیے جانے کا ارادہ تھا مگر کوئی ساتھ جانے والا نہیں ملا۔ جا ہی نہ سکی پھر تمہارے بھائی کے پاس جانا ہو گیا۔“

”اب ہو آئے گا۔“

”دیکھوں گی..... ویسے بھی ان کا گھر دوسرے رخ

پر ہونے کی وجہ سے ہمارے اسے تو تعلقات نہیں ہیں ان لوگوں سے..... کسی روز چہمت سے نظر آئیں جاوید صاحب کی بیگم اپنے لان میں بیٹھے تو تعزیت کر لوں گی..... اچھا تو یہ جاوید صاحب کی مرحومہ سالی کی بیٹی ہے۔“ راحمہ اصل موضوع پر آگئی۔

عاقب نے نظریں جھکا کر اثبات میں سر ہلایا۔

”ہے تو خوب صورت!“

”سجھدار بھی ہے۔“ عاقب نے تر ت کہا۔

”سجھدار ہے سچی تو دیکھ کر پھنسا یا ہے اس نے تمہیں۔“

”نہیں نہیں وہ تو بس ایک بار دیکھ کر مسکرائی تھی۔ فون

نمبر میں نے ہی مانگا تھا اس سے۔“

”اچھا جی!“ راحمہ نے عاقب کو گہری نگاہوں سے

دیکھا۔ ”تو بات فون تک پہنچی ہوئی ہے۔“

”بھائی کو مت بتائیے گا۔“

راحمہ جو عاقب اور نسرین کے طے کردہ رشتے میں وراڑ

ڈلوانے کی کوشش میں ناکام رہی تھی ایک عجیب سے احساس

سے دوچار ہوئی۔ وہ کام جو وہ نہیں کر پاتی تھی۔ پڑوس کی اس

لڑکی سے وہ کام لیا جاسکتا تھا۔ عاقب کے لیے اگر اس کے

حسب منشا اس کے اپنے خاندان کی کوئی لڑکی نہیں تو پھر نسرین

بھی نہیں۔ بے شک کوئی اور ہی سہی..... غیر سہی..... ایک ہی

خاندان کی دو لڑکیاں آجانے سے وہ تو اقلیت نہیں بنے گی

تا..... و فرسٹ کزنز مل کر تو اس کے خلاف نہ جانے کیا کیا

سازشیں کریں گی..... جذبہ رقابت اور حسد انسان کی سوچ

اور فکر کو کہاں سے کہاں پہنچاوتے ہیں۔

”ثاقب کو نہیں بتائیں گی مگر ایک شرط پر۔“ راحمہ

نے کہا۔

”وہ کیا؟“ عاقب چونکا۔

”جو ہوا ہے اب تک وہ بھی مجھے بتا دو..... اور آئندہ

بھی بتاتے رہنا۔“

عاقب نے کچھ سوچتی ہوئی نظروں سے راحمہ کو دیکھا۔

”راز داری کا وعدہ کرتی ہوں۔“ راحمہ نے اپنا ہاتھ

عاقب کی جانب بڑھایا۔ عاقب نے کچھ ہلکے پھلکے ہوئے اپنا

ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

نسرین ان دونوں ہاتھوں کے بیچ کہیں گم ہو گئی۔

☆☆☆

ایک طرف راحمہ نے ثاقب کی خواہش کے مطابق

اس کا بیٹا بچاؤ کے گھر پہنچا دیا کہ ثاقب چھٹی پر گھر آئے

گا تو ثاقب کی شادی کر کے جائے گا۔ دوسری جانب وہ

عاقب اور ماہ نور کے درمیان بھیلے جانے والے کھیل کی نہ صرف تماشا کی بلکہ عاقب کی راز داریاں بھی بن گئی۔ وہ عاقب سے ماہ نور کی بابت چیخڑ چھاڑ کر سکتی، اس کے اور ماہ نور کے درمیان فون پر ہونے والی باتیں کرید کرید کر پوچھتی۔ عاقب شروع شروع اس کی چیخڑ چھاڑ اور کرید پر چیخینتا، شرماتا اور گھبرا بھی جاتا مگر راحمہ کی مسلسل چیخڑ چھاڑ نے بالآخر اسے بھی بے حجاب کر دیا اور وہ اسے فون پر ماہ نور سے ہونے والی باتیں نہ صرف زبانی نکالی بتانے لگا بلکہ اپنے اور ماہ نور کے میسجز بھی اسے بے تکلفی سے دکھانے اور پڑھانے لگا۔ ماہ نور کے معاملے میں اس کے اور راحمہ کے درمیان کوئی حجاب رہا نہ راز۔ تاہم راحمہ نے اس معاملے میں ماہ نور سے فاصلہ رکھا ہوا تھا اور عاقب کو بھی یہ ہدایت کر چکی تھی کہ وہ ماہ نور کو یہ نہ بتائے کہ وہ اس کے اور عاقب کے پیکر سے آگاہ تھی۔

”کیوں نہ بتاؤں بھابی؟“ عاقب نے پوچھا۔

”اس لیے مٹائیے کہ اسے اگر یہ پتا چل گیا کہ بھابی کو

بھی اس کی اور تمہاری دوستی کا علم ہے تو وہ اس ڈر سے کہ بھابی

کسی سے کچھ کہہ سن نہ دیں تم سے اپنا فیئر ختم بھی کر سکتی ہے۔“

یہ دلیل عاقب کے دل کو لگ گئی۔

☆☆☆

نسرین۔۔۔ گھر والوں نے شادی کی تیاریاں شروع

کر رکھی تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے دن ثاقب کی پھوپھی کا

راحمہ کو فون آجاتا اور وہ اسے نسرین کے جہیز کی تیاری سے

متعلق تازہ ترین معلومات اسے بتا کر اس سے رائے مشورہ

بھی چاہتیں۔

”اس لیے تم سے مشورہ کرتی ہوں راحمہ کہ تم گھر کی

بڑی ہو۔ تمہیں پتا ہے کہ گھر میں کس چیز کی ضرورت ہے کس

کی نہیں..... ایسی چیزیں جن کی ضرورت نہ ہو خواہ مخواہ جہیز

میں دینے سے فائدہ۔“ پھوپھی نے ایک دن کہا۔

”جی پھوپھی آپ ٹھیک کہتی ہیں..... اور بہت شکر یہ کہ آپ

مجھے اتنی اہمیت دیتی ہیں۔“ راحمہ نے اوپری دل سے کہا۔

”اہمیت دینے کی کیا بات بنا تمہیں اللہ نے رشتے

میں، مقام میں بڑائی دی ہوئی ہے اس گھر میں۔“

”آپ کی محبت ہے پھوپھی۔“

”میں تو نسرین کو بھی سمجھاتی رہتی ہوں کہ اس گھر جا کر

اپنی بڑی جیٹھانی کو بڑی بہن اور ماں کا سا مقام دینا..... ہر

اچھی بری اسی سے پوچھنا..... اسی سے صلاح مشورہ رکھنا.....

بھئی ماں کا کام تو یہی ہوتا ہے کہ وہ بیٹیوں کو صحیح سیکھ دے۔“

بھر کاموں میں لگی رہتی ہیں، نوکر ہیں مگر ان سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔“

”تمہارے پاس ہر بات کا جواب ہوتا ہے۔“
 ”ای کے ساتھ رہ کر سیکھا ہے..... ای نے بڑی مشکل زندگی گزار لی، ای کہا کرتی تھیں جب بندے کی زندگی مشکل سے گزرے تو اسے دوسرے کی بات کا جواب دینا آجاتا ہے۔“

”ای کی زندگی مشکل سے گزری؟“
 ”بہت..... اتنی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے..... مجھے تو اب یوں لگتا ہے جیسے خالہ کے گھر میں، میں جنت میں رہ رہی ہوں۔“

”تم میری بات گول کر گئیں۔“

”کون سی بات؟“

”کسی روز آؤنا۔“

”کہاں؟“

”ہماری طرف۔“

”خالہ کے بغیر میں کیسے آسکتی ہوں؟“

”خالہ کے بغیر تم مجھ سے عشق بھی تو کر رہی ہو۔“

”مگر ان کے بغیر آ نہیں سکتی تمہاری طرف۔“

”مجھ سے شادی کرنے کو کہتی ہو اور آ نہیں سکتیں.....“

اگر تمہاری خالہ اور خالو مجھ سے تمہاری شادی کرنے پر راضی

نہ ہوئے تو کیا تب بھی تم ایسی ہی بزدلی دکھاؤ گی؟“

”تمہیں نہیں عاقب..... شادی تو میں تمہی سے کروں گی۔“

”نہا؟“

”بالکل۔“

”لیکن یا ایک مسئلہ ہے۔“

”وہ کیا؟“

”ڈیڈی میری بات اپنی بہن یعنی میری پھوپھی کی بیٹی

سے ملے کر گئے تھے اور بڑے بھائی کہتے ہیں چھٹی پر

پاکستان آئے تو میری شادی کر کے جائیں گے۔“

”تم نے یہ بات پہلے کیوں نہیں بتائی مجھے؟“ وہ یک

لخت رد ہانسی ہوئی۔

”بتانے کا موقع ہی نہیں آیا تھا۔“

”اب کیسے آگیا؟“

”کیونکہ تم کالج میں داخلہ لینے والی ہو۔ پھوپھی شادی

کی تیاری کر رہی ہیں اور بڑے بھائی دو مہینے بعد چھٹی پر

آنے والے ہیں..... تمہارا کالج میں داخلہ ہو گیا اور بھائی

نے میری شادی پھوپھی کے ہاں کر دی تو پھر تم مجھ سے کیسے

”بالکل پھوپھی..... آپ ٹھیک کہتی ہیں۔“

”بیٹا! نرسین اس گھر سے تمہارے گھر آ کر تمہاری

عی ہوگی..... ہمارے گھر میں تو بس اب تھوڑے سے دنوں

کی مہمان ہے یہ۔“ پھوپھی آواز بھرا گئی۔

راحمہ دل ہی دل میں ہنسی۔ پھوپھی کو کیا مظلوم عاقب کو ان

کی بیٹی میں شادی پہلے بھی دلچسپی رہی ہو مگر اب تو تیری بھر بھی

نہیں تھی، اس کی پختہ نہیں تو ماہ نور کے ساتھ روز افزوں تھیں۔

کالجز میں داخلہ شروع ہو چکے تھے۔ ماہ نور نے

بھی خالہ کے ساتھ جا کر گھر کے قریب ہی داخلہ ایک کالج

میں داخلہ کی درخواست جمع کروا رکھی تھی۔ میرٹ لسٹ میں

اس کا نام نہیں آسکا تھا۔ کالج انتظامیہ نے دوسری اور تیسری

لسٹ کا انتظار کرنے کو کہا تھا۔

”اگر دوسری اور تیسری لسٹ میں بھی نام نہ آیا تو؟“

عاقب نے اس سے پوچھا۔

”تو خالو جی کہتے ہیں کسی پرائیویٹ کالج میں داخلہ

کرا دیں گے۔“

”یار! ہمارے کالج میں داخلہ لے لو نا۔“

”تمہارا کالج! تمہارا کون سا کالج ہے؟“

”تمہاری خالہ کے گھر کے پھوپھی..... بس ایک دیوار

ہی تو ہے درمیان میں..... آ جاؤ کسی روز داخلہ لینے۔“

عاقب جو شروع میں بہت گھبرایا مگر یا ر بتا تھا اب اس سے

ایسی ہی باتیں کرنے لگا تھا۔

”خالہ میرا حلو اپنا دیں گی۔“

”بہت لذیذ بہت شٹھا ہوگا۔“

”یڈ تیز!“

”کسی روز آؤ نا۔“

”کہاں؟“

”ہمارے گھر۔“

”تمہاری بھابی میری خالہ سے دعا سلام ہی نہیں

رکھتیں۔ ان کا آنا جانا ہوتا خالہ کے ہاں تو شاید میں بھی خالہ

کے ساتھ کسی دن آ ہی جاتی تمہارے ہاں۔“ اس نے شاکی

لہجے میں کہا۔

”بھابی دراصل مصروف بہت رہتی ہیں۔“

”مصروف تو خالہ بھی بہت رہتی ہیں۔“

”بھابی کے ساتھ بچہ بھی تو ہوتا ہے نا..... اسے

ایسکول بھیجنا، ہوم ورک کرانا..... بھابی سارا دن کاموں میں

لگی رہتی ہیں۔“

خالہ کے ساتھ میں ہوتی ہوں..... خالہ بھی دن

”وہ..... بھابی..... وہ.....“ زبان اس کا ساتھ دے

رہی تھی نہ الفاظ۔ ”بھابی..... وہ.....“

”بول بھی چکوا عاقب..... مجھے وحشت ہو رہی ہے۔“

”وہ..... ماہ نور..... رات وہ..... ہماری طرف آگئی تھی۔“

”ہاہ!“ راحمہ نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا

پھر پوچھا۔ ”پھر گئی کیسے؟“

”گئی نہیں..... اوپر کمرے میں ہے۔“

”اوہ میرے خدا!“ راحمہ چکرائی گئی۔ ”رات بھر تمہارے

کمرے میں رہی؟“ اس نے وہی وہی آواز میں پوچھا۔

عاقب کا سر جھک گیا۔

بھابی نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا اور اس کی

نظریں فرش سے جا لگیں۔ وہ مجرم بنا کھڑا تھا..... مجرم تو تھا

وہ..... بلکہ گناہ گار!

پکا یک راحمہ کی تھر تھری چھوٹ گئی اور دانت بیٹے

لگے۔ ”صبح ہونے والی ہے اسے جلدی دانیں سمجھو۔“ اس

نے مسلسل بیٹے دانتوں کی کھٹکا ہٹ میں کہا۔

”وہ دانیں جانے کو تیار نہیں۔“ عاقب نے کہا۔

”کیا!“ راحمہ نے اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا

اور اپنے لرزتے وجود کے ساتھ گھر کے لاؤنج سے اوپر

جاتے زینے کا رخ کیا۔ جس کھیل کا وہ اتنے دنوں سے خود بھی

ایک اہم کردار بنی رہی تھی اس کے اس منظر نے اس کے چہرے

چھڑا دیے تھے۔ اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں ہوگا۔

☆☆☆

کمرے کا منظر اور ماہ نور کی جھکی جھکی نظریں زبان

حال سے گزشتہ شب کی داستان سنا رہی تھیں۔ راحمہ نے

عاقب کی طرف دیکھا اس نے نظریں جرائیں۔ راحمہ نے

کمرے کی جاوید اختر کے مکان کی جانب کھلنے والی کھڑکی کا

پروہ چنگی سے پکڑ کر نہایت احتیاط سے ذرا سا ہٹایا اور باہر

جھانکا۔ جاوید صاحب کے گھر میں کھل سناٹا تھا اور کسی

کمرے میں روشنی نہ تھی۔ اس کا مطلب تھا اہل خانہ ابھی سو

رہے تھے۔ راحمہ پروہ چھوڑ کر بیٹی اور اس نے ماہ نور کو

ڈانٹا۔ ”کتنی بڑی قحطی کی تم نے..... اٹھو..... اپنے گھر

جاؤ.....“ اس نے کھٹی کھٹی آواز میں کہا اور عاقب کو گھورتے

ہوئے بولی۔ ”یہ تالاق تمہیں دیوار چڑھا دے گا۔“

ماہ نور ٹھس بیٹھی رہی۔

”سنا نہیں تم نے میں کیا کہہ رہی ہوں۔“ راحمہ نے

تیور مزید بگاڑے۔

ماہ نور بدستور سر جھکائے اسی طرح بیٹھی رہی۔

شادی کر سکوگی؟“

”تم میرے علاوہ کسی اور سے کر لو گے شادی؟“

عاقب سے جواب نہ بنا تو اس نے الٹا سوال داغ

دیا۔ ”تم کر لوگی؟“

”نہیں۔“ اس نے بلا توقف فیصلہ کن لہجے میں

جواب دیا۔ ماہ نور عمر کے اس حصے میں تھی جہاں شعور و دانش

سے زیادہ جذبات کا غلبہ ہوتا ہے۔ اسے عاقب دنیا کے ہر

دوسرے انسان سے بڑھ کر اچھا اور اپنا لگنے لگا تھا۔

☆☆☆

کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز پر عاقب نے اپنے

چہرے سے لحاف ہٹائے بغیر قدموں کی چاپ کو بھابی کی آمد

پر محمول کرتے ہوئے کہا۔ ”آج سردی بہت ہے بھابی۔“

دروازہ آہستگی سے بند ہو گیا۔ قدموں کی چاپ

نزدیک ہوتی گئی پھر مہین سی آواز سنائی دی۔ ”میں ہوں۔“

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور چھلانگ لگا کر گرم بستر سے

نکل آیا۔ ”تم!“ زہیر و پاؤں بلب کی نیلگوں روشنی میں ماہ نور

اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”ہاں۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”اس وقت ا“

”تم نے کہا تھا نا..... آؤ۔“

وہ اپنی بات سے کمر نہ سکتا تھا مگر..... اب جب وہ

آگئی تھی تو وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔

”تمہارے گھر والے؟“

”سور ہے ہمارا۔“

”تم آئیں کیسے؟“

”دیوار کو دوکر۔“

وہ اس کی جمرات زندانہ پر حیران رہ گیا۔ اتنی سردی

اور اندھیرے میں وہ دو گھروں کی مشترکہ دیوار پھلانگ کر

اس تک پہنچی تھی۔ وہ اس کے بہت قریب آگئی..... اتنی کہ وہ

اس کی گرم سانسیں اپنے وجود پر محسوس کر سکتا تھا۔

”عاقب! میں صرف تم سے شادی کروں گی۔“

کمرے میں وہ تھا، ماہ نور، تار کی اور.....

صبح پو پھننے سے پہلے وہ گھر کی زیریں منزل پر راحمہ

کے کمرے کے دروازے پر کھڑا دروازے کو آہستگی سے

کھٹکھٹا رہا تھا۔

”کون؟“ راحمہ نے پوچھا۔

”میں ہوں بھابی۔“

”خیریت؟“ راحمہ نے دروازہ کھول کر پوچھا۔

”نہیں جانا..... نہیں جاتا۔“
 ”تمہیں پتا ہے تم نہیں سکتیں تو ہم لوگ کتنی مشکل میں
 آجائیں گے۔“ راحمہ گڑبگڑائی۔
 ”میں بھی تو مشکل میں آ جاؤں گی۔“
 ”ہاں تو اسی لیے تو کہہ رہی ہوں چلی جاؤ اپنے گھر۔“
 ”نہیں جاتا۔“
 ”آخر کیوں ا۔“
 ”بس۔“
 ”بس کا مطلب۔“

وہ کچھ نہیں بولی۔ راحمہ کو اس کی ڈھٹائی پر غصہ آیا۔
 راحمہ پھر کھڑکی تک پہنچی اور اس نے اسی احتیاط سے
 پھر باہر جھانکا اور یقیناً گھبرا کر پلٹی۔ ”تمہارے گھر میں
 ایک کمرے کی بنی جل گئی ہے..... کوئی جاگ گیا ہے شاید۔“
 اس نے ایک نظر راحمہ کو دیکھا۔ تھوڑی سی گھبرائی مگر
 اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

”اب خود ہی سمجھنا اس مصیبت سے۔“ راحمہ نے
 عاقب پر آنکھیں نکالیں۔

عاقب نے پھر سر جھکا لیا۔
 ”تھانہ کچھری ہو جاتا ہے ایسے قصوں میں۔“ راحمہ ہنسی۔
 ”میرا کیا قصور بھابی..... وہ خود آئی ہے۔“

”ہاں ہاں..... تم تو جیسے بہت مصدوم..... دودھ پیتے بچے
 ہوتا..... سب کچھ کر کے بیٹھے گئے اور کہتے ہو میرا کیا قصور۔“

”عاقب تم نے خود ہی تو بلایا تھا مجھے۔“ ماہ نور جیسی
 آواز میں بولی۔

راحمہ نے چونک کر عاقب کو دیکھا پھر ماہ نور کی
 گھورتے ہوئے ترش لہجے میں بولی۔ ”اور تم اتنی بھولی نہیں
 کہ اس کے بلانے پر آئیں..... وہ بھی رات کو..... شرم نہیں
 آتی تمہیں؟“

ماہ نور نے پھر کر عاقب کو دیکھا۔ ”عاقب! بتاؤ نا
 نہیں تم نے مجھ سے کیا کہا ہے۔“

راحمہ نے چونک کر سوالیہ نظروں سے عاقب کو یوں
 دیکھا جیسے جاننا چاہتی ہو کہ اس نے ایسا کیا کہا تھا۔ ماہ نور
 سے۔ وہ خاموش گھڑا رہا۔ ”کیا کہا ہے؟“ اس کی خاموشی نہ
 ٹوٹنے پر راحمہ کو پوچھنا پڑا۔

”کچھ نہیں۔“ عاقب بولا۔
 ”جھوٹ مت بولو..... بتاؤ نا تم نے مجھ سے کہا ہے
 کہ تم مجھ سے شادی کرو گے۔“

صورت حال یہ نہ ہوتی جو کہ اس وقت تھی تو راحمہ

”اٹھو بھی۔“ راحمہ نے اس کے نزدیک پہنچ کر اس کا
 بازو جھنجھوڑا۔

ماہ نور منہ سے کچھ نہیں بولی لیکن اس نے فیصلہ کن
 انداز میں نفی میں سر ہلا دیا۔

”کیا مطلب ا۔“ راحمہ غرائی۔
 ”مجھے نہیں جانا۔“ ماہ نور جیسی آواز میں کہا۔

”یا گل ہوئی ہوا مروا، ہمیں اور..... خود بھی
 سرو گی۔“ راحمہ کے لہجے میں ناگواری تھی۔ ”اٹھو..... ابھی
 روشنی نہیں ہوئی..... تمہارے گھر والے جاگ گئے تو انہیں پتا
 چل جائے گا کہ تم گھر میں نہیں ہو۔“

”پتا چلنے دیں۔“ وہ بولی۔
 ”وماغ تو نہیں چل گیا تمہارا..... قیامت کرویں گے
 تمہارے گھر والے۔“

”کرنے دیں۔“ اس کا انداز سرفروشانہ ہو گیا۔
 راحمہ نے عاقب کو دیکھا اور غرائی۔ ”کھڑے دیکھ
 کیا رہے ہو..... اسے سمجھو اس کے گھر۔“

عاقب دائیں بائیں دیکھنے لگا۔
 ”میں کیا کچھ اس کر رہی ہوں عاقب۔“ راحمہ نے
 اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”بھابی..... وہ جا نہیں رہی تو میں کیا کروں۔“
 عاقب بے بسی سے بولا۔

”پھر انجام پہنچنے کو تیار ہو جاؤ..... نہ اس کے گھر
 والے ہنسی کے تمہیں نہ تمہارے اپنے بھائی۔“

”آپ بتائیں میں کیا کروں پ۔“
 ”کرو نہ کہ.....“ راحمہ نے بیڈ پر بیٹھی ماہ نور کی
 طرف انگلی اٹھائی۔ ”گناہ کی اس پوٹلی کو اس کے گھر میں
 پھینک دو۔“ راحمہ بھول رہی تھی کہ گناہ کے اس کھیل کو ہوا
 دکھانے میں اس نے بھی حصہ ڈال رکھا تھا۔

”چلو بھی اٹھو۔“ عاقب نے ماہ نور سے کہا۔
 ”نہیں جاؤں گی۔“

راحمہ دونوں مٹھیاں بھینچ کر بیچانی کیفیت میں چھت
 کی طرف دیکھنے لگی۔

”دیکھو..... پلیز..... ابھی وقت ہے..... تم خاموشی
 سے اپنے گھر واپس جا سکتی ہو..... چلی جاؤ.....“ راحمہ نے
 اپنا لہجہ بدل لیا۔

ماہ نور اس سے مس نہ ہوئی۔
 ”اچھی لڑکیاں ایسا نہیں کرتیں جیسا تم نے کیا.....
 گھر جاؤ.....“ راحمہ نے اسے پکھارا۔

وہم وگمان میں بھی وہ نہ تھا جو ہو چکا تھا۔ ”بائی دی وے ایمر جنسی کی نوعیت کیا ہے؟ ثاقب اور عاطف تو خیریت سے ہیں نا؟“

”جی..... جی..... اوہ تو سب خیریت سے ہے..... رات وہ آئی تھی ہماری طرف۔“ ثاقب نے ہلکے پھلکے ہونے بتایا۔
”وہ ادہ کون؟“

”یار دینی نا..... ماہ نور..... جس سے میری ڈانگ چل رہی تھی۔“

”اچھا اچھا! کیا کہا تمہاری طرف آگئی تھی؟“
”جی..... اور اب اپنے گھر واپس جانے کو تیار نہیں۔“
”یعنی رات کو وہ تمہاری طرف ہی رہی؟“
”جی۔“

”اومائی گاڈ!“ فرقان علی کے لہجے میں تشویش تھی۔
”اس کے گھر والوں کو پتا نہیں چلا؟“
”پتا چلتا تو کھینچ کر نہ لے جاتے..... اب جاگیں گے تو پتا چلے گا۔“
”آئی کیسے؟“

”دیوار پھلانگ کر۔“
”یار مجھو اسے اس کے گھر ورنہ ایسے پھنسو گے کہ جان چھڑائی مشکل ہو جائے گی۔“
”وہ جانے کو تیار ہی نہیں۔“
”بس تو اب کچھ بھی بھنگنے کو تیار رہو۔“

”فرقان بھائی! پلیز بتائیں نا کیا کروں؟“
”میں کیا بتاؤں۔“
”آپ ہی نے تو کہا تھا فون نمبر مانگنے کو۔“

”یہ تم کائی دن پہلے کی بات یاد دل رہے ہو مجھے۔“
فرقان کے لہجے سے حیاں تھا کہ اس نے ثاقب کی بات کا برا منایا تھا۔ ”یار! یہ کب کہا تھا میں نے کہ وہ تمہارے گھر آجائے تو رات بھر مزے کرنا۔“ فرقان یکتا بخ ہو گیا۔
”پلیز فرقان بھائی میری مدد کریں۔“ وہ گڑ گڑایا۔
”بھائی بھی بہت پریشان ہیں۔“

”ہونا چاہیے..... جانتے ہو کیا ہوتا ہے ایسی باتوں کا انجام..... پولیس، تھانہ، کچہری..... اور دشمنیاں الگ..... لڑکی والوں کے لیے عزت کا مسئلہ ہوتا ہے۔“
”غلطی ہوگئی فرقان بھائی۔“

”تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ بھائی دونوں باہر ہیں..... گھر میں ایک عورت ہے اور ایک بچہ..... تم لاکھ چھاپو گے بچہ کہیں نہ نہیں اگل دے گا۔“

خوشی سے بے اوسان ہوگئی تھی۔ یہی تو چاہتی تھی وہ کہ ثاقب اپنی پھوپھی زاد نسرین کے بجائے کسی اور سے شادی کر لے تاکہ اس گھر میں نسرین کے نبھانے اس کی پھوپھی کے جاہل اور کٹر گھرانے کا عمل و عمل نہ ہونے پائے۔ مگر اس وقت صورت حال کچھ اور تھی۔
”شادی ایسے ہوتی ہے۔“ راحمہ نے ماہ نور کو گھورا۔

اس نے سر جھکا لیا۔
”کھڑے کیا ہوا اب اس معصیت کا کوئی حل نکالو۔“

راحمہ ثاقب کے رو برو جا کھڑی ہوئی۔
ثاقب اسے شرمساری سے دیکھنے لگا۔
”میرا منہ کیا تک رہے ہو..... کچھ کرو..... صبح ہوگئی ہے۔“
”فرقان..... فرقان..... بھائی کو..... بتاؤں۔“ ثاقب اٹکتے ہوئے بولا۔

”وہ کیا کر لے گا۔“
”یہ جانتیں رہی تو..... شاید وہی کچھ مشورہ دے دیں۔“
”صبح صبح اس کا فون کھڑکاؤ گے؟“
”مجھوری ہے نا بھائی۔“

”کر لو۔“ راحمہ نے ماہ نور پر ناگواری سے نظر ڈالی اور پھر اسی کھڑکی کی طرف پیش قدمی کی۔ کھڑکی پر پڑا پردہ پھر اسی احتیاط سے ڈرا سا ہٹا کر جاوید اختر کے گھر کی طرف دیکھنا پھر گھبرا کر پیچھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”لگتا ہے سب جاگ گئے ہیں۔“

”آٹھ نو بجے سے پہلے کسی کو پتا نہیں چلے گا..... میرے کمرے کا دروازہ اندر سے بند ہے..... میں کھڑکی سے کود کر آئی ہوں۔“ ماہ نور نے کہا۔

راحمہ کے جڑے آپ ہی آپ بھینچ گئے۔ کیسی فتنہ لڑکی تھی۔

فرقان سے بات کرنے کو ثاقب نیچے چلا گیا۔
”فرقان بھائی آپ ہماری طرف آسکتے ہو؟“
ثاقب فون پر فرقان علی سے کہہ رہا تھا۔

”اسی صبح آخریت؟“ فرقان علی اپنے بستر میں تھا۔
”ایمر جنسی ہے فرقان بھائی۔“
”کیا ہوا؟“ فرقان اٹھ بیٹھا۔

”آپ آؤ گے تو بتاؤں گا..... فون پر بتانے والی بات نہیں۔“

”میں تو ابھی جاگا ہوں..... شاور لوں گا..... تیار ہوں گا..... پھر نکلوں گا تمہاری طرف آنے کے لیے..... اتنی دیر میں تم کیوں نہیں آجاتے میری طرف۔“ فرقان علی کے

کے تینوں بھائیوں سے تھے۔ عاقب کو تو وہ بچے کی طرح ٹریٹ کرتا تھا۔ کسی بھائی میں اس نے عاقب کو پڑوس کی چھت والی لڑکی سے تعلقیں بڑھانے کا مشورہ تو دے دیا تھا اور عاقب اپنے اور ماہ نور کے درمیان فون پر ہونے والی باتیں بھی کبھار اس سے شیئر بھی کر لیا کرتا تھا مگر فرقان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ انٹرنٹ اس گروٹ پیٹھے گا۔

چادر میں لپٹی ماہ نور کو اپنے ہمراہ لیے عاقب... علی الصباح فرقان کے گھر پہنچا تو فرقان بھبک اٹھا۔ "یار! کچھ عقل ہے تمہیں... ماں بہنوں والا آدمی ہوں، بیگم بھی ہے گھر میں... کیا سوچیں گی سب کی سب۔"

عاقب شرمندہ ہو گیا۔
"کچھ شرم کرو یار۔" فرقان علی نے اسے ڈانٹا۔
"پلیز فرقان بھائی۔" عاقب دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑایا۔ "کچھ کریں۔"
"کیا کروں۔" فرقان نے آنکھیں نکالیں۔

"اسے اندر بلا لوں؟"
"اندر بلا کر کیا کروں... اندر گھر میں خواتین مجھ سے پوچھیں گی نہیں یہ کون ہے۔ یار کیوں اپنے ساتھ مجھے بھی ذلیل کرانا چاہتے ہو۔"

عاقب نے سر جھکا لیا۔ کچھ دیر کے لیے کمرے میں کھل خاموشی چھا گئی۔ دونوں اس وقت ڈرائنگ روم میں تھے۔ عاقب کے تیل بجانے پر فرقان کی والدہ نے دروازہ کھولا تھا اور عاقب کو صبح سویرے پریشان حال دروازے پر کھڑے دیکھ کر چونک گئی تھیں۔ عاقب ان کے لیے اجنبی نہ تھا۔ تینوں بھائیوں کا ان کے ہاں آنا جانا رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتیں عاقب نے کہا۔ "آئی فرقان بھائی سے ملنا تھا۔"

فرقان کی والدہ نے ایک اچھی نظر گاڑی میں بیٹھی ماہ نور پر ڈالی جس نے چادر اوڑھ رکھی تھی اور آنکھوں کے سوا پورا چہرہ چادر سے چھپا رکھا تھا۔ فرقان کی والدہ اسے دروازے پر ہی کھڑا چھوڑ کر فرقان کو باہر بھیجنے کے لیے گھر کے اندر جانے کو منزس۔

فرقان اسے گھر کے اندر لے آیا اور ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر کے رخ کھٹکنے والے دوسرے دروازے کی چابی چڑھائی۔ اس نے گھر کے باہر کھڑی گاڑی میں بیٹھی چادر پوش لڑکی کو دیکھ کر بھی اسے اندر بلانے سے گریز کیا تھا مگر اب عاقب اس سے لڑکی کو اندر بلانے کی اجازت مانگ رہا تھا۔ عاقب سے اس کے پرانے تعلقات تھے۔ عاقب کی غلطی

"اسے کچھ بتائیں... وہ تو ابھی سو رہا ہے۔"
"سب سے پہلے تو کوشش کرو کہ وہ چپ چاپ اپنے گھر چلی جائے۔"
"بہت سمجھایا... نہیں جا رہی۔"
"تو اسے لے کر نکلو ہاں سے ورنہ برے پھنسو گے۔"
"کہاں لے کر جاؤں؟" عاقب نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

"یہ بات تمہارے سوچنے کی ہے یار۔"
"ٹھیک ہے فرقان بھائی۔" عاقب کو فرقان کی سر مہری سے آنسوؤں ہوا۔
"راحمہ بھی نیچے آگئی تھی۔" کیا ہوا؟ اس نے پوچھا۔
"وہ تو لٹف ہی نہیں کر رہے... بس یہ کہا یا تو اسے واپس بھیجو ورنہ وہاں سے لے کر نکلو۔"
"ہاں عاقب اسے لے ہی جاؤ۔"
"کہاں لے جاؤں بھائی؟"

راحمہ جو انتہائی پریشان دکھائی دے رہی تھی سوچ میں پڑ گئی۔ "خاندان میں کہیں لے جاؤ گے تو عزت بچانی مشکل ہو جائے گی... وہ وہ باتیں نہیں کی کہ خدا کی پناہ۔"
راحمہ نے کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔

"جاہل بھرے پڑے ہیں نا خاندان میں اس لیے۔"
"ٹھیک کہتے ہو۔" عاقب نے اس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔

"آپ اپنی اہلی کے ہاں بات کریں۔"
"پاگل ہوئے ہو... تمہارے ساتھ میری بھی ذلت ہوگی۔"
"پھر؟"

"فرقان کے پاس ہی جاؤ... وہ سمجھدار آدمی ہے کوئی راستہ نکال دے گا۔"
"اور اگر نہ نکالا کوئی راستہ؟"
"جاؤ تو سہی۔" راحمہ زچ ہو کر یونی۔

☆☆☆

فرقان علی چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ وہ ہمیشہ شادی شدہ تھیں، ود کنواری والدہ حیات تھیں۔ والد کا انتقال ہوئے برسوں بیت چکے تھے۔ فرقان خود بھی شادی شدہ تھا۔ عمر کوئی پینتیس کے لگ بھگ تھی۔ دو بچوں کا باپ تھا۔ اکلوتی اولاد زینہ ہونے کے باعث قدرے من موچی مگر تھا مہر و آدمی۔ جو کہہ دیتا اسے نبھانا فرض جانتا۔ تھا تو وہ عاقب کے دوستوں میں اور اس کا ہم پیشہ بھی مگر مراسم اس

عاقب کو غیرت آگئی۔

”تو پھر اس بے چاری کو تحفظ دو۔“

”بھابی گھبرا رہی تھیں کہ اس کے گھر والے آجائیں

گے، پولیس آجائے گی..... یہ ہو جائے گا، وہ ہو جائے گا۔“

”ان کی پریشانی بھی چاڑھ ہے..... ایسے معاملات

میں یہی ہوتا ہے..... لڑکی والے خاموش تھوڑی بیٹھتے ہیں۔“

”مشورہ دیں نا کیا کروں؟“

”عاقب کو فون کرو..... عاطف کو خبر کرو۔“

”نہیں، نہیں۔“ عاقب نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔

”وہ دونوں تو میرے نکلے کر دیں گے۔“

”غلط نہیں کریں گے..... لڑکے دالوں کی بھی عزت

جاتی ہے یار۔“ فرقان غصے سے بولا۔

ڈرائنگ روم کے اندر کی طرف کھٹنے والے بند

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور فرقان کی والدہ جو در

سے بند دروازے کے پیچھے کان لگائے کھڑی نہیں بولیں۔

”فرقان کیا بات ہے بیٹے؟“

”کچھ نہیں امی۔“

”دروازہ کھولو۔“

”کھول ہوں امی۔“

”میں اتنی صبح اس لڑکے کے آنے پر پہلے ہی کھٹک گئی

تھی..... میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔“ دروازے کے پیچھے

سے فرقان کی والدہ کی آواز سن کر ماہ نور بھی چونکی ہی ہو گئی تھی۔

فرقان نے دروازہ کھول دیا۔ والدہ اندر آ گئیں اور

انہوں نے خشونت سے پہلے عاقب کو ایک نظر دیکھا پھر ماہ

نور پر اپنی لگا ہیں مڑ کر دیں۔

”بیٹیہ امی۔“ فرقان نے دلی زبان سے کہا۔

”کیا بیٹیہوں..... یہ.....“ انہوں نے پھر عاقب کو

دیکھا مگر اس بار حقارت اور نفرت سے۔ ”اس لڑکی کو ہٹا کر

لایا ہے نا۔“

عاقب نے شرمندہ ہو کر پہلو بدلا اور نظریں چراتے

ہوئے بولا۔ ”آئی یہ خود آگئی تھی۔“

”خود کیسے آگئی تھی۔“ والدہ تڑخ کر بولیں۔

”بڑوس کے گھر میں رہتی ہے۔“ فرقان نے ماں کو بتایا۔

”چکر چل گیا ہوگا۔“ والدہ نے ناگواری سے کہا پھر

اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولیں۔ ”اللہ بچائے آج

کل کی لڑکیوں سے اور لڑکوں سے بھی۔“ پھر ماہ نور کو غصے

سے دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ”شرم نہ آئی ماں باپ کی

عزت کو داغدار کرتے ہوئے۔“

پردہ اس کے بڑے بھائی سے اپنے ویرینہ تعلق سے لیکھت

آکھیں نہیں پھیر سکتا تھا پہلے تو اس نے منع کیا پھر کچھ سوچ کر

اس نے قدرے تامل سے کہا۔ ”بلاو۔“

عاقب گیا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ وہ درمیانہ

قامت کی حامل تھی۔ مختار روی سے کمرے میں داخل ہوئی۔

”بیٹھو۔“ فرقان نے اس سے کہا۔

وہ سستی سستی سی صوفے پر بیٹھ گئی۔

”تم بھی بیٹھو۔“ فرقان نے عاقب سے کہا۔

کچھ دیر خاموشی رہی پھر فرقان نے اس سے پوچھا۔

”گھر کیوں نہیں گئیں تم اپنے؟“

وہ اپنی گود میں رکھے ہاتھوں کی انگلیاں بیجان کے

عالم میں باہم مردونے لگی۔

”اس نے تو حماقت کی ہے۔“ فرقان نے ایک نظر

عاقب کو دیکھا پھر ماہ نور کی جانب نگاہ کی۔ ”تم کیوں بے

دقونی کرنا چاہتی ہو۔“ فرقان اپنے گھر دالوں کے خیال سے

دبی دبی آواز میں بول رہا تھا۔

وہ چادر کے کنارے سے اپنی آنکھیں مسلنے لگی۔

”گھر سے نکلی لڑکی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔“ وہ اسی

طرح اپنی آنکھیں مسلتی رہی۔

”پہلی جاؤ اپنے گھر۔“ فرقان نے سبھایا۔ وہ رونے لگی۔

”اب رونے سے کیا فائدہ۔“

”خالو مجھے قتل کر دیں گے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز

میں بولی۔ ”چادر اس کے چہرے سے ڈھٹک گئی تھی۔

فرقان نے اندازہ کیا وہ بہ مشکل سولہ ہترہ سال کی رہی

ہوگی۔“ خالو تو مجھے زبردستی ساتھ لائی تھیں..... خالو کی مرضی

نہیں تھی۔“ اس نے مزید کہا۔

”اور تم نے خالو کی محبت اور مہربانی کا انہیں یہ انعام دیا؟“

اس نے سر جھکا لیا۔

”اپنے ساتھ خالو کو بھی مشکل میں ڈال دیا..... اب

کیا کرو گی..... کہاں جاؤ گی؟“

وہ اضطراب سے دو چار نظر آنے لگی۔

”بولو۔“ فرقان نے تقاضا کیا۔

اس نے اپنی جھکی جھکی نظریں عاقب کی طرف

اٹھائیں۔ ”انہی کے ساتھ رہوں گی اور کہاں جاؤں گی۔“

”سن لیا!“ فرقان نے عاقب کو دیکھا۔ ”اب

عورتوں کی طرح مت چھو مرنو اور مردوں کی طرح بہادری

میں پیچھے تو نہیں ہٹ رہا فرقان بھائی۔“

سے کام لیا ہوتا۔“

ماہ نور نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر بے حس و حرکت رہی پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فرقان کی بیوی اور بہنیں دروازے کی آڑ میں آن کھڑی ہوئی تھیں۔ فرقان کی نظریں دیوار گیر گھڑی پر تھیں۔ دفتر جانے کا وقت ہو چکا تھا۔

”ذرا سوچو تو۔“ فرقان کی والدہ نے عاقب کو گھورا۔
”اس کی جگہ تمہاری اپنی بہن ہوتی اور تمہاری اپنی جگہ کوئی اور لڑکا..... تو تم اس وقت کیا کرتے ہے؟“
عاقب نے پھر سر جھکا لیا۔

یگا یک عاقب کا فون بجا اس نے چونک کر موبائل جیب سے نکالا اور کال ریسیو کی۔ ”جی بھابی!“
کمرے میں موجود دونوں خواتین اور فرقان کی نظریں ای پر تھیں۔

”اچھا..... پھر..... اوہو..... ہوں..... ہوں.....“
راحہ کی کال سننے کے دوران عاقب کے چہرے کی کیفیت متغیر ہوتی رہی۔ بالآخر عاقب نے یہ کہہ کر کال منقطع کر دی۔ ”میں آپ کو فون کرتا ہوں بھابی۔“
”کیا ہوا؟“ فرقان نے پوچھا۔

”ماہ نور کی خالہ آئی تھیں ہمارے گھر..... جس کرسی پر چڑھ کر یہ دیوار پھلانگی تھی وہ انہیں دیوار کے نزدیک رکھی ملی اور دیوار پر اس کے جوتوں کے نشان بھی تھے۔“ عاقب نے بتایا۔
”شہادتیں بھی مل گئیں..... اب تم تیار ہو جاؤ۔“
فرقان نے عاقب سے کہا۔

عاقب سرا سید دکھائی دینے لگا۔
”شابش ہے بھئی!“ فرقان کی والدہ نے ماہ نور کو نیڑھی نظر سے دیکھا۔ ”ہوائی دیدہ ہے آج کل کی لڑکیوں کا..... دیوار پھلانگتے ٹانگ ٹوٹ جاتی۔ کہیں جا، بے جا چوٹ لگ جاتی تو؟“

ماہ نور ان کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی۔
”تمہاری بھابی نے اس کی خالہ سے کیا کہا؟“
فرقان نے عاقب سے پوچھا۔

”انہوں نے کہا آپ کی لڑکی ہماری طرف تو نہیں آئی۔“
”پتا اچھس گئے ہو بری طرح..... اسے گھر سے لے کر نہ نکلے ہوتے تو جب خالہ آئی تھیں اسے چپ چاپ ان کے سپرد کر دیتے..... ان کی بھی عزت بچ جاتی، تمہاری بھی..... اب بھی وقت ہے..... اس سے پہلے کہ بات زیادہ بڑھے..... لے جاؤ اسے یہاں سے اور پہنچا دو اس کے گھر۔“ فرقان نے کہا۔

”ای اس کے ماں اور باپ دونوں مر چکے ہیں..... عاقب کے پڑوس میں اس کی خالہ اور خالورہ تھے ہیں۔ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں۔ اس کی والدہ کے انتقال کے بعد وہ اپنے ماں لے آئے تھے۔“

”لڑکی! تمہیں چاہیے تھا عزت سے بیٹھتیں..... خالہ اور خالو تو اب تمہیں منہ بھی نہیں لگائیں گے۔“
”منہ کیا نہیں لگائیں گے..... یہ کہتی ہے خالو تو اسے مار دے گا۔“ فرقان نے ماں سے کہا۔
”ہونا تو یہی چاہیے۔“ وہ بولیں۔
ماہ نور رونے لگی۔

”اب مگر مجھ کے آنسو بہانے سے کوئی فائدہ نہیں۔“
فرقان کی والدہ نے ماہ نور کو ڈانٹا پھر بیٹے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں پر اے پھڑے میں اچھنے کی ضرورت نہیں..... انہیں یہاں سے چلا کرو۔“

”پلیز آئی۔“ عاقب نے ان کے سامنے بھی دونوں ہاتھ جوڑ دیے پھر متوش ہو کر فرقان کو دیکھا۔ ”پلیز! پلیز! میری مدد کریں..... اسے لے کر کہاں جاؤں گا۔“
”جہاں مرضی آئے جاؤ..... فرقان کو اس قصے میں کھینچنے کی ضرورت بالکل نہیں۔“

”فرقان بھابی!“ عاقب نے اسے تکی لگا ہوں سے دیکھا۔
صوفے پر بیٹھی ماہ نور وقتاً اوندھے منہ گر پڑی۔ وہ تینوں بے ساختہ چوٹے ڈرائنگ روم میں بچھے قالین پر اوندھے منہ گری ماہ نور کے پورے جسم پر ارتعاش ساخاری تھا۔ عاقب نے لپک کر اسے سیدھا کیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں جڑے سینچے ہوئے تھے۔

”بے ہوش ہو گئی ہے بے ہوش..... اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دو جو تازہ سکھاؤ اسے۔“ فرقان کی والدہ نے کہا۔
عاقب ہونٹوں کی طرح انہیں دیکھنے لگا۔
”میں پانی لاتی ہوں۔“ فرقان کی والدہ دروازے کی طرف لپکیں۔

عاقب اور فرقان کی نظریں باہم ملیں۔ ”یار تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ فرقان کے لہجے میں ناگواری تھی۔ عاقب شرمندہ ہو گیا۔ وقت وقت کی بات تھی۔ وہ پہلے بھی اس گھر میں آتا رہا تھا۔ چائے، کافی سے اس کی تواضع ہوتی رہی تھی مگر آج.....

ماہ نور کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیتے ہوئے فرقان کی والدہ نے خود کلائی کی۔ ”چھوٹی عمر کی ہے۔“ پھر عاقب کو دیکھ کر بولیں۔ ”تیمیم جی ہے..... تو نے ہی کچھ کھس

”ابھی دل نہیں چاہ رہا..... کر لوں گا۔“ عاقب دروازے سے نکل گیا۔

”چلو بھئی اندر چلو۔“ فرقان کی والدہ ماہ نور سے یوں۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ فرقان کی بیوی اور بیٹھیں دروازے کے پاس سے ہٹ گئی تھیں۔ فرقان ڈرائنگ روم میں اکیلا رہ گیا۔ اب وہ تھا اور اس کے ضمیر کی عدالت۔

”تم ہی تھے جس نے عاقب کو اس لڑکی سے محبت کی پیٹنگیں بڑھانے کی ترغیب دی تھی..... تم ہی اس کے راز دار اور صلاح کار رہے..... تم جانتے تھے کہ یہ لڑکا اپنی پھوپھی زاد سے منسوب ہے پھر بھی تم نے اس کی ایک غیر لڑکی سے دل لگی پر حوصلہ افزائی کی..... مزے لے لے کر سنتے رہے۔ وہ تو نوجوان تھا..... تم تو شادی شدہ اور دو بچوں کے باپ تھے..... اس کے گھر میں تو کوئی بہن نہیں تھی..... تم تو بہنوں والے تھے..... دو اب بھی بیٹھیں ہیں گھر میں..... ذرا سوچو..... اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچو..... تمہاری ان دو غیر شادی شدہ بہنوں میں سے کوئی..... خدا نخواستہ اس طرح کسی غیر گھر میں منہ چھپائے بیٹھی ہو..... رو رہی ہو..... کانپے، لرزے اور بے ہوش ہو جائے تو.....“

فرقان کٹھن کے میں کھڑا تھا۔ اس کا ضمیر ایک ماہر وکیل کی طرح اسے اس کے جرم کا احساس دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ہاں..... میں بھی شریک جرم ہوں۔“ لڑکی کی کم عمری، اس کی خوب صورتی، اس کے چہرے سے ہویدا نا تجربہ کاری، اس کا چادر میں بار بار منہ چھپا کر رونا، سسکتا اور اس کی آنکھوں میں ڈبڈبائے آنسو فرقان کو ناقابل بیان دکھ اور احساس شرمندگی سے دوچار کر رہے تھے۔ اپنا یہ دکھ وہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

فرقان کے گھر سے نکل کر عاقب نے راحمہ کو تازہ ترین حالات سے آگاہ کیا۔ بینک جاتے ہوئے گاڑی ڈرائیو کرنے کے دوران وہ آئندہ کے بارے میں فکر مند رہا۔ بینک پہنچے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ راحمہ کا پھر فون آ گیا۔ وہ فون سننے کو باہر نکل آیا۔ راحمہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے عاقب کو بتایا ماہ نور کی خالہ اپنے شوہر کے ساتھ پھر ان کے گھر آئی تھیں۔ ماہ نور کا خالو اپنے دوران کے گھر کی اس مشترکہ دیوار کے دوسری طرف جائزہ لینے آیا تھا جس کے نزدیک انہیں اپنے گھر میں کرسی رکھی ملی تھی اور جوتوں کے نشانات دکھائی دیے تھے۔

”عاقب وہ دونوں مجھ سے کھوج لگانے کی کوشش کر

”نہیں..... میں گھر نہیں جاؤں گی۔“ ماہ نور رونے لگی۔

”پھر کہاں جائے گی تو؟“ فرقان کی والدہ نے اسے گھورا۔ اس کے پاس کوئی جواب ہوتا تو ہوتی۔

”خالد سے بات کروں؟“ فرقان نے والدہ کو دیکھتے ہوئے دلی زبان سے کہا۔

”کس لیے؟“ وہ چونکیں۔

”جوہر میں اس کا فلیٹ خالی پڑا ہے..... فی الحال وہاں رہ لیں گے یہ دونوں۔“

”بغیر کسی رشتے کے؟“ والدہ نے تہوری چڑھا کر فرقان کو دیکھا۔ وہ جھینپ گیا۔ ”دیکھو بھئی۔“ فرقان کی

والدہ نے اب عاقب کی طرف اپنا روئے سخن کیا۔ ”میں بیٹیوں والی ہوں..... اس لڑکی کو دیکھ کر میرا دل اس خیال سے کانپ رہا ہے کہ آج اگر اس کی ماں زندہ ہوتی تو اس کے دل پر کیا گزرتی، بیٹی کی آب تو بہرے موٹوں سے بھی

زیادہ ہیتی ہوتی ہے..... تم اسے ادھر ادھر کہیں لے جا کر ڈالو گے تو نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہو..... شکاری کتے پھر رہے ہیں گھر سے لگی لڑکیوں کی یوسو تھکتے..... گند کو مزید گند بنانے کے بجائے اسے نہیں چھوڑو ہمارے پاس..... محفوظ تو رہے

گی اور..... جا کر اس کے گھر والوں سے بات کرو۔“

”مگر میں..... میں وہاں نہیں جاؤں گی۔“ ماہ نور نے بھراکی ہوئی آواز میں کہا۔

”چپ کر۔“ فرقان کی والدہ نے اسے ڈانٹا۔

وہ سہم سی گئی۔

”جاؤ بھئی تم جاؤ۔“ والدہ عاقب سے یوں۔

ماہ نور کو کون انجیروں سے دیکھتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

”ویسے میرا ذاتی خیال یہ ہے عاقب کہ..... تمہیں اپنے بھائیوں کو ضرور بتادینا چاہیے..... تم اکیلے نہیں منٹ سکو گے اس مسئلے سے..... دوسری بات یہ کہ اس وقت گھر جاؤ

گے تو لوگوں کی نظر میں آؤ گے..... کیونکہ یہ وقت تو کام پر جانے والوں کا گھر سے نکلنے کا وقت ہوتا ہے گھر آنے کا نہیں..... بہتر ہے گھر جانے کے بجائے معمول کے مطابق

بینک جاؤ..... ویسے بھی دو لڑکے چھٹی پر ہیں..... اور ہاں اپنا بھابی سے احتیاط کے ساتھ رابطہ میں رہو۔“

عاقب جو فرقان کی بات سننے کو ٹھنک گیا تھا اس کی بات سے متحقق نظر آیا۔ البتہ فرقان کی والدہ کچھ جربز ہوئیں

مگر چپ رہیں۔

”بھئی کرو گے؟“ فرقان نے رسماً پوچھا۔

سے کام لیا ہوتا۔“
 ماہ نور نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر بے حس و حرکت
 رہی پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فرقان کی بیوی اور بہنیں
 دروازے کی آڑ میں آن کھڑی ہوئی تھیں۔ فرقان کی نظریں
 دیوار گیر گھڑی پر تھیں۔ دفتر جانے کا وقت ہو چکا تھا۔
 ”ذرا سوچو تو۔“ فرقان کی والدہ نے عاقب کو گھورا۔
 ”اس کی جگہ تمہاری اپنی بہن ہوتی اور تمہاری اپنی جگہ کوئی
 اور لڑکا..... تو تم اس وقت کیا کرتے؟“
 عاقب نے پھر سر جھکا لیا۔

یہ ایک عاقب کا فون بجا اس نے چونک کر موبائل
 جیب سے نکالا اور کال ریسیو کی۔ ”جی بھابی!“
 کمرے میں موجود دونوں خواتین اور فرقان کی
 نظریں اسی پر تھیں۔

”اچھا..... پھر..... اوہو..... ہوں..... ہوں.....“
 راحمد کی کال سننے کے دوران عاقب کے چہرے کی کیفیت
 متغیر ہوتی رہی۔ بالآخر عاقب نے یہ کہہ کر کال منقطع
 کر دی۔ ”میں آپ کو فون کرتا ہوں بھابی۔“
 ”کیا ہوا؟“ فرقان نے پوچھا۔

”ماہ نور کی خالہ آئی تھیں ہمارے گھر..... جن کرسی پر
 چڑھ کر یہ دیوار بھلا گئی تھی وہ انہیں دیوار کے نزدیک رکھی ملی اور
 دیوار پر اس کے جوتوں کے نشان بھی تھے۔“ عاقب نے بتایا۔
 ”شہادتیں بھی مل گئیں..... اب تم تیار ہو جاؤ۔“
 فرقان نے عاقب سے کہا۔

عاقب سر اسیسر دکھائی دینے لگا۔
 ”شائش۔ ہے بھی ا!“ فرقان کی والدہ نے ماہ نور کو
 ٹیڑھی نظر سے دیکھا۔ ”ہوائی دیدہ ہے آج کل کی لڑکیوں
 کا..... دیوار بھلا گتے ٹانگ ٹوٹ جاتی۔ کہیں جاہ بے جا
 چوٹ لگ جاتی تو؟“

ماہ نور ان کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی۔
 ”تمہاری بھابی نے اس کی خالہ سے کیا کہا؟“
 فرقان نے عاقب سے پوچھا۔

”انہوں نے کہا آپ کی لڑکی ہماری طرف تو نہیں آئی۔“
 ”بیٹا! پھنس گئے ہو بری طرح..... اسے گھر سے
 لے کر نہ نکلے ہوتے تو جب خالہ آئی تھیں اسے چپ چاپ
 ان کے سپرد کر دیتے..... ان کی بھی عزت بچ جاتی، تمہاری
 بھی..... اب بھی وقت ہے..... اس سے پہلے کہ بات زیادہ
 بڑھے..... لے جاؤ اسے یہاں سے اور پہنچا دو اس کے
 گھر۔“ فرقان نے کہا۔

”امی اس کے ماں اور باپ دونوں مر چکے ہیں.....
 عاقب کے پڑوس میں اس کی خالہ اور خالورہ تھے ہیں۔ ان
 کی اپنی کوئی اولاد نہیں۔ اس کی والدہ کے انتقال کے بعد وہ
 اپنے ہاں لے آئے تھے۔“

”لڑکی! تمہیں چاہیے تھا عزت سے بیٹھتیں..... خالہ
 اور خالو تو اب تمہیں منہ بھی نہیں لگا میں گے۔“
 ”منہ کیا نہیں لگا میں گے..... یہ کہتی ہے خالو تو اسے
 مار دے گا۔“ فرقان نے ماں سے کہا۔
 ”ہونا تو یہی چاہیے۔“ وہ بولیں۔
 ماہ نور رونے لگی۔

”اب مگر مجھ کے آنسو بہانے سے کوئی قاعدہ نہیں۔“
 فرقان کی والدہ نے ماہ نور کو ڈانٹا پھر بیٹے کی طرف دیکھتے
 ہوئے کہا۔ ”تمہیں پر اسے پھنڈے میں الجھنے کی ضرورت
 نہیں..... انہیں یہاں سے چلا کر دو۔“

”پلیز آئی۔“ عاقب نے ان کے سامنے بھی دونوں
 ہاتھ جوڑ دیے پھر متوحش ہو کر فرقان کو دیکھا۔ ”پلیز! پلیز!
 میری مدد کریں..... اسے لے کر کہاں جاؤں گا۔“
 ”جہاں مرضی آئے جاؤ..... فرقان کو اس قصبے میں
 کھینچنے کی ضرورت بالکل نہیں۔“

”فرقان بھابی ا!“ عاقب نے اسے جتنی لگا ہوں سے دیکھا۔
 صوفے پر بیٹھی ماہ نور دفعتاً اوندھے منہ گر پڑی۔ وہ
 تینوں بے ساختہ چونکے۔ ڈرائنگ روم میں بچھے قالین پر
 اوندھے منہ گری ماہ نور کے پورے جسم پر ارتعاش سا طاری
 تھا۔ عاقب نے لپک کر اسے سیدھا کیا۔ اس کی آنکھیں بند
 تھیں جڑے بچھے ہوئے تھے۔

”بے ہوش ہو گئی ہے بے ہوش..... اس کے منہ پر پانی
 کے چھینٹے دو جو تازہ لگاؤ۔“ فرقان کی والدہ نے کہا۔
 عاقب ہونٹوں کی طرح انہیں دیکھنے لگا۔

”میں پانی لاتی ہوں۔“ فرقان کی والدہ دروازے
 کی طرف نکلیں۔

عاقب اور فرقان کی نظریں باہم ملیں۔ ”یار تمہیں
 یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔“ فرقان کے لہجے میں ناگواری
 تھی۔ عاقب شرمندہ ہو گیا۔ وقت وقت کی بات تھی۔ وہ
 پہلے بھی اس گھر میں آتا رہا تھا۔ چائے، کافی سے اس کی
 تواضع ہوتی رہی تھی مگر آج.....

ماہ نور کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیتے ہوئے
 فرقان کی والدہ نے خود کلاہی کی۔ ”پھوٹی عمر کی ہے۔“ پھر
 عاقب کو ڈیکھ کر بولیں۔ ”تیم بچی ہے..... تو نے ہی کچھ عقل

”ابھی دل نہیں چاہ رہا..... کر لوں گا۔“ عاقب دروازے سے نکل گیا۔

”چلو بھئی اندر چلو۔“ فرقان کی والدہ ماہ نور سے یولیس۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ فرقان کی بیوی اور بہنیں دروازے کے پاس سے ہٹ گئی تھیں۔ فرقان ڈرائنگ روم میں اکیلا رہ گیا۔ اب وہ تھا اور اس کے ضمیر کی عدالت۔

”تم ہی تھے جس نے عاقب کو اس لڑکی سے محبت کی پیٹلیں بڑھانے کی ترغیب دی تھی..... تم ہی اس کے راز دار اور صلاح کار رہے..... تم جانتے تھے کہ یہ لڑکا اپنی پھوپھی زاد سے منسوب ہے پھر بھی تم نے اس کی ایک غیر لڑکی سے دل لگی پر حوصلہ افزائی کی..... مزے لے لے کر سنتے رہے۔ وہ تو نوجوان تھا..... تم تو شادی شدہ اور دونوں کے باپ تھے..... اس کے گھر میں تو کوئی بہن نہیں تھی..... تم تو بہنوں والے تھے..... دو اب بھی بیٹھی ہیں گھر میں..... ذرا سوچو..... اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر سوچو..... تمہاری ان دو غیر شادی شدہ بہنوں میں سے کوئی..... خدا نخواستہ اس طرح کسی غیر گھر میں منہ چھپائے بیٹھی ہو..... زور رہی ہو..... کانپے ہلرے اور بے ہوش ہو جائے تو.....“

فرقان کنبھرے میں کھڑا تھا۔ اس کا ضمیر ایک ماہر وکیل کی طرح اسے اس کے جرم کا احساس دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ہاں..... میں بھی شریک جرم ہوں۔“ لڑکی کی کم عمری، اس کی خوب سوئی، اس کے چہرے سے ہویا تا تجربہ کاری، اس کا چادر میں بار بار منہ چھپا کر رونا، مسکنا اور اس کی آنکھوں میں ڈبڈبائے آنسو فرقان کو ناقابل بیان دکھ اور احساس شرمندگی سے دوچار کر رہے تھے۔ اپنا یہ دکھ وہ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

فرقان کے گھر سے نکل کر عاقب نے راحمہ کو تازہ ترین حالات سے آگاہ کیا۔ بینک جاتے ہوئے گاڑی ڈرائیو کرنے کے دوران وہ آئندہ کے بارے میں فکر مند رہا۔ بینک پہنچے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ راحمہ کا پھر فون آ گیا۔ وہ فون سننے کو باہر نکل آیا۔ راحمہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے عاقب کو بتایا ماہ نور کی والدہ اپنے شوہر کے ساتھ پھر ان کے گھر آئی تھیں۔ ماہ نور کا خالو اپنے اور ان کے گھر کی اس مشترکہ دیوار کے دوسری طرف جائزہ لینے آیا تھا جس کے نزدیک انہیں اپنے گھر میں کرسی رکھی ملی تھی اور جوتوں کے نشانات دکھائی دیے تھے۔

”عاقب وہ دونوں مجھ سے کھوج لگانے کی کوشش کر

”نہیں..... میں گھر نہیں جاؤں گی۔“ ماہ نور رونے لگی۔

”پھر کہاں جائے گی تو؟“ فرقان کی والدہ نے اسے گھورا۔ اس کے پاس کوئی جواب ہوتا تو وہ تبتی۔

”خالد سے بات کرو؟“ فرقان نے والدہ کو دیکھتے ہوئے ولی زبان سے کہا۔

”کس کیے؟“ وہ چونکیں۔

”جوہر میں اس کا فلیٹ خالی پڑا ہے..... فی الحال وہاں رہ لیں گے یہ دونوں۔“

”بغیر کسی رشتے کے!“ والدہ نے تیوری چڑھا کر فرقان کو دیکھا۔ وہ جھینپ گیا۔ ”دیکھو بھئی۔“ فرقان کی

والدہ نے اب عاقب کی طرف اپنا روئے سخن کیا۔ ”میں بیٹیوں والی ہوں..... اس لڑکی کو دیکھ کر میرا دل اس خیال سے کانپ رہا ہے کہ آج اگر اس کی ماں زندہ ہوتی تو اس کے دل پر کیا گزرتی، بیٹی کی آب تو ہیرے موتیوں سے بھی

زیادہ قیمتی ہوتی ہے..... تم اسے ادھر ادھر کہیں لے جا کر ڈالو گے تو نہ جانے اس کے ساتھ کیا ہو..... شکاری کہتے پھر رہے ہیں گھر سے نکلی لڑکیوں کی بوسہ جھٹکتے..... گند کو مزید گند بنانے کے بجائے اسے بہنیں چھوڑ دو ہمارے پاس..... محفوظ طور ہے

گی اور..... جا کر اس کے گھر والوں سے بات کرو۔“

”مگر میں..... میں وہاں نہیں جاؤں گی۔“ ماہ نور نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”چپ کر۔“ فرقان کی والدہ نے اسے ڈانٹا۔ وہ سہم سی گئی۔

”جاؤ بھئی تم جاؤ۔“ والدہ عاقب سے یولیس۔

ماہ نور کو کون آنکھیں سوں سے دیکھتے ہوئے وہ دروازے کی طرف بڑھا۔

”ویسے میرا ذاتی خیال یہ ہے عاقب کہ..... تمہیں اپنے بھائیوں کو ضرور بتا دینا چاہیے..... تم اکیلے نہیں منٹ سکو گے اس مسئلے سے..... دوسری بات یہ کہ اس وقت گھر جاؤ گے تو لوگوں کی نظر میں آؤ گے..... کیونکہ یہ وقت تو کام پر

جانے والوں کا گھر سے نکلنے کا وقت ہوتا ہے گھر آنے کا نہیں..... بہتر ہے گھر جانے کے بجائے معمول کے مطابق بینک جاؤ..... ویسے بھی دو لڑکے چھٹی پر ہیں..... اور ہاں

اپنی بھائی سے احتیاط کے ساتھ رابطے میں رہو۔“

عاقب جو فرقان کی بات سننے کو خشک گیا تھا اس کی بات سے متفق نظر آیا۔ البتہ فرقان کی والدہ کچھ جربز ہوئیں۔

”خاکا کرو گے؟“ فرقان نے رسما پوچھا۔

بچ بڑیک کے دوران عاقب نے بینک سے باہر نکل کر راحمہ کو خود فون کیا۔ فرقان جو کام کے دوران ایک دو مرتبہ ضرور اس کی طرف آکر اس سے بات چیت کر لیا کرتا تھا اس روز ایک مرتبہ بھی اس کی سیٹ کی طرف نہیں آیا تھا۔ راحمہ نے اسے بتایا ماہ نور کی خالہ کے گھر میں پراسراری خاموشی تھی۔ گھر کا رخ دوسری طرف ہونے کے باعث کچھ پتہ نہ چل رہا تھا کہ گھر میں کیا ہو رہا تھا۔

”چھٹی کے بعد گھر ہی آؤ گے نا؟“ راحمہ نے اس سے پوچھا۔

”کہہ نہیں سکتا۔“

”کیا مطلب کہہ نہیں سکتے۔“ راحمہ چونکی۔ ”میں اکیلی رہوں گی کیا!“

”آپ اپنی امی کے ہاں چلی جائیں۔“

”بہت اچھے! ادھر تم گھر سے غائب ادھر میں امی کے ہاں..... انہیں تو پھر پکا شک ہو جائے گا۔“

”آ جاؤں گا..... فکر نہ کریں۔“

بہ پہر کو ماہ نور کے خالو اور ماموں کے ساتھ پولیس کے تفتیشی اہلکار دیوار کے دوسری طرف گھر کا اسی طرح جائزہ لینے آگئے جیسے صبح ماہ نور کے خالو اور خالہ لے کر گئے تھے۔ تفتیشی اہلکاروں نے راحمہ سے بھی پوچھ بچھ کی اور گھر میں رہنے والے دیگر افراد کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ ان کے جانے ہی راحمہ نے عاقب کو فون کیا۔

”انہوں نے تمہارے بینک کا نام پتا بھی پوچھا مجھ سے۔“ راحمہ نے بتایا۔

”بھائی! اب تو میرا گھر آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا..... رات کو پولیس آگئی اور مجھے اٹھا کر لے گئی تو.....“

عاقب کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

”تمہارے بھائی کو بتانا ضروری ہو گیا ہے۔“ راحمہ نے کہا۔

”نہیں بھائی ابھی نہ بتائیں۔“

”تو پھر کب بتاؤں؟“ راحمہ تنک کر بولی۔

”ہو سکتا ہے معاملہ سٹبل ہو جائے۔“

”پھر بھی..... عاقب کو پتا تو چلے گا نا کبھی نہ کبھی..... وہ بگڑیں گے مجھ پر کہ اتنی بڑی بات تم مجھ سے چھپائیں..... لڑکی اپنے گھر سے رات کو ہمارے گھر آگئی۔ رات اس نے تمہارے کمرے میں گزاری..... اس کے گھر والوں کو پتا چل گیا کہ وہ درمیان کی دیوار سے ہمارے گھر میں کودی ہے..... پولیس نے آکر پوچھ بچھ کر لی ہے..... اب کیا میں

رہے تھے..... خالہ کہنے لگیں۔ آپ کو دیوار پر سے کسی کے کودنے کی آواز نہیں آئی..... میں نے کہا مجھے کیا پتا..... میں تو سوئی ہوئی تھی نیند میں کس کو ہوش رہتا ہے۔“

”پھر؟“

”پھر انہوں نے تمہارا پوچھا..... میں نے کہا وہ تو اپنے بینک چلا گیا..... عاقب انہوں نے لان سے گیٹ تک چھا چھا دیکھا..... پوچھ رہے تھے گیٹ آپ کو صبح بند ملایا کھلا۔“

”پھر آپ نے کیا کہا؟“

”میں نے کہا میں نے نوٹ نہیں کیا۔“

”اوہ بھائی کہہ دینا تھا کھلا ملا..... وہ سمجھتے ماہ نور نے فرار کے لیے ہمارا گیٹ استعمال کیا ہے۔“

”خیر میں نے تو وہی کہا جو تمہیں بتایا ہے..... ویسے ایک بات ہے۔“

”کیا؟“ عاقب کے لہجے میں پتائی تھی۔

”مجھے لگتا ہے انہیں یہ علم نہیں کہ تمہاری اور ان کی لڑکی کی فون پر بات چیت رات ہی تھی۔“

”بھائی! تھوڑے دن ہی تو رہی اور..... وہ اپنے کمرے میں چھپ کر بات کرتی تھی..... پھر نمبر بھی ڈیلیٹ کر دیتی تھی۔“

”ہے حرفوں کی بنی۔“ راحمہ نے کڑوے کیلے لہجے میں کہا۔ عاقب کو حیرت ہوئی۔ راحمہ تو اس کی تعریفوں کے پل باندرھے رہتی تھی اس کے سامنے۔ ”اللہ عاقب اتنی پیاری لڑکی ہے کہ میرا بس چلے تو اسے اپنے گھر لے آؤں۔“ اور اب وہی کہہ رہی تھی کہ حرفوں کی بنی ہے۔

”بھائی..... مجھے بتاتی رہے گا کیا ہو رہا ہے۔“ عاقب نے کہا۔

”ہاں ہاں..... خالہ کہہ رہی تھیں..... کچھ ویر دیکھتے ہیں..... پتا نہ چلا تو خاندان والوں کو بھی بتانا پڑے گا اور ہو سکتا ہے پولیس کو بھی رپورٹ کرائیں گے۔“

”آپ پریشان نہ ہوں۔“ عاقب نے راحمہ کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

”پریشان کیسے نہ ہوں..... پولیس تو جب تفتیش کرنے پر آئی ہے تو عورت دیکھتی ہے نہ مرد..... یہ تم نے کیا کرو یا عاقب..... سوچ تو لیتے۔“

عاقب کو اپنا دل ڈوبتا اور ٹانگیں بے جان ہوتی لگ

☆☆☆

READING
Section

”کھانا کھاؤ گے؟“

”نہیں..... شکر یہ..... بس چلتا ہوں۔“

”کیا گھر جاؤ گے؟“

”نہیں..... آج تو نہیں..... گاڑی کسی پبلک پلیس پر

کھڑی کروں گا اور اسی میں سو جاؤں گا..... اول تو نیند کے آتی ہے۔“

”بھائی؟“

”وہ سوچ کر لیں گی۔“

”والدہ کی ڈانٹ ڈپٹ کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں تم سے

کہتا نہیں سو جاؤ۔“

”نہیں نہیں ٹھیک ہے..... فرقان بھائی مردوں کا

کیا..... کہیں بھی پڑ سکتے ہیں..... ماہ لور کا مسئلہ تھا..... آپ

نے اسے اپنے گھر میں رکھ کر بڑی مہربانی کی۔“

”والدہ کو دعائیں دو۔“

”بہت دعائیں فرقان بھائی۔“

”احتیاطاً کل تم بینک نہ آؤ تو بہتر ہے۔“

”ہاں جی میں بھی سوچ رہا تھا..... پولیس نے بھائی

سے مجھ سمیت گھر کے تمام لوگوں کے بارے میں تو

انفارمیشن لے لی ہے..... پولیس بینک آگئی اور مجھے لے گئی

تو بدنامی ہوگی۔“

”بیٹے مجھے تو تمہاری نوکری بھی اب خطرے میں لگ

رہی ہے۔“

”یہاں زندگی خطرے میں لگ رہی ہے فرقان بھائی۔“

”مخاطب ہو۔“

”چلتا ہوں۔“

”اوکے۔“

☆☆☆

رات گیارہ بجے تک وہ راحمہ سے فون پر رابطے میں

رہا۔ پھر ایک کاروباری مرکز کی پارکنگ لائٹ میں جگہ تاک

کر گاڑی کھڑی کی اور پچھلی سیٹ پر لیٹ گیا۔ نیند آنکھوں

سے دور رہی مگر..... سوئی پر بھی آجاتی ہے کے مصداق بالآخر

وہ سو ہی گیا..... رات کو دو سو اوو بجے کا وقت تھا جب اس

کے موبائل کی آواز نے اسے نیند سے جگا یا۔ اس نے نمبر

دیکھا۔ راحمہ کا نمبر تھا۔

”جی بھائی۔“

”عاقب! پولیس آئی تھی۔“ راحمہ نے وہی وہی آواز

میں بتایا۔

”اچھا!“ وہ ہڑبڑا کر سیدھا ہو بیٹھا۔

اس بات کا اظہار کروں کہ تمہارے بجائے پولیس مجھے

تھانے لے جا کر بٹھا دے اور تب تمہارے بھائی کو اطلاع

ہو اور وہ مجھے چمڑانے آئیں..... نہ بابا نہ تمہاری وجہ سے

میں اپنی عزت اور اپنے گھر کو داؤ پر نہیں لگا سکتی..... جانتے

ہونا کتنے غمے والے ہیں تمہارے بھائی۔“

”جانتا ہوں بھائی۔“ اس نے مردہ سی آواز میں کہا۔

بینک سے چھٹی کے بعد وہ پریشانی کے عالم میں بہت

ویر بلا مقصد ادھر ادھر گھومتا پھرا۔ فرقان کے ہاں جانے کی

ہمت نہ ہو رہی تھی۔ راحمہ نے اس دوران دو تین مرتبہ فون

کیا۔ اس نے ثاقب کو خبر دے دی تھی۔ وہ نہایت پریشان

ہوا تھا۔

”بھائی نے کیا کہا آپ سے؟“

”کہہ رہے تھے امیر جنسی کی بنیاد پر چھٹی لینے کی

کوشش کرتا ہوں اور پاکستان آتا ہوں..... عاطف اور

رخشندہ تو کل پہنچ رہے ہیں۔“

”اچانک!“ عاقب چونکا۔

”اچانک نہیں..... عاطف کو ثاقب نے فون کیا تھا۔

وہ چھٹیوں پر ہے۔ اسے چھٹی لینے کا کوئی مسئلہ نہیں تھا لہذا وہ

اور رخشندہ تو کل آ رہے ہیں۔“

عاقب کو اس خبر سے حوصلہ بھی ملا مگر اس خیال سے پریشانی

بھی ہوئی کہ بھائی آکر اس کا نہ جانے کیا حسرت کریں گے۔

رات ہونے پر وہ فرقان کے گھر پہنچا اور اسے

عاطف کی چھٹی اور ثاقب کی ممکنہ آمد کی اطلاع دی۔

”چلو اچھا ہوا..... انہیں بتانا ضروری بھی تھا..... وہ

آئیں گے تو معاملہ کچھ نہ کچھ سنبھال ہی لیں گے۔“

”ماہ لور ٹھیک ہے؟“ عاقب نے وہی زبان سے پوچھا۔

”ہاں..... ای اور بہنوں کے کمرے میں ہی

ہے..... ای بتا رہی تھیں بہت سادہ لڑکی ہے..... خالو اور

ماموں کے ڈر سے اس کا دم لگلا ہوا ہے..... کہتی ہے میں گھر

گئی تو وہ مجھے مارویں گے..... خاندان میں اس سے پہلے بھی

ایک لڑکی کو پسند کی شادی پر مارا جا چکا ہے۔“

”مجھے نہیں بتایا اس نے۔“

”تم نے اسے دوسری ہی باتوں میں جو الجھائے رکھا

ہوگا۔“

”قلطی ہوگی فرقان بھائی۔“

”مگر دیکھو اب پیچھے مت ہٹنا..... اس قلطی کو اب

READING Section

اگلے دن عاطف اور رخشندہ کراچی پہنچ گئے۔ جاوید اختر کے گھر کی چھت جہاں شاذ ہی کوئی فرد نظر آیا کرتا تھا چہل پہل کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ ایک آٹا ایک جاتا اور ہر آتے جاتے کی نظر ادھر ہی ہوتی۔ ماہ نور کی الماری سے ملنے والے ویلنٹائن کارڈ اور عاقب کے گھر سے غائب ہونے اور بینک سے غیر حاضری نے ماہ نور کے گھر والوں کے شک کو یقین میں بدل دیا تھا۔ انہوں نے ماہ نور کی گمشدگی کیس میں عاقب کو ملزم نامزد کر دیا تھا۔

جاوید اختر زمان کی شہر کے کاروباری حلقے میں اچھی ساکھ تھی۔ اپنے علاقے کے حوالے سے سیاسی اثر و رسوخ بھی تھا۔ پولیس کے اعلیٰ افسران تک بھی رسائی تھی۔ لڑکی کی بازیابی عزت و وقار کا معاملہ تھا۔ دوسرے درجے، سنیے ہر طرح سے وہ ماہ نور کی جلد از جلد بازیابی کی کوشش کر رہے تھے۔ جاوید اختر کے اثر و رسوخ کی بنا پر تفتیشی اہلکاروں کی کارروائی گھنٹوں میں کر رہے تھے۔ جہاں عام آدمی اپنے ساتھ ہونے والے کسی ظلم کی پولیس کو فریاد کرنے جلتے اور خود ہی مجرم بنا کر بٹھالیا جائے وہاں ماہ نور کی بازیابی کے لیے پولیس کا دوسرے ہی دن عاقب کے بینک پہنچ جانا جاوید اختر کے اثر و رسوخ کی ہی دلیل تھی۔

جاوید اختر کے گھر سے زبانی کلامی دھمکیاں بھی ملنا شروع ہو چکی تھیں۔ راحمہ گھر میں اکیلی ہوتی تو شاید گھر چھوڑ کر ہی چلی گئی ہوتی مگر عاطف اور رخشندہ کے آجانے سے اس کو حوصلہ مل گیا تھا۔ ثاقب بھی ایمر جنسی میں چھٹی لے کر پہلی دستیاب پرواز سے وطن آنے کے لیے بے چین بیٹھا تھا۔

عاطف نے آتے ہی راحمہ سے واقعے کی تفصیلات حاصل کیں۔ سم ٹریکنگ کے خوف سے عاقب نے پرانی سم کی جگہ نئی سم لگالی تھی۔ راحمہ سے نیا نمبر لے کر عاطف نے عاقب کو فون کیا تو اس نے کال ریسیو نہیں کی۔ راحمہ نے اپنے نمبر سے اس کی بات کرائی۔

”کہاں ہو؟“ عاطف کے لہجے سے ناراضگی عیاں تھی۔

”یہیں ہوں بھائی۔“ عاقب مردہ سی آواز میں بولا۔

”یہیں کے بچے ایہ کیا کیا ہے تو نے۔“ ہمیشہ نہایت میٹھے لہجے میں بات کرنے والا بھائی انتہائی حقارت سے بات کر رہا تھا۔ وہ چنپ رہا۔ کہنے کو تھا ہی کیا۔ ”فرقان بھائی کا نمبر دو مجھے۔“

”ادکے۔“

”پھر کیا..... میں نے ای کو بلا لیا تھا..... انہیں مجبوراً سب کچھ بتانا پڑا تھا..... انہوں نے مجھ سے کہا کہہ دو وہ گھر میں نہیں ہے۔“

”پھر؟“

”پھر کیا..... اب تو ماہ نور کے گھر والوں کا بھی اور پولیس کا بھی تم پر شک پکا ہے..... مجھے والوں کو بھی پتا چل گیا..... بدنامی ہے عاقب..... تم نے کسی کو منہ دکھانے کا نہیں چھوڑا ہمیں۔“

”یہ باتیں بعد میں کر لیجئے گا..... یہ بتائیں پھر کیا ہوا؟“

”ہونا کیا تھا..... پولیس کی موبائل وین آئی تھی..... جے جے پولیس والے لیکن مجھے یقین ہے پھر آئیں گے..... ہو سکتا ہے کل تمہارے بینک بھی جائیں۔“

”عاشق کو گھر کے اندر ہی رکھیے گا بھائی۔“

”مجھے اسی کا ڈر تھا... آپا ای کو میرے پاس چھوڑنے آئیں تو میں نے عاشق کو ان کے ساتھ ہی بھیج دیا..... ایک تو اس خیال سے کہ بچہ ہے کچھ اٹنی سیدھی نہ بول دے کسی سے..... دوسرے ماہ نور کے گھر والوں کا کیا اعتبار میرے بچے ہی کو کوئی نقصان پہنچا دیں..... تم نے اچھا نہیں کیا عاقب۔“

”بھائی اب تو جو ہونا تھا ہو گیا۔“

”آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔“

خالد کے گھر میں ماہ نور کے کمرے سے عاقب کے خلاف ثبوت بھی مل گیا۔ ویلنٹائن ڈے پر عاقب نے اسے گھر کی اسی دیوار پر سے جسے پھلانگ کر وہ اس کے پاس آئی تھی ایک ٹیڈی بیئر اور اس کے ساتھ گلاب کے پھول کی ایک مصنوعی ٹوٹی وی تھی۔ دونوں چیزوں کو اس نے اپنی الماری میں پکڑوں کے نیچے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ کمرے کی تلاشی لی گئی تو یہ دونوں چیزیں ہاتھ لگیں۔ ٹیڈی بیئر کے گلے میں جھولتے چھوٹے سے کارڈ پر لکھا تھا۔ ”ٹو مائی ٹو ماہ نور..... فرام عاقب۔“

پولیس کو عاقب کی تلاش میں اس کے بینک پر چھاپا مارنے کے لیے یہ ثبوت کافی تھا مگر عاقب بینک سے غیر حاضر تھا۔ فیجرت نے پولیس کے استفسار پر فرقان سے پوچھا۔ ”عاقب کے بارے میں کوئی خبر ہے فرقان صاحب؟“

”جی نہیں۔“ فرقان نے سپاٹ چہرے کے ساتھ

مصیبت کی اس گھڑی میں عاطف کو فرقان ہی سے رجوع کرنا تھا۔ اپنے خاندان والوں کا تو اسے پتا تھا کہ کسی میں اتنی سمجھ تھی کہ اس سرپڑی سے نکلنے کی کوئی راہ سمجھا سکتا۔ ثاقب نے بھی فون پر اسے یہی مشورہ دیا تھا کہ فرقان سے رابطہ کرے۔

فرقان پیسے کے اعتبار سے تو بیکار تھا مگر سیاست اس کا شوق، دلچسپی اور شاید حالات کا تقاضا بھی تھا۔ ملکی سیاست پڑھے لکھے، دہنگ اور مضبوط کردار کے حامل افراد کی طلب گار تھی۔ فرقان اپنی خاندانی ذمہ داریوں اور پہلے تعلیم پھر روزی، روٹی کے چکر میں سیاست کو اپنا اوڑھنا چھوٹا تو نہ بنا سکا تاہم ایک سیاسی جماعت سے اس کی ذہنی وابستگی ضرور ہوئی تھی۔ اسے بارہا اس جماعت میں سیاسی عہدوں کی پیشکش ہوئی مگر اس نے عہدہ لینے کے بجائے بلا عہدہ کام کرنا زیادہ پسند کیا۔ وہ خود کو جماعت کا "اوتی کارکن" کہا کرتا تھا۔ مگر جماعت کے بڑے بھی اس کی سیاسی پالغ نظری کے معترف تھے۔ تھا تو وہ جوان مگر اس کی "اپروچ" جماعت کے بزرگوں کو بھی حیران کر دیتی تھی۔ جماعت میں جب کوئی بحران پیدا ہوتا وہ اس بحران کا حل نکالنے والوں کے اجلاس میں ضرور بلایا جاتا۔ اپنا کام کر کے وہ خاموشی سے منظر سے نکل جاتا۔ والدہ کی خواہش و ہدایت اور اپنی خاندانی ذمہ داریوں کے باعث فرقان علی کو اپنا "ایکسپوژر" یا نگاہوں میں آنا پسند نہیں تھا۔ گھر میں ایک نہیں کئی عورتیں اسی کو اپنا کھینچون ہار سمجھتی تھیں۔ نہ وہ انہیں مایوس کرنا چاہتا تھا نہ کسی آزمائش میں ڈالنا چاہتا تھا مگر اس کا کیا علاج کہ پھر بھی وہ لوگوں کی نگاہوں میں تھا۔ اپنے ہی نہیں مخالفین بھی اسے جانتے تھے اور یہ پہچان اسے لوگوں سے تعلقات اور گھر سے باہر آمدورفت میں محتاط رہنے کا پابند کرتی تھی مگر ثاقب کے گھرانے سے اس کے تعلقات ہر احتیاط سے ماورا تھے۔ ثاقب اس کا دوست تھا۔ عاطف اور عاقب کو وہ اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح سمجھتا تھا بلکہ عاقب تو اس کی نظر میں بچہ تھا۔ بینک میں اسے ملازم رکھوانے میں اس کی کوشش بھی شامل تھی۔ ہر انسان کی طرح فرقان بھی اپنی ذات میں متضاد صفات سے ماورا نہ تھا۔ عاقب کو بچہ سمجھتا مگر کبھی کبھی اس سے ہم عمروں کی طرح راز و نیاز کرنے لگتا۔ عاقب کو ماہ نور سے پیشگی بڑھانے کی صلاح اس کی انہی متضاد صفات کا شاخسانہ تھا اور اپنی اس دلچسپی کے ادا کرنے کے لیے وہ اس مسئلے کے حل میں اپنا حصہ

عاطف کا فون آئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ عاقب کا فون آ گیا۔ "فرقان بھائی عاطف بھائی نے آپ کا نمبر لیا تھا مجھ سے، آپ کی بات ہوئی؟"

"ہاں..... وہ اوپر ہی آرہا ہے۔"
"فرقان بھائی انہیں ذرا ٹھنڈا کرنے کی کوشش کیجیے گا..... بہت غصے میں لگ رہے تھے وہ۔"
"تمہیں تو الٹا لٹکا دینا چاہیے..... سارے گھر کو پریشان کر کے رکھا ہوا ہے تم نے۔"
"بس اس وقفہ معافی و لوا دیں..... آئندہ میرے باپ کی بھی توبہ۔"

"معافی ملنا آسان نہیں ہے..... تمہارے گھر والے تو شاید معاف کر دیں مگر لڑکی کے گھر والے اور پولیس جیسے جتنے گی تمہیں۔"

عاطف آیا تو دونوں بہت ویر بیٹھے اس معاملے کی ہر اونچ نیچ پر غور کرتے رہے۔ اس دوران عاطف کے اہم پر فرقان نے فون کر کے عاقب کو بھی بلالیا۔ وہ آیا تو سر جھکا ہوا تھا نظریں نیچی تھیں۔ عاطف نے اسے زہر خند لگا ہوں سے دیکھا اور ترشی سے بولا۔ "مٹی تو چاہتا ہے تمہیں شوٹ کر دیا جائے۔"

اس کی ٹھوڑی سینے سے جا لگی۔
"سر جھکانے سے کام نہیں چلے گا..... پرسوں ثاقب بھائی بھی پہنچ رہے ہیں۔ وہ دیکھنا کیا حشر کریں گے تمہارا۔"
"وہ تو جو حشر کرے سو کرے۔ خدا آخواستہ یہ پولیس کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ جو حشر کریں گے اس کا یہ تصور بھی نہیں کر سکتا..... لڑکی کا معاملہ ہے مذاق بات نہیں..... اور ابھی تو وہ اپنے گھر واپس جانے سے انکار کر رہی ہے۔ اگر کہیں اس نے گھر واپس جانے کا ارادہ کر لیا تو لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں..... لڑکی کے اغوا کا مقدمہ بنے گا اور یہ سیدھا اندر۔"
فرقان نے کہا۔

"سن لیا!" عاطف نے اسے گھورا۔ وہ شرمندہ دکھائی دینے لگا۔ "یہ رہ کہاں رہا ہے؟" عاطف نے فرقان کو دیکھا۔

"پوچھ لو۔" فرقان نے کہا۔
"ہاں بھئی کہاں.....؟"
وہ حنہ بذب دکھائی دینے لگا۔
"جو گھر کا نہیں رہتا وہ کہیں کا بھی نہیں رہتا عاطف۔"
فرقان نے کہا۔

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے..... اور گھر کا وہی نہیں

”اگر یہ بات ہے تو پھر تم نے رپورٹ کیوں نہیں کرائی ابھی تک؟“

”ملاش کر رہے ہیں ہم..... خدا نخواستہ نہ ملا تو رپورٹ ہی کرائیں گے۔“

”اسے حاضر کرو تھانے میں۔“

”کہاں سے حاضر کریں؟“

”کہیں سے بھی۔“

ثاقب آیا تو عاطف اسے ساتھ لے کر بڑی رازداری سے فرقان کے پاس پہنچا اور تینوں میں خاصی دیر گفتگو رہی۔ فرقان نے کہا۔ ”اب بچاؤ کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔“

”وہ کیا؟“

”ان دونوں کا نکاح کر دیا جائے اور لڑکی یہ بیان دے دے کہ وہ بالغ ہے اپنی مرضی سے آئی ہے اور اس نے اپنی پسند سے عاقب سے شادی کی ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے فرقان..... عاقب کی مانگ پیہو کے گھر میں ہے وہ لوگ شادی کی تیاری کر رہے ہیں۔“

”سوچ لو..... میں نے تو وہ صلاح دی ہے جس سے عاقب کی بچت ہو سکتی ہے..... اور تم سب بھی کسی بڑی پریشانی سے بچ سکتے ہو۔“

”گھر والوں سے شورہ کر لیا جائے۔“ ثاقب نے کہا۔

”مجھے جیسے معلوم نہیں کہ گھر میں کون ہے..... دو خواتین بے چاری جنہیں قانونی موٹو کاغذوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ جو تم کہو گے اسے آتما صدقاً کہیں گی۔“

”اس کینے سے تو پوچھنا پڑے گا کہ وہ راضی ہے یا نہیں۔“ ثاقب نے غصے سے کہا۔

”اسے راضی ہونا پڑے گا میرے بھائی اور یہ کام فوراً کرنے والا ہے۔“

”لڑکی راضی نہ ہوئی تو؟“

”یہی بات تو عاقب کے حق میں جا رہی ہے کہ لڑکی کہتی ہے وہ شادی کرے گی تو صرف عاقب سے۔“

”تم سے کس نے کہا؟“

”گھر کی خواتین سے وہ خاصی بے تکلف ہو گئی ہے۔“

”بلاؤ اس خبیث کو۔“ ثاقب نے عاطف سے کہا۔

عاطف نے فرقان کو دیکھا۔ ”فرقان بھائی آپ فون کریں۔“

”میں کیے لیتا ہوں۔“

عاقب آیا تو اسی طرح سر جھکائے اور شرمندہ شرمندہ

رہتا جیسے گھر کی عزت کا پاس نہیں ہوتا۔ ”عاطف کے لیے میں کئی تھی۔“

☆☆☆

اگلے دن تفتیشی افسر پھر آیا اور اس نے عاطف سے دھمکی آمیز لہجے میں بات کی۔ ”شام تک اگر تمہارا بھائی تھانے نہ پہنچا تو تمہیں اور تمہارے گھر کی عورتوں اور بچوں کو اٹھا کر لے جاؤں گا..... بند کر دوں گا تھانے میں۔“

”جرم بھائی نے کیا ہے اور پتا نہیں کیا بھی ہے کہ نہیں اور دھمکی آپ مجھے اور میرے گھر کی عورتوں اور بچوں کو اٹھا کر لے جانے کی دے رہے ہیں۔ کیا عجیب بات ہے انسپکٹر صاحب۔“ عاطف بگڑ کر بولا۔

”اتنی عجیب بھی نہیں..... جب تم اور تمہارے گھر کی عورتیں تھانے میں ہوں گی تو وہ کیا اس کا باب بھی آئے گا۔“

”پلیز!“ عاطف نے بدزبانی پر ٹوکا۔ ”بھائی کی کشتہ گردی سے ہم لوگ خو پریشان ہیں۔“

”آجائے گا..... پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..... جب اسے پتا چلے گا کہ گھر والے لاک اپ میں ہیں تو وہ سامنے آجائے گا..... مگر ہمیں لڑکی بھی چاہیے..... شرم نہیں آتی دوسروں کی عزت پر ڈاکا ڈالتے۔“ تفتیشی افسر نے اہانت سے کہا پھر تیوری چڑھائی۔ ”لڑکی کی بازیابی ضروری ہے۔“

”آپ پورا گھر دیکھ سکتے ہیں۔“ عاطف نے کہا۔

”اوائے اب یہ خوف سمجھتے ہو ہمیں..... لڑکی کوئی تم نے اس گھر میں رکھی ہوگی۔“

”تم سے آپ کا مطلب؟“ اب عاطف نے تیور بدلا۔

”تمہارا بھائی۔“ انسپکٹر نے اپنی بھوس اچکا کی۔

”مطلوب آپ کو میرا بھائی ہے اور غصہ آپ مجھے دکھا رہے ہیں۔“

”اس سے کہو شام تک تھانے پہنچ جائے ورنہ..... خیر نہیں۔“ تفتیشی افسر نے آنکھیں دکھائیں۔ عاطف نے خاموش رہنے میں عافیت سمجھی۔

شام ہو گئی۔ رات بھی خیریت سے گزری۔ اگلے روز تفتیشی افسر پھر آدھکا۔ ”آپ سے تو وہ ضرور ہوگا رابطے میں۔“ اس نے عاطف کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔

”جی نہیں..... میں تو خود اس کے غائب ہونے کی خبر سن کر باہر سے آیا ہوں..... آپ مجھے مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں۔ میں کسے الزام دوں..... یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میرا

بھائی ہی کئی واردات کا شکار ہوا ہو۔“

”اوجھلے کی نیت کیوں رکھی جائے۔“ فرقان بولا۔
عاطف اس کی بات پر جھینپ گیا۔ ”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔“ اس نے کہا۔
”میرا بھی وہ مطلب نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔۔۔۔۔ لڑکی کا وکیل بنا ہوں۔۔۔۔۔ اس کے حق کا تحفظ میری ذمہ داری ہے۔۔۔۔۔ یتیم بنی ہے۔۔۔۔۔ اس وقت اس کا اپنا کوئی نہیں۔۔۔۔۔ نہ تم لوگوں نے اسے عروسی جوڑا دیا ہے نہ کوئی زیور۔۔۔۔۔ مہر دولا کھ سے کم نہیں ہوگا۔“

ثاقب اور عاطف نے ایک دوسرے کو دیکھا اور عاقب نے ان دونوں کا ٹکھیوں سے جائزہ لیا۔ گھر کے اندر فرقان کے گھر کی خواتین ماہ نور کو اوڑھانے کے لیے سرخ رنگ کا کوئی دوپٹا تلاش کر رہی تھیں۔ مہر دولا کھر وپٹا ہی لکھا گیا۔
عاقب اور ماہ نور کا نکاح ہو گیا۔

نکاح کے بعد ثاقب اور عاطف یوں گھر واپس ہوئے جیسے میت کی تدفین کر کے آنے والے قبرستان سے لوٹا کرتے ہیں۔ گاڑی عاقب کے پاس تھی۔ ثاقب اور عاطف نے گاڑی اسی کے پاس رہنے دینا مناسب سمجھا۔ فرقان ان دونوں کو اپنی گاڑی میں گھر پہنچانے آیا۔ ثاقب نے اسے اصرار کر کے کھانے کے لیے روک لیا۔ عاقب اور ماہ نور کے نکاح کی خبر نے راحمہ اور رخشندہ دونوں کو ششدر کر دیا۔

”پھوپھو کو کیا جواب دیں گے؟“ رخشندہ نے عاطف سے کہا۔

”کیا کرتے مجبوری تھی۔“ عاطف کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔

راحمہ دل ہی دل میں خوش تھی۔ اس کے جذبہ حسد کو تسکین ملی تھی۔ ماہ نور سے عاقب کے نکاح کے بعد نسرین کے اس گھر میں بیاہ کر آنے کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ ورنہ وہ بھی اس گھر میں آکر رخشندہ ہی کی طرح اپنی اوقات بھول جاتی۔

کھانے کے بعد ثاقب نے راحمہ سے قہوہ بنانے کو کہا اور تینوں مردان میں آ بیٹھے۔ عاطف کو بیک خیال آیا۔ اس کا موبائل فون بیلنس ختم ہونے کو تھا۔ فرقان کی گاڑی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ نزدیکی مارکیٹ سے فون کارڈ لینے چلا گیا۔ ابھی واپس نہ لوٹا تھا کہ ماہ نور کے گھر والوں کی خبری پر پولیس کا چھاپا پڑا اور ثاقب کے ساتھ پولیس فرقان کو بھی لے گئی۔ عاطف گھر لوٹا تو راحمہ اور رخشندہ سراپیمہ گیٹ کے باہر کھڑی ملیں۔ آئندہ خطرے کے پیش نظر عاطف نے ان دونوں اور عاشر کو لے کر فوراً وہاں سے نکل کر کہیں اور پناہ

سا۔ ثاقب نے اسے جی بھر کر صلواتیں ستائیں۔ وہ ایک لفظ نہیں بولا۔

”انلو کے پٹھے اجیل کی ہوا نہیں کھانا چاہتا تو تیرا اس سے نکاح کرنا پڑے گا میں۔“ ثاقب نے کہا۔

عاقب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
”اس سے تمہارا سو فیصد تو نہیں لیکن بڑی حد تک بچاؤ ہو جائے گا۔“ فرقان بولا۔

”بتا کیا مرضی ہے تیری؟“ ثاقب نے اس سے جواب کے لیے تقاضا کیا۔ وہ چپ رہا۔ ایک ذرا سی بھولنے سے قعر مذلت میں دکھیل دیا تھا۔ بیٹھے بول بولنے والی زبانیں اس سے تو تڑاق کر رہی تھیں۔

ثاقب نے عاطف کو اشارہ دیا کہ وہ اس سے پوچھے۔ ”بول بھی کیا مرضی ہے تیری؟“

”بتاؤ عاقب۔“ فرقان نے کہا۔

”آپ لوگوں کی مرضی۔“ وہ دبی زبان سے بولا۔

”ہماری مرضی کا تو نے اس وقت تو نہیں سوچا ہوگا جب لڑکی تیرے پاس آئی تھی۔“ ثاقب نے غصے سے کہا۔

”آگے کی سوچو۔“ فرقان نے ثاقب کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے فرقان۔۔۔۔۔ تم نے جو سوچا ٹھیک ہی سوچا ہے۔ لڑکی سے بھی پوچھ لو۔“

فرقان اٹھا اور اس نے اندر جا کر والدہ سے بات کی۔

نکاح خواں کا بندوبست فرقان ہی نے کیا۔ ”نکاح نامے کی خانہ پری کی جانے لگی تو مہر کی رقم کے بارے میں ثاقب، عاطف، عاقب اور فرقان نے ایک طرف ہو کر آپس میں صلاح مشورہ کیا۔ عاقب نے بھائیوں پر چھوڑا اور دونوں بھائیوں نے اتفاق رائے سے کہا۔ ”شرعی مہر۔“

”یعنی؟“ فرقان نے پوچھا۔

”ساڑھے بیس روپے۔“

فرقان نے اختلاف کیا۔ ”مہر شرعی سے مراد ہے وہ مہر جو شرع محمدی کے مطابق مرد کی حیثیت دیکھ کر مقرر کیا جائے۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے مہر دولا کھ سے کم نہ رکھا جائے۔“

”دو لاکھ!“ ثاقب نے آنکھیں پھاڑیں۔ ”اس بھگوڑی کی اوقات ہے اتنی۔“

”وہ تمہارے گھر کی عزت بننے جا رہی ہے ثاقب۔“

فرقان کو ثاقب کی بات بری لگی تھی۔

فرقان بھائی کوئی اوجھلے ہو گئی تو یہ کہاں سے وسے گا دولا کھ۔“ عاطف نے دبی زبان سے کہا۔

لینے میں عاقبت جانی۔

☆☆☆

خاندان بھر میں یہ خبر پھیل گئی کہ عاقب نے کسی لڑکی کو بھگا کر اس سے نکاح کر لیا تھا۔ نسرین کے گھر میں رونا پینا پڑا ہوا تھا۔ عاقب کی پھوپھی ہاتھ مل مل کر عاقب اور اس لڑکی کو کلب کلب کر بدو عاقب دے رہی تھیں۔

گو فرقان کا بہ ظاہر کوئی بیچ نہ تھا مگر شوئی قسمت کہ علاقہ تھانے کا ایس ایچ او جو مخالف جماعت کا ہمدرد سمجھا جاتا تھا اس کا چہرہ آشنا تھا۔

”تو آپ ہیں لڑکی کے اغوا کے پیچھے۔“ ایس ایچ او جاہاز علی نے اپنا ڈنڈا ہاتھ کی ہتھیلی پر دھیرے دھیرے مارتے ہوئے کہا۔

”جناب! یہ میرے دوست ہیں۔ مجھ سے ملنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔“ ثاقب نے صفائی پیش کی۔

”چور کا یار گرہ کٹ.....“ ایس ایچ او نے تحقیر سے کہا۔

”آپ تو ہین کر رہے ہیں ایس ایچ او صاحب۔“

فرقان نے احتجاج کیا۔

”تو ہین!“ ایس ایچ او نے اسے گھورا پھر ثاقب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”دوسروں کی عزت پر ڈاکا ڈالنے والوں کا ساتھ دیتے ہو..... شرم نہیں آتی پھر اپنے جلسوں جلسوں میں نعرے لگاتے ہو کہ ہم بہنوں، بیٹیوں کی عزتوں کے رکھوالے ہیں۔“

فرقان نے کچھ کہنے کو منہ کھولا مگر ثاقب نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں صلاح دی کہ اس وقت چپ رہنے میں عاقبت تھی۔

ایس ایچ او نے اپنے معاون اہلکاروں کو طلب کیا اور دونوں کو حوالات میں بند کر دینے کا حکم دیا۔ ثاقب نے گھبرا کر فرقان کو دیکھا۔

”جب تک لڑکی اور لڑکا تھانے میں پیش نہیں ہو جاتے تم دونوں حوالات میں رہو گے۔“ ایس ایچ او نے ثاقب اور فرقان کو گھورتے ہوئے کہا۔

”میں..... میں ایک کال کر سکتا ہوں؟“ فرقان نے کہا۔

”کسے کرو گے؟ پارٹی کو؟“

”جی نہیں..... اپنے دوست کو۔“

”کر لو۔“ ایس ایچ او کا انداز کچھ اس طرح تھا جیسے کہتا

ہو کہ لو فون دیکھتا ہوں تمہارا فون کرنا کیا کام دکھاتا ہے۔

شہر کے ایک دوسرے تھانے کے انچارج اشفاق احمد سے فرقان کے بہت پرانے مراسم تھے۔ دونوں ایک ہی

کالج سے فارغ التحصیل تھے۔ گریجویٹیشن کے بعد اشفاق نے پولیس کے محکمے میں نوکری کر لی تھی۔ فرقان نے بینکاری کا شعبہ اپنایا تھا۔ اشفاق اور جاہاز علی ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ہم پیشہ تھے۔ ہم عہدہ تھے۔ ایک دوسرے کو بڑی اچھی طرح جانتے تھے۔ وقت پڑنے پر ایک دوسرے کو ممنون احسان بھی کرتے رہتے تھے۔

فرقان نے اشفاق کے موبائل یا آفس کے نمبر پر فون کرنے کے بجائے اس کی بیوی کے نمبر پر فون کیا اور اسے محتاط الفاظ میں بتایا کہ وہ اس وقت فلاں تھانے کی

حوالات میں بند تھا۔ وہ یہ بات اپنے شوہر کو ضرور بتا دے۔

”آپ فکر نہ کریں بھائی میں ابھی ان کے موبائل پر

بات کرتی ہوں۔“ اشفاق کی بیوی نے کہا۔

”اور ہاں اسے کہیں والدہ کو ذرا تسلی دے دے۔“

انہیں پتا چلے گا تو وہ بہت پریشان ہوں گی۔“

”او کے او کے۔“

فرقان کو یقین تھا اشفاق اس کی خیر ضرور لے گا۔ وہ

اگر اس وقت مشکل میں تھا تو کیا ہاں ہاں فرقان کے کام آیا

تھا۔ جماعت کے اثر و رسوخ پر اسے اس کی مرضی کے

تھانوں میں تعیناتیاں دلوائی گئیں۔ مجرموں تک رسائی میں

جماعت کے ایکٹوسٹوں سے اسے مدد دلوائی تھی۔ اسے آنا

چاہیے تھا آخر آئندہ بھی تو اسے اسی شہر میں نوکری کرنی تھی۔

آئندہ بھی کام پڑنے تھے۔ فطرتاً ہی اشفاق بے فیض اور

طوطا چشم نہیں تھا۔ اسے دوستی اور تعلق کا بھرم رکھنا آتا تھا۔

اس کی بیوی کے بھی فرقان کی والدہ، بہنوں اور بیگم سے

خاصے اچھے تعلقات تھے۔ دونوں گھرانوں میں ایک

دوسرے کے ہاں آنا جانا بھی تھا۔

ثاقب اور فرقان کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

حفظ ما تقدم کے طور پر راحہ درخشندہ اور عاشر کے

ساتھ خود بھی اپنی سسرال منتقل ہو جانے کے بعد عاطف

اپنے زیر استعمال فرقان کی گاڑی اس کے گھر پہنچانے گیا تو

اس کی والدہ ہول گئیں۔ ”فرقان کہاں ہے؟“

”آجائیں گے..... آپ پریشان نہ ہوں۔“ عاطف

نے انہیں تسلی دی۔

”ہے کہاں وہ؟“

”آجائیں گے..... آجائیں گے۔“

”مجھے بتاؤ تو..... تم اس کی گاڑی کیوں لے کر آئے

ہو۔“ والدہ روہا سی ہو گئیں۔

عاطف کو انہیں حقیقت حال سے آگاہ کیے بنا چارہ نہ

کے فون سے بات کر رہا ہوں اور میں نے اسے ساری بات بتا بھی دی ہے مگر جب تک میں یہاں ہوں احتیاط سے بات کریں..... جیسے اس قصے سے میرا کوئی تعلق ہی نہیں۔“

”ٹھیک ہے سمجھ گئی۔“

فرقان نے فون اشفاق کو تھما دیا۔

”ٹھیک ہے آئی..... میں خود آؤں گا آپ کی طرف۔“

”میرا بچہ کب گھر آئے گا؟“

”آجائے گا..... آجائے گا..... آپ تسلی رکھیں۔“

ایس ایچ او جانباڑ علی سے اپنے مراسم کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اشفاق اپنی فتنے داری پر فرقان کو لاک اپ سے باہر نکال لایا تھا اور دونوں تھانے کے ایک علیحدہ کمرے میں بیٹھے تھلپہ میں باتیں کر رہے تھے۔ اشفاق نے اس کے لیے جائے بھی منگوائی تھی۔ ”رات میں نے تیرے ساتھ ہی گزارنی ہے۔“ اشفاق نے فرقان سے کہا۔

”کیوں؟“ فرقان چونکا۔

”کیونکہ میں اگر تیرے ساتھ نہ بیٹھا تو جانباڑ علی کی

نیت اچھی نہیں لگتی مجھے تیرے بارے میں۔“

فرقان کے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

”کچھ کہا اس نے؟“

”ہاں..... کہہ رہا تھا لڑکی والے سوس فل لوگ

ہیں..... آئی جی تک جا پہنچے ہیں..... آئی جی کہتا ہے جو میں گھنٹے

میں لڑکی بازیاب ہو جاتی چاہیے..... لڑکی کی بازیابی کے لیے تم

دونوں کی پھرتول چینی ہے۔ میں رات بھر تمہارے ساتھ بیٹھا

رہوں گا۔ جانباڑ کچھ تو مروت کرنے کا میری۔“

”تاقب کا کیا ہوگا..... وہ بے چارہ تو کمزور سا آدمی

ہے میری طرح سخت جان نہیں..... دو منٹ کی پھرتول بھی

برداشت نہیں کر سکے گا..... اگلے دنے گا سب کچھ۔“

”ایسے کمزور لوگوں کے لیے تم کیوں خود کو خطرے

میں ڈالنے ہو..... معلوم ہے نا جانباڑ علی تمہاری جماعت سے

کتنی خاثر رکھتا ہے۔“

”معلوم ہے۔“

”وہ دن پہلے تمہاری مخالف جماعت کا جولیڈر مارا گیا

ہے وہ جانباڑ علی کا قریبی تھا۔ اس کی پر خاش میں وہ تمہیں

کوئی زک پہنچا سکتا ہے۔“

”تمہاری اس سے کوئی بات ہوئی؟“

”ہاں..... جب میں آیا تو تھوڑی دیر اس کے ساتھ

ہی بیٹھا رہا۔ میں نے اس کو بتا دیا کہ یہ جو بندے تم نے

اٹھائے ہیں ان میں فرقان میرا جگری ہے۔ اسے کچھ نہیں

رہا۔ ان کے گھر میں رونا بیٹھا بچ گیا۔ عاقب اور ماہ نور جنہیں گھر کی خواتین نے ان کے نکاح کی محوشی میں اچھا کھانا کھلانے کی تیاری کر رکھی تھی چور بنے بیٹھے تھے انہی کی وجہ سے اس گھر کا واحد مردحوالات چلا گیا تھا۔

”میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔۔۔ کس سے کہوں!“

فرقان کی والدہ سینہ پیٹ رہی تھیں۔

”آہستہ ای..... مجھے والوں کو آواز گئی تو اور مشکل

ہو جائے گی۔“ فرقان کی بہن نے ماں کو سمجھایا۔ فرقان کی

والدہ کو اپنے گھر میں عاقب اور ماہ نور کی موجودگی سخت کھٹک

رہی تھی۔ سمجھدار اور تحمل مزاج نہ ہوتیں تو شاید دونوں پر

برس ہی پڑتیں۔ بعید نہ تھا کہ اپنے گھر سے نکال باہر کرتیں۔

”آئی! آپ فکر نہ کریں..... فرقان بھائی آجائیں

گئے..... انہوں نے ہماری پریشانی میں ہمارا ساتھ دیا

ہے..... ہم ان کے لیے اپنا خون بھی بہانے سے دریغ نہیں

کریں گے۔“ عاقب نے کہا۔

”جیسی تم یہاں بیٹھے ہو آرام سے اور میرا بچہ.....“

والدہ دوپٹے سے منہ ڈھانپ کر رونے لگیں۔ اچانک فون

کی گھنٹی بجی اور سب چونکے۔ فون کال اشفاق کی تھی۔ وہ

فرقان کی والدہ سے بات کرنا چاہتا تھا۔

”ہاں بیٹے..... میں بات کر رہی ہوں۔“

”السلام علیکم آئی۔“

”وعلیکم السلام۔“

”آئی میں اس وقت فرقان کے پاس ہوں۔ آپ

بے فکر ہو جائیں۔“

”کیسے بے فکر ہو جاؤں بیٹے..... مجھے یہ وہ ایک

ہی آنکھ ہے۔“

”میں جانتا ہوں..... جانتا ہوں آپ اس سے کتنا

پیار کرتی ہیں..... میرا بھی وہ دوست نہیں بھائی ہے.....

انشاء اللہ اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ میں اسے خود اپنے

ساتھ گھر لے کر آؤں گا۔“

”میری اس سے بات تو کرواؤ۔“ والدہ کے لہجے

میں یک گونہ بے قراری تھی۔

”ہاں..... کر لیں۔“

”السلام علیکم!“ فرقان نے اشفاق سے فون لے کر کہا۔

والدہ اس کی آواز سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

”پلیز ای۔“

”دیکھنا یہ ہوتا ہے پرانے پھندے میں پڑنے کا انجام۔“

”ای احتیاط سے..... اس وقت تو خیر میں اشفاق

سب سہہ سکتا ہوں..... نوکری کی بھی پروا نہیں..... رزق دینے والا اوپر بیٹھا ہے..... مگر..... تم شاید پولیس کی سختی نہ سہہ سکو کیونکہ میری طرح سخت جان نہیں ہو..... جب کل بھی مسئلے کا حل یہی ہے، آج بھی یہی تو..... سوچ لو۔“ فرقان نے کہا۔

”میں نے کیا سوچنا ہے یار..... سوچنا تو اس غیثت عاقب کو چاہیے تھا لاک اب کا بس نام ہی سنا تھا اس نے اندر بٹھا دیا۔“ ثاقب کے لہجے میں طلال تھا۔

”بہتر ہے یہاں سے جلدی نکلو..... میں خود بھی پولیس والا ہوں مگر حقیقت یہ ہے کہ جو پولیس کے شکنجے میں نہ آئے وہی اچھا..... خواجہ تمہارا پیسہ بھی خرچ ہوگا وقت بھی ضائع ہوگا اور جان پر بھی سختی۔“ اشفاق بولا۔

”ٹھیک ہے اشفاق صاحب جیسے آپ بہتر سمجھیں۔“

”گڈ آٹو میں کہہ دوں ان لوگوں سے کہ لڑکی کو پیش کر رہے ہیں؟“

”جی۔“

”صرف لڑکی کو نہیں لڑکے کو بھی پیش ہونا پڑے گا۔“

فرقان بولا۔

”ظاہر ہے..... نکاح کا قانونی ثبوت بھی پیش کرنا پڑے گا.....“ اشفاق نے کہا۔

”تو پھر کب پیش کر دوں گے“

”جب آپ کہیں۔“ ثاقب نے گویا پتوار اشفاق کے ہاتھ میں دے دی۔

”میرا خیال ہے صبح۔“ فرقان نے کہا پھر توجہ بھی پیش کی۔

”اس وقت تو بے چاری لڑکی بھی پریشان ہوگی۔“

”ٹھیک ہے..... میں کہہ دیتا ہوں جاہاز علی سے کہ صبح لڑکی اور لڑکا دونوں پیش ہو رہے ہیں۔“

رات بھر اشفاق تھانے میں فرقان کے ساتھ ہی بیٹھا رہا۔ گو اس نے جاہاز علی کو اس امر کی یقین دہانی کرا دی تھی کہ صبح لڑکی پیش کر دی جائے گی لہذا احرامت میں لیے گئے افراد پر کوئی سختی نہ کی جائے لیکن پھر بھی اس نے فرقان کے پاس سے جانا مناسب نہ سمجھا تھا۔ فرقان سے تو جاہاز علی کی سیاسی مخلصت بھی تھی۔ اس پر اندھا بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تھانوں میں کیا کچھ نہیں ہوتا بھلا!

☆☆☆

عاقب جو فطرتاً ایک بزدل نوجوان تھا، تھانے میں پیش ہونے کو تیار نہ تھا مگر عاطف نے اسے غیرت دلائی۔

”کیئے انسان تیری وجہ سے بڑا بھائی حوالات میں بند ہے“

ہونا چاہیے۔“

”بھگر؟“ فرقان کے لہجے میں پیتابی تھی۔

”اس نے مجھے آئی جی والی بات بتائی اور کہا تمہاری خاطر میں اتنا کر سکتا ہوں کہ اگر یہ کل تک لڑکی اور اسے ہنگا کر لے جانے والے کو حاضر کرویں تو کسی کو ان دونوں بندوں کو ہاتھ نہ لگانے دوں..... وہ بھی صرف تمہاری خاطر..... ورنہ تمہیں معلوم ہے ہم بندہ بھی باز یاب کروا لیتے ہیں اور تمہارے دل بھی خوب لگاتے ہیں۔“

”لڑکی کسی نے نہیں ہنگائی وہ خود آگئی تھی ان لوگوں کے گھر۔“ فرقان نے اسے آہستگی سے بتایا۔

”اب کہاں ہے؟“

”اسی کے ساتھ ہے..... وہ اپنے گھر واپس ہی نہیں جانا چاہتی..... دونوں نے نکاح بھی کر لیا ہے۔“

”ارے تو پھر لیے چکر میں کیوں پڑے ہوئے ہیں یہ لوگ اور تمہیں بھی پریشانی میں ڈال دیا..... ان سے کہو دونوں کو تھانے میں پیش کریں اور لڑکی بیان دے دے کہ میں اپنی مرضی سے آئی ہوں، عاقل و بالغ ہوں اور میں نے اس لڑکے سے نکاح کر لیا ہے..... اس کے بیان کے بعد تمہاری اور تمہارے یار ثاقب کی جان بھی چھوٹ جائے گی۔“

”ثاقب سے بات کر سکتے ہیں ہم لوگ؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں..... تم بیٹھو میں اسے ساتھ لے کر آتا ہوں۔“

اشفاق گیا اور تھوڑی ہی دیر میں ثاقب کو اپنے ساتھ لے کر آ گیا۔ ثاقب کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی ہوئی تھیں۔ اشفاق نے پہلے تو اس کے لیے چائے منگوائی پھر صلاح کاری شروع کی۔

”دیکھو بھی لڑکی تو پولیس نے تم لوگوں سے بہر حال باز یاب کرنی ہے۔ بات اوپر تک پہنچ گئی ہے اور جب اوپر سے ڈنڈا پڑے تو پولیس مردے کو بھی قبر سے نکال لاتی ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ لڑکی پیش کر دی جائے۔ دونوں نکاح تو کر ہی چکے ہیں۔ لڑکی شوہر کے حق میں بیان دے دے۔ بس کافی ہے۔ ورنہ خواجہ تمہاری بھی سختی اور میرے یار فرقان کے گھر والے بھی مفت میں پریشان اور بدنام الگ..... اس کی نوکری کا معاملہ بھی ہے..... اپنے بچے بھی تو پالتے ہیں اس نے۔“

ثاقب نے فرقان کو دیکھا جیسے اس کی صلاح جانتا

میرا کوئی مسئلہ نہیں ثاقب..... پریشانی، بدنامی

READING Section

اس کے قدموں میں ڈال دیں مگر وہ اس سے مس نہ ہوئی۔ وہ پولیس کو اپنا بیان دے چکی تھی کہ وہ عاقل و بالغ ہے اپنی مرضی سے خالد کا گھر چھوڑ کر نکلی تھی۔ عاقب سے اس کا نکاح ہو چکا ہے۔ وہ اس کا شوہر ہے، اب وہ اسی کے ساتھ رہتا اور بسنا چاہتی ہے۔

ماہ نور اور عاقب کے پیش ہو جانے کے بعد ثاقب اور فرقان کو پولیس حراست سے نجات مل گئی۔ فرقان کو ہمراہ لے کر اشفاق حسب وعدہ اس کی والدہ کے پاس پہنچا۔

”آئی! میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا نا..... پوچھ لیں اس سے کسی نے اسے انگلی بھی نہیں لگائی ہے۔“
”جیسے رہو بیٹا..... جیسے تم نے میرا دل ٹھنڈا کیا تمہاری ماں کا دل بھی تمہاری طرف سے سدا ٹھنڈا رہے..... بہت بہت شکریہ۔“

”لیکن ایک بات کہوں برا نہ مانیے گا۔“
”ہاں ہاں..... کہو۔“

”دوستی اپنی جگہ لیکن دوستی کی خاطر بدنامی کو گلے لگانا غلطی نہیں..... اس لڑکے کے بھائی سے فرقان کی دوستی ہے، ٹھیک ہے لیکن اس دوستی کی خاطر گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کو اپنے گھر میں رکھ لینا غلطی نہیں تھی..... بیٹوں والا گھر ہے کچھ بھی ہو سکتا ہے..... جس کی لڑکی جاتی ہے وہ تو سانپ کی طرح تل کھارہا ہوتا ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہو بیٹا..... غلطی مجھ سے بھی ہوئی..... میں نے سوچا جو ان لڑکی ہے وہ کبھی نہ جانے کہاں کہاں لیے چھپاتا پھرے گا اسے، بسیں بیٹھی رہے تو بہتر۔“
”آپ کی ہمدردی کو سو سلام آئی مگر یہ خطرناک معاملے ہوتے ہیں۔ دشمنی بندھتی ہے تو نسلوں چلتی ہے..... جس گھر کی بزرگ عورت اپنی عزت کی خاطر گھر سے بھاگی لڑکی کے پیروں میں پڑ جائے اور مردوں سے ٹوپیاں اتار کر اس کے قدموں میں ڈال دیں اور وہ پھر بھی ان کے بجائے اس لڑکے کا ساتھ دے جس کی خاطر اس نے گھر چھوڑا ہو؟ وہ پھر ایسی لڑکی کا جو حشر نہ کریں کم ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے وہ اس سے انتقام لیں گے۔“
”فرقان کی والدہ سینے پر ہاتھ دھر کر بولیں۔“
”کچھ بھی کر سکتے ہیں۔“

”اللہ رحم کرے..... اس بچی پر بھی اور ہم پر بھی..... دیے لڑکی ہے اچھی..... ساری گھرداری آتی ہے اسے..... سخت دقت دیکھ رکھا ہے..... ہر حال میں گزارہ کرنے والی لڑکی ہے..... میری بچیوں اور بہو سے تو وہ ایسے گل مل گئی تھی

کیا وہ بند ہی بیٹھا رہے گا۔“
”انہیں لڑکی چاہیے نا اسے پیش کر دیں..... وہ کہہ دے گی میں اپنے شوہر کے پاس جانا چاہتی ہوں۔“
”تمہارا دور کچھری تھم جیسے ذکیل آدمی کا چہرہ بھی دیکھنا چاہیں گے۔“

”اور اگر تمہانے دالوں نے مجھے اندر کر دیا؟“
”تو میں شکرانے کے لٹل پڑھوں گا کہ تمہ جیسے تنگ خاندان سے ہمیں چھٹکارا ملا..... تیری وجہ سے بڑا بھائی اندر ہے۔ سارا گھر پریشان ہے..... راحہ بھائی کی طبیعت خراب ہو گئی ہے..... بے چارے فرقان بھائی کی بلا وجہ میں سختی..... والدہ اس کی رود کر ہلکان ہو رہی ہیں..... بیوی کو بار بار دورے پڑ رہے ہیں اور تو بزدلی دکھا رہا ہے..... تمہ سے اچھی تو وہ لڑکی ہے جو تھلے جا کر بیان دینے کو تیار ہے۔“
”دیکھ لیں بھائی۔“

”اے مجھے تو جو دیکھنا تھا میں نے دیکھ لیا..... دیکھ لیا کہ تو کتنا خود غرض ہے..... کوئی اور ہوتا تیری جگہ تو کہتا میرا باپ جیسا بھائی میری وجہ سے اندر ہے اسے باہر لگانے کے لیے تو میں اپنی جان پر بھی کھیل جاؤں گا۔“

عاطف نے عاقب کو اتنی غیرت دلائی کہ وہ بالآخر پولیس کے سامنے پیش ہونے کو تیار ہو ہی گیا۔ ماہ نور کو پولیس اسٹیشن لے جانے سے قبل اسے اچھی طرح سمجھایا بچھایا گیا۔ نوبیا ہتا دلہن کا روپ دینے کے لیے اسے فرقان کی ایک بہن نے اپنا زرق برق جوڑا جو اس نے اپنے ایک کزن کی شادی پر سلوایا تھا اور صرف ایک مرتبہ ہی پہنا تھا پہننے کو دیا۔ عاطف اس کے لیے رخصتہ کا ایک ایسی ٹیشن جینزری سیٹ لے آیا۔ فرقان کی بیوی نے کندی لگن جو اس کی والدہ اس کے لیے انڈیا سے بطور سوغات لائی تھیں، ماہ نور کی کلائیوں میں پہنا دیے۔ یہ لگن اسے واپس ملنے نہ ملتے اس کا شوہر گھر تو واپس آجاتا بس..... ماہ نور کا میک اپ بھی کر دیا گیا تاکہ بنی سنوری ہونے کی بنا پر وہ نوبیا ہتا دلہن ہی دکھائی دے۔

ماہ نور اور عاقب تمہانے میں پیش ہو گئے۔ ماہ نور کے گھر والوں کو اس کی بازیابی کی اطلاع دے دی گئی۔ اس کی خال، خالو، ماموں اور دوسرے بہت سے رستے وار تھلے پہنچ گئے۔ اسے اپنے حق میں کرنے اور اپنے ساتھ لے جانے کے لیے انہوں نے اسے سمجھانے بچھانے کی کوشش کی۔ منت سماجت کی، واسطے دیے۔ اسے کچھ نہ کہنے سننے کی یقین دہانی کرائی۔ پورے تحفہ کی ضمانت دی۔ خالہ اس کے پیروں میں پڑ گئی۔ مردوں نے اپنی ٹوپیاں سر سے اتار کر

دے رہی ہوں..... نہ بھاگ جائے تمہارے گھر سے بھی تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔“

”پھوپھو!“ ثاقب نے پھکپھکاتے ہوئے وہی زبان سے کہا۔ ”آپ تھوڑے دن انتظار کر لیں۔“

”کس بات کا!“ پھوپھو نے چونکیں۔

”وہ جائے گی تو ہم لوگوں کو عاقب کے لیے پھر آپ کے دروازے پر ہی آتا ہے۔“

پھوپھو نے ثاقب کو گھورا پھر تلخ لہجے میں بولیں۔

”میری بچی کو تم نے ایسی گری پڑی سمجھ رکھا ہے..... ارے اس ارادے سے تو میں تم لوگوں کو اپنی چوکھٹ بھی نہ چڑھنے دوں گی کبھی..... اور عاقب! اس لنگے سے تو کہنا مجھے اپنی صورت بھی نہ دکھائے کبھی ورنہ ماروں گی ہزار گنوں کی ایک!“

ثاقب شرمندہ ہو کر اٹھا۔

ماہ نور کے خالو نے دونوں گھروں کی مشترکہ دیوار اونچی کروالی۔ محلے داروں کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ اپنی ہی لڑکی کو مورد الزام ٹھہراتے تھے اور اب اس کی صورت تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ چند محلے داروں سے یہ بھی پتا چلا

کہ اپنے طور پر بھائی چارگی میں جب انہوں نے ماہ نور کے خالو کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ جو ہونا تھا ہو چکا اب وہ اپنی لڑکی یا اس کے سسرال والوں میں سے کسی کو کوئی ذک

پہنچانے کی نیت نہ رکھیں تو اس نے کہا۔ ”عزت کا معاملہ تھا وہ تو کئی اب سات خون بھی کر دیے جائیں تو عزت واپس نہیں آسکتی۔ میں تو جو ان لڑکی کی ذمہ داری لینے کے حق میں

ہی نہیں تھا، میری بیوی یہ خوف تھی جو مرنے والی بہن کی محبت میں اس کی بیٹی کو گھر لے آئی..... ہمارا اب اس سے کوئی لینا

دینا نہیں..... زندگی بھر اس سے تعلق ختم..... اس کے ماموں اور مای کا بھی یہی خیال ہے۔“

☆☆☆

ثاقب اور عاطف دونوں ہی کو اپنے گھر کی عزت خاک میں مل جانے کا نہایت ملال تھا۔ یہ وہ گھرانہ تھا جس کی ان کے باپ کی وجہ سے محض میں عزت رہی تھی۔ ثاقب اور عاطف نے بھی اپنے طرز عمل سے باپ کی زندگی میں

بھی اور ان کی موت کے بعد بھی اس عزت کو برقرار رکھا تھا۔ مجال تھی جو دونوں میں سے کسی نے محلہ کی کسی لڑکی کو نظر

بھر کر دیکھنے کی بھی کوشش کی ہو۔ عاقب سے بھی انہیں ایسا کوئی اندیشہ نہ تھا مگر ہونی کو کون روک سکا ہے۔ حالات و

واقعات سے انہیں اب بھی یہ یقین تھا کہ زیادہ غلطی لڑکی کی تھی۔ کیوں آئی وہ رات کو گھر کی دیوار پھلانگ کر ان کے

جیسے انہی کے ساتھ رہتی آئی ہو۔“

”فی الحال دور دور رہیے گا..... اسی میں بہتری ہے..... یہ میرا مشورہ ہے آگے آپ کی مرضی۔“

☆☆☆

ماہ نور نے عدالت میں بھی اپنا وہی بیان دہرایا جو اس نے تھانے میں پولیس کو دیا تھا۔ عدالت نے اسے

عاقب کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی، خالہ اور ماموں نے عدالت سے بے نسل و مرام جاتے ہوئے اس سے کہا۔ ”تو آج سے ہمارے لیے مر چکی..... اپنے باپ کی

اولاد ہے تو آج کے بعد ہمیں اپنا منہ نہ دکھانا۔“

ماہ نور اور عاقب گھر آ گئے۔ راحمہ اور رخشیدہ بھی ڈرتی ڈرتی واپس آ گئیں۔ ثاقب کو پھوپھو اور ان کے گھر والوں سے معذرت کرنا پڑی کہ عاقب کی ناخلفی نے انہیں

باپ کا بٹے کر وہ رشتہ نبانے لائق نہ چھوڑا تھا۔

”نہ میں تمہاری پھوپھو نہ تم میرے بیٹھے..... ارے تم نے اس لڑکی سے عاقب کا نکاح کرتے ہوئے یہ نہ سوچا کہ

میری بچی پر کیا گزرے گی۔“ پھوپھو نے تکی سے کہا۔

”مجھے آپ لوگوں کے دکھ کا پورا احساس ہے پھوپھو لیکن حالات ہی ایسے ہو گئے تھے کہ.....“ ثاقب اس سے آگے

کچھ نہ کہہ سکا۔

”روز حشر بھائی سے بھی گلہ کروں گی اور تم لوگوں کے گریبان بھی پکڑوں گی جو تم نے میری معصوم بچی کے ساتھ

کیا ہے۔“ پھوپھو جذباتی ہو کر رونے لگیں۔

”پھوپھو ہمارا کیا تصور..... غلطی تو عاقب کی ہے بلکہ سچ پوچھیں تو عاقب کی بھی اتنی نہیں جتنی اس لڑکی کی ہے..... وہ

خود ہی آگئی تھی ہمارے گھر۔“ ثاقب نے صفائی پیش کی۔

”ارے تو ایسی کیا گھر بسائے گی..... جسے اپنے خاندان کی عزت کا خیال نہیں وہ تمہاری کیا عزت رکھے

گی..... رہ جائے تو میرا نام بدل دینا۔“ پھوپھو نے بڑے یقین سے پیشگوئی کی۔

”آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ جسے اپنے خاندان، اپنے خالہ خالو کی عزت کا پاس نہیں جنہوں نے اسے اپنے گھر میں پناہ دی، عزت سے رکھا..... وہ عاقب کی کب بن کر رہے گی..... اس وقت تو اس کے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ خالہ، ماموں کے پاس واپس جاتی تو وہ اسے قتل کر دیتے اس لیے اس نے عاقب کے حق میں بیان دے دیا۔“

ثاقب کو بھی اپنا ہنوا پا کر پھوپھو نے بڑے یقین سے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”صرف چھ ماہ کا نام

تھا۔ شوہر اور سسرال کی طرف سے اسے ایک وحشی تک تو ملی نہیں تھی اور نہ کسی کو اس کا احساس ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اس کے بیروں میں جوتے بھی ابھی تک وہی تھے جو وہ خالہ کے گھر سے پہن کر نکلی تھی۔ زیور تو دور کی بات شوہر کے گھر میں اسے عزت بھی نہ مل رہی تھی۔ وہ دن بھر کسی ملازمہ کی طرح گھر کے کاموں میں لگی رہتی، کسی کا سراپنا تو دور کنار اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ سمجھا جاتا۔ عاقب بھی عجیب دیوسا آدی تھا گھر والوں کے اس رویے پر احتجاج کرنا تو دور کنار اس کا دل رکھنے کو بھی کچھ نہ کہتا۔

گھر میں؟ کیوں رہی وہ رات بھر عاقب کے کمرے میں؟ اور کیوں آمادہ نہ ہوئی اپنی خالہ کے گھر واپس جانے کو؟ گئی عزت کا بھرم رکھنے کی خاطر لوگ کیا کچھ نہیں کر گزرتے؟ آہی گئی تھی تو صبح ہونے سے پہلے اگر اپنے گھر چلی گئی ہوتی تو اتنی ذلت اور رسوائی تو نہ ہوتی۔ ایک چچا کے گھر کے سوا کہ ان کی بھی مجبوری تھی کہ ان کی بیٹی رخشندہ عاطف سے بیاہی ہوئی تھی باقی سارا خاندان ان کے گھرانے سے قطع تعلقی کر بیٹھا تھا۔

عاقب اور ماہ نور کے گھر آ جانے کے بعد ثاقب اور عاطف نے دونوں پر اپنی ناراضگی کا اظہار اپنی خاموشی سے کیا۔ ماہ نور نے شروع شروع میں ان سے بے تکلف ہونے اور ان کے آگے بچھے بچھے جانے کی پوری کوشش کی مگر دونوں میں سے ایک کی خاموشی نہ ٹوٹی۔ وہ چائے بنا کر ان کے آگے رکھتی تو وہ پیالیاں پر سے سرکا دیتے۔ کھانا پکاتی تو اس کے ہاتھ کا پکا کھانا نہ کھاتے۔ اس سے سامنا ہوتا تو تیوری چڑھا لیتے۔ اسے دیکھ کر اپنا راستہ بدل لیتے۔ کھانے کی میز پر آتی تو دونوں اٹھ کر چلے جاتے۔ دونوں نے اپنی اپنی بیویوں کو بھی اسے زیادہ رنج دے کر بات نہ کرنے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ رخشندہ تو خیر اسے لفٹ ہی نہ کرائی راحمہ البتہ بات کر لیتی تھی۔ ماہ نور نے اس سے اور عاقب سے کئی مرتبہ ثاقب، عاطف اور رخشندہ کی بے رخی کا گلہ کیا۔

”خود مجھ سے بھی بات نہیں کرتے ہیں دونوں بھائی۔“ عاقب نے کہا۔ اس کی یہ بات تو ٹھیک تھی۔ وہ دونوں اس سے بھی ہمگلا م نہ ہوتے تھے۔

”ٹھیک ہو جائے گا سب۔“ راحمہ ماہ نور کو دھیرے سے تسلی دیتی۔

ماہ نور کا دل برا ہوتا۔ سوائے عاقب اور راحمہ کے اس گھر کے باقی لوگ اس سے کس قدر حقارت اور اہانت کا رویہ رکھتے تھے جیسے وہ کوئی پرلے درجے کی گری پڑی مخلوق تھی۔ عاقب بھی دونوں بھائیوں کے سامنے جلی سے ڈرے چوہے کی طرح سہا سہا رہتا۔ ان کی موجودگی میں اس سے بات کرنے سے گریز کرتا۔ اس کے جائز جذباتی تقاضوں کے ساتھ وہ اس کی مادی ضرورتوں سے بھی بے نیازی اختیار کیے ہوئے تھا۔ عجیب شوہر تھا۔ خالہ کے گھر سے جن تین کپڑوں میں وہ اس کے گھر آئی تھی، ان کے علاوہ فرقان کی ایک پہن نے اسے اپنا ایک عام سا جوڑا پہننے کے لیے دیا تھا اور نکاح کے موقع پر ایک نینسی سوٹ جو اس کے اصرار کے باوجود فرقان کی والدہ نے بیٹی کو اس سے واپس نہیں لینے دیا

www.Paksociety.com

واپسی کے لیے پہلے ثاقب نے رخصت سفر باعہدا۔ سفر پر جاتے ہوئے آدی کا دل ویسے بھی رتیں ہو رہا ہوتا ہے۔ عاقب سے اس کی کیسی ہی ناراضگی ایسی خون کا رشتہ تھا۔ جانے سے قبل اس نے عاقب سے بات چیت شروع کر دی۔ ثاقب کی دیکھا دیکھی عاطف کی بھی اس سے بات چیت شروع ہو گئی جانے سے پہلے ثاقب نے عاقب کو سمجھایا۔ ”ذرا احتیاط سے رہنا..... دشمن کو کبھی بے خبر نہ سمجھے آدی..... دشمن تاک کر حملہ کرتا ہے..... سمجھ رہے ہونا؟“

”جی بھائی۔“

”اور اس لڑکی کو کبھی قابل اعتبار نہ سمجھنا..... جسے اپنے خاندان کی عزت کی پر دانتیں ہوئی وہ تمہاری عزت کی پروا کب کرے گی..... کسی بھی وقت تمہاری عزت مٹی میں ملا سکتی ہے۔“

”سچ ا“ عاطف نے جو تینوں بھائیوں کے اس خفیہ اجلاس میں شریک تھا ثاقب کی بات کی پر جوش تائید کی اور اپنی طرف سے گرہ لگائی۔ ”یہ زیادہ عرصہ رہے گی نہیں..... ایسی عورتیں ایک کی ہو کر نہیں رہتیں۔“

راحمہ کو ثاقب پر اپنے اور بیٹے کو سعودی عرب بلائے جانے کے لیے دباؤ ڈالنے کا بیہانہ ہاتھ آ گیا۔ ”مجھے تو اب یہاں رہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ماہ نور کے گھر والے کسی بھی وقت کچھ کر سکتے ہیں..... میں تو عاشر کے لیے بہت گھر مند رہنے لگی ہوں جب تک اسکول سے گھر واپس نہیں آ جاتا میرا تو دل سو لی پر لڑکار ہوتا ہے۔“ اس نے ثاقب سے کہا۔

”فکر مت کرو راحمہ۔“ ثاقب نے اسے تسلی دی۔ ”کوشش میں تو میں پہلے بھی لگا ہوا تھا اب زیادہ کوشش کروں گا تمہیں اور عاشر کو جلد از جلد وہیں بلائے گی..... اور ہاں تم اس کو زیادہ منہ نہ لگا یا کرو۔“

”کسے؟“ راحمہ نے تجاہل عارقانہ کا مظاہرہ کیا۔

”ارے وہی جس کی وجہ سے مجھے معاملات کا منہ دیکھنا

ہدایتیں اور نصیحتیں اس پر مستزاد ثابت ہوئیں۔ وہ اسے ماہ نور کو سختی میں رکھنے، اس کا بھی اعتبار نہ کرنے اور اس پر پیسا خرچ نہ کرنے کی صلاح دیتے۔۔۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی بیویاں تو خاندانی تھیں۔ عزت سے رخصت ہو کر آئی تھیں اس کی بیوی کی طرح غیر خاندانی اور اپنے گھر سے بھاگ کر نہیں۔ ماہ نور کی تنہیک اور اس کی طرف سے عاقب کا دل برا کرنے کو وہ دونوں بہت کچھ کہہ جاتے۔ کبھی کبھی رخشندہ بھی اس سلسلے میں اپنا حصہ ڈال دیتی اور اپنی گفتگو میں ہر پھر کر نسرین کا ذکر لے آتی۔ ”نسرین کی ہائے لی ہے تمہاری بیوی نے۔ خوش نہیں رہ سکتی۔“ وہ عاقب سے کہتی۔

گو خاندان والوں سے ملنا جلنا تقریباً ختم ہی ہو گیا تھا لیکن راحمہ کسی نہ کسی سے رابطے میں رہتی۔ اس کے ذریعے عاقب کو پھوپھی اور ان کے گھر والوں کی شدید ناراضگی کا پتا چلتا رہتا۔ صدمے کی ماری پھوپھی نے نسرین کی شادی اپنے چیلے کے بیٹے سے کر دی تھی جس کی پہلی شادی ناکام ہو چکی تھی۔ جوڑیا بازار میں باپ کی دکان پر بیٹھتا تھا اور نرا انگوٹھا چھاپ تھا۔ عاقب کو نسرین کی شادی کی نہ خوشی ہوئی نہ رنج..... وہ اس کے مرحوم باپ کا فیصلہ تھا اور بس..... اگر ماہ نور اس کی زندگی میں نہ آئی ہوتی تو بڑے دونوں بھائیوں کی طرح وہ بھی باپ کے فیصلے کے مطابق نسرین سے شادی کر کے اسے اپنے گھر لے آیا ہوتا اور وہ بھی اس گھر میں اسی طرح ہنسی خوشی بن رہی ہوتی جیسے اس کے بھائیوں کی بیویاں ہی ہوتی تھیں۔

☆☆☆

راحمہ سے کیے وعدے کے مطابق عاقب نے جلد ہی راحمہ اور عاشر کو اپنے پاس بلا لیا۔ راحمہ کے میکے والوں نے چھین کا سانس لیا۔ ماہ نور والے واقعے کے بعد سے اس کے گھر والوں کو اس کی اور عاشر کی بہت فکر رہنے لگی تھی۔ دشمن اور رقیب کو آدھی بھی سویا ہوا نہ سمجھے۔ وار کرتا ہے اور پھر کرتا ہے۔

راحمہ کے جانے کے بعد گھر میں عاقب اور ماہ نور رہ گئے۔ عاقب صبح دفتر چلا جاتا۔ بینک کی نوکری تھی جس کے بارے میں کہا جاتا ہے جانے کا وقت تو معلوم ہوتا ہے واپسی کا کچھ بتائیں ہوتا۔ عاقب شام کو گھر واپس لوٹتا۔ کبھی رات بھی ہو جاتی۔ ماہ نور دن بھر گھر میں اکیلی ہوتی۔ راحمہ اور عاشر کے جانے کے بعد عاقب نے عاقب کی صلاح پر ملازمدگی بھی چھٹی کر دی تھی۔ ”تم اکیلی تو ہوتی ہو..... کرنے کو کچھ ہوتا نہیں تمہارے پاس..... گھر کے کام خود کر دگی تو مصروف بھی رہو گی، دل بھی بہلا رہے گا۔“ اس نے ماہ نور

پڑا..... اب کسی نیک پروین بنی پھرتی ہے اس گھر میں۔“

”شکر ہے وہ مولیٰ بھدو نسرین نہیں آئی اس گھر میں۔“ راحمہ نے دل ہی دل میں سوچا۔

”خاندان میں منہ دکھانے کا نہیں رکھا اس نے ہمیں۔“ عاقب کے لہجے میں تلخی تھی۔ ”میں تو سوچ رہا ہوں جب تک سعودیہ میں دانہ پانی لکھا ہے لکھا ہے جب وہاں سے دانہ پانی اٹھ جائے تو یہاں واپس آنے کے بجائے کہیں اور نکلا جائے۔“

”کہاں؟“ راحمہ چونکی۔

”وہی، انگلینڈ، امریکا، کینیڈا..... کہیں بھی۔“

راحمہ کو یک گونہ خوشی ہوئی۔ انگلینڈ، امریکا اور کینیڈا جانا تو اس کا خواب تھا۔

عاقب کے جانے کے بعد عاطف اور رخشندہ نے بھی واپسی کی تیاری کی۔ جانے سے قبل عاطف نے بھی عاقب کو ماہ نور پر بھروسہ نہ کرنے اور اس کے خاندان والوں سے ہوشیار خبردار رہنے کی تلقین کی۔ ان کے جانے کے بعد گھر میں راحمہ، عاشر، عاقب اور ماہ نور رہ گئے۔ عاقب کی بینک سے بنا اطلاع کئی روز غیر حاضری کا سبب بینک والوں سے چھپا نہ رہ سکا مگر فرقان نے اپنا سیاسی اثر و رسوخ عمل میں لا کر معاملہ بحال کر دیا تھا۔

راحمہ کو ماہ نور کی صورت گویا ایک قل نام کیئر فیکر میسر آ گئی تھی۔ دونوں بھائیوں کے جانے کے بعد راحمہ اور ماہ نور میں گاڑھی چھیننے لگی تھی۔ راحمہ آرام کرتی اور ماہ نور سارا گھر سنبھالتی۔ ملازمہ سے اپنی نگرانی میں گھر کے کام کر داتی۔ صبح ناشتا اور دونوں وقت کھانا پکانا اب ماہ نور ہی کی ذمہ داری بن گئی تھی۔ عاقب بالائی منزل سے نیچے شفٹ ہو گیا تھا۔ اوپر والا کمر اب منٹے میں ایک آدھ بار صفائی کے لیے ہی کھولا جاتا۔ ماہ نور کبھی وزیدہ نظروں سے خالہ کے گھر کی طرف دیکھتی تو اسے وہاں کوئی دکھائی نہ دیتا۔ دونوں گھروں کی مشترکہ دیوار اونچی ہو کر فصیل شہر کی طرح درمیان میں حائل ہو گئی تھی۔ خالہ کے گھر سے ماہ نور کو کبھی کوئی آواز بھی نہ سنائی دیتی۔ ماہ نور اپنا دھیان اور دل دونوں نئے گھر میں لگائے رکھنے کی کوشش کرتی مگر کبھی کبھی دونوں ہی بھٹک کر خالہ اور اس کے گھر کی طرف نکل جاتے۔

☆☆☆

عاقب نہایت بے پروا شوہر ثابت ہوا۔ اسے بس اپنی ذات اپنے آرام، اپنی تسکین کا خیال رہتا۔ ماہ نور کا اسے کوئی خیال نہ تھا۔ فون پر دونوں بھائیوں سے ملنے والی

تزاخ! اس کے منہ پر طمانچہ رسید کرنے کے لیے
عاقب کو بس کوئی بہانہ چاہیے ہوتا۔
رات کو وہ اس پر بدترین جسمانی تشدد کرتا جسے سہنے
میں ماہ نور ضبط کرتی۔

”میں تمہیں کسی اور کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ
وحشی پن سے کہتا۔

”میں صرف آپ کی ہوں..... آپ ہی کی رہنا چاہتی
ہوں ساری زندگی۔“ وہ رو ہانسی ہو جاتی۔

”اور مجھ سے پہلے کتنوں کی رہ چکی ہو۔“ وہ اس کے
بازو اتنی شدت اور ویوانگی سے دبوچتا کہ اس کی سسکیاں
نکل جاتیں۔

وہ منہ الال کر قہقہہ لگاتا۔ اس کے بازو چھوڑ کر جا بجا
چکلیاں بھرنے لگتا۔ وہ تکلیف سے بلبلائی تو حوا اٹھاتا۔

ماہ نور یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ عاقب اسے جسمانی
تشدد اور ذہنی اذیت سے کیوں دوچار رکھتا تھا۔ اپنی کسی
جائز ضرورت سے اسے آگاہ کرتی تو وہ نہایت حنارت سے
کہتا۔ ”شکل دیکھی ہے تم نے اپنی..... ہوتم اس لائق کہ میں
تمہیں کچھ لاکر دوں۔“

وہ بے چارگی سے اس کا منہ دیکھنے لگتی۔
”آپ کے بھائی اپنی بیویوں کی ضرورتیں پوری نہیں
کرتے ہیں کیا۔“ ایک بار اس نے کہہ دیا تو وہ بھینک پڑا۔

”ان کی بیویاں اپنے گھروں سے بھاگ کر نہیں آئی تھیں۔“
وہ دم بخود رہ گئی تھی۔

اسے گھر سے بھاگنے کا طعنہ وہ دے رہا تھا جس کی
خاطر وہ گھر سے بھاگی تھی۔ اس نے خود ہی تو بلایا تھا اسے
اپنے گھر۔ ماہ نور کو اب اپنی غلطی کا احساس ہوتا۔

”تم جیسی لڑکیاں پتا نہیں کتنوں سے یاریاں لگاتی
ہیں۔“ عاقب نہایت بے ہووگی سے کہتا۔

ماہ نور کو دکھ ہوتا کہ وہ اس سے اتنی بدگمانی رکھتا تھا۔
اس کی خاطر تو اس نے اپنے سارے خاندان سے دشمنی مول
لی تھی۔ ماں کا سا بچا روینے والی خالہ کو دھککا دیا تھا۔ تھانہ

اور عدالت میں وہ کس لے بسی سے اس کے سامنے ہاتھ
جوڑے اس کی منت سماجت کرتی رہی تھیں کہ وہ گھر واپس
آجائے مگر اس نے کسی کی نہیں سنی تھی۔ اپنے پیروں میں

پڑی خاندان کے مردوں کی ٹوپیوں کی پروا نہیں کی تھی۔
صرف اس لیے کہ وہ عاقب کی بن کر رہنا چاہتی تھی اور اب
وہی اسے کچھ کھاتا تھا..... بات بات پر..... بہانے بہانے۔

کبھی بھی ماہ نور کو یوں لگتا جیسے عاقب ایک نارمل
کسی کا منہ پر طمانچہ رسید کرنے کے لیے

سے کہا۔
”کام کا مسئلہ نہیں عاقب..... آپ چلے جاتے ہو تو
گھر میں کوئی بات کرنے والا ہی نہیں ہوتا..... میں بور
ہو جاتی ہوں۔“

”نی وی کس مرض کی دوا ہے۔“ عاقب نے کہا۔
”نی وی بھی آوی کتنی ویر دیکھ سکتا ہے..... دل بھر
جاتا ہے۔“

”پھر تو تم ایک دن یہ بھی کہو گی کہ مجھ سے بھی تمہارا دل
بھر گیا ہے۔“

”کیسی بات کرتے ہیں۔“
”ٹھیک کہہ رہا ہوں..... خالہ کا گھر چھوڑ آئیں تو یہ
گھر بھی چھوڑ کر جاسکتی ہو۔“ دونوں بھائیوں کی باتیں اپنا اثر
دکھا رہی تھیں۔

”عاقب! ماہ نور نے اسے صدمے کی کیفیت میں دیکھا۔
”ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟“
”مجھے آپ کی بات سن کر بہت دکھ ہوا ہے۔“
”میں غلط تو نہیں کہہ رہا..... جسے اپنے خاندان کی
عزت کا پاس نہیں اسے شوہر کی عزت کا کب احساس ہوگا۔“
ماہ نور کی آنکھیں بھرا آئیں۔

”مگر مجھ کے آنسو مت بہاؤ..... مجھے ٹسوے بہانے
والی عورت سے شدید نفرت ہے۔“
”ایسی کتنی عورتیں دیکھ رہی ہیں آپ نے؟“
عاقب نے ہاتھ اٹھایا اور اس کا زور وار طمانچہ ماہ نور
کے گال پر پڑا۔

”آپ نے مجھے مارا۔“
”جو اب دوگی تو اس سے بھی بری ہوگی۔“

ایک دفعہ اس کا ہاتھ اٹھا تو وہ ذرا اور اسی بات پر اسے
مارنے پینے لگا۔ خالہ کا گھر پڑوس میں ہونے کے خیال سے
وہ اونچی آواز میں بات کر پاتی نہ اس کے مارنے پر آہ و بکا
کرتی۔ گھٹ گھٹ کر روتی اور روپیٹ کر چپ ہو جاتی، کوئی
اس کی فریاد سننے والا بھی نہ تھا۔ کپڑے لٹے، جوٹا، زیور،
سیر و تفریح کی تو اسے عاقب سے کوئی امید ہی نہ نظر آتی تھی۔

آہستہ آہستہ اس نے کھانے پینے کی کچھ بھی دینا شروع
کروی۔ وہ اس سے گھر کی ضرورت کا کوئی سامان لانے کو
کہتی تو وہ گالم گلوچ پر اتر آتا۔ ”تمہارے باپ نے کھاتا
نہیں کھلوار کھا ہے تمہارے نام کا میرے پیٹک میں۔“

وہ بے چارے تو کبھی اپنے نام کا کھاتا بھی نہیں
کھلوار کھاتا۔ ”ماہ نور حسرت سے کہتی۔

”ماہ نور حسرت سے کہتی۔

”ماہ نور حسرت سے کہتی۔

”ماہ نور حسرت سے کہتی۔

”ماہ نور حسرت سے کہتی۔

”ماہ نور حسرت سے کہتی۔

”ماہ نور حسرت سے کہتی۔

”ماہ نور حسرت سے کہتی۔

”ماہ نور حسرت سے کہتی۔

وہ دم بخود اس کا منہ دیکھنے لگی۔ اختلاف کی جرأت ہی نہ وہی تھی شوہر کے سخت رو نے اسے۔ وہ تو نفس میں گرفتار ایک پرندے کی طرح بے بس اور لاچار تھی۔
عاقب نے کہا۔ "اس کام کے لیے تمہیں کسی ڈاکٹر یا حکیم کے پاس جانے کی بھی ضرورت نہیں..... نیٹ پر دنیا کے ہر محلے کا محل موجود ہے..... سرسوج کرو۔"

عاقب نے نیٹ پر سرسوج کیا تو کسی ڈاکٹر یا حکیم کی مدد کے بغیر گھر میں ہی حمل ضائع کرنے کے ایک دو تیس بیسیوں طریقے اس کے علم میں آگئے اور اس نے ماہ نور کو تختہ مشق بنا ڈالا۔ دٹامن سی کے حامل رس وار پھلوں کی کثرت سے پنساہ کی جڑی بوٹیوں، ڈاکٹری ادویات اور سخت جسمانی مشقت تک اس نے حمل ضائع کرنے کا ہر طریقہ ہی تو وحان پان ہی ماہ نور پر آزما ڈالا۔ وہ گڑگڑاتی، منت سماجت کرتی کہ وہ اسے اس خوشی سے محروم کرنے کے لیے اسے یوں تختہ مشق نہ بنائے مگر وہ اپنے ہونٹوں پر انگلی دھر کر اسے خاموش رہنے کی ہدایت کرتا اور آنکھیں دکھاتا۔ دفتر جاتا تو باہر گیٹ پر تالا ڈال جاتا۔

حمل تو ضائع ہو گیا مگر ماہ نور موت کے دہانے پر جا پہنچی۔ اسے ایک نئی اسپتال میں داخل کرانا پڑا۔ وہ مرنے مرنے پہنچی اور جب اس نے اپنی معالج کے استفسار پر اسے وہ سب کچھ بتایا جو عاقب نے اسے حمل ضائع کرانے کے لیے استعمال کرایا تھا تو ڈاکٹر نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "تمہارا ہسپتال پانگھن تو نہیں ہے۔ اس نے تو تمہاری موت کی تیاری کر رکھی تھی۔" ماہ نور کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔
"خدا کا شکر ادا کرو کہ تم بچ گئی ہو..... مگر نقصان بہت ہوا ہے۔"

عاقب نے اسپتال ہی میں اس پر اپنا غصہ نکالا۔
"ڈاکٹر سے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ میرے شوہر کو ابھی بچہ نہیں چاہیے..... یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ میں نے گھر سے بھاگ کر شادی کی ہے ابھی بچہ نہیں پیدا کرنا چاہتی۔ ہو سکتا ہے اس سے بھی اچھا دوسرا کوئی مل جائے۔"
ماہ نور کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

"پھر وہی مگر مجھ کے آنسو..... نفرت ہے مجھے ان نسلوں سے۔" عاقب نے یہ سوچ کر بھی اس پر رحم نہ کھایا کہ وہ موت کی وادی میں جا کر پلٹی تھی۔ خدا جانے کس جنم کی دشمنی نکال رہا تھا وہ اس سے۔

تین دن اسپتال میں رہ کر وہ گھر واپس آئی تو عاقب کا منہ پھولا ہوا تھا اور اس کے منہ میں دونوں بھائیوں کی

آدی نہیں تھا بلکہ نفسیاتی مریض تھا جو اسے اذیت دینے میں تسکین یا تھکا یا شاید اسے اذیت دے کر وہ خاندان میں اپنی کھوئی عزت کا رنج نکالتا تھا۔ بے عزتی تو اس کی بھی ہوئی تھی۔ بہر حال وجہ جو بھی تھی۔ اس کا رویہ ماہ نور کے لیے انتہائی تکلیف دہ تھا۔

☆☆☆

ماہ نور امید سے ہو گئی۔ اسے امید بندھی کہ اب عاقب کا رویہ اس کے ساتھ بہتر ہو جائے گا۔ وہ یہ سوچ کر کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی تھی اس کے ساتھ اپنا غیر انسانی رویہ ترک کر دے گا۔ اس پر مہربان ہو جائے گا۔ اس کا خیال رکھے گا۔ اسے قابل اعتبار جانے گا مگر اس کی یہ امید خوش چہی ثابت ہوئی۔ دونوں بھائیوں نے ماہ نور کے امید سے ہونے کی خبر سن کر عاقب کو خوب تالا ڈالا۔

"بہت جلدی تھی تمہیں۔" عاقب نے ڈانٹا۔
"فیملی بڑھانے کی منصوبہ بندی دیکھ بھال کر کی جاتی ہے یار..... تمہارے پاس ابھی ہے کیا..... ابھی اتنا تو پتا نہیں ہے تمہیں کہ یہ عورت کب تک تمہارے پاس لگتی ہے۔" عاقب نے اپنی فرسٹ بگھاری۔

"یہ جو چالاک عورتیں ہوتی ہیں یہ مرد کے پیروں میں اولاد کی بیڑی ڈال کر اسے چھاتی ہیں..... ابھی اس چکر میں مت پڑو..... جس لڑکی نے اپنے خاندان کی عزت کی پروا نہیں کی۔ وہ تم سے کب وفا کرے گی۔"
عاقب نے تڑکا لگایا۔

دونوں بھائیوں نے اسے ماہ نور سے بدظن کرنے اور بچہ پیدا کرنے کے خلاف کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔

"اس جھنجٹ سے فوراً چھٹکارا حاصل کرو۔" عاقب نے صلاح دی۔

"ابارشن کرو یار۔" عاقب نے مشورہ دیا۔
"ابارشن؟"

"ہاں یار..... لیکن احتیاط سے..... کسی ڈاکٹر کا پتا کرو جو یہ کام کرتی ہو، شہر میں بہت سی ایسی کلینکس اور اسپتال ہیں جہاں یہ کام ہوتا ہے..... اسے لے جاؤ وہاں..... تجھوڑا خرچہ ضرور ہوگا مگر تمہاری جان چھوٹ جائے گی اور آئندہ ذرا احتیاط کرنا۔" عاقب نے صلاح دی۔

عاقب نے ماہ نور سے کہا۔ "مجھے ابھی بچہ نہیں چاہیے۔"
وہ اسے حیرانی سے دیکھنے لگی۔

"اسے ضائع کر اوتے ہیں۔"

مریض تھا یا بھائیوں کے اشاریوں پر ناچنے والا ایک بووا اور کمزور انسان۔ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ اس کی خانماں بربادی میں وہ اکیلا نہیں اس کے دونوں بھائی بھی شریک رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا وہ اس گھر سے نکل کر کہاں جائے۔ بدن کے تین کپڑوں میں وہ اپنی خالہ کے گھر سے اس گھر آئی تھی۔ اس گھر سے بھی اسے تین کپڑوں میں ہی لکٹا پڑا۔ نیچے زمین بھی اوپر آسمان اور ان دونوں کے بیچ اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرتی بے آسراء بے ٹھکانا ماہ لورا!

☆☆☆

دونوں بھائی بہت خوش ہوئے۔

”فرقان کو ضرور بتا دینا تاکہ کوئی اونچ نیچ ہو تو وہ سنبھال سکے۔“ ثاقب نے عاقب کو ہدایت کی۔

فرقان نے سنا تو اس نے عاقب کو بے نقط سنا لیا۔

”بے شرم آدمی تو نے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ بے چاری جائے گی کہاں۔“

”یہ تو اسے اپنی خالہ کے گھر سے نکلتے ہوئے خود سوچنا چاہیے تھا فرقان بھائی۔“ عاقب کو اپنے کیے پر ذرا حلال نہ تھا۔

”اب تو وہ تمہاری عزت تھی۔“ فرقان بھبھک کر بولا۔

”رہنے دیں فرقان بھائی ایسی عورتیں نہ آج آپ کی ہوتی ہیں نہ کل۔“ عاقب کے منہ میں بھائیوں کی زبان بول رہی تھی۔

”کیا نہیں کیا اس نے تمہارے لیے..... خاندان کی عورتوں نے اپنے واپسے اور مردوں نے اپنی ٹوپیاں ڈال دی تھیں اس کے قدموں میں..... وہ اگر اس وقت تمہارے خلاف بیان دے دیتی تو تم جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوتے۔“

”وہ خود آئی تھی..... کیسے دے سکتی تھی میرے خلاف بیان۔“ عاقب نے خود کو بے قصور ثابت کرنا چاہا۔

”تمہارے بلا نے پر آئی تھی۔“ فرقان جو ہمراز تھا شخص سے عاقب کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”مجھ سے کہہ سکتے ہو تم کہ یہ جھوٹ ہے۔“

وہ شرمندہ ہو کر بظلمت جھانکنے لگا۔

”کیا تصور تھا اس کا جو تم نے اسے طلاق دی۔“ فرقان نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

”اس نے گزارہ نہیں کرنا تھا فرقان بھائی وہ آوارہ تھی۔“

”یکو اس مت کرو۔“ فرقان گرجا۔

”ثاقب بھائی اور عاطف بھائی کی مرضی بھی یہی

رہا نہیں دھری تھیں۔“ اگر تمہیں شوہر کی عزت کا خیال ہوتا تو ڈاکٹر کے سامنے اسے بنگا کرنے کے بجائے کہتیں میں خود پریکٹسی ضائع کرنا چاہتی تھی..... اب میں تمہارا کیسے اعتبار کر سکتا ہوں کسی معاملے میں۔“

وہ چپ رہی..... کہتی تو کیا کہتی..... اس سے غلطی ہوئی تھی اور اسے اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنا واجب تھا۔

☆☆☆

”خوش قسمت تھے تم جو تمہاری جان چھوٹ گئی۔“ ثاقب نے کہا۔

”مگر کے بنگی ہے وہ۔“ عاقب نے بتایا۔

”مرجاتی تو اچھا تھا..... خس کم جہاں پاک۔“ عاطف نہایت بے رحمی سے بولا۔

”چھٹی کرو اس کی اور اپنی جان چھڑاؤ۔“ دونوں بھائیوں کی طرف سے اسے مشورہ دیا گیا۔ مگر اس کے گلے میں تو دو لاکھ روپے مہر کی پھونڈ رانگی ہوئی تھی۔

”یار اول لاکھ کی خاطر ساری زندگی گند کو تو اپنے سر پر نہیں رکھا جاسکتا..... لاکھ تم دینا پچاس پچاس ہزار ہم دونوں دے دیں گے۔“

اس نے سوچتے میں دیر نہ لگائی۔ البتہ یہ کہہ کر اپنی اوقات ضرور دکھا دی کہ دو لاکھ مہر فرقان کی ماہ لور سے خواہواہ کی ہمدردی کا شاخسانہ تھا۔

بھائیوں کی طرف سے رقم وصول ہونے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ اس نے پچھری جا کر طلاق نامہ تیار کروایا اور نہایت سفاکی سے اس بے آسرا لڑکی کے ہاتھ میں تھما دیا جس کے قدموں کی ایک لہزش نے اس کے قدموں تلے سے زمین ہی کھینچ لی تھی۔

”میرا تو کوئی ٹھکانا بھی نہیں میں کہاں جاؤں گی؟“ اس نے زار و قطار روتے ہوئے بے بسی سے کہا اور اس کے قدموں میں لوٹ گئی۔

”یہ تمہارا مسئلہ ہے میرا نہیں۔“ اس کی آنکھوں سے بے رحمی ٹپک رہی تھی۔ محبت تو خیر اس نے اس سے شاید کبھی بھی نہیں کی تھی۔ بس اپنے نفس کی تسکین کا آلہ کار بنائے رکھا تھا مگر ماہ نور کو اس سے اتنی سفاکی اور غیر انسانی رویہ کی توقع نہ تھی۔ وہ شدید رنج اور صدمے کی کیفیت میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اجنبیت کا پر تو اپنے چہرے پر لیے یہ وہ شخص تھا جسے

اس نے سوچے سمجھے پیارات کی تاریکی میں اپنی سب سے قیمتی متاع سونپ دی تھی۔ وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ اس کے سامنے کھڑا وہ شخص بے حس تھا یا بے رحم..... نفسیاتی

اس نے سوچے سمجھے پیارات کی تاریکی میں اپنی سب سے قیمتی متاع سونپ دی تھی۔ وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ اس کے سامنے کھڑا وہ شخص بے حس تھا یا بے رحم..... نفسیاتی

تھی۔“ اس نے وہی زبان سے کہا۔
 ”اس لیے کہ ان کی اپنی کوئی بہن نہیں تھی..... بھگتو
 گے تم سب بھگتو گے..... اور جلدی بھگتو گے..... آسمان والا
 اور پریشاں کچھ دیکھ رہا ہے..... وہ کئی کہاں؟“

”یار فرقان بھائی.....“ جربزد کھائی دیتے ہوئے وہ
 لفظ اتنا ہی کہہ سکا۔
 ”بیٹا! بھگتو گے ضرور..... تم سب بھگتو گے۔“ فرقان
 کے لیے میں یقین تھا مگر یہ اس کے اپنے گمان میں بھی نہیں تھا اس
 کے کہے پر مشیت ایزدی کی مہر اتنی جلد ثبت ہو جائے گی۔

☆☆☆

عارف صاحب کی طرف سے ان کے تینوں بیٹوں کو
 مکان کے ساتھ مرض دل بھی وراثت میں ملا تھا۔ اس مرض
 کے باعث عارف صاحب خود بھی محض چھپالیس سال کی عمر
 میں جہان فانی سے کوچ کر گئے تھے۔ ثاقب کو ان سے بھی
 کم عمر میں ہارٹ ایکٹ ہوا۔ وہ راحمہ اور اکلوتے بیٹے عاشر
 کے ساتھ سعودی عرب ہی میں تھا۔ وہیں میڈیکل ٹیسٹ
 ہوئے۔ رپورٹ آئی کہ دل کی تین شریانیں بند تھیں اور باکی
 پاس سرجری لازم۔ راحمہ کے سیکے والوں کی رائے ٹھہری کہ
 سرجری پاکستان میں کروائی جائے تاکہ مشکل وقت میں وہ
 بھی بیٹی داماد کے ساتھ کھڑے ہوں۔

سرجری کامیاب رہی مگر ثاقب کو سعودی عرب میں
 اپنی ملازمت کو خیر یا و کھنا پڑا۔ ماہ نور کو اس گھر سے کچھ
 زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ وہی راحمہ جو کبھی عاقب کی شادی
 اپنے خاندان کی کسی لڑکی سے کروانے کی خاطر عاقب کی
 پھوپھی زاد منگیتر نسرتین کی جڑیں کاٹنے کے درپے رہا کرتی
 تھی ماہ نور کے ساتھ عاقب کے ہمسایہ سلوک کے بعد اب
 اپنے خاندان کی کسی لڑکی کا تو کجا باہر کی کسی غیر لڑکی کا خیال
 بھی عاقب کے لیے اپنے دل میں لانے کو تیار نہ تھی۔ سعودی
 عرب جانے کے بعد بھی ثاقب اور عاقب سے چوری چھپے
 اس کی اور ماہ نور کی فون پر بات چیت رہا کرتی تھی۔ ماہ نور
 پر کیے جانے والے عاقب کے ہر ظلم و ستم بلکہ بربریت سے
 آگاہ تھی وہ اب بالخصوص ماہ نور کی پریشانی صابغ کرانا اور اس
 ہمسایہ اقدام کے لیے اسے جسمانی اور نفسیاتی ہر دو قسم کے
 تشدد سے دوچار کرنا، عاقب کا ایسا غیر انسانی سلوک تھا جس
 نے راحمہ کو عاقب سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔
 انسان کو درعدہ بنتے کے لیے برسوں کا سفر طے کرنے کی
 ضرورت نہیں ہوتی۔ بعض لوگ عاقب کی طرح نوجوانی میں
 بھی درندے بن جاتے ہیں۔

اپنے اور اپنی فیملی کے محفوظ مستقبل اور پرسکون
 زندگی گزارنے کی خاطر ثاقب نے برطانیہ میں جائے کی
 منصوبہ بندی کی اور برطانیہ چلا گیا۔ زیادہ نہیں چند ہی ماہ
 گزرے ہوں گے کہ ایک رات ایسا سویا دوبارہ زندگی سے

فرقان نے جڑے بھیج لیے۔ کچھ دیر ناقابل بیان
 ذہنی جھونچال سے دوچار کھڑا ہا پھر اس نے عاقب کے سینے
 پر ہلکے سے گھونسا سید کرتے ہوئے نہایت تحقیر سے کہا۔ ”تم
 سے اور تمہارے بھائیوں سے اچھی تو میری ماں رہی جس
 نے عورت ہونے کے باوجود اس لڑکی کو اس وقت اپنے گھر
 میں پناہ دی جب شاید کوئی بھی اس کے سر پر ہاتھ دھرنا
 مناسب نہ سمجھتا..... جانتے ہو کیوں..... کیونکہ اس کے اپنے
 گھر میں بیٹیاں تھیں اور دل میں خدا ترسی..... تم بد قسمت ہو
 کہ نہ تمہارے گھر میں بہنیں تھیں اور نہ دل میں خدا ترسی۔“
 ”مانسڈ نہ کیجیے گا فرقان بھائی..... اس راستے پر مجھے
 لگایا تو آپ ہی نے تھا۔“ عاقب نے اوچھا وار کرنے کی
 کوشش کی۔

”مجھے معلوم تھا ایک دن یہی کہو گے..... مجھ سے
 واقعی غلطی ہوئی۔ اس غلطی کی کچھ سزا تو میں بھگت چکا
 ہوں..... میری تم سے کیا رشتہ داری تھی جو ثاقب کے ساتھ
 پولیس مجھے بھی سمجھنے لے گئی..... حساب کتاب کیا تو سمجھ میں
 آ گیا کہ میرا حوالہ جانا میری اسی غلطی کی سزا تھی..... مجھے
 اب بھی جب اپنی غلطی کا خیال آتا ہے تو بہ کرتا ہوں اپنے
 اللہ کے حضور اور آگے کے لیے معافی مانگتا رہتا ہوں خدا
 سے..... یار تمہاری غلطی تو میری غلطی سے نہیں بڑی تھی.....
 اس لڑکی کو طلاق دے کر بے گھر اور بے آسرا کرتے ہوئے
 تمہیں اللہ سے ڈرا خوف نہیں آیا۔“

وہ چپ رہا پھر کچھ دیر بعد دھیمی آواز میں بولا۔ ”میرا
 خیال تھا وہ آپ کے گھر ہی جائے گی۔“

فرقان نے دھیر سے سے نشی میں سر ہلایا پھر کہا۔
 ”نہیں..... وہ میری طرف نہیں آئی..... اور ہاں ذرا یہ سوچ
 لیتا کہ اگر وہ اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں بھی نہیں گئی ہے
 تو..... آج تو وہ اس سے ناراض ہیں کل کلاں کو اگر انہوں
 نے پلٹ کر اس کی خیر خبر لینے کی کوشش کی تو تم انہیں کیا
 جواب دو گے۔“

عاقب نے شیشا کر اس کی طرف دیکھا۔
 ”کیا بتا رہے تھے؟ کہاں گئی وہ؟“ فرقان نے

نظریں نہیں ملا سکا۔

کی خالہ اور خالو کے گھر پر چھائی خاموشی سے محسوس ہوتا۔
وضیح دار اور اتنا پسند لوگ تھے۔ انہوں نے کبھی یہ دیکھنے یا
جاننے کی کوشش نہیں کی کہ ماہ نور کس حال میں تھی..... اور تھی
بھی کہ نہیں۔ معاشرے کے بدلے اطوار نے ہمسایوں کو
عاقب کے گھر میں خاتون خانہ کی خیر خبر لینے کی ضرورت ہی
محسوس نہ ہونے دی۔ ویسے بھی جو کچھ ہوا تھا اس کے بعد محلے
دار اس گھرانے سے دور دردی رہتے تھے۔

☆☆☆

گھر کے ستائے اور اپنی تنہائی سے تنگ آ کر عاقب
نے اخبار میں ضرورت رشتہ کا اشتہار دیا اور نہایت سادگی
اور خاموشی سے دوسری شادی کر کے آفریدہ کو گھر لے آیا۔
اس پاس آباد گھرانے اس کے ساتھ ایک نئی عورت کو گھر
سے باہر آتے جاتے دیکھ کر چونکے ضرور مگر کسی نے کچھ نہیں
پوچھا۔ بہر حال چھینے والی بات تھی نہیں سو بالآخر لوگوں کو پتا
چل ہی گیا کہ عاقب نے دوسری شادی کر لی تھی۔ کئی چلی
گئی تھی..... کہاں؟ کیوں؟ کسی نے پوچھنے کی ضرورت
محسوس نہیں کی تھی کہ ماہ نور کی خالہ اور خالو نے بھی نہیں.....
آخر لوگ اپنے بہت پیارے لوگوں کو وقتا کر، رد دھوکہ بھی تو
صبر کر ہی لیتے ہیں۔ ان عزت دار لوگوں نے بھی عدالت
سے آخری فیصلہ سننے کے بعد ماہ نور سے کہا تھا۔ ”آج کے
بعد تو ہمارے لیے مر گئی۔“

عاقب کا لوگوں سے میل جول بہت محدود ہو چکا تھا۔
فرقان سے بھی بس اس وقت تک تعلق رہا جب تک دونوں
ایک برائچ میں تھے۔ ماہ نور کو طلاق دینے کے بعد فرقان
نے عاقب سے بات چیت بہت کم کر دی تھی۔ پیشہ ورانہ
تعلقات کی مجبوری نہ ہوتی تو شاید فرقان اس سے بول چال
یا نکل ہی ختم کر دیتا۔ فرقان کی عاقب سے ناراضگی بے جا نہ
تھی۔ اس نے ایک کمزور اور بے آسرا لڑکی کو اپنے ظلم کا
نشانہ بنایا تھا۔ عاقب اپنی بیگ کی اس برائچ میں نہیں تھا
البتہ فرقان وہیں تھا اور تری پا کر برائچ نیچر بن چکا تھا۔

آفریدہ سے شادی سے قبل جب عاقب سے اس کے
گھر والوں کی بات چیت چل رہی تھی۔ آفریدہ سمیت تمام
اہل خانہ عاقب کے سامنے بڑی تہذیب اور نہایت شرافت
کے ساتھ پیش ہوتے رہے۔ شادی کے بعد ان کا اصل
روپ کھلا۔ آفریدہ سمیت اس کے گھر کے تمام افراد اسی
سایہ جماعت سے وابستہ تھے جس سے فرقان علی کی بھی
واپسائی تھی۔ آفریدہ کا ایک بھائی اس پارٹی کا نامی گراہی
کارکن تھا اور اس کی پارٹی راہنما تک براہ راست رسائی

عاطف جو دو بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ بڑے بھائی
کی موت کے بعد اس کا نم اپنے چچا اور ان کی فیملی کے ساتھ
مل بیٹھ کر بنانے کو رخصتہ اور بچوں کے ساتھ پاکستان آیا اور
اسے بھی ول کی تکلیف ہوئی۔ فوری سرجری لازم ٹھہری۔
آپریشن کامیاب رہا لیکن بعد میں کچھ ایسی پیچیدگیاں ہوئیں
کہ گوما میں چلا گیا۔ تقریباً دو ماہ زندگی سے بے نیاز بستر پر
پڑے رہنے کے بعد چل بسا۔

شوہر کے انتقال کے بعد رخصتہ نے اپنے سسرالی
گھر میں رہنے کے بجائے دونوں بچوں کے ساتھ اپنے میکے
میں رہنے کو ترجیح دی۔ اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد سسرالی
گھر میں رہ کر وہ اپنے اور بچوں کے لیے کوئی خطرہ مول نہ
لینا چاہتی تھی۔ عاطف نے جو اپارٹمنٹ خرید رکھا تھا۔ وہاں
وہ دو چھوٹے بچوں کے ساتھ رہ نہ سکتی تھی۔ میکے والوں نے
چاہا کہ اس کے بچوں کا دادا کے گھر میں حصہ مل جائے تو وہ
اپارٹمنٹ کو بھی فروخت کر کے اپنے میکے کے نزدیکی کوئی
گھر خریدنے لے مگر عاقب ان کا حصہ دینے پر تیار نہ ہوا۔ بلکہ
جب اس پر مکان میں بھائیوں کے پیسے بچوں کو ان کا جائز
حق دینے کے لیے واپس بڑھا تو وہ حق داروں کا حق ہڑپ
کرنے کے لیے سینہ ٹھونک کر کھڑا ہو گیا۔ ”کسی میں ہمت
ہے تو مکان بیچ کر دکھائے۔“ خود غرضی اور حرص و ہوس نے
اسے باڈا کروایا تھا۔

شوہر کی زندگی میں پر آسائش زندگی گزارنے والی
رخصتہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ والدین کے آسے کے
پر پڑی رہنے پر مجبور ہو گئی۔ اس کا تازہ و تکر خاک میں مل
گیا تھا۔ کبھی سوچا بھی نہ تھا اس نے کہ آنا فنا زندگی اتنی
بدل جائے گی سوچا تو اس کے شوہر نے بھی نہیں ہو گا اپنی
زندگی میں کہ ماہ نور کو طلاق و لوا کر اور گھر سے بے گھر
کرا کے وہ اپنے بال بچوں کے لیے کیسی تکلیف وہ زندگی
کا بیج بوجائے گا۔

راحہ کے مسائل دوسری نوعیت کے تھے۔ غریب
الوطنی، اپنوں سے دوری، اکیلا پن اور اکلوتے بیٹے کو منترنی
معاشرے کی بے اعتدالیوں سے محفوظ رکھنے کی فکر۔ سات
سمندر پار رہی اور اس کا بیٹا معاشرہ۔ ان کے دکھ سکھ میں کوئی
تیسرا ان کا سا بھی نہ تھا۔

باپ کے نہایت چاہ سے تعمیر کردہ مکان میں فقط
عاقب رہ گیا۔ اپنے گھر کے ستائے سے اس کا دل گھبراتا مگر
ان سے زیادہ خوف اسے اپنے گھر کی شخصی طرف واقع ماہ نور

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ تم کسی کو دھوکا دے کر یہ مت سمجھو کہ وہ کتابے و قوف تھا بلکہ یہ سوچو کہ اسے تم پر اعتبار کتنا تھا۔

☆ لوگوں کو اتنی ہی اہمیت دو جتنی وہ تمہیں دیتے ہیں۔ اگر کم دو گے تو ضرور کہلاؤ گے اور زیادہ دو گے تو گر جاؤ گے۔

☆ اپنی زبان کو کسی کے عیوب بیان کر کے آلودہ نہ کرو۔ اس لیے کہ عیب تو تم بھی رکھتے ہو اور زبان دوسروں کے پاس بھی ہے۔

☆ جو لوگ صرف اپنے کام کے وقت آپ کو یاد کرتے ہیں ان کے کام ضرور آیا کرو کیونکہ وہ اندھیروں میں روشنی ڈھونڈتے ہیں اور ان کے لیے وہ روشنی آپ ہو۔

☆ اگر تم اپنے سر کو ٹھنڈا اور اپنے پاؤں کو گرم رکھو گے تو تمہیں پوری زندگی کسی طیب کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

☆ انسان کی اصل موت اس وقت ہوتی ہے جب وہ کسی کے دل اور دعاؤں سے نکل جاتا ہے۔

مرسلہ۔ جاوید اختر رانا، حیدرآباد

تھی۔ شادی کے بعد عقدہ کھلا کہ آفریدہ کی بھی یہ پہلی نہیں دوسری شادی تھی حالانکہ شادی سے قبل اس کے گھر والوں نے عاقب پر یہی ظاہر کیا تھا جیسے وہ غیر شادی شدہ تھی۔ شادی کے بعد پتا چلا کہ آفریدہ کے پہلے شوہر نے اسے دو وجوہ کی بنا پر طلاق دی تھی۔ اولاً وہ نہیں چاہتا تھا کہ آفریدہ کسی بھی سیاسی جماعت کے لیے کام کرے۔ دوم اس کا ہاتھ ہونا۔

آفریدہ سے شادی کے بعد اس کی اور اس کے گھر والوں کی اصل حقیقت کھلتا عاقب کے لیے صیاد کے اپنے ہی دام میں آجانے کے مترادف تھی۔

ماہ نور کے برعکس آفریدہ معمولی شکل و صورت کی حامل تھی۔ نہ اسے بات کرنے کا سلیقہ تھا نہ گھر سنبھالنے کا قرینہ۔ دن بھر فون پر سیاست کرتی رہتی۔ ابھی ایک سے بات تو ابھی دوسرے سے راز و نیاز۔ عاقب کے بارے میں اسے چند ہی دنوں میں اندازہ ہو گیا تھا کہ بڑی بولا آدی ہے۔ پہلے اس نے اپنی زبان ورازی سے ان کے بڑبڑولے پن کی منڈیا مروڑی پھر اپنے اور اپنے گھر والوں یا مخصوص بھائی کے سیاسی اثر و رسوخ کا ہوا دکھا کر اسے اپنے کموں تلے لگا گیا۔ عاقب یہ قوف اور عاقبت نا اندیش ایسا کہ اس نے شادی کے ابتدائی دنوں ہی میں آفریدہ کو ماہ نور سے اپنے تعلق کی داستان اول تا آخر سنا دی تھی۔ اب وہ اٹھتے بیٹھتے اس سے کہتی۔ ”مجھے ماہ نور مت سمجھنا۔ میں تو تمہاری ہڈیوں کا شور بابتا کر پی جاؤں گی مگر اس گھر سے نہیں جاؤں گی۔“

عارف صاحب مرحوم نے یہ گھر بڑے ارمانوں سے اپنے تینوں بیٹوں کے لیے بنوایا تھا۔

آفریدہ کے گھر والوں کی رال تو اس گھر پر ای دن ایک بڑی بھی جب وہ شادی سے قبل عاقب کی دعوت پر اس گھر میں آئے تھے۔

”آتا بڑا لان ہے آفریدہ کہ تو پورے خاندان کو بھی دعوت پر بلائے گی تو کافی ہوگا۔“ آفریدہ کی ماں نے اس سے کہا تھا۔

”اور خالی گھر..... نہ ساس مندوں کا جھنجٹ نہ کسی دیورانی جیٹھانی کا دم چھلا۔“ آفریدہ کی بھالی بولی۔

”دو منتر لیس ہیں گھر کی جیسا نیچے دیا ہی اوپر..... بھی آفریدہ میں تو جب آؤں گا اور ہی بیٹھا کروں گا..... پہاڑ دکھائی دیتے ہیں اور پر سے۔“ آفریدہ کے باپ کی تندیگی اس کے لہجے سے چھلک رہی تھی۔

”اللہ بھوکچن، ہاتھ رومز، بیڈ رومز سب ہی بہت اچھا ہے۔“ آفریدہ کی بیٹی نے جو اپنے ماں باپ، چھ بہن بھائیوں اور پوڑھے دادا کے ساتھ دو کمروں کے ایک چھوٹے سے فلیٹ کی رہائش تھی عاقب کے گھر سے ہو کر آنے کے بعد نہایت رشک سے اپنی پھوپھی آفریدہ کو اس گھر کا احوال دیتے ہوئے کہا۔

”اور چنچن گھر میں کوئی بھی نہیں سوائے انکل کے..... آپ اکیلی کیسے رہیں گی اتنے بڑے گھر میں..... آپ کے ساتھ میں رہوں گا۔“ بیٹی نے اپنی خدمات پیش کیں۔

شادی کے بعد آفریدہ نے عاقب سے پہلی فرمائش تو یہ کی کہ اسے گھر کے کام کرنے کے لیے ایک فل ٹائم ملازمہ کی سہولت فراہم کی جائے پھر اس نے کھانے پینے کے لیے نت نئی چیزوں کی فرمائش شروع کی، آئے دن نئے کپڑوں،

جوتوں اور کا سٹیبلز کی خریداری معمول بن گیا۔ ناپسند اور پرانی چیزیں جو نئی جیسی ہی ہوتیں وہ تھیلے بھر بھر کر اپنی بہنوں اور بھانجیوں بھتیجیوں کے لیے بیگے پہنچاوتی۔ عاقب اعتراض کرتا تو وہ منہ پھلاکتی۔ کبھی لڑنے بھی لگتی اور اس کی تانن بالآخر اس بات پر ٹوٹی۔ ”مجھے ماہ نور سمجھنے کی ضرورت نہیں..... اس کے تو آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ مجھے بہت ہیں پوچھنے والے۔ مجھے کسی نے ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھا تو اللہ رکھے میرا بھائی حمید ہی کافی ہے نمٹنے کے لیے۔“ عاقب کو تو اس کی شکل ہی سے خوف آتا تھا۔ شادی کی بات چیت کے زمانے میں وہ اپنی کسی ایکٹیویٹی کے بعد روپوش نہ ہوتا اور عاقب کو اپنی برعنائی کرا دیتا تو شاید عاقب اس کی صورت سے ڈر کر ہی اس کی بہن سے شادی کا خیال ترک کر دیتا۔ بہر حال ماہ نور کے بعد اس کا دوسرا جوڑو ہیں لکھا تھا، کون نال سکتا تھا۔

شادی کے بعد حمید منظر عام پر آیا تو اس نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر آفریدہ سے کہا۔ ”واہ باجی! تمہاری تو قسمت کھل گئی..... مقدر کی سکندر بن گئیں تم تو..... ایسا گھر تو اپن نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا..... بس اب تم فوراً اسے اپنے نام کروانے کی کرو۔“

آفریدہ اور اس کے گھروالوں نے عاقب سے یہ فرمائش بڑے پیار سے کی۔ وہ پہلے تو چونکا پھر اس نے انہیں ٹرخانے کو کہا۔ ”گھر آفریدہ ہی کا ہے جب وقت آئے گا نام بھی ہو جائے گا۔“

”گھر نام کرنے کے لیے وقت کیا دیکھنا۔ پکھری جاؤ لکھت پڑھت کراؤ..... اللہ اللہ خیر سلا۔“ آفریدہ کی ماں نے کہا۔

”ٹھیک ہے امی..... کر لیں گے۔“ عاقب نے انہیں نالنے کی کوشش کی۔

گھر آفریدہ کے نام کرنے کے لیے عاقب پر آفریدہ اور اس کے گھروالوں کا دباؤ روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا۔ ناچار عاقب کو اس حقیقت سے انہیں آگاہ کرنا پڑا جس سے وہ اب تک خود نظریں چراتا رہا تھا۔ ”یہ گھر صرف میرا نہیں اس میں میرے دونوں بھائیوں کے بچوں کا حصہ بھی ہے۔“ اس نے انہیں بتایا۔

”مرنے والے مر گئے اب کسی کا کوئی حصہ و حصہ نہیں۔“ آفریدہ کا بھائی آفریدہ کی حمایت میں ہاتھ نچاتا عاقب کے سامنے آیا۔

یہ سب نہیں کہہ رہا..... شریعت کہہ رہی ہے قانون

کہہ رہا ہے۔“ عاقب نے تڑپ کا پتا پھینکا۔ ”ارے چلو چلو..... اور کتنی شریعت کی پابندی کر رہے ہو تم..... قانون کو بھی دیکھ لیں گے..... لوگوں کے زعمہ ہوتے ان کی جائدادیں دوسروں کے نام ہو جاتی ہیں تم گڑے مردوں کو رو رہے ہو۔“ حمید استہزائیہ انداز میں بولا۔

”حمید بھائی! کورٹ جائیں گے تو وہ وراثت نامہ اور نہ جانے کیا کچھ مانگیں گے۔ تمام ورثا کو بلائیں گے..... قانون بہر حال قانون ہوتا ہے۔“

حمید نے عاقب کو دیکھا۔ دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔ ”عاقب بھائی قانون کی آنکھوں میں مرجیں جھونک کر اسے اندھا کرنا آتا ہے ہمیں..... تم بس نوٹ ڈھیلے کرو گھر باجی کے نام کروانا میری ذمہ داری۔“

”یار! بھابھیاں اور ان کے بچے آکر میرا گریبان پکڑ لیں گے۔“

”اپنا کے ہوتے کوئی ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا تمہیں۔“

”نہیں حمید میں تمہیں کے حق پر ڈاکا نہیں ڈال سکتا۔“

سیدھی آنکھوں سے کبھی ٹپکتے نہ دیکھ کر حمید نے تھور بدل لیے۔ ”عاقب بھائی تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ بندے کو نی الفور پار کر دیتا ہوں میں۔“ اس نے عاقب کو آنکھیں دکھائیں۔

عاقب فطرتاً بزدل آدمی تھا۔ کو وقت اور تجربے نے اسے گرگ دیدہ بنا دیا تھا مگر اندر سے وہ بزدل ہی تھا۔ حمید نے تھور بدلے تو اس کا پتا پانی ہونے لگا۔ وراثت کی قانونی پیچیدگیوں سے آگاہ تھا۔ جانتا تھا مکان آفریدہ کے نام ہونا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں تھا۔

مگر حمید نے کہا۔ ”یہاں سب کچھ ہو جاتا ہے۔“ قانونی پیچیدگیوں سے آگاہ عاقب نے اس خیال سے اسے فری وینڈ دے دیا کہ وہ منہ کی کھائے گا مگر حمید نے سچ کہا تھا۔ پکھری میں بیٹھے گرگوں سے ساز باز کر کے اس نے بالآخر مکان آفریدہ کے نام کروالیا۔ عاقب دیکھتا رہ گیا۔ یہی نہیں اپنی اس غیر معمولی خدمت کے صلے میں حمید مکان کی بالائی منزل پر بھی قابض ہو گیا اور اسے اپنا سیاسی گڑھ بنا لیا۔ طرح طرح کے لوگ دعتا تے ہوئے گھر میں آتے اور اوپر چڑھ جاتے۔ عاقب اعتراض کرتا تو آفریدہ کہتی۔ ”گھر میرا ہے آپ کو کیا تکلیف۔“

عاقب کے اعتراضات حمید تک پہنچے تو وہ سینہ پھلائے عاقب کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ”دیکھو عاقب

”بکھی سوچا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا تمہارے ساتھ؟“ فرقان نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔
اس نے چونک کر فرقان کو دیکھا پھر دھیرے سے بولا۔ ”آپ بھی کہیں کے ماہ نور کی وجہ سے۔“
”تو کیا غلط کہوں گا؟“ فرقان نے کہا۔
”فرقان بھائی اس کی وجہ سے ہم سارے خاندان سے کٹ گئے تھے۔“ عاقب بولا۔
”تو کیا اب جڑ گئے۔“

عاقب نے سر جھکا لیا۔
”اس بے چاری کے لیے تو تم نے دنیا ہی تنگ کر دی یار..... بے عزتی، گالم گلوچ، مار پیٹ، تنگی، تشدد، کون سا ظلم تھا جو تم نے اس پر نہیں کیا..... یار! اپنے ہی بچے کو تم نے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی مار ڈالا۔“
عاقب نے بے ساختہ چونک کر فرقان کی طرف دیکھا کہ یہ بات اسے کیوں مضمون ہوئی۔ وہ اس جرم سے انکار تو نہیں کر سکتا تھا۔

”عاقب بھائی اور عاقب بھائی نہیں چاہتے تھے کہ ماہ نور کو آزمائے بغیر میں اتنی جلدی بچوں کے چکر میں پڑ جاؤں۔“

”اپنی بیویوں کے ساتھ انہوں نے ایسا کیا؟“
فرقان کے لہجے میں کئی تھی۔ ”معاف کرنا کہ میں مرحومین کے بارے میں ایسا کہنے پر مجبور ہوں..... سفاک وہ بھی تھے اور بے رحم تم بھی۔“ وہ ایک لمحے کو رکا۔ ”انجام؟“ اس نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ ”تم نے اپنی اولاد گنوائی تو ان کی اپنی اولاد بن باپ کے رہ گئی..... یار! رب سوہنا بندوں کی خطاؤں پر لٹھے لے کر مارنے نہیں آتا، ایسے ہی ہماری پکڑ کرتا ہے..... بات سمجھنے کی ہوتی ہے بس..... انسان کو کبھی بھی اپنا احتساب کرتے رہنا چاہیے..... افضل تو یہ ہے کہ ہر رات بستر پر لیٹنے سے قبل..... کیا سمجھے؟“

”جی فرقان بھائی۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا۔
”مہر کے دو لاکھ روپے اس کے ہاتھ میں تھا کر اور اسے اپنے گھر سے نکال کر تم نے تو شاید یہ سمجھا ہو کہ اس بے بس لڑکی کا کوئی حق تم نے اپنے ذمہ نہیں رکھا..... مگر جانتے ہو تمہاری بے رحمی نے جو تم نے اس پر پختہ سی ضائع کرانے کے لیے آزمائی اسے کیسا ناقابل تلافی نقصان پہنچایا؟“

عاقب اسے ابھی ابھی نظروں سے دیکھنے لگا۔
”وہ دو بارہا ماں بننے کے لائق نہیں رہی۔“
عاقب چونکا۔

بھائی! اپن سے پنکا لینے کی ضرورت نہیں۔ بھائی بن کر رہو کے تو سر آنکھوں پر رکھوں گا..... نظر بگاڑی تو نا میں تا میں قش کیا سمجھے۔“
”شرم نہیں آتی بہنوئی کو دھمکی دے رہے ہو۔“
عاقب نے اخلاقی حربہ آزمایا۔
”بہنوئی بھی تو بہنوئی بن کر رہے بھائی میاں۔“ حمید استہزائیہ لہجے میں بولا۔

”کیوں! میں نے کیا کیا ہے؟“
”پورے مکان کی مالک بنا دیا آپ کی پیگم کو اور آپ احسان ماننے کے بجائے آنکھیں دکھا رہے ہو۔“
”کوئی احسان نہیں کیا..... میری پیگم تمہاری بہن بھی ہے۔“

”ہاں تو جب میری بہن کو اس گھر میں میرے آنے جانے پر اعتراض نہیں تو آپ کو اعتراض کیوں بھائی میاں!“
”میں نہیں چاہتا کہ تمہاری وجہ سے میرے گھر میں تمہاری پارٹی کے لوگ آئیں جائیں۔“
”وہ تو آئیں گے..... جہاں ہم ہوں گے وہاں پارٹی کے لوگ بھی ضرور آئیں گے۔“
”دیکھو مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں۔“

”آپ کی پسند نا پسند سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا..... گھر ماجی کا ہے اگر وہ منع کریں تو میں.....“ حمید نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

عاقب جانتا تھا آفریدہ اسے منع نہیں کرے گی۔
سات بہن بھائیوں میں حمید تو اس کی جان تھا۔
حمید اپنے ہاتھ پاؤں دن بہ دن پھیلاتا ہی چلا گیا۔ بالائی منزل پر ایک حصے میں اس نے اپنی ”گرل فرینڈ“ کے ساتھ رہائش اختیار کر لی اور ایک حصے کو سیاسی بیٹھک بنا لیا۔

اپنے گھر میں قماش قماش کے لوگوں کی آمد و رفت روکنے کے لیے عاقب نے نہ چاہتے ہوئے بھی فرقان علی کی مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ پارٹی کے بااثر لوگوں میں سے تھا۔ نیچے سے اوپر تک اس کی بات سنی جاتی تھی۔ حمید کے خلاف وہی اس کی مدد کر سکتا تھا۔

☆☆☆

عاقب طویل عرصے بعد فرقان سے ملا تھا۔ اس نے اپنے مسائل کی روداد فرقان کو سنا دی تھی اور اب اس کی مدد کا طالب تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ☆ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ☆ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ☆ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ☆ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ☆ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ☆ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ☆ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ☆ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ☆ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ☆ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ☆ سیریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کپریڈ کوالٹی
- ☆ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ☆ ایڈفری لنکس، لنکس کو ایسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan



Like us on Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

جو توں اور کا سٹیٹس کی خریداری معمول بن گیا۔ ناپسند اور پرانی چیزیں جوئی جیسی ہی ہوتیں وہ تھیلے بھر بھر کر اپنی بہنوں اور بھانجیوں بھتیجیوں کے لیے میکے پہنچاوتی۔ عاقب اعتراض کرتا تو وہ منہ پھلا لیتی۔ کبھی لڑنے بھی لگتی اور اس کی تان بالآخر اس بات پر ٹوٹتی۔ ”مجھے ماہ نور سمجھنے کی ضرورت نہیں..... اس کے تو آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ مجھے بہت ہیں پوچھنے والے۔ مجھے کسی نے ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھا تو اللہ رکھے میرا بھائی حمید ہی کافی ہے نمٹنے کے لیے۔“ عاقب کو تو اس کی شکل ہی سے خوف آتا تھا۔ شادی کی بات چیت کے زمانے میں وہ اپنی کسی ایکٹوٹی کے بعد روپوش نہ ہوتا اور عاقب کو اپنی رونمائی کرا دیتا تو شاید عاقب اس کی صورت سے ڈر کر ہی اس کی بہن سے شادی کا خیال ترک کر دیتا۔ بہر حال ماہ نور کے بعد اس کا دوسرا جوڑ دہیں لکھا تھا کون ٹال سکتا تھا۔

شادی کے بعد حمید منظر عام پر آیا تو اس نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر آفریدہ سے کہا۔ ”واہ باجی! تمہاری تو قسمت کھل گئی..... مقدر کی سکندر بن گئیں تم تو..... ایسا گھر تو اپن نے بھی سوچا بھی نہیں تھا..... بس اب تم فوراً اسے اپنے نام کروانے کی کرو۔“

آفریدہ اور اس کے گھر والوں نے عاقب سے یہ فرمائش بڑے پیار سے کی۔ وہ پہلے تو چونکا پھر اس نے انہیں ٹرخانے کو کہا۔ ”گھر آفریدہ ہی کا ہے جب وقت آئے گا نام بھی ہو جائے گا۔“

”گھر نام کرنے کے لیے وقت کیا دیکھنا۔ پکھری جاؤ کھت پڑھت کراؤ..... اللہ اللہ خیر سلا۔“ آفریدہ کی ماں نے کہا۔

”ٹھیک ہے امی..... کر لیں گے۔“ عاقب نے انہیں تاننے کی کوشش کی۔

گھر آفریدہ کے نام کرنے کے لیے عاقب پر آفریدہ اور اس کے گھر والوں کا دباؤ روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا۔ ناچار عاقب کو اس حقیقت سے انہیں آگاہ کرنا پڑا جس سے وہ اب تک خود نظریں چراتا رہا تھا۔ ”یہ گھر صرف میرا نہیں اس میں میرے دونوں بھائیوں کے بچوں کا حصہ بھی ہے۔“ اس نے انہیں بتایا۔

”مرنے والے مر گئے اب کسی کا کوئی حصہ وقتہ نہیں۔“ آفریدہ کا بھائی آفریدہ کی حمایت میں ہاتھ نچا تا عاقب کے سامنے آیا۔

یہ میں نہیں کہہ رہا..... شریعت کہہ رہی ہے قانون

کہہ رہا ہے۔“ عاقب نے تڑپ کا پتا پھینکا۔
”ارے چلو چلو..... اور کتنی شریعت کی پابندی کر رہے ہو تم..... قانون کو بھی دیکھ لیں گے..... لوگوں کے زندہ ہوتے ان کی جائدادیں دوسروں کے نام ہو جاتی ہیں تم گڑے مردوں کو رو رہے ہو۔“ حمید استہزائیہ انداز میں بولا۔

”حمید بھائی! کورٹ جائیں گے تو وہ دراجت نامہ اور نہ جانے کیا کچھ مانگیں گے۔ تمام درتا کو بلا لیں گے..... قانون بہر حال قانون ہوتا ہے۔“

حمید نے عاقب کو دیکھا۔ دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔ ”عاقب بھائی قانون کی آنکھوں میں مر چیں جھونک کر اسے اندھا کرنا آتا ہے ہمیں..... تم بس نوٹ ڈھیلے کرو گھر باجی کے نام کر دانا میری ذمہ داری۔“

”یار! بھابھیاں اور ان کے بچے آکر میرا گریبان پکڑ لیں گے۔“

”اپن کے ہوتے کوئی ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا نہیں۔“
”نہیں حمید میں تیسوں کے حق بڑا کا نہیں ڈال سکتا۔“

سیدھی آنکھوں سے کبھی نکلتے نہ دیکھ کر حمید نے حور بدل لیے۔ ”عاقب بھائی تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ بندے کو فی الفور پار کر دیتا ہوں میں۔“ اس نے عاقب کو آنکھیں دکھائیں۔

عاقب فطرتاً بزدل آدمی تھا۔ گو وقت اور تجربے نے اسے مرگ دیدہ بنا دیا تھا مگر انداز سے وہ بزدل ہی تھا۔ حمید نے حور بدلے تو اس کا پتا پانی ہونے لگا۔ دراجت کی قانونی پیچیدگیوں سے آگاہ تھا۔ جانتا تھا مکان آفریدہ کے نام ہونا کوئی خالد جی کا گھر نہیں تھا۔

مگر حمید نے کہا۔ ”یہاں سب کچھ ہو جاتا ہے۔“
قانونی پیچیدگیوں سے آگاہ عاقب نے اس خیال سے اسے فری ہینڈ دے دیا کہ وہ منہ کی کھائے گا مگر حمید نے سچ کہا تھا۔ پکھری میں بیٹھے گروں سے ساز باز کر کے اس نے بالآخر مکان آفریدہ کے نام کر دایا۔ عاقب دیکھتا رہ گیا۔ یہی نہیں اپنی اس غیر معمولی خدمت کے صلے میں حمید مکان کی بالائی منزل پر بھی قابض ہو گیا اور اسے اپنا سیاسی گڑھ بنا لیا۔ طرح طرح کے لوگ دندنا تے ہوئے گھر میں آتے اور اوپر چڑھ جاتے۔ عاقب اعتراض کرتا تو آفریدہ کہتی۔ ”گھر میرا ہے آپ کو کیا تکلیف۔“

عاقب کے اعتراضات حمید تک پہنچے تو وہ سینہ پھلائے عاقب کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ”دیکھو عاقب

اپنے

بھائی! اپن سے پنگا لینے کی ضرورت نہیں۔ بھائی بن کر رہو گے تو سر آنکھوں پر رکھوں گا..... نظر بگاڑی تو ٹائیس ٹائیس فٹ! کیا سمجھے۔“

”شرم نہیں آتی بہنوئی کو دھمکی دے رہے ہو۔“

عاقب نے اخلاقی حربہ آزمایا۔

”فرقان نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ اس نے چونک کر فرقان کو دیکھا پھر دھیرے سے بولا۔“ آپ بھی کہیں گے ماہ فور کی وجہ سے۔“

”تو کیا غلط کہوں گا؟“ فرقان نے کہا۔

”فرقان بھائی اس کی وجہ سے ہم سارے خاندان سے کٹ گئے تھے۔“ عاقب بولا۔

”تو کیا اب جڑ گئے۔“

”بہنوئی بھی تو بہنوئی بن کر رہے بھائی میاں۔“ حمید استہزائیہ لہجے میں بولا۔

”کیوں امیں نے کیا کیا ہے؟“

عاقب نے سر جھکا لیا۔

”اس بے چاری کے لیے تو تم نے دنیا ہی تنگ کر دی یار..... بے عزتی، گالم گلوچ، مار پیٹ، دنگی تشدد، کون سا ظلم تھا جو تم نے اس پر نہیں کیا..... یار! اپنے ہی بچے کو تم نے اس دنیا میں آنے سے پہلے ہی مار ڈالا۔“

”پورے مکان کی مالک بنا دیا آپ کی بیگم کو اور آپ احسان ماننے کے بجائے آنکھیں دکھا رہے ہو۔“

”کوئی احسان نہیں کیا..... میری بیگم تمہاری بہن بھی ہے۔“

عاقب نے بے ساختہ چونک کر فرقان کی طرف دیکھا کہ یہ بات اسے کیونکر معلوم ہوئی۔ وہ اس جرم سے انکار تو نہیں کر سکتا تھا۔

”ہاں تو جب میری بہن کو اس گھر میں میرے آنے جانے پر اعتراض نہیں تو آپ کو اعتراض کیوں بھائی میاں!“

”عاقب بھائی اور عاقب بھائی نہیں چاہتے تھے کہ ماہ فور کو آزمائے بغیر میں اتنی جلدی بچوں کے چکر میں پڑ جاؤں۔“

”میں نہیں چاہتا کہ تمہاری وجہ سے میرے گھر میں تمہاری پارٹی کے لوگ آئیں جائیں۔“

”وہ تو آئیں گے..... جہاں ہم ہوں گے وہاں پارٹی کے لوگ بھی ضرور آئیں گے۔“

”اپنی بیویوں کے ساتھ انہوں نے ایسا کیا؟“

فرقان بے لہجے میں ٹپکی۔ ”معاف کرنا کہ میں مرحومین کے بارے میں ایسا کہنے پر مجبور ہوں..... سفاک وہ بھی تھے اور بے رحم تم بھی۔“ وہ ایک لمحے کو رکا۔ ”انجام؟“ اس نے سوالیہ لہجے میں کہا۔ ”تم نے اپنی اولاد گنوا لی تو ان کی اپنی اولاد بن باپ کے رہ گئی..... یار! رب سوہنا بندوں کی خطاؤں پر لٹھ لے کر مارنے نہیں آتا، ایسے ہی ہماری پکڑ کرتا ہے..... بات سمجھنے کی ہوتی ہے بس..... انسان کو بھی اپنا احتساب کرتے رہنا چاہیے..... افضل تو یہ ہے کہ ہر رات بستر پر لیٹنے سے قبل..... کیا سمجھے؟“

”دیکھو مجھے یہ سب کچھ پسند نہیں۔“

”آپ کی پسند ناپسند سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا..... گھر باجی کا ہے اگر وہ منع کریں تو میں.....“ حمید نے جملہ اٹھوڑا چھوڑ دیا۔

”جی فرقان بھائی۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا۔

”مہر کے دو لاکھ روپے اس کے ہاتھ میں تمہا کر اور اسے اپنے گھر سے نکال کر تم نے تو شاید یہ سمجھا ہو کہ اس بے بس لڑکی کا کوئی حق تم نے اپنے ذمہ نہیں رکھا..... مگر جانتے ہو تمہاری بے رحمی نے جو تم نے اس پر پریکٹسی ضائع کرانے کے لیے آزمائی اسے کیسا ناقابل تلافی نقصان پہنچایا؟“

عاقب جانتا تھا آفریدہ اسے منع نہیں کرے گی۔

سات بہن بھائیوں میں حمید تو اس کی جان تھا۔

عاقب نے بے دن پھیلاتا ہی چلا گیا۔ بالائی منزل پر ایک حصے میں اس نے اپنی ”گرل فرینڈ“ کے ساتھ رہائش اختیار کرنی اور ایک حصے کو سیاسی بیٹھک بنا لیا۔

اپنے گھر میں قماش قماش کے لوگوں کی آمد و رفت روکنے کے لیے عاقب نے نہ چاہتے ہوئے بھی فرقان علی کی مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ وہ پارٹی کے بااثر لوگوں میں سے تھا۔ نیچے سے اوپر تک اس کی بات سنی جاتی تھی۔ حمید کے خلاف وہی اس کی مدد کر سکتا تھا۔

☆☆☆

عاقب اسے ابھی ابھی ابھی نظروں سے دیکھنے لگا۔

”وہ دوبارہ ماں بننے کے لائق نہیں رہی۔“

عاقب طویل عرصے بعد فرقان سے ملا تھا۔ اس نے اپنے مسائل کی روداد فرقان کو سنا دی تھی اور اب اس کی مدد کا عاقب شاید.....

عاقب چوٹکا۔

Section

خوردگی سے۔ فرقان نے ایک گہری اور لمبی سانس کھینچی پھر بوجھل آواز میں بولا۔ ”ہم سب اپنے اپنے بوائے کی فصل کاٹتے ہیں عاقب..... گو میں پارٹی معاملات سے آج کل لاتعلق ہو چکا ہوں لیکن پھر بھی تمہارے سارے کولگام دلوانے کی کوشش کروں گا..... کوشش کروں گا، اسے وعدہ مت سمجھنا..... اور کوشش بھی اس لیے کہ تمہارا بھائی ثاقب میرا بہت اچھا دوست رہا۔“

”تھیک یو ویری مج فرقان بھائی۔“

عاقب جانے کو اور فرقان اسے رخصت کرنے کو اٹھا۔ دروازے کے نزدیک پہنچ کر عاقب ٹھنک گیا اور ہچکچاتے ہوئے نہایت دل گرفتگی سے بولا۔ ”بہت بے سکون ہوں فرقان بھائی..... آپ کی کبھی اس سے ملاقات ہو تو کہیے گا مجھے معاف کر دے..... بلکہ انہیں بھی جو اس دنیا میں نہیں رہے۔“

”اوکے..... موقع ملا تو کہہ دوں گا۔“ فرقان نے کہا۔

”میں نے اس کے ساتھ واقعی بہت زیادتی کی۔“ عاقب سر جھکا کر ندامت سے بولا۔ ”بہت پچھتا تا ہوں اب۔“ فرقان نے ایک لمبی اور گہری سانس کھینچی۔ ”یہ تمہارا نہیں ہم انسانوں کا مشقہ کہ الیہ ہے..... جب چیزیں ہماری دسترس میں اور لوگ ہمارے ساتھ ہوتے ہیں تو ہم اکثر ان کی قدر نہیں کرتے..... انہیں کھو کر پچھتاتے ہیں۔“

”پتا نہیں خدا مجھے معاف کرے گا یا نہیں۔“ عاقب کی آواز بھرا رہی تھی۔

”یار ایہ تو ہم میں سے کوئی بھی نہیں جانتا کہ خدا اس کے ساتھ کیا معاملہ کرے گا..... فقط امید ہے اس کی رحمت کی جو ہمارے دل کو اس وقت بھی سہارا دے رکھتی ہے جب تمام سہارے ٹوٹ جاتے ہیں۔“ فرقان نے ایک پل کو توقف کیا پھر کہا۔ ”مگر توبہ اور معافی سچے دل کے ساتھ شرط ہے۔“

عاقب نے ایک نظر فرقان کو دیکھا۔ فرقان کو اس کی نگاہوں میں پچھتاوا، دکھ اور شرمندگی کے ساتھ کشمکش کی وہ کیفیت نظر آئی جو نتیجے کا انتظار کرتے اس طالب علم کی نگاہوں میں دکھائی دیتی ہے جس کے پرچے اچھے نہ ہوئے ہوں فقط سخن کی مہربانی کی آس ہو۔

”چلتا ہوں فرقان بھائی۔“ اس نے بوجھل آواز میں کہا لیکن جانے سے پہلے اس کا سر جھک گیا۔ اتنا کہ عرق ندامت کے قطرے اس کے گریبان پر ٹپکنے لگے۔

”اور یہ شاید اس کی اس غلطی کی سزا ہے جو اس بے وقوف لڑکی نے اس رات اپنی خالہ کے گھر سے تمہارے گھر آ کر اور اپنے خاندان کی ناموس کو داؤ پر لگا کر کی تھی۔“

عاقب گوگو کیفیت سے دوچار دکھائی دیتے لگا۔ کچھ دیر ان کے درمیان خاموشی حائل رہی اور فرقان اسے تنگیوں سے کچھ اس طرح دیکھتا رہا جیسے اس کے بولنے کا منتظر ہو پھر اس نے خود ہی اس خاموشی کو توڑا۔ ”تم نے یہ نہیں پوچھا مجھے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا۔“

عاقب نے پہلو بدلا اور اس کی آنکھوں میں چمک سی لبرائی۔ ”جی..... میں یہی پوچھنا چاہتا تھا مگر.....“

”بہت نہیں ہوئی۔“ وہ مردہ سی آواز میں بولا۔

”مرد ہو تو فرو جرم کا سامنا کرنے کی ہمت رکھنی چاہیے۔“ فرقان کی بات عاقب کو گالی کی طرح لگی۔

”تمہارے گھر سے نکالے جانے کے بعد اس کا اپنے گھر والوں کے پاس جانے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ وہ کئی دن ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی رہی..... کبھی کسی مسجد کے خواتین کی نماز کے لیے وقف حصے میں دن گزارا تو کبھی کسی اسپتال کی راہداری میں پڑ کر رات بسر کی۔ کبھی رانا ہی اداروں کا رخ کیا اور اندر جائے بغیر ہی گھبرا کر پلٹ آئی۔ ایک روز دن کے وقت مسجد میں تھی کہ کئی دن سے تقاب کرتا شیطان اس پر حملہ آور ہوا۔ براساں ہو کر بھاگی اور اس نے میری والدہ کے پاس آ کر دم لیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس نے ایک ماں کے سائے میں پناہ لی ورنہ فرشتہ ہونے کا دعویٰ تو میں بھی نہیں رکھتا۔“

عاقب نے پھر چونک کر اسے دیکھا۔

”ہاں یار..... شیطان تو ہر آدمی کے اندر بست ہے۔“

فرقان نے بے لاگ کہا۔

”پھر؟“ عاقب اتنا ہی کہہ سکا۔

”پھر اس نے والدہ کو وہ سب کچھ بتایا جو اس کے ساتھ تمہارے گھر میں ہوتا رہا..... کچھ عرصہ وہ ہمارے گھر رہی پھر والدہ نے کوشش کر کے اس کا نکاح اپنے دور پار کے ایک رشتہ دار سے کرادیا جس کی بیوی مرچنگی تھی اور اسے اپنے مین پیجوں کے لیے ماں کی ضرورت تھی۔“

عاقب کچھ دیر سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا پھر اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ ”خوش ہے؟“

”خوش ہوں؟“ فرقان نے اتنا سوال داغا۔

اس کے دھیرے سے نگیں میں سر ہلایا..... شکست

اسماء الحسنیٰ - کامیابی کا راستہ

روزِ اسلام کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

پیر شہاد محمد قادری



پیر شہاد محمد قادری ناجی ہاشمی گذشتہ 22 برسوں سے اسماء الحسنیٰ کے حوالے سے زندگی میں درپیش تمام مسائل اور پریشانیوں کے حل کے لئے اسماء الحسنیٰ کی فلاحی کتبیں لکھتے ہیں اور آیات قرآنی کے ذریعے روحانی علاج کے حوالے سے دنیا بھر میں شہرت یافتہ ہیں۔ اب کے پروگرام اسماء الحسنیٰ کامیابی کا راستہ، انگریزی اور فارسی زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔ اب اپنے مسائل اور پریشانیوں میں برادراہ اسے بذریعہ خط اور ملاقات راد نمائی لے سکتے ہیں۔

موتے اس جہاں سے گزرتی تھیں لیکن آپ نے ان کی کوئی فہم نہیں کی۔ آپ کی والدہ نے مجھے سو ایسے عقیدے کوئی بدو بتائیں ہوں، ہوں لیکن ان کے مہر اور سہنی نے آپ کو بچھڑا لیا ہے، آپ ان کے لئے ایسا لکھ کر لیں، لیکن ہوا تو ان کی قبر پر چڑھ کر پانچ عدد دعائی لکھیں۔ ”سورۃ الفک“ پڑھ کر ان کو یہ کہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے والدین کی اجازت اور ان کی دعا میں شہید والا بنائے۔ (آمین)

ہر بار۔ مزید قرضدار

○ گزشتہ کئی برسوں سے جو کہ وہاں رہتی کرتا ہوں وہ شہر میں تو اچھا چلتا ہے لیکن پھر آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوئے نقصان میں آکر شہر سے ہوجاتا ہے اور میں مزید قرض دار ہوجاتا ہوں، پچھلے ٹیکم کارڈ پر پھر پلاٹ، آفیس میں ٹھہرا کر رہی تھی، جب تھی اور ہم دعائی سولہ سے 64 گز کے معمولی سے کرائے کے گھر میں آگئے ہیں، ہزار ہا کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوتا، بہت سے وعدے پلائے، ہوتی ہے جو دوسروں کو مانتا ہوں وہ بہت ہوجاتا ہے جو خود کرتا ہوں یہ جانتا ہے، کوئی کہتا ہے جاؤ سے تو تیرے، کیا کروں۔ آپ کے مستحق بہت سنا ہے، اللہ کے واسطے میرا مسئلہ حل کر دیجئے۔ دعا گو ہوں گا۔ نصیر احمد۔ کہو اپنی

اللہ بھیا اور باتیں ہیں آپ بہت اچھے مستحکم اور اچھے پانچ ہیں لیکن آپ کو جو اسکل ہے وہ بڑے پیمانے پر کام کرنے کا ہے۔ آپ اپنے کاروبار کی بجائے کسی بڑے ادارے میں کام کر کے لئے چلائی گئے، دوسرے آپ کی ناکامی تھی یہ بھی ہے کہ آپ نے ایسے پیلے پار ہوئے تھے۔ اس کا دوسرا علاج نہیں، ہاتھ باندھنا آپ کا روحانی علاج ہوا تھا لیکن اس کے بعد آپ دوسرا طریقہ پر تو صحت مند ہو گئے لیکن برائے کے دائرے سے نہیں نکل پائے۔ آپ ”سورۃ یحییٰ“ سات تین دن بعد نماز عشاء پڑھنی شروع کریں، معاملات اچھے ہو جائیں گے۔ آپ کی خصوصی فرمائش پر لوگ مشتری برائے کامیابی

اولاد نرینہ کی طلب

○ میرے دونوں بیٹے پیدائش کے بعد تین ماہ نہ رہے اور فوت ہو گئے۔ اللہ کی رحمت تین بیٹیاں ہیں وہ پانچ بیٹے سلامت ہیں اللہ ان کی حیات دے لیکن اولاد نرینہ کی فرمائش ہے۔ آپ کے وہابی علماء کی بہت شہرت ہے آپ پر سرکار و تاحسب اور میرٹھ اور ٹیکم کی بڑی کتابیں لکھی ہیں، آپ انہیں بھی لکھنے اور روحانی علاج بھی لکھ کر دیتے ہیں، آپ نے مجھے کوئی بھی بے حد اشتیاق ہے۔ نہیں جب پر آپ کی زیارت ہوتی رہتی ہے۔ آپ کا نام احمد۔ خانہ کربلا۔ شہر اختر شہر پورہ۔ اللہ تعالیٰ کے پاس درجے لیکن نام لکھ کر دے، اللہ تعالیٰ ہر دعا کو پورا کرنے پر قادر ہے۔ جب وہاں تک نہیں اسلام پونہ میں اسرار مظاہر لکھا ہے تو آپ کو عطا کر اس کے لئے کیا دعائیں ہے۔ اپنا ایمان قائم رکھئے ہر نماز کے بعد 101 مرتبہ درود شریف پڑھ کر دعا کیجئے۔ آپ کی فرمائش پر حاجی درخشاں اور پورے لئے ارسال کیا جا رہا ہے۔ آپ پر دعا اور محض درود شریف میں آئے، ان کے بعد ملاقات ہو جائے گی۔ سائنس دانہ ڈپریشن۔ والدہ کی بے بسی

○ راستہ مٹا کر جاتی ہوں لیکن نرینہ نہیں آتی ہے۔ بظاہر کوئی پریشانی نہیں ہے لیکن سبوں قلب بے حسرت ہے۔ دل، اولاد سب حاصل ہے لیکن دل پاؤں مردود ہے۔ ڈپریشن، غصہ، ناگہانی الازمی ہستی کیفیت طاری رہتی ہیں۔ کئی ٹیکوں، بہر نفسیات کو دیکھا چکی ہوں لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ وہاں کھا کھا کر اس کی مریش ہو چکی ہوں کیا میری اس بے بسی کا علاج ہے؟ امرت آباد کہو اپنی

اللہ بہن! آپ کی بیماری دوسرا نہیں روحانی ہے آپ کے حوالے سے جو چیز اشتکارے کے ذریعے سامنے آئی اس نے میرا دل دبا دیا اور آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیا، آپ نے اپنی والدہ کا دل بہت دکھایا ہے، وہ آپ کو آخری لمحوں تک یاد کرتے کرتے، آپ کا انتظار کرتے

یہ چار (4) صفحات اشتہار پر مشتمل ہیں، ان صفحات کے متن اور مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق ہے، نہ ادارے پر اس بارے میں کوئی لکھی گئی ہے اس ضمن میں ادارے سے کوئی خط کتابت نہ کی جائے۔

اور وہ پے پیسے میں برکت کے لئے ارسال کی جا رہی ہے۔

حالات اچھے تھے تو بھول گیا

○ میں آپ کا ایک مرید ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں کہ جب حالات اچھے تھے تو بھول گیا اب برے ہوئے ہیں تو پھر آپ کے پاس حاضر ہوں، میں نے اپنے ایک دوست کے ہمراہ کاروبار شروع کیا۔ اس نے سارا لین دین ملا اپنے ہاتھ میں رکھا مگر ساری بینک ٹرانزیکشن میں کرتا تھا۔ چار سال کاروبار بہت اچھا چلا ہم لوگوں نے خوب پیسے کمائے۔ ہمارے کاروبار کی بہتری کو دیکھ کر میرے پارٹنر نے مجھے کچھ لوگوں سے ملوایا کہ یہ ہمارے کاروبار میں سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اپنے ایک کام کے لئے چودہ لاکھ کی ضرورت تھی۔ انہوں نے ہم سے معاہدہ کر کے ہمیں 20 لاکھ ادا کر دیئے جو میں نے بینک میں جمع کر دوائے، چند دنوں میں کام کی پے منٹس کے سلسلے میں پارٹنر نے تمام رقم نکال لی اور مجھے معلوم ہی نہ ہوا اس میں 6-6 ماہ کے 8 لاکھ کے بارہ تیر چیک بھی تھے۔ پھر اچانک تھوڑے ہی عرصے میں جن لوگوں نے رقم دی تھی انہوں نے تقاضا شروع کر دیا اور جنہوں نے مال ہمیں بھیجا تھا ان کے چیکس واپس ہونا شروع ہو گئے، گھر بار ہر چیز بک گئی مگر میرے اوپر قرض کا پہاڑ بکڑا ہے۔ کبھی ایک چیک کی ضمانت کرواتا ہوں، کبھی حالات کی سیر کرتا ہوں۔ عزیز رشتے دار مزہ موڑ چکے ہیں بیوی ساتھ دیتی ہے۔ بچے بڑی طرح ہم گئے ہیں کیا کروں سمجھ نہیں آتا۔ وہ پارٹنر ایسا غائب ہوا ہے کہ جیسے زمین کھا گئی ہو یا آسمان نکل گیا ہو۔ کیا کروں کبھی تو بول چاہتا ہے خود کشی کر لوں۔ کیا ایک بار پھر نظر کرم نہیں کریں گے۔ دعا کا طالب۔ محمد طالب حسین۔ حیدرآباد

○ اچھے میاں! ہمارا ناراضگی یا غصے سے کیا علاقہ، محبت اور مروت ہمارا مشرب ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام معاملات کو بہتر کرنے والا ہے۔ میرے رب کی رحمت سے پہاڑ جیسا قرض بھی ہو تو ادا ہو جائے گا۔ ”سبحان اللہ و بحمدہ سبحان اللہ العظیم“ کثرت سے پڑھا کرو۔ بروز جمعرات ایک روٹی کا صدقہ کیا کرو اور اتوار کے دن ٹھیک 2 بیجے تا 4 بیجے گھر والوں کے ساتھ درود شریف پڑھا کرو اور پیر خانے کی دعا جو پونے چار بیجے شروع ہوتی ہے اس وقت دعا شروع کر دو پیر خانے میں بھی دعا ہوگی۔ تمام بہن بھائی جو کسی وجہ نہ آسکیں یا بیرون ملک اشرہ ہوں ان کو بھی تاکید ہے کہ 2 بیجے تا 4 بیجے محفل درود شریف منعقد کیا کریں۔ تمہارے کاروباری مسائل کو دیکھتے ہوئے لوحِ تسخیر خاص ارسال کی جا رہی ہے۔

معاملہ ختم۔ صحت بحال

○ میری بی بی ما شانہ اللہ خوبصورت قد بُت کی ہے، ماسٹرز کیا ہے۔ مگر جب بھی اس کے رشتے کی بات فائل ہونے لگتی ہے وہ بیمار پڑ جاتی ہے

چہرے کی رنگت خچر جاتی ہے سانس پھولنے لگتا ہے، ہاتھ پیروں میں ٹخنڈے پسینے آنے لگتے ہیں۔ چہرے پر پانی والے والے نکلنے شروع ہو جاتے ہیں۔ اسکن اسپیشلسٹ، ماہر نفسیات سب کو دکھایا، لیکن افادہ نہیں ہوتا۔ مگر جو نبی شادی کا معاملہ ختم ہو جاتا ہے صحت بحال، دنا شروع ہو جاتی ہے، لوگ کہتے ہیں جادو تو تیر کا اثر ہے۔ اگر ایسا ہے تو علاج عنایت کیجئے تاکہ شادی کا مسئلہ حل ہو جائے۔ آپ کی بہن دعا گو ۶۶ اچھی بہن! معاملہ تو واقعی تشریفات کا ہے۔ آپ کی صاحبزادی آئینی کیفیت کا شکار ہیں۔ شریعت قطعی برہنہ ہو کر نہانے سے منع کرتی ہے۔ اسی لئے شریعت نے قصائے حاجات کے لئے مسنون دعائیں مقین کی ہیں لیکن بد قسمتی سے ہم احتیاط نہیں کرتے، جس کا نتیجہ ہمیں بھگتنا پڑتا ہے۔ آپ کو نظر بد جن اور آئینی معاملات کے لئے ایک ورد، پینے کے غسل کے جلانے کے تعویذ بذریعہ ایک صحیحے چار ہے ہیں۔ اس پر باہری سے عمل کیجئے۔ انشاء اللہ بچی کے معاملات 90 روز میں بہتر ہو جائیں گے۔

مطلبی مرید۔ نہ میاں نہ

○ بیرون ملک جانے کی بڑی خواہش ہے مگر کئی برسوں کی کوشش کے باوجود بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ ہزاروں روپے بینکوں کے چکر میں بہاؤ کر چکا ہوں، ایک بار بڑی مشکل سے یونان پہنچا مگر وہی پورٹ کر دیا گیا والد صاحب کا کہنا ہے کہ ہمیں کوئی کام کر لو مگر میری بھی نیکی خند ہے کہ کام باہری کر لوں گا۔ اس وجہ سے لہا بھی ناراض رہتے ہیں۔ کیا اس کا کوئی حل ہے آپ کے روحانی اور قرآنی اعمال کا بہت سنا ہے آپ میرا کام کر دیں تو میں آپ کا مرید ہو جاؤں گا۔ رضوان محمود۔ نواب شاہ

○ نہ میاں نہ! ہمیں مطلبی مریدوں کی ضرورت نہیں۔ اللہ پاک آپ کے معاملات حل فرمائے۔ ترکیب ہم بتا دیتے ہیں۔ بینکوں کا چکر چھوڑیں جو لہا کہتے ہیں مان لیں اور کاروبار شروع کر دیں جب لہا خوش ہو جائیں تو ان کی مرضی سے بیرون ملک کے لئے اپلائی کر دیں، کامیاب ہو جائیں گے، یاد رکھیں والد کا غضب اللہ کا غضب اور والد کی اطاعت اللہ کی خوشنودی ہے آپ کی بے حد فرمائش پر لوحِ تسخیر خاص ارسال کی جا رہی ہے۔

شادی۔ ورنہ خود کشی

○ کئی دنوں سے ایک ایسی پریشانی میں پھنس گئی ہوں کہ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں، میرا بیٹا میری بہو کی بہن کو پسند کرتا ہے مگر وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے آپس میں رشتے داری کی وجہ سے کوئی رکاوٹ نہیں ہے مطلب یہ کہ شادی ملے ہے۔ مگر میرے بیٹے کی ضد یہی ہے کہ وہ روزیہ ہی سے شادی کرے گا۔ دو مرتبہ خود کشی کی کوشش کی مگر اللہ کے فضل نے اسے بچالیا۔ میرے دو بیٹے اور ایک بی بی ہیں بے بہا اور بیٹے کا رویہ بدل گیا ہے، بیٹا کہتا ہے کہ اس بے عزتی سے بہتر ہے کہ میں علیحدہ

کروں۔ کیا اس کا علاج ہے آپ کے پاس میں تو دعائیں کر کر کے تھک گئی ہوں ایک بزرگ کی طرح میری مدد فرمائیں۔ شاہین اسلم۔ کراچی

بہن! جیتی رہو تم جیسی بچیوں سے معاشرہ سلامت ہے تمہارے میاں اصل میں احساس کمتری کے مریض ہیں، اوپر سے اللہ تعالیٰ نے انہیں اعلیٰ تعلیم اور نوکری سے نواز دیا۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ ہر شخص خصوصاً خاندان والے چونکہ ان کی خامیاں کمزوریاں ان کے علم میں ہیں لہذا ان کا فائدہ اٹھا کر تعجب کرنا اپنا شعار بنالیا ہے۔ ہرگز خودکشی کا نہ سوچنا اللہ میاں بہت غفور الرحیم ہے۔ ہر نماز کے بعد صرف 14 مرتبہ درود شریف تاج "پڑھ کر ان کا تصور کر کے دم کر دیا کرو خصوصاً جب "دفع البلاء وادواءہ واطیبہ والرضیہ والالہم" تک پہنچو تو تین بار تکرار کرو اصلاح کے لئے لوح تخییر خاص اور تیسری زعفران ارسال کئے جا رہے ہیں۔ یقین رکھو اللہ پاک اچھا اجر دیں گے۔

ہو جاؤں، دوسری طرف وہ لوگ بھی ہم سے ناراض ہو رہے ہیں کہ ہم اپنے بیٹے کو سمجھاتے نہیں ہیں مگر ہم کیا کریں، اچھی بات تو یہ ہے بھائی صاحب کہ اگر میرے بیٹے کو محبت کا حق حاصل ہے تو ان دونوں کو بھی یہی حق حاصل ہے پھر یکطرفہ محبت سے فائدہ کیا؟ اذیت کے علاوہ کیا ملتا ہے۔ لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں۔ اس کے لئے کوئی ایسا روحانی حل تجویز کریں کہ یہ سب خوش رہیں۔ سلٹی پردین۔ راولپنڈی

بہن عزیز! اللہ تعالیٰ تمام والدین کو اولاد کے دکھ سے محفوظ و مامون رکھے۔ آپ ہر نماز کے بعد 14 مرتبہ "یا کریم یا سلام یا حامد یا مانع" پڑھ کر دعا کیا کریں اولاً آخر 9 مرتبہ درود شریف۔ بیٹے کی اصلاح کے لئے لوح تخییر خاص ارسال کی جا رہی ہے۔ نیلی کے استحضات میں کامیابی کے لئے لوح عطار ارسال ہے۔

اسکول کی لڑکی۔ خواب میں آئے

میرے ساتھ کچھ عرصے سے عجیب سا واقعہ ہونا شروع ہو گیا ہے۔ جس کی وجہ سے میرا سکھ جین غارت ہو گیا ہے، میں اپنے گھر، بھئی، بچوں سے بے حد خوش ہوں، مگر گزشتہ ڈیڑھ سالوں سے میرا ہر چل نڈاب ہو گیا ہے، ہم میرا پورا خاص میں رہتے تھے، پھر والد صاحب کے حادثے کے ساتھ یہاں آ گئے، تعلیم وغیرہ سب یہیں حاصل کی، شادی ہو گئی۔ ایک دن اچانک بازار میں پرانے شہر کے ایک واقعہ مل گئے بچپن میں ہم سب ایک ہی گلی میں رہتے تھے، وہ میرے گھر آئے میں ان کے گھر گیا تو معلوم ہوا ان کی شادی ہماری ہی ایک سکول فیلو سے ہو گئی تھی، اچھی بات تو یہ کہ مجھے اس کی شکل تک یاد نہیں تھی مگر جب انہوں نے طویا تو ایک عجیب سا احساس ہوا، مجھے یاد آیا کہ وہ کالی سی سوکھی سی مرلی سی لڑکی ہو کر تھی مگر اب وہ ایک بھر پور خاتون تھی، ملاقات چائے کھانے کے بعد ہم گھر واپس آ گئے مگر وہ میرے ذہن سے چپک

آیا امتحان۔ ہوگئی چڑچڑاہٹ

پیری ٹی اور بیٹانویں دسویں کے طالب علم ہیں ٹیسٹ میں ان کے نمبر بہت اچھے آتے ہیں مگر امتحان کے دنوں میں طبیعت سست رہتی ہے جین ہو جاتی ہے چڑچڑاہٹ ہو جاتی ہے نیند بہت آنے لگتی ہے جو یاد کرتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں پڑائیں کہ بچوں کو نظر لگ گئی ہے یا کوئی جادو ہے۔ آپ کوئی روحانی علاج تجویز کریں۔ عذرا آفتاب۔ فیصل آباد

بہن! ہر نماز کے بعد 13 مرتبہ "سورۃ الم نشرح" پانی پر دم کر کے پلائیں، بے وجہ نصیحتوں اور ہڈوں سے گریز کریں۔ دونوں کو 7 باناسوں پر "یا علیم یا قوی" 100 مرتبہ دم کر کے دے دیا کریں آپ کی فرمائش پر لوح عطار ارسال کی جا رہی ہے۔ گیارہویں شریف کے لئے آپ کے ہدیے کا شکریہ

میاں۔ اڑیل مزاج

میرنی شادی کو 9 برس ہو گئے ہیں مگر کوئی سکھ نصیب نہیں ہوا۔ بیابا عجیب سے اڑیل مزاج ہیں جو بات منہ سے نکل جائے بس وہی ہوتا ہے۔ چاہے غلط ہو یا سہی ہر معاملے میں ٹانگ اڑانا اپنا فرض سمجھتے ہیں پہلے رشتے دار ناراض تھے اب سکھ بن بھائی بھی ملنا چھوڑ رہے ہیں۔ دوسروں کی بیویوں کو ٹوکنا لازمی سمجھتے ہیں سب میرے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ تم سمجھاتی کیوں نہیں ہو اپنے میاں کو، مگر میری کوئی اذیت ہو تو میں سمجھاؤں، بس ایک ٹوکرائی ہی ہوں، ضرورت کے تحت میرے پاس آتے ہیں اور اس میں بھی رویہ ایسا ہوتا ہے کہ ذہن اور بدن احساسی ذلت سے مسلک جاتا ہے، اذیتا زہد روزہ اوپر سے دین کی من مانی تشریح جو صرف اپنے مفاد کے مطابق ہو۔ جاہل نہیں ہیں اپنے مضمون کے پی ایچ ڈی ہیں دنیا ان کے علم و فضل کی دیوانی اور گریلو معاملات میں مغرور سمجھی گئی تھی چاہتا ہے کہ خودکشی کر لوں مگر پھر سوچتی ہوں میرے بچوں کا کیا تصور اگر باپ کی شفقت نہیں ہتی تو ماں کی ممتا سے کیوں محروم

ضروری نوٹ

اپنا تکرار مسئلہ اپنے نمٹنے نام محمد والدین اور تاریخ پیدائش کے ساتھ ارسال کریں۔ اس کا ہم میں جواب باری آنے پر دیا جاتا ہے۔ براہ راست جواب کے لئے اپنا پتہ لکھا ہوا جوابی لفافہ بھیجئے۔ فون پر مسئلہ نہیں سنا جاتا ہے، خط لکھیں یا ملاقات کریں۔ ہیر وہن شہر سے آنے والے وقت لے کر تشریف لائیں۔ ہیر وہن ملک، قیم خواتین و حضرات اپنا مکمل پتہ ارسال کریں۔

پیر شاہ محمد قادری 382-A/2، جوہر ٹاؤن، نزد محمد علی چوک، کالج روڈ، لاہور۔ تعطیل بروز جمعہ المبارک
0302-5555967

محفل درود شریف علیہ السلام

ہر اتوار دوپہر 2 بجے تا 4 بجے منعقد ہوتی ہے

الحمد للہ آسٹاٹ، قادریہ تاجیہ ہاشمیہ پر محفل درود شریف باقاعدگی سے گزشتہ کئی برسوں سے ہورہی ہے۔ جس میں سرکار درود جہاں سرور انبیاء حضور اکرم نور مجسم محمد مصطفیٰ ﷺ کے حضور درود شریف کا نذرانہ پیش کیا جاتا ہے اور اقسام پر زندگی میں پیش آنے والے جملہ مسائل کے لئے اجتماعی دعا کی جاتی ہے خواتین کے لئے علیحدہ انتظام ہوتا ہے تمام عاشق رسول ﷺ خواتین و حضرات کو شرکت کی تاکید ہے۔

آسانیف بہر شاہ محمد قادری

اسلام الحسنى کا میابی کا راستہ، عملیات، اسما الحسنى، خواب اور تعبیر، بچوں کے خوبصورت نام، عملیات سے تصوف تک، ہاتھوں میں تقدیر، سیدنا غوث الاعظم، جادو اور جنات، ہر اچھے بکسٹال پر دستیاب ہیں۔

ختم گیارہویں شریف

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آستانہ قادریہ تاجیہ ہاشمیہ میں ہر مہینے کی پہلی اتوار کو صبح 10 بجے تا 12 بجے ختم گیارہویں شریف محفل نعت کے ساتھ منعقد ہوتی ہے۔ محفل کے اختتام پر بہر شاہ محمد قادری خصوصی طور پر مزیدین، عقیدت مند ان اور ملک و ملت کی خوشحالی، حفاظت اور سلامتی کے لئے دعا کرتے ہیں۔

نوٹ: وقت کی پابندی کا خیال رکھیں۔ خواتین کے لئے باپردہ اہتمام ہوتا ہے۔ شرکاء کے لئے الٹرا کا اہتمام ہوتا ہے۔

ملاقات صبح 11 تا 7 بجے شام

آستانہ قادریہ تاجیہ ہاشمیہ بہر شاہ محمد قادری
3-2-V2 جوڑو روڈ، گلبرگ، کراچی۔ فون: 042-35168036
042-35167842
0302-5555967
0335-2911117

گنی، اب ہر رات خوابوں میں آتی ہے، میں اندر سے اندر گھلتا جا رہا ہوں وہ میرے دوست کی بیوی ہے، پھر میرا اس کا تعلق ہی کیا مگر جس قدر بھی نظر انداز کروں اس کے خیال کو کچلوں وہ میرے اعصاب پر سوار ہے، خدا کے لئے میرا گھر جاہ ہونے سے بچا لیجئے۔ محمد جنید۔ کراچی

بہتر عزیزم! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں یہ ایک ذہنی مددے کا رد عمل ہے بقول آپ کے وہ کالی سوگی مرین ہی لڑکی تو آپ اس روپ میں دیکھنے کو تیار ہی نہیں تھے مگر جب آپ نے اس کو اچانک دیکھا اس کی جاہلیت نے آپ کو ایسی گرفت میں لے لیا یہ تو ہے آپ کے مسئلے کی توجیح روحانی عمل یہ ہے آپ رات سوئے سے قبل بکثرت "ایک نعت الیا ایک نستغین احد باصرہ الاستغیم" پڑھا کریں آپ کے لئے لوح زہرہ ارسال ہے۔

ٹیچر کی محبت لگاتار

بات اچھی تو نہیں ہے مگر جب مشورہ لیا جائے تو سچ کہے بغیر چارہ نہیں اور آپ سے تو ویسے بھی میں بھون بولنا گناہ سمجھتی ہوں، آپ کی فیس بک اور ویب سائٹ بہت پسند ہے میں عجب تہ آپ کی مرید ہوں میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے اپنے ٹیچر سے محبت ہو گئی ہے وہ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں حالانکہ وہ شادی شدہ ہیں اور دو بچوں کے باپ ہیں

ہمارے اور ان کے درمیان بہت فاصلہ ہے، وہ پانچ مرلے کے کرائے کے پورشن میں رہتے ہیں اور ہمارا گھر دو کناں پر ہے، ان سے آپ اندازہ لگالیں، مگر دل کا کیا کروں کہ وہ میرے قابو میں نہیں ہے، ان کی نرمی، محبت اور توجہ نے مجھے ان کی محبت میں گرفتار کر لیا ہے۔ مگر وہ سبزی طرف توجہ ہی نہیں دیتے، ایک بار میں نے ان سے کہنے کی کوشش کی تو

انہوں نے صرف اتنا کہا کہ جو چیز میں انور نہیں کر سکتا اس پر توجہ دیتا ہوں اور وہی اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں، ان کی اس بے نیازی نے مجھے اور بھی ان پر مائل کر دیا ہے، میں کیا کروں کہاں جاؤں؟ دن رات

ان کے فراق میں تڑپتی رہتی ہوں، آپ مدد کریں۔ نوشاہہ۔ شہرنا معلوم ہے کریم آقا حضرت محمد ﷺ کی حدیث مبارک کا مفہوم ہے، آدمی کے تین باپ ہیں، ایک وہ جسم کے ضلب سے وہ پیدا ہوتا ہے ایک وہ جو اسے تعلیم دیتا ہے اور ایک وہ جو اس کو بیٹی دیتا ہے، آپ کی محبت درست ہے مگر زودید درست نہیں، اپنا نقطہ نظر بدل لیجئے، زندگی آسان ہو جائے گی، آپ کے لئے لوح زحل ارسال کی جا رہی ہے، آپ ہماری بیٹی ہیں اور بیٹیوں سے ناراض نہیں ہوتے، مرید ہونے کے لئے اپنے والدین

کے ہمراہ آئیں